

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

ایک ربتہ

مئی 2017

عمران خان

A contact loved ones.

ایک ربتہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.



www.PakistaniPoint.Com

نعت سراج اور شیریں حیدر کے پُر اثر قسط دار ناول
اسٹریزور پڈرز کی خوشگوار تقریب کا احوال رخ چوہدری کے قلم سے

پاکینہ

اندر ان اعلیٰ : معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد



دکن آل پاکستان نرسیز و مساعی

منیجر اشتہارات

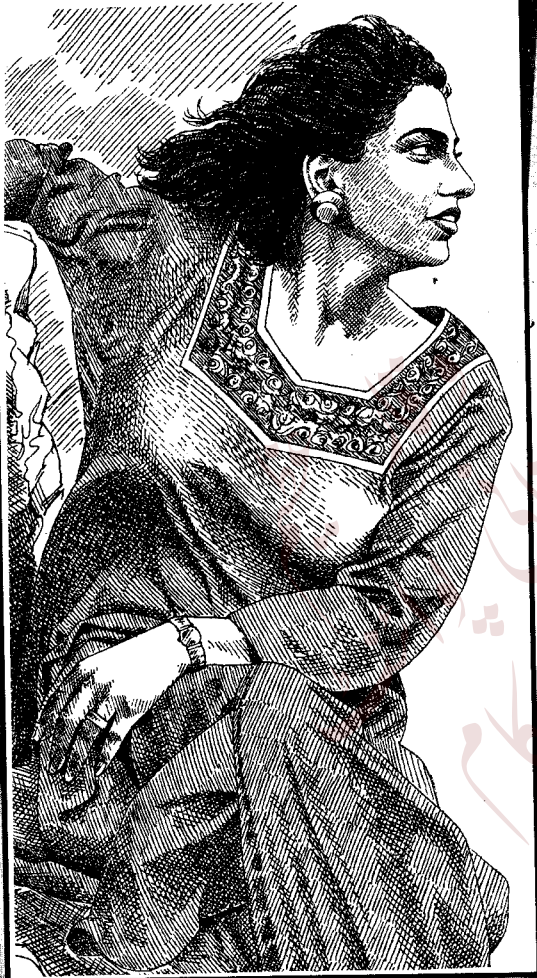
محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269



۱۔ تہ تی پرچا (پاکستان) 60 روپے

۲۔ تہ تی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا سعودی متحدہ عرب امارات

۳۔ مالان (اندرون ملک) 800 روپے جلد 45 شمارہ 08 نومبر 2017ء

فوتو گرافی : ایم کاشف میک اپ : زیب زی ماڈل : ماہ نور راجا (لاہور)

افسانے

- 7 ہاجرہ ریحان
1 اُم ایمان
23 حیا بخاری
27 دردانہ نوشین خان
37 نصرت یوسف
51 شگفتہ شاہ
55 سارہ احمد
59 شمیم فضل خالق
60 ناہید چوہدری
9 سیما بنت عاصم
- شیریں
بلال عیون
محبت زاد راہ
خواب گزینہ
شیریں کو لکھتے ہوئے
عورت کتھا
ہفتوں آتا
اکوڑا شادی
بہن آتی سی بات
دیا جلا کا

فصوصی مضامین

- 3 ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
3 اختر شجاعت
7 سنبل ملک اعوان
30 رخ چوہدری
39 شائستہ زریں
- اللہ اور آئی کا نور
شیریں کا دل
عمر کے کاغذ
احوالِ تفریح
ہر روز

اداریہ

مدیرہ 15

مجھے کچھ کہنا ہے

سلسلے وار ناول

22 رفعت سراج
96 شیریں حیدر

پہلی کڑی
امرت

منی ناول

154 سیما رضاردا

ہم کو عشق کی یاد آگیا

ناولٹ

54 شہناز وسیم
77 رفاقت جاوید
203 ریحانہ آفتاب

بوجھ
فصلِ محبت
نکلی جود

مکمل ناول

224 سمیرا یونس ہارون

کوئی تعویذ ہو بلکہ



مستقل عنوانات

پاکیزہ بہنیں 295	چرخِ اللہ	16 ادارہ	بین کی باتیں
پاکیزہ بہنیں 297	برکاتِ پاکیزہ	273 ادارہ	اکبر بہ نظر آفت
۴ جیس 299	حسن نگار کے آگے	275 مدیرہ	نہن کی مفل
ادارہ 300	روحانی مشق	287 عظمیٰ آفاق سعید	ماہنامہ ہائری
302	ہومیو پیتھک	292 صغریٰ زیدی	نہن کی باتیں
		294 ادارہ	نہن کی باتیں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو
آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا
شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیک کی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

قارئین کرام! السلام علیکم.....
بچوں کو مستقبل کا معمار کہا جاتا ہے۔ انہی بچوں کو ملک و قوم کا سرمایہ بھی کہا جاتا ہے اور انہی سے ڈھیروں ڈھیر امیدیں بھی وابستہ کی جاتی ہیں، بے شک بچے اپنے، اپنے خاندان کا اثاثہ، معاشرے کا سرمایہ اور ملک و قوم کے لیے خزانہ بے بہا ہوتے ہیں..... مگر کون سے بچے.....؟ کیا بھوک و افلاس کے مارے بچے..... یا وہ جو کم عمری میں اپنے خاندان کی کفالت کے لیے سخت ترین محنت اور جفاکشی کی تصویر بنے کبھی کسی درکشاپ پر..... کبھی چائے خانوں میں گاہکوں کے آگے چائے کی پیالیاں رکھتے اور میزیں صاف کرتے ہوئے اور کبھی قیمتی گاڑیاں دھوئے ہوئے..... ان مراعات یافتہ طبقے کے بچوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں جو کلف لگایو نینفارم پہنے قیمتی بستے لٹکائے منگنے ترین اسکولوں میں جا رہے ہوتے ہیں۔

لمحہ فکریہ یہ ہے کہ بچوں کا عالمی دن تو بڑے شاندار طریقے سے منایا جا رہا ہے مگر جن کے لیے منایا جا رہا ہوتا ہے ان کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ تو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں..... طبقہ امرا کے بچوں کو اس سے کوئی سروکار ہی نہیں ان کے لیے تو مراعات بڑے، بڑے نقشین تھالوں میں رکھی رہتی ہیں اور غریب ترین طبقے کے بچے دو وقت کی روٹی کے لیے کبھی محنت مزدوری میں سرگرداں اور کبھی اخلاقیات کا درس بھولے والدین کے زیر پرستی چھوٹی عمر سے ہی ہیرا پھیری اور چوری چکاری کی تربیت میں مصروف..... اب رہ گیا متوسط طبقہ تو وہ معاشرے میں ایک معزز مقام بنانے کے لیے تمام عمر ڈولتا ہی رہتا ہے..... بنیادی ضروریات اور سہولیات کا عدم توازن اور مراعات کی غیر منصفانہ تقسیم اسے اپنی ہی زمین پر قدم جماتے نہیں دیتی ایسے میں بچوں کا عالمی دن منانا تو محض میڈیا اور این جی او کی ڈسے داری رہ جاتی ہے تاکہ ریٹنگ کا تناسب اور فنڈز کا حصول برقرار رہے انہیں کہیں بے خبری کے خمیازے نہ بھٹکتے پڑ جائیں اور ساقی میڈیا ہاؤسز باری نہ لے جائیں۔

جہاں تک بچوں کے اصل حقوق کی بات ہے تو اس کا مکمل نصاب تو ہمیں چودہ سو سال پہلے ہی مل چکا ہے جو ہماری اپنی ہی غفلت اور کوتاہی سے رائج نہ ہو سکا۔

اس دن کے حوالے سے صرف اتنا ہی کہیں گے کہ کیا ایک دن منالینا بچوں کے حقوق سے آگاہی اور وقتی اطلاق کے لیے کافی ہے.....؟ اس پر تو اجتماعی عملی اقدام کی ضرورت ہے۔

مدیرہ

نزہت اصغر

ان کے لیے دوزخ کا پھوٹنا ہوگا۔ اور ان کے اوپر سے (وہی) ان کا اوڑھنا، اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۴۱) اور وہ لوگ جو ایمان لا چکے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، ہم کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ (۴۲) اور جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہوگا، وہ ہم نکال دیں گے، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور وہ کہیں گے ہر قسم کی حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی۔ اور ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ کرتا۔ بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق کے ساتھ آئے تھے۔ اور انہیں نداء دے دی جائے گی کہ تم جو عمل کیا کرتے تھے اس کی وجہ سے یہ جنت ہے جس کے تم وارث بنا دیے گئے ہو۔ (۴۳) اور جنت والے دوزخ والوں کو آواز دیں گے کہ جو کچھ ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ ہم نے یقیناً پایا۔ تو کیا تم سے جو کچھ تمہارے پروردگار نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اسے ٹھیک پایا۔ وہ جواب دیں گے کہ ہاں۔ پھر ایک آواز دینے والا ان کے درمیان آواز دے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (۴۴) یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس میں کجی پیدا کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں (۴۵) اور ان دونوں (گروہوں) کے درمیان پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ہر ایک کو ان کے نشانوں سے پہچان لیں گے۔ اور جنت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ وہ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے حالانکہ وہ خواہش رکھتے ہوں گے (۴۶) اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی، وہ کہہ انھیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالموں کی قوم کے ساتھ نہ رکھو (۴۷)۔ اور اعراف والے ان لوگوں کو آواز دیں گے جنہیں وہ ان کی پیشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہاری جمیعت، اور جو کچھ تم تکبر کیا کرتے تھے۔ تمہارے کام نہ آئے۔ (۴۸) کیا یہی وہ لوگ تھے جن کی نسبت تم قسمیہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا۔ (آج انہیں کہا جائے گا کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں ہے، اور نہ تم غم کرو گے۔ (۴۹) اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے، کہ تھوڑا سا پانی اور کچھ اس رزق میں سے جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ہم پر بھی ڈال دو۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر یقیناً حرام کر دی ہیں۔ (۵۰) جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور کودنا رکھا تھا۔ اور انہیں دنیاوی زندگی نے دھوکا دے رکھا تھا۔ پس آج کے دن ہم انہیں اسی طرح چھوڑ دیں گے جیسا کہ انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کی (تیاری) کو چھوڑ دیا تھا، اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ (۵۱)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ط

افضل الانبیاء محی مرتبت، سید المرسلین، حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی و مفہوم، رسول، پیغام رساں، پیغمبر اور پیامبر کے ہیں۔

1۔ لقولان: ۱۔ ترجمہ: کہہ دو کہ لوگوں میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ (سورۃ اعراف، آیت ۱۵۸)

۲۔ ترجمہ: اور اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تمہیں سب لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور اللہ گواہ کافی ہے۔ (سورۃ نساء آیت ۷۹)

2۔ الحدیث: ۱۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ میں تھا ایک روز ہم اس کے بعض نواح میں نکلے تو راستے میں جو پہاڑ یا درخت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آتا تھا کہتا تھا۔
”السلام علیک یا رسول اللہ“ اور میں اس کو نرہا تھا۔

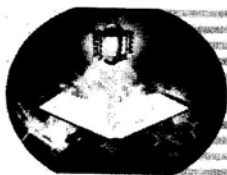
3۔ لوالانے: ۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی رسالت کی صداقت پر جو پختہ یقین تھا وہ ہر خشک و شہ سے بالاتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا جو پہلو نہایت شدت سے ابھرا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دینی جذبہ تھا جب اس کا احتراز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی سیاسی صلاحیتوں سے ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت دنیا میں ہی کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ (جوزف شاہٹ)

۲۔ پوری نسل انسانی کو اسلام کے پیغمبر پر فخر کرنا چاہیے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کے لیے وہ قانون چھوڑا ہے جس کے اعلیٰ معیار پر انسانیت اگر آئندہ دو ہزار سال میں بھی آجائے تو بڑی باعث مسرت کامیابی ہوگی۔ (پروفیسر سیریل جینوایو نیورسٹی)
اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انصاف و ایمان داری سے تنقیدی نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ مرسل اور مامور من اللہ تھے۔ (ریورنڈ آرمیکو نیل)

4۔ الغضائل: ۱۔ ہر نماز کے بعد ۲۹ مرتبہ اس اسم پاک کا ورد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے دور رکھے گا۔

۲۔ کسی سخت مالی مشکلات میں نقصان ہونے کا خدشہ لاحق ہو تو نماز عصر کے بعد با وضو حالت میں قبلہ رخ نہایت یکسوئی کے ساتھ مغرب کی اذان تک بکثرت اس اسم پاک ”سیدنا رسول“ کا ورد کرے اور مشکل کے حل کے لیے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ ہر پریشانی دور کر دے گا۔ (ابلی آمین)

پیغمبر و حیات کی کتاب، مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ سے نقل



قرآن پاک سے عشق کی پر نور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب دہم

برائی کا بدلہ اور معافی

اللہ تعالیٰ کی معاف کردینے والی خصوصیت کی بابت آپ نے گزشتہ شمارے میں پڑھ لیا ہوگا۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتا ہے جو دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ برائی کی ہے تو اس کا جواب تین طرح سے دیا جاسکتا ہے۔

- 1۔ برائی کے بدلے میں برائی۔
- 2۔ برائی کے بدلے میں خاموش رہنا، صبر کرنا۔
- 3۔ برائی کے بدلے میں بھلائی کرنا۔

ان تینوں صورتوں کی وضاحت مندرجہ ذیل آیات سے ہو رہی ہے۔
”اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو

(مناسب طریقے سے) بدلہ لیتے ہیں۔“ (الشوریٰ آیت 39)

”اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور (معاملے) کو درست کر دے اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے۔“ (40)

”اور جس پر ظلم ہوا ہو (مگر وہ اس کے بعد انتقام لے) تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔“ (41)
”اور جو صبر کرے اور قصور معاف کر دے تو

ہمت کا کام ہے۔“ (43)
سورہ نجم سچا (41) کی مندرجہ ذیل آیات بے حد اہمیت اور توجہ کی حامل ہیں۔

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں

”کہہ دو کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے۔“

کہنے کو یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے لیکن اگر اس بات کی گہرائی میں جائیں تو آیت اپنے معنی و مطالب کے لحاظ سے بے حد وسعت رکھتی ہے۔ اس کا پھیلاؤ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بے حیائی اور فحاشی خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ طور پر اختیار کی جائے ہر حال میں حرام قرار دی گئی۔ جس بات کے لیے ایک قطعی حکم آگیا اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ بے حیائی کے مظاہرے کئی انداز میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم لباس کی بات کر لیں۔ لباس

زینت، زیبائش اور ستر پوشی کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ستر پوشی کا خیال نہیں رکھا گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی ہوگی۔ مغرب کی تقلید میں آج کل مسلمان لڑکیوں نے بھی اپنے جسم کو عریاں کر لیا ہے۔ دوپٹا تو اب بھولی بھری کہانی بن چکا ہے۔ اگر ہوتا بھی ہے تو صرف ایک طرف شانے پر ڈالنے کے لیے یا پھر بازوؤں میں جھول رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے صاف، صاف حکم دیا ہے کہ اپنی اور دوسری کو اپنے سینے پر اچھی طرح سے پھیلا لو۔

اس کے خلاف کرنے والی عورت اپنے لیے جہنم کی آگ خرید رہی ہے۔ نظروں کے لیے حیاتی بھی سراسر حرام ہے۔ جیسا کہ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنی نگاہیں نیچے رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کوئی بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ نومن (آیت نمبر 19) میں فرماتا ہے۔ ”وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو (باتیں) سینوں میں پوشیدہ ہیں (ان کو بھی)۔“

بے حیائی کے مناظر دیکھنا، خواہ وہ کسی فلم ہی میں کیوں نہ ہوں، حرام ہے۔ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا جو بے حیائی اور فحاشی پھیلانے والے ہوں، غلط ہے۔

”یہی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔“ (34)
”اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔“ (35)

اگرچہ برائی کا بدلہ برائی سے لینے کی اجازت ہے مگر درگزر کرنے، معاف کر دینے اور مہربان کرنے کے بڑے درجات ہیں اور جو لوگ برائی کے بدلے میں ہلائی کرتے ہیں تو بہت اونچے نصیب والے ہوتے ہیں۔ معاف کر دینے والوں کو اللہ نے اپنا دوست کہا ہے۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 134 میں کہا گیا ہے۔

”جو آسودگی اور نیکی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور خدا ان کو دوسرے رکھتا ہے۔“
اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیات طیبہ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ نے آپ کے اوپر اتنے مظالم ڈھائے، طرح، طرح سے ستایا، پتھر مارے مگر آپ نے مہربان اور بردبار رہنا سیکھا۔ آپ نے نہ صرف

اپنے حال کو دیکھا بلکہ ان کے لیے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری ان برائیوں کو اور رد کر دے جنہوں نے ہماری زندگیوں کو کھوکھلا دیا ہے۔ دلوں میں کشادگی پیدا ہو اور معاف کرنے کی عادت کو اپنا کر ہم اللہ کے دوست بن جائیں آمین

بے حیائی کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۃ النور، آیت نمبر 151 میں اللہ تعالیٰ ان باتوں کو حرام قرار دیا ہے جو اس نے حرام قرار دیں۔ یہ بھی ہے کہ ”اور بے حیائی کے کام“

سورۃ اعراف آیت نمبر 33 میں اللہ

بے حیائی والی فلم دیکھنا دکھانا، بنانا، اس میں کام کرنا، اسے لوگوں کے سامنے پیش کرنا، سب حرام ہے۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے۔ ایسے مقام پر جانا جہاں بے حیائی کے مظاہرے ہوتے ہوں، حرام ہے۔ فحاشی والا لٹریچر پڑھنا بھی عذاب ہے۔ لوگ گندی کتابیں چھپ، چھپ کر پڑھتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے فحاشی ہر دو صورتوں میں منع فرمائی خواہ وہ ظاہر میں ہو یا پوشیدہ طور پر۔

سورہ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزرتے ہیں۔“ (آیت نمبر 72)

اللہ تعالیٰ نے سورہ قلم میں قسم کھائی ہے قلم اور اس سے لکھنے والے دونوں کی۔ اب قلم کار کے اوپر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریر سے دوسروں تک کون سی بات پہنچا رہا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر..... یعنی اچھی بات لوگوں کو پہنچاؤ اور بری بات سے منع کرو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حرام کاموں سے دور رکھے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن کرے۔ (الہی آمین)

متاع الغرور

ایک زمانہ تھا جب انسان کی شرافت اور اخلاق کو ہی انسانی پرکھ کا معیار خیال کیا جاتا تھا مگر اب بدلے ہوئے زمانے کے ساتھ لوگوں کی اقدار بھی بدل چکی ہیں۔ شرافت، عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ ظاہری نمود و نمائش، چمک دیک اور دولت کی ریل تیل نے انسان کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ ان دھوکا دینے والی چیزوں میں اس قدر کم ہو چکا ہے کہ احساس بھی ختم ہو گیا ہے۔ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر آخرت کی زندگی سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ حدید

(57) کی آیت نمبر 20 میں ارشاد فرماتا ہے۔

(ترجمہ) ”دنیا کی زندگی تو متاعِ فریب ہے۔“

غرور کے معنی دھوکا، فریب اور سراب کے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی زندگی کو دھوکے کی چتر قرار دیا اور اپنی بہت سی آیات میں واضح کر دیا کہ دنیاوی مال و متاع، آسائشیں یہ سب کچھ دھوکا ہیں، فریب ہیں۔ اصل زندگی تو وہ ہے جو آنے والی ہے اور جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اس سلسلے کی آیات کا ترجمہ

پیش ہے۔ سورہ آل عمران (3) آیت نمبر 185 (ترجمہ) ”ہر تنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا، پورا بدلہ دیا جائے گا اور جو شخص آتشِ جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔“

سورہ انعام (6) آیت نمبر 32 ”اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور مشغلہ ہے اور بہت اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے۔ (یعنی) ان کے لیے جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔“

اسی سورہ کی آیت نمبر 70 میں ارشاد ہوتا ہے۔ ”اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان سے کچھ کام نہ رکھو۔ ہاں اس (قرآن کے) ذریعے سے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن)

کوئی اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔ (اس روز) خدا کے سوانہ تو کوئی اس کا دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا..... اور اگر وہ ہر (چیز جو روئے زمین پر ہے بطور) معاوضہ دینا چاہے تو وہ اس سے قبول نہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔ ان کے لیے پینے کا کھولنا پانی اور دکھ دینے والا عذاب ہے۔ اس لیے کہ کفر کرتے تھے۔“

اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو بتاتا ہے کہ دنیا کی زندگی پر خوش ہونا نادانی ہے اور اس کے فائدے بھی عارضی ہیں اور آخرت کی نعمتیں تو بہت

زیادہ ہیں۔

زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں، وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔“ (46)

سورہ قصص (28) آیت نمبر 60: ”اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟“

سورہ قصص آیت 61: ”بھلا جس شخص سے ہم نے وعدہ کیا ہے اور اس نے اسے حاصل کر لیا تو کیا وہ اس شخص کا سا ہے جس کو ہم نے زندگی کے فائدے سے بہرہ مند کیا پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں ہو جو (ہمارے روبرو) حاضر کیے جائیں گے۔“

قارون کے پاس بہت بڑا خزانہ تھا۔ اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش اتنی دولت ان کے پاس بھی ہوتی۔ حالانکہ انجام اس کا یہ ہوا کہ قارون کا خزانہ اللہ کے حکم سے دفن ہو گیا اور وہ خود بھی دفن ہو گیا۔

”اس بات کو سورہ قصص کی آیت نمبر 79 میں یوں بیان کیا گیا ہے۔“ تو (ایک روز) قارون (بڑی) آرائش (اور ٹھانڈ) سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ جو لوگ دنیا کی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے کہ جیسا (مال و متاع) قارون کو ملا ہے کاش (ایسا ہی) ہمیں بھی ملے۔ وہ تو بڑا ہی صاحب نصیب ہے۔“

آیت نمبر 80: ”اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا کہ تم پر افسوس مومنوں اور نیکو کاروں کے لیے (جو) ثواب خدا (کے ہاں تیار ہے) کہیں بہتر ہے اور وہ صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا۔“

اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو کھیل اور تماشا کہا ہے جیسا کہ سورہ عنکبوت (29) میں ارشاد ہوتا ہے۔ ”اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔“ (آیت 64)

(جاری ہے)

سورہ توبہ (9) آیت نمبر 38 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ”مومنو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم (کامیابی کے سبب سے) زمین پر گرے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت (کی نعمتوں) کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔“

سورہ یونس (10) کی آیت نمبر 24 میں اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی کی بہت اچھی مثال پیش کر رہا ہے۔ ”دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں مل کر نکالا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوش نما اور آراستہ ہو گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں تا کہیں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو ککاث (کریا کر) ڈالا کہ گویا کھل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم (قدرت کی نشانیاں) اسی طرح کھول، کھول کر بیان کرتے ہیں۔“

سورہ رعد (13) آیت نمبر 26 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”خدا جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور (جس کا چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے اور کافر لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں اور دنیا کی زندگی آخرت (کے مقابلے) میں (بہت) چھوڑا فائدہ ہے۔“

سورہ کہف (18) کی آیت نمبر 45، 46 میں اللہ تعالیٰ دنیا کی مثال کچھ یوں بیان کر رہا ہے۔ ”اور ان سے دنیا کی مثال بھی بیان کر دو۔ (وہ ایسی ہے) جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے برسایا تو اس کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل گئی، پھر وہ چورا، چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑائے پھرتی ہیں اور خدا تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ (45)

”مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونی)

..... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، دریم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
 دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں ...
 سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے ...
 دل کو رو یا جاتا ہے، جگر کو بیٹا جاتا ہے ...
 کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، باریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
 الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
 دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے ...
 آج کا انسان یہ راہ سٹیلانٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
 دل اور سونے کا بچھڑا ...
 عبادات، معاملات ...
 جنت کم گشتہ کیے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی ...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
 غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قطعہ 16

پرنس کے گم صم ہو کر رک جانے کو سب ہی نے محسوس کیا۔ گاڑی کی بات تو پرنس کے علاوہ کوئی نہ سن سکا۔ مگر ہر آنکھ تجسس نظر آئی۔

لیڈی صوفیہ نے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"what happend?" وہ پرنس کے قریب جا کر سوال کر رہی تھیں۔ تاجور، سفینہ، زارا، انجیلا سب داوی، پوتے کی طرف متوجہ تھیں جس کا احساس پرنس کو فوراً ہی ہو گیا تھا..... وہ زبردستی کے انداز میں مسکرایا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر ٹویان کی طرف لگ چکا تھا جو گیٹ کے اس پار پرنس کا منتظر تھا۔

"گریڈ نام آپ کیسٹ کو لے کر اندر جائیں..... باہر ایک وزیٹر میرا منتظر ہے بس میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں....." اس کی نظر غیر ارادی طور پر سفینہ کی طرف اٹھ گئی جس کا انتظار وہ اس بے تابی سے کر رہا تھا کہ وقت وزمانے کی



قید سے آزاد ہو کر بس دل کی دھڑکنیں شمار کی تھیں۔ سفینہ بھی محبوب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ روحانی مسرت جس کا انتظار بے شمار لوگ کرتے ہیں۔ نصیب کسی، کسی کو ہوتی ہے۔ سفینہ کی آنکھوں سے قدرتی چشمے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

”او کے.....“ لیڈی صوفیہ الجھن میں ضرور تھیں مگر خاصی حاضر دماغی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے باوقار و دل نشین انداز میں ہاتھ کے اشارے سے مہمانوں کو آگے بڑھنے کا عندیہ دیا۔ وہ جس کے ہم قدم چل کر یہ حسین وقت امر کرنے کی لاشعوری خواہش دل میں ہمک رہی تھی..... یوں ٹھہر گئی جیسے شیر خوار دودھ پیتے، پیٹے ماں کی آغوش میں سو گیا ہو..... طوعاً و کرہاً وہ اندر کی طرف بڑھ رہی تھی..... پلٹ کر دیکھنے کی آرزو کو اس نے گردن سے دبوج کرنا کی ریت میں دھنسا دیا۔

☆☆☆

ٹوبان گیٹ سے باہر ایک کیاری کی منڈیر پر بیٹھا دونوں ہاتھوں میں چہرہ لیے پرس کا منتظر تھا..... بچے کی آنکھوں میں کوئی فکر جھلکتی تھی۔ جیسے ہی اس نے پرس کو گیٹ سے باہر آتے دیکھا۔ بجلی کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑنے کے انداز میں اس کے قریب پہنچا۔

”انکل..... پلیز..... میرے ساتھ گھر چلیں.....“ ٹوبان کے انداز میں بے قراری، عجلت اور ایک محسوس ہونے والا پویشیدہ سا خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے سلام یا مصافحے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا جس سے اس کی اضطرابی کیفیت واضح ہو رہی تھی۔

بے ساختگی بچوں والی مٹی..... تڑپ دیوانوں جیسی..... پرس تو بری طرح چکرا کر رہ گیا تھا۔

”انکل..... پلیز ہری اپ..... پلیز انکل.....“ ٹوبان، پرس کا ہاتھ پکڑ کر کچنی انداز میں کہہ رہا تھا..... معاً اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے..... اور آنسو پرس کی کمزوری تھے۔ وہ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔ اسے شعور تھا کہ آنسو کا ایک قطرہ بے شمار اذیتوں سے کشید ہوتا ہے۔

”او کے!“ اس نے شدید روحانی اذیت برداشت کرتے ہوئے ٹوبان کا ہاتھ نرمی سے دبا یا اور گارڈ کو اشارے سے قریب بلا یا۔

گارڈ مؤڈ باند انداز میں آکر کھڑا ہو گیا۔

”میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں..... گریڈ مام کو بتا دو کہ میں گھر سے قریب ہی ہوں، وہ پریشان نہ ہوں۔“ جو فطرت سے ہم آغوش رہتے ہیں، فطرت بھی انہیں بازوؤں کے گھیرے میں لیے رکھتی ہے۔ کیسا نازک مقام تھا کہ دل جذبات کی انتہاؤں پر دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔

ایک طرف وہ دنو از محبوب تھا..... جو بل، بل اپنی موجودگی کے احساس سے سرشار رکھتا تھا..... دوسری طرف فطرت کا وہ شاہکار جس کی آنکھوں میں تخلیق کائنات کا منشور رقم تھا۔

وہ ٹوبان کا ہاتھ تھا اس کے گھر کی طرف چل پڑا..... ٹوبان کا انداز بھاگنے جیسا تھا۔ وہ پرس کی متوازن چال سے الجھ رہا تھا۔ اس کا مافی الضمیر جاننے کے بعد پرس نے بھی تیز رفتاری اختیار کی۔

☆☆☆

”کیوٹ..... زار تو ایک ہی میٹنگ میں میری کمزوری بن گئی ہے۔ جب سے مل کر گئی ہے تب سے میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔“ لیڈی صوفیہ نرم و شفقت لہجے میں بولتے ہوئے زار کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اور زار ایوں ناز سے مسکرائی گویا سفینہ کو بتا رہی ہو کہ میں تم پر بازی لے گئی ہوں۔ تا جو تو پرس کے گھر کو دیکھ کر ہی مہوت رہ گئی تھیں۔ حالانکہ خود بھی جس کٹھنی میں رہتی تھیں اس کی موجودہ مالیت پینتیس کروڑ سے زائد ہی تھی۔ جس کا وسیع و



عریض لان اتنا منفرد اور قیمتی پھولوں، پودوں سے سجا ہوا تھا کہ جو بھی گھر میں داخل ہوتا اس پر امارت کا رعب طاری ہو جاتا تھا۔ مگر پرنس کا گھر جو آنے والے دنوں میں ان کی بیٹی کا گھر ہونے جا رہا تھا۔ دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئی تھیں۔
 ”اس گھر میں حرام کا مال تو نہیں آتا..... اتنی دولت ظاہر ہے تو چھپی ہوئی کتنی ہوگی؟“ چھوٹے ہی شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

”سفینہ آج تو تم بس قیامت لگ رہی ہو..... دل چاہ رہا ہے کہ بس تمہیں دیکھتی رہوں۔ تھینک گاڈ..... پرنس کے لیے میں جیسی لڑکی اور جیسی چاہتی تھی مجھے مل گئی۔ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو.....“ لیڈی صوفیہ نے سفینہ کو اپنے پہلو میں آ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
 وہ اٹھ کر ان کے پہلو میں جا بیٹھی۔

زارا کو یوں لگا جیسے نرم گھاس پر چلتے، چلتے پاؤں کسی گڑھے میں جا پڑا۔ لیڈی صوفیہ نے اپنے خیالات کا واضح اظہار کر کے اسے وہی طور پر مایوسی سے دوچار کر دیا تھا..... خوب صورت ماحول میں عجیب سی بد مزگی کا ذائقہ پکھنے کو ملا تھا..... وہ اضطرابی انداز میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

”ہاں نہیں کون وزیر اس وقت آ گیا..... بہت کوفت ہوتی ہے..... اس ملک کے اکثر لوگ وقت کی ویلیو سے آگاہی نہیں رکھتے۔ موت کی طرح منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔“ لیڈی صوفیہ کے بے ساختہ جملے پر بیٹیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ سفینہ نے یوں داخلی دروازے کی طرف دیکھا گویا تڑپ و بے چینی کسی بھی طرح پرنس کو کھینچ

لا رہی ہو..... وہ بے خبر تھی کہ زارا اس کے دیکھنے کو دیکھ رہی ہے۔ ان حسین لمحات میں کون اس سے بازی لے گیا تھا کہ جس سے پرنس معذرت بھی نہ کر سکا تھا..... پے در پے خیالات آرہے تھے۔

☆☆☆

سنائے میں ڈوبا ہوا عالی شان گھر..... جس کی زیادہ سے زیادہ روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔
کائنات کی شبِ اول کی ہی جیرانی..... آج گیٹ بھی دربان سے خالی تھا..... اور گھر میں وہ نوکر بھی دکھائی نہیں دیا جس سے ملاقات ہو چکی تھی۔

ٹوبان کھلے گیٹ سے اسے لے کر اندر داخل ہوا تھا اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی پرنس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو رہی تھی۔ پرنس نے گیٹ خود بند کیا..... وہ تاریک راہداریوں سے گزرتا اب زبے کی طرف جا رہا تھا۔

”ٹوبان..... گھر میں کوئی نہیں ہے؟“
”آپ آئیں تو سہی.....“ وہ آہستہ آواز میں بولا۔

اب وہ زینہ پڑھ رہے تھے۔
پہلی منزل بھی ٹیلی منزل کے نمونے پر تھی البتہ آرائشی اشیاء میں خاصا فرق تھا۔
ٹوبان ایک خواب گاہ کے دروازے پر جا کر رک گیا اور اس نے پرنس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔
پرنس جس وضع داری اور اعلیٰ اخلاقیات کے ساتھ زندگی گزارتا چلا آ رہا تھا اس کے نزدیک تو براہِ راست کسی کی خواب گاہ کے دروازے پر جا کھڑا ہونا ایسا ہی تھا جیسے اس نے موٹر وے پر کوئی بہت بڑی قانون شکنی کی ہو، متذبذب کیفیت میں اس نے ٹوبان کی طرف دیکھا۔

”please come“ ٹوبان نے ہینڈل کو حرکت دی اور دروازہ کھول دیا، ایک دل پر زخمی اور جانفزا مہک نے پرنس کا استقبال کیا..... اندر داخل ہونے میں ایک جھجک مانع تھی..... قدم اٹھ کر ہی نہیں دیے۔
”پلیز انکل.....“ ٹوبان التجائیہ انداز میں اسے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پٹ تھا ما ہوا تھا۔ اس کی پشت کمرے کے اندرونی حصے کی طرف تھی اور رخ پرنس کی طرف stopper کی وجہ سے اس نے پوری قوت سے دروازے کو تھا ما ہوا تھا مبادا وہ دھڑ سے بند ہو جائے۔

گھر میں پھیلی خاموشی بہت معنی خیز و پراسرار تھی..... کانوں کو دھڑکنیں سننے کے علاوہ اس وقت کوئی کام نہیں تھا۔
”انکل آئیں ناں..... پلیز انکل..... ہیپ پی.....“ اب ٹوبان کی آواز آنسوؤں کے باعث رندھی ہوئی محسوس ہوئی..... بس یہ پرنس کی برداشت سے زیادہ کا دباؤ تھا۔

وہ ٹوبان کے ساتھ یوں بھنپتا اندر داخل ہوا تو گویا کوئی پشت سے دھکیل رہا ہو۔
کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیپ روشن تھا اور بس بیڈ کے آس پاس ہی روشنی بکھری ہوئی تھی..... پہلی نظر میں تو بیڈ خالی نظر آیا مگر جیسے ہی نگاہ دھندلاہٹ میں دیکھنے کے قابل ہوئی حیرت کا زور دار جھکایوں لگا تھا..... گویا بے خبری میں کسی نے پشت پر کوڑا دے مارا۔ ایک نوجوان عورت کا سر بیڈ کے کنارے سے ٹکا ہوا تھا..... اور وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔
فرش کی ٹائلیں سیاہ پر نہایت چمکدار تھیں اسی باعث کمرے میں تاریکی کا عنصر زیادہ محسوس ہوتا تھا۔

”یہ..... یہ.....؟“ حیرت کی انتہا پر رنگ زبان سے ایک ہی لفظ نکل سکا۔
”یہ میری می بیس انکل..... دیکھیں..... پتا نہیں کیا ہو گیا انہیں..... میں تو چھوٹا ہوں ناں..... ان کو بیڈ پر نہیں لٹا سکتا.....“ ٹوبان بہت معصومانہ انداز میں اپنی مجبوری و معذوری بیان کر رہا تھا۔
”آپ کے ڈیڈ کہاں ہیں؟“

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

پرنس کو پہل بھر میں طرح، طرح کی بریکنگ نیوز یاد آگئیں..... اسے یوں لگا وہ کسی عفریت کے پُچنگل میں پھنس گیا ہے۔ عورت کو چھوتے ہوئے ایک فطری جھجک مانع تھی..... وہ جواب کے لیے ٹوہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں نہیں..... شاید ان کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے..... ان کے پاس پہل تھا ناں.....“ ٹوہان تو بڑی مصمصیت سے کہہ رہا تھا مگر درحقیقت پرنس کے پسینے چھوٹ گئے تھے..... اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا جو دیکھنے میں نوخیزہ و شیرہ نظر آتی تھی اور اسے یاد آ رہا تھا کہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہے مگر اس وقت یادداشت بھی جواب دے رہی تھی۔ اسے کہیں سے پتہ خون کے نشان نظر نہیں آئے۔ اس نے غیر ارادی طور پر سر گھما کر سوچ بوز تلاش کیا جو اسے دروازے کے ساتھ ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ٹھک، ٹھک کئی سوچ بوز دبا دیے..... بیڈ کے عین اوپر بہت خوب صورت فانوس لٹک رہا تھا جس میں درجن بھر بلب لگے ہوئے تھے..... کمرے میں ایک دم دن نکل آیا..... ہر شے واضح ہو گئی۔

ٹوہان اب بے قراری سے ماں کا کندھا ہلاتا رہا تھا۔

”ممی، ممی انھیں، دیکھیں انکل آئے ہیں، ممی، ممی۔“ وہ ماں کو آواز دے رہا تھا مگر عورت کے ساکت وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔

پرنس نے اپنے چکراتے ذہن کو قابو میں کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔

”کیا پولیس کو فون کرنا چاہیے؟“ اس نے خالی، خالی نظروں سے ٹوہان کی طرف دیکھا اور سوچا جواب صرف اور صرف ماں کی طرف متوجہ تھا، آنکھوں میں موٹے، موٹے آنسو تھے پرنس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے..... عورت کہیں سے بھی زخمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”کیا پہلے ڈاکٹر کو بلاؤں.....“ مگر اس کے پاس تو سیل فون ہوتا نہیں تھا۔ ڈائریکٹری گھر میں بڑی تھی۔ وہ ہاؤس منیجر کو فون کر کے اپنے فیملی ڈاکٹر کو کال کر سکتا تھا مگر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ عورت کو فرش سے اٹھا کر بستر پر کیسے ڈالا جائے..... ایسا نہ ہو وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرے اور عورت خود ہی ہوش میں آ کر اٹھ کھڑی ہو..... اس صورت حال میں تو وہ بدحواس ہو کر اسے چھوڑ سکتا تھا جیسے کوئی ذہنی شے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر جا پڑے۔ زخمی نہیں تھی مگر اس طرح زخمی ہو سکتی تھی۔

”انکل، ممی کو ہتا نہیں کیا ہو گیا ہے..... یہ بول ہی نہیں رہیں.....“ ٹوہان بڑے لاچارو بے بس لہجے میں ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ڈونٹ وری ٹوہان..... گلنا ہے آپ کی ممی بے ہوش ہیں..... ابھی ہوش میں آجائیں گی۔“ وہ تسلی دیتے ہوئے سوچ رہا تھا شاید اس عورت پر جسمانی تشدد کیا گیا ہے اسی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس محیر العقول واقعے سے گزرتے ہوئے اس کا ذہن اپنے گھر سے قطعی طور پر ہٹ چکا تھا..... اس کی محبوبہ گھر میں بھی جس کے انتظار میں اس کے شب و روز بے قراری سے کٹ رہے تھے..... کمال ہو گیا کہ وہ خود گھر سے غیر حاضر تھا..... اس نے ساری ہمت جمیع کر کے عورت کا شانہ آہستہ سے چھوا..... مگر یوں جیسے کسی پتھر کو ہاتھ لگایا ہو..... عورت کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا ہمت بندھ گئی..... ٹوہان کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے وہ سسکیاں روکنے کی جدوجہد میں بھی لگا ہوا تھا..... اس کے آنسوؤں نے پرنس کو بے قرار کر کے بلکہ تڑپا کر رکھ دیا۔

اس نے عورت کو ہاتھوں میں بھر کر اٹھانے کے بجائے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تھی اور اپنی تمام زقوت کا استعمال کیا تھا۔

وہ عورت کو کھڑا کرنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر عورت کھڑی ہو کر یوں جھولنے لگی گویا تیز آندھی میں کزور سے کا درخت جھول رہا ہو۔

بس اتنا بھی غنیمت تھا اس نے کھڑی اور جھولتی عورت کو بہر حال بیڈ پر لٹا ہی دیا۔۔۔۔۔ تیز روشنی مزید تیز ہو گئی۔۔۔۔۔ سیاہ لباس میں دو دھیارنگت سے گویا روشنی پھوٹ رہی تھی۔

اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک صوفی گڑیا ہاتھ پاؤں ڈالے لیٹی ہوئی تھی۔ پرنس نے جھپکتے ہوئے اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”ممی۔۔۔۔۔ دیکھیں یہ انکل ہیں۔۔۔۔۔ آپ ڈریں نہیں۔۔۔۔۔ یہ کچھ نہیں کہیں گے۔ انکل روزانہ مسجد جاتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ دعا کریں گے ناں تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ٹوبان ماں کے گالوں کو چھو، چھو کر بھرائی آواز میں کہہ رہا تھا۔ آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

”ٹوبان آپ کے ڈیڈی گھر سے کب گئے تھے؟“ پرنس سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔۔۔۔۔ سب کچھ بھلا کر معصوم ٹوبان کی مدد کرنا اس کے نزدیک اس وقت کا سب سے ضروری کام تھا۔

”انکل، پاپا، ممی کو بہت مارتے ہیں۔“ یہ کہتے ہی ٹوبان بلک، بلک کر رو پڑا۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔!“ پرنس نے بے ساختہ کہا اور روحانی اذیت کے باعث ہل بھر کو آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔۔ مگر اس خیال سے فوراً ہی چوکس ہو گیا کہ اس عورت کو کسی بھی صورت ہوش میں لانا ہے۔ ساتھ ہی اب وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا لا شعوری طور پر وہ تشدد کے نشان تلاش کر رہا تھا۔ ٹوبان اب خود پر قابو کھو چکا تھا۔۔۔۔۔ ماحول میں اس کی سسکیاں نمایاں تھیں۔۔۔۔۔ پرنس نے بے اختیار اس کے سر پر دست شفقت رکھ دیا۔۔۔۔۔ اوسان قدرے بحال ہو چکے تھے کیونکہ عورت کے وجود پر کسی زخم کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ پرنس اس کے حسن و جمال سے یوں نگاہ بچارا ہوا تھا گویا کرانا تین اسے گھور رہے ہوں۔۔۔۔۔ شادی شدہ ایک بچے کی ماں جو کسی کی امانت تھی۔ اس کے نزدیک تو اسے نگاہ بھر کر دیکھنا اعلیٰ درجے کا اخلاقی جرم تھا۔

”میں ایک فون کرنا چاہوں گا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر آکر چیک کر کے بتائے گا کہ آپ کی ممی کیوں بے ہوش ہیں۔۔۔۔۔ میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔“

ٹوبان بہت ذہین تھا فوراً مدعا سمجھ گیا کیونکہ ماں کو ہوش میں دیکھنے کی جلدی تھی تیزی سے ایک طرف گیا اور سیل فون اٹھا کر لے آیا۔

”یہ پاپا کا ہے۔۔۔۔۔ ممی کے پاس سیل فون نہیں ہے۔“ ٹوبان نے سیل پرنس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پاپا کا۔۔۔۔۔؟“ پرنس کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

”وہ سیل اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے۔“ ساتھ ہی پرنس کو ایک اندیشے نے ستایا۔۔۔۔۔ کہ کہیں ٹوبان کا باپ گھر کے کسی اور کمرے میں موجود تو نہیں؟ جانے کب اپنا سیل ڈھونڈنا اس طرف آنکلی۔

بہر حال اس نے سیل فون آپریٹ کرنا شروع کیا تو سامنے کی سڈ کاٹرا اور منیج کی خبریں تھیں۔ اسے ان سب سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے اپنے منیجر کا نمبر ڈال کیا۔۔۔۔۔ کال دوسری تیل بری ریسیو ہو گئی تھی۔

”سر آپ کہاں ہیں۔۔۔۔۔ لیڈی صاحبہ بہت پریشان ہیں۔۔۔۔۔ یونو گھر میں گیسٹ ہیں۔۔۔۔۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ منیجر ایک سانس میں یوں گویا ہوا گویا تلاشِ بسیار کے بعد گم شدہ شے مل گئی ہو۔۔۔۔۔ اس کے لہجے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میں گھر سے قریب ہی ہوں۔۔۔۔۔ گرینڈ مام کو پولیس تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔ ماں اس نمبر پر ڈاکٹر ڈی کا نمبر سینڈ کر دیں۔“ وہ جگت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔ جس سے دوسری جانب تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”سر آپ خیریت سے ہیں۔۔۔۔۔؟ منیجر اچانک حواس باختہ ہو گیا تھا۔

”میں بالکل خیریت سے ہوں پلیز آپ جلدی نمبر سینڈ کریں۔۔۔۔۔ اور گرینڈ مام کو بالکل بھی پتا نہیں چلے کہ

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

میں نے آپ سے ڈاکٹر ذکی کا نمبر لینے کے لیے فون کیا تھا بلکہ ان کو ہا ہی نہیں چلے کہ میں نے آپ سے کاٹھیاٹ کیا ہے..... وہ شدید ڈنٹی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا..... گھر میں خاص مہمان موجود تھے اور وہ ٹوبان کی مدد کرنے سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا..... بڑی آزمائشی صورت حال تھی۔

ٹوبان کے چہرے پر امید نے ایک روشنی سی تکسیر دی تھی..... ڈاکٹر کی آمد کا خیال ہی بہت باعث تقویت تھا۔ پرنس سیل ہاتھ میں لیے بیچ کا منتظر تھا..... گاہے گاہے نگاہ ٹوبان کی ماں کی طرف جاتی تھی مگر فوراً ہی یوں لوٹ آتی جیسے کوئی نگاہ پر نگاہ جمائے بیٹھا ہو۔

اسی وقت میج الرٹ کی پیپ سنائی دی۔ اس نے بیچ دیکھا۔ ڈاکٹر ذکی کا نمبر آگیا تھا..... اس نے فوراً ہی نمبر ذہن نشین کر کے ڈائل کرنا شروع کر دیا تھا۔



سفینہ کی بے قراری کا عالم یہ تھا کہ گویا چاند کی چودہ کو جو اربھا ٹا چاند کو چھونے کو بے تاب ہو مگر اسے خود پر بہت قابو تھا..... چہرے پر پھیلی مسامتے سے کسی کی عین نگاہ بھی اس کے دل کا بھید نہیں پاسکتی تھی۔
زارا الیتہ اپنی بے چینی کو چھپا نہیں پارہی تھی..... کبھی پہلو بدلتی تو کبھی کوئی اینٹنگ ڈیکوریشن پس دیکھنے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

"I am feeling very embarrassment" لیڈی صوفیہ کی مرتبہ یہ جملہ بول کر شرمندگی کا اظہار کر چکی تھیں۔

تاجور کو بے بنیاد اندیشے تک کرنے لگے تھے۔ آج کل رئیسوں کا اغوا معمول کی بات تھی۔ پرنس گیٹ سے باہر گیا اور اس کے بعد کوئی خبر نہیں..... وہ اپنے اندیشوں کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ سامنے ایک انتہائی بوڑھی عورت

شکست کی فتنہ

گھٹن زدہ حالات سے ایک حسینہ کی بغاوت..... آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے ایک ایسی دلگذاڑ داستان جو سونے پر مجبور کر دے

نوشت اتحاد

تاریخی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم سے..... برہان نظام شاہ کے عہد کے اہم لمحات اور پرتجسس گزرے واقعات کا عکس

رنگ آسمان

ماضی کی دلفریب یادیں اور ایک فرنگی حسینہ کی دلداریاں.....
ایس۔ آر۔ راجپوت کے قلم سے خوب صورت سلسلہ

وقت

دلچسپ معلوماتی اور حیرت انگیز واقعات کا قصہ.....

حسام بٹ کے خیالات کی روانی

دسمبر 2017ء کا شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیاں کا مجموعہ

سپر ہٹس

ماہنامہ

مزید

خلو ملک کی محفل
محفل شہرِ سخن
اور

دلگدگ محفل حیات کی تیشہ کشی

تنویر دیاض۔ سلیم انور۔ منظر امام۔ ثمر عباس۔
ڈاکٹر شبیر شاہ سید اور ناہید سلطانہ اختر کی دلچسپ کہانیاں

ایس آئی جی

اور دو کم عمر نا تجربہ کار نوجوان لڑکیاں تھیں..... حتیٰ کہ وہ تو اتنی احتیاط کر رہی تھیں کہ پرنس کی غیر موجودگی پر کوئی بات تک نہیں کر رہی تھیں۔

سفینہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے گھبرلا کر بے توقیر کر دیا ہو۔ خوش لباس، خندہ رو خادمہ مہمانوں کو تازہ مشروب پیش کر چکی تھی۔ لیڈی صوفیہ مکمل طور پر غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ سب پڑھا بھولے بیٹھی تھیں..... بار، بار نگاہ داخلی حصے کی طرف جاتی تھی۔

زارا کو کوفت سے برا حال ہو رہا تھا۔ ساری آرائش دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

”ایسا کرتے ہیں کہ ہم پرنس کے اسٹوڈیو کا وزٹ کرتے ہیں، زارا نے اس وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا جب یہ یہاں آئی تھی اور میں نے اس سے پراس کیا تھا کہ جب وہ دوبارہ آئے گی تو اسٹوڈیو کا وزٹ ضرور کرے گی۔“

”مگر پرنس کے بغیر اسٹوڈیو کا وزٹ.....؟“ کوفت سے زارا کا برا حال ہو گیا یہاں تو بس ایک ہی تمنا مچل رہی تھی کہ پرنس اسے اور سفینہ کو دیکھے..... بار، بار دیکھے اور کسی بھی طرح اسے احساس ہو جائے کہ سفینہ کا انتخاب کر کے اس نے جلدی کی..... آرٹ اس کا شوق تھا..... آرٹ وہ پڑھ رہی تھی..... ڈینی، ہم آجنگی تو اس کے ساتھ ہی ہونی چاہیے تھی..... وہ آج پرنس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے درپے تھی۔

حاسد کے جذبات بہت تو اتنا ہوتے ہیں..... اسی لیے حسد کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حاسد کی خواہشات میں بھی طوفانی قوت ہوتی ہے..... خواہشات میں شدت نہ ہو تو وہ کچھ اور بھی سوچ لے..... احساس برتری کی کوکھ سے ہی تمام روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں..... تکبر، خود پسندی، حسد، بغض، کینہ، جھوٹ، خوامد پسندی..... یہ تمام روحانی بیماریاں دانائی و فراست کی دیک ہیں..... کھوکھلا دماغ بھی فطرت کے اشارے نہیں سمجھ سکتا۔

بد نصیبی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں تکبر میں مبتلا ہو جائے..... عموماً دولت کی کثرت کو خوش نصیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

خوش نصیبی میں خوشحالی کے ساتھ فطرت کے بنائے ہوئے تمام رشتے اور تعلقات سے لطف اندوز ہونا بھی شامل ہے۔

جب بہن، بہن سے اور بھائی، بھائی سے حسد کرے تو یہ اس کی بد قسمتی کی بالکل واضح اور مکمل نشانی ہے۔ روحانی مسرت ہمیشہ خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی ہے..... جو چہرے کو چمک اور آنکھوں کو دمک عطا کرتی ہے۔

وہ اتنی دور سے اڑان بھر کر آئی تھی..... ہل، ہل اس ملاقات کو سوجا تھا..... مگر یہ ایک دم سے کیا ہو گیا.....؟ سفینہ کے دل پر اداسی اتر رہی تھی اس کے خیالات زارا سے یکسر مختلف تھے..... اس کو کڑھن نہیں تھی..... روح، محبوب سے محبوبانہ شکوے کر رہی تھی۔

لیڈی صوفیہ کی ایما پر طوعاً و کرہاً نشست سے اٹھنا پڑا..... بے قرار دل کہہ رہا تھا کہیں ایسا نہ ہو وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوں اور پرنس گھر میں..... پھر..... ملن میں اذیت ناک وقفہ..... وہ بھی ایک چھت تلتے..... جتنا دیکھتا تھا آج ہی تو دیکھتا تھا..... یہ اس دوشیزہ کی فطری بے قراری تھی جسے اس نے چاہا تھا، جسے دنیا چاہتی تھی..... خلق خدا سے دیکھتی تھی اور وہ اس کو دیکھنے کا خواہش مند تھا..... خواب دیکھنے کی عمر میں چاہے جانے سے زیادہ حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا..... خاص طور پر جب قروفا قے سے آزاد نعمتوں بھری زندگی میسر ہو تو بس پھر ایک ہی کمی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی دل و جان سے چاہنے والا بھی ہو..... جو عین اس عمر میں میسر آرہا تھا۔ جس عمر میں چاہے جانے کی آرزو

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

اوج کمال پر ہوتی ہے۔

انجیلا، لیڈی صوفیہ کو سہارا دے کر چھڑی تھما رہی تھی..... لیڈی صوفیہ بہت کم صم اور شرمندہ، شرمندہ ہی نظر آ رہی تھیں۔

”کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے..... میرا مطلب ہے پرنس اچانک کچھ دیر کے لیے گھر سے چلے جاتے ہوں۔“ تاجور سے رہا نہ کیا..... بالآخر بول پڑیں۔ لیڈی صوفیہ نے چوری، چوری تاجور کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔

”وہ صرف پانچ وقت نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے..... اس کے علاوہ اس کے باہر جانے کا پورے ویک کا ہنڈول ہوتا ہے..... اور وہ مجھے پتا ہوتا ہے۔“ لیڈی صوفیہ نے دھیمی، کانپتی آواز میں جواب دیا اور چھڑی پر اپنا مارا بوجھ ڈال کر قدم بڑھائے۔ انجیلا سائے کی طرح ان کے ساتھ تھی۔

”مثنیٰ حیرت کی بات ہے..... پرنس کے پاس سیل فون نہیں ہوتا.....“ زارا اندر ہی اندر تلملارہی تھی بظاہر عام سے انداز میں گویا ہوئی۔ ”جبکہ آج کل تو سوپر زنگھی سیل فون کے بغیر نہیں ہوتے.....“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”وہ creative ہے..... creation مکمل آزادی مانگتی ہے۔ بس اسے کسی بھی قسم کی باؤنڈنگ پسند نہیں..... وہ اتنے حسین تصورات ڈیلور کرتا ہے..... سیلک کو اس سے شکایت نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ لیڈی صوفیہ نے مسکرا کر زارا کی طرف دیکھا۔ لہجہ پوتے کی محبت سے سرشار و معمور تھا۔ زارا نے اپنی کلفت چھپانے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

”شادی کے بعد تو ان کو سیل فون رکھنا پڑے گا..... یہ تو آج کل کی اشد ضرورت ہے۔“

”ناٹ ایٹ آل..... بہت ساری باتیں محبت کی ضمانت نہیں ہوتیں..... میری پیاری زارا..... محبت کو کسی ایم کی ضرورت نہیں ہوتی..... مگر ابھی تم بہت چھوٹی ہو..... وقت تمہیں سب کچھ سمجھا دے گا۔“ لیڈی صوفیہ نے لہا۔ سفینہ نے آگے بڑھ کر زارا کا ہاتھ زور سے دبا یا..... یہ اشارہ تھا کہ بس اب خاموش ہو جاؤ، بے وقوفوں والی باتیں نہ کرو۔

انجیلا سمیت پانچوں اب سرخ بجزی کا کارپٹ عبور کرتی اسٹوڈیو کے قریب پہنچ چکی تھیں۔



”اچانک کوئی شاک لگا ہے.....“ ڈاکٹر ڈکی، پرنس کی استدعا پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ٹوپان کے گھر پہنچ گئے۔ عبور مقامی کی وجہ پرنس کے وہ الفاظ تھے جو اس نے غیر معمولی صورت حال کا اندازہ لگانے کے لیے ہوا کے دھبے، ارسال کیے تھے۔

”ڈاکٹر..... کچھ دیر بعد ہو سکتا ہے میں ایک ڈیڈ باڈی کے ساتھ نظر آؤں اور کرائم رپورٹر میری فوٹو لے رہے ہوں..... بس اتنا ہی کافی تھا ڈاکٹر ڈکی نے ڈرائیور کا انتظار بھی نہ کیا جو کسی کام سے نزدیکی پر اسٹور گیا ہوا تھا۔

”کیس survival ہے ناں..... کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟“ پرنس نے اب خاصے پُرسکون انداز میں ٹوپان کی ماں کی طرف دیکھا تھا..... موی مجسمہ نگاہ کے سامنے تھا۔

ٹوپان بڑی مصومیت، آس و امید سے دونوں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایس کے لیے فون کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ڈکی فرسٹ ایڈ دینے میں مصروف تھے۔ پرنس نے ٹوپان کو اپنے اٹھنے پر بڑی شفقت سے اس کے سر پر بوس دیا۔

”اٹ وری..... بس تھوڑی دیر میں ماما بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

اللہ کی اس وقت سے پرنس کے فیملی ڈاکٹر تھے جب وہ سات برس کا تھا۔ عمر میں تقریباً وہ پرنس سے بائیس

سال بڑے تھے مگر پرنس کے ساتھ ان کا دیرینہ محبتوں کا رشتہ تھا۔

اسی سبب اس نے محتاط انداز میں بتا دیا کہ گھر میں بہت اہم ڈنر ہے..... اس بچے نے گھر آ کر مدد چاہی تو اسے آنا پڑا..... وہ بچے کو لے کر چلا جائے گا اور وہ پیشہ کو لے کر اسپتال چلے جائیں۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ ان سے رابطہ کر کے اسپتال پہنچ جائے گا۔

”یہ آپ کے پڑوسی ہیں..... اس بچے کے فادر سے تو بات چیت ہوتی ہوگی۔“ ڈاکٹر ڈکی نے ایک دوا ٹوٹان کی ماں کو سونگھاتے ہوئے پرنس کی طرف دیکھا..... کیونکہ بچے نے جس طرح بتایا تھا کہ کیسے پرنس تک رسائی کی اور مدد طلب کی تو سیدھا سامطلب نکلتا ہے کہ پڑوسیوں کے آپس میں اچھے تعلقات ہیں۔

پرنس نے ایک نظر ٹوٹان کی طرف دیکھا جو گویا سانس روکے ماں کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا اور آہستگی سے نفی میں گردن کو تھنٹس دی۔

ڈاکٹر ڈکی اپنی حیرانی چھپانے کے مگر مزید سوال بھی نہیں کیا۔

ایمبولینس کے سائرن کی آواز فضا میں گونجی تو پرنس کو یوں محسوس ہوا گویا دلدل میں دھنسنے شخص کو کسی نے رسا پھینک کر بچانے کی کوشش کی ہو۔

☆☆☆

سفینہ اگر اسٹوڈیو میں پہلی بار بھی آئی ہوتی تو حیران ہوتی نہ ہی متاثر..... کہ اس وقت تو سفینہ کا ذہن ہواؤں کے سنگ اڑان بھرتا پرنس کے تعاقب میں تھا۔

البتہ زارا کا برا حال تھا اس نے اتنا شاندار اسٹوڈیو تو شاید خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے شوق کا یہ عالم تھا کہ واش روم کا دروازہ تک کھول کر جھانک لیا تھا..... اتنا وسیع و عریض واش روم..... دنیا کی بہترین سینیٹری، سائے میں پروان چڑھنے والے ہرے بھرے پودوں کے سرخ گلے..... پیٹنگ، سنہری فریم کی وال کلاک، جس میں ہندسوں کی جگہ پر موٹے، موٹے زرقون جڑے ہوئے تھے اور بیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ شیشے کی الماری میں سفید ٹاڈلر تہ درتہ لگے ہوئے تھے۔

یہ اسٹوڈیو کا واش روم تھا تو بیڈ روم کا کیسا ہوگا۔

”یہ اسٹوڈیو بہت پرانا ہے..... پرنس بارہ سال کا تھا تو میں نے اس کے لیے یہ اسٹوڈیو بنوایا تھا..... کیونکہ میں جان چکی تھی کہ وہ آگے کیا کرنے جا رہا ہے۔“ لیڈی صوفیہ جو پرنس کی غیر حاضری کی وجہ سے ذہنی طور پر بہت منتشر تھیں اور مہمانوں کے سامنے بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہی تھیں..... خود کو نارمل ظاہر کرنے کی حتی الوسع کوشش ضرور کر رہی تھیں۔

تا جو نظر بچا کر گاہے گاہے اپنی رسٹ وائچ پر نظر دوڑا لیتیں۔ پرنس کی اچانک گم شدگی سمجھ سے بالاتر تھی۔ سفینہ کا ذہن بار بار صرف ایک سوال کر رہا تھا کہ کیا کوئی اتنا اہم ہے جو پرنس کو سفینہ کی طرف سے غافل کر دے..... جبکہ وہ بن بانی بھی نہیں۔ نہ اس کا ذہن پیٹنگ کی طرف متوجہ ہو رہا تھا نہ لیڈی صوفیہ کی بات چیت میں اسے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

معاشر کا م پر رنگ ہوئی..... انجیلا بڑی پھرتی سے آگے بڑھی۔

”ایس.....!“ اس نے ریسپورکان سے لگایا..... پھر ایک دم خوش و پرجوش نظر آئی۔

”اوکے!“ کہہ کر اس نے ریسپور رکھا۔

”میم، پرنس آگئے ہیں۔“ وہ لیڈی صوفیہ سے مخاطب ہوئی۔

لیڈی صوفیہ یوں خوشی سے کاٹنے لگیں گویا پرنس برسوں بعد پرانے دیس سے واپس آیا ہو..... مارے جذبات

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

کے چلتے ہوئے لڑکھڑا گئیں..... انجیلا نے لپک کر تھام لیا۔

تاجور نے سکون کی گہری سانس لی۔ زارا کو ایک دم اپنے دوہنے اور ہمیر اسٹائل کا خیال ہوا۔ اسٹوڈیو میں آئیوں کی کمی نہیں تھی اس نے چلتے، چلتے آئینے میں نظر دوڑا کر اپنی تسلی کی۔

سفینہ اندر ہی اندر یوں لبائی گویا دہن کو تجلہ عروسی میں لے جایا جا رہا ہو۔ اب یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ پرنس واپس آ گیا ہے تو اچانک گھر سے جانے کی وجہ بھی سامنے آ جائے گی۔

زارا نے چورنگا ہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

سفینہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکان اس کی نگاہوں سے نہ چھپ سکی۔

”سب کچھ اسی کے لیے کیوں ہو..... ہم بھی زندہ ہیں..... مرنے تو نہیں گئے.....“ حسد میں انسان جو کچھ سوچتا ہے..... وہ شیطان کا مشترکہ کائناتی ایجنڈا ہے..... زبان خواہ کوئی ہو..... جذبات کی کوئی خصوص زبان نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ٹوبان لاؤنچ میں پرنس کا ہاتھ یوں دبو پے بیٹھا تھا گویا اسے پرنس کے کہیں بھاگنے کا اندیشہ ہو۔

”ریلیکس، ابھی تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کی کال آئے گی..... اور ہم اسپتال چلے جائیں گے..... بس تھوڑا سا انتظار کرنا ہے۔ ماما بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ٹوبان مسلسل گردن ہلاتا رہا تھا جیسے وہ پرنس کے ایک، ایک لفظ پر اعتبار کرنے کا عندیہ دے رہا ہو۔ اور ذرا برا بر شک نہ ہو۔

گھر میں داخل ہوتے ہی خادمہ نے بتا دیا تھا کہ لیڈی صاحبہ مہمانوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں ہیں۔ اب پرنس انتظار کی گھڑیاں ٹوبان کو تسلیاں دیتے ہوئے گزرا رہا تھا۔ اسے خادمہ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ گرینڈ نام کو مطلع کر دے وہ گھر واپس آ چکا ہے۔

اس طرح کی ہدایات دینے کا اس گھر میں مطلب یہ ہوتا تھا کہ ملازمین پر لے درجے کے نکلے اور غیر ذمے دار ہیں۔ ہوش رہا بخواہ اٹھانے والے ملازمین کی سب سے بڑی برکھان کا کامن بنیں ہی ہوتا ہے۔

اس گھر میں نوکری پانے والے یہاں سے نکل کر کہیں اور نوکری کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے تھے..... یوں گویا کسی بیورو کریٹ افسر کو ریٹائرمنٹ کے بعد پرچون کی دکان پر بٹھا دیا جائے۔

ایک قابل برداشت وقفے کے بعد لیڈی صوفیہ، تاجور، سفینہ، زارا، انجیلا لاؤنچ میں داخل ہوئیں۔

سب کے ذہنوں میں اسٹوڈیو سے لاؤنچ تک آتے، آتے بے شمار سوالات مرتب ہو چکے تھے مگر ٹوبان پر نظر پڑتے ہی سب سوالات وفات پا گئے۔

عجیب حیرت کا عالم تھا..... گویا کسی خطے میں بارش کے ساتھ پہلی بار اگلے پڑے ہوں، ٹوبان بھی ایک دم سے پانچ مختلف انداز کی خواتین کو سامنے پا کر سر اسیم ہو گیا تھا۔ اور گھبرا کر پرنس کی طرف دیکھا تھا۔

لیڈی صوفیہ تو اتنی زیادہ حیران پریشان ہوئیں کہ خزاں کے زرد پتے کی طرح کاٹنے لگیں۔ تاجور کو فضول کے وہم آسیب بن کر چٹ گئے۔ سفینہ بچے کو یوں غور سے دیکھ رہی تھی گویا چہرے سے تفصیلات پڑھ کر ہی دم لے گی..... البتہ زارا جس کو ہمیشہ بولنے کی جلدی بلکہ ٹپ رہتی تھی..... بول پڑی۔

”اوہ، ویری کیوٹ..... کس کا بچہ ہے..... کم از کم آپ کا تو نہیں ہو سکتا..... ویسے زبردست مسٹری ہے..... آپ اچانک غائب ہوئے پھر بچے کے ساتھ appear ہو گئے۔“ تاجور نے گھور کر زارا کی طرف دیکھا..... سفینہ اپنی جگہ جڑ نظر آئی۔

”ارے..... اسے میرا ہی بچہ سمجھیے.....“ پرنس نے پیار بھری نظروں سے ٹوبان کی طرف دیکھا۔

”what a nonsense“ لیڈی صوفیہ نے محل کر اعتراض کیا۔

”آپ سب تو پریشان ہو گئے..... اتنا پیارا بچہ دیکھ کر پریشان تھوڑی ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں..... وہ جو لیتے ہیں ناں پھول، بچے، نظارے سب کے ہوتے ہیں۔“ پرنس نے اب بہت اہتمام سے مسکرا کر سفینہ کی طرف دیکھا تھا۔ سفینہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”آئی پلینز.....!“ پرنس نے ہاتھ کے اشارے سے تاجور کو نشست سنبھالنے کے لیے کہا..... انجیلا، لیڈی صوفیہ کو پرنس کے پہلو میں بٹھا رہی تھی۔

پرنس کے انداز میں جو اعتماد اور سنجیدگی محسوس ہو رہی تھی وہ کم از کم تاجور کے لیے تو بہت باعث تقویت تھی۔ ہر قسم کی منفی سوچ ہوا میں گم ہو گئی۔ کوئی گڑبڑ ادالی بات ہوتی..... اور یہ بچہ پرنس کا ہوتا تو وہ اس موقع پر تو کبھی سانس نہ لاتا۔

”فار گاڈ سیک..... پرنس مجھے بتاؤ یہ کون ہے؟“ لیڈی صوفیہ اب مہمانوں کے سامنے پہلے سے زیادہ شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔

”یہ بہت پیارا بچہ ہے..... اسے جب موقع ملتا ہے یہ مسجد میں آکر نماز پڑھتا ہے۔“ پرنس نے ٹوبان کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کا تعارف کرنا شروع کیا..... اور اس کے گال پر بوسہ دیا۔

”اوہ.....“ لیڈی صوفیہ ایک دم مطمئن ہو گئیں..... وہ سمجھ گئیں کہ مسجد کی وجہ سے اس بچے کا پرنس سے تعارف ہوا ہے۔ اور ان کا پوتا ضرور اس بات سے متاثر ہوا ہوگا کہ اتنا چھوٹا بچہ عید کے علاوہ بھی مسجد آتا ہے۔

”آئی یہ چھوٹا پرنس ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ مجھ سے تو اس کی ملاقات مسجد میں ہی ہوئی تھی۔“

”ماشاء اللہ..... بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو مسجد کا عادی بنانا..... یہ تو بہت اچھی بات ہے.....“ اب تاجور کے انداز میں خود بخود دھلاوت و شیرینی چھلکنے لگی تھی۔ درحقیقت بچہ پر پیار آنے لگا تھا۔

سفینہ کی آنکھوں میں حیرت آمیز مسرت درآئی تھی۔

”ہیچ..... لیکن..... یہ تو بتائیں..... آپ ہمیں چھوڑ کر اسپتالی اس بابا سے ملنے چلے گئے تھے.....؟ کچھ سمجھ نہیں آئی۔“

زارا جذبات سے عاری اپنے سوالات میں الجھی ہوئی تھی۔

سب اس سوال کے بعد بہت غور سے پرنس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ گویا زارا سب کی ترجمانی بنی ہوئی تھی۔

پرنس نے ٹوبان کو بالکل اپنے ساتھ لگا لیا تھا..... ٹوبان، پرنس کے بازو سے سر لگائے سب کی طرف مگر، مگر دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی ہجوم میں ماں کے ہاتھ کا سہارا مکمل تحفظ کا احساس دیتا ہے۔ مگر نہ ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

☆☆☆☆

تاجور کا سیل مسلسل پاور ڈرافٹل رہا تھا۔ ساحل بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ site پر ایک ایمر جیسی ڈیٹیکٹر ہو گئی تھی۔ آج کل سائٹ آفس کا کرتا دھرتا وہ بنی ہوا تھا۔ اس طرف ہونے والے تمام معاملات ڈائریکٹ اس کو رپورٹ ہوتے تھے۔ زیر تعمیر عمارت کی ایک نئی دیوار ڈھ گئی تھی اور ایک مزدور جاں بحق ہو گیا تھا جو وہیں دیوار کے ساتھ چارپائی پر سو رہا تھا۔

پولیس، سیکورٹی کے لوگ جائے حادثہ پر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے..... اور مزدور کا جسد خاکی سرد خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

پولیس ضابطے کی کارروائی میں مصروف ہو چکی تھی۔ کنسٹرکشن کمپنی کے تمام ذمے داروں کو ان کے گھر وں سے اٹھالیا گیا تھا۔

تاجور کی غیر موجودگی کے باعث تمام معاملات براہ راست ساحل سے طے ہو رہے تھے۔ اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت نے تو گویا ساحل میں برقی رو دوڑا دی تھی۔ گاہے گاہے تاجور سے رابطے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

ماہنامہ ہالکیزہ

نومبر 2017ء

34

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

اذیت ناک پریشانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ لینڈ لائن نمبر بھی اینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تاجور دن بھر لگ بھگ چار نمبر استعمال کرتی تھیں، اس وقت چاروں پر رابطہ نہ ہوتا، اس حادثے کے بعد دوسرا حادثہ تھا۔
اور سیر، ٹھیکیدار، آرکیٹیکٹ، آؤٹ ڈور پلانر، سرور، انجینئر..... سب قانون کی گرفت میں آچکے تھے۔
مگر مالک لاپتا ہو گئی تھی۔

ساحل سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ کسی بھی صورت پولیس تاجور کے گھر نہ پہنچے..... اس غریب مزدور مرحوم نے جان دے کر اسے ایک سنہری موقع فراہم کیا تھا کہ وہ ایک حسرت میں کامیابی کی بلند یوں کو چھو لے۔
وہ ایک مالک کی طرح تمام معاملات دیکھ رہا تھا۔
اس نے تو تاجور کے ہیڈ آفس کے کسی کرتا دھرتا تک کو فون نہیں کیا تھا۔ یوں گویا آج کی تاریخ میں تاجور کو اپنا ممنون احسان کر کے ہی چھوڑے گا۔

”دیکھیے آفیسر..... میری ادویہ ایک قانون ہیں، اس شہر کی ایک معزز شہری ہیں اور اس سارے قصے میں بالکل innocent ہیں۔ یہ سراسر کنٹرولیشن کمپنی کی ذستے داری ہے۔“
”وہ مالک ہیں، ان کا جائے وقوعہ پر موجود ہونا قانونی تقاضا ہے۔“ آفیسر نے ایک جملے میں ساحل کی ساری خطابت پر پانی پھیر دیا۔

”اس ملک میں قانون کی کتنی حکمرانی ہے..... دن بھر کی بریلنگ نیوز سے پتا چلتا ہے۔“ ساحل نے تمللا کر سوچا مگر خود پر قابو نہ رہا۔ اس وقت اسے صورت حال کو حسبِ منشا کنٹرول کرنا تھا۔
”ایک بے قصور، عزت دار خاتون کے گھر پر رات کے اندھیرے میں پولیس کا جانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ میں مسلسل غرائی کر رہا ہوں جیسے ہی رابطہ ہوگا وہ خود آپ سے ملیں گی..... اور جو کچھ بھی ہے فیس کریں گی..... ہر طرح کا تعاون کریں گی۔“
”آپ چیویشن کو سمجھیں..... اس مزدور کے لواحقین ان کے بچے کا گھیراؤ کر لیں گے، اس کو بھی روکنا ہے۔“
آفیسر اپنی جگہ اڑا ہوا تھا۔

”آپ اپنی منطق اپنے پاس رکھیں ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا ہے۔“ آفیسر نے آنکھیں ماتے پر رکھ کر جواب دیا۔

”اوکے..... تو پھر میں خود گھر جا کر انہیں لے آتا ہوں..... اطمینان رکھیں ہم لوگ بھاگیں گے نہیں..... میڈم کا پھیلا ہوا بزنس ہے، سیکڑوں لوگ ان کے ماتحت کام کرتے ہیں..... یہ سب کچھ چھوڑ کر کون بھاگ سکتا ہے.....؟ آپ خود سوچیں.....“

”دیکھیں..... ہم وقوعہ پر کھڑے، کھڑے سب کچھ سوچ لیتے ہیں..... مشتعل ہجوم تھانے کو آگ لگانے پہنچ جاتا ہے..... ہم بھی اتنے ہی بے قصور ہیں جتنی آپ کی مالک.....“ آفیسر کی ٹون نہ بدل کر دی..... ساحل کی بات کاٹ کر اپنی سنائی۔

”ٹھیک ہے..... میں جاتا ہوں، میڈم کو لے کر آتا ہوں..... میرا سیل نمبر آپ کے پاس ہے..... جب تک میں میڈم کو لے کر نہیں پہنچتا..... آپ سے رابطے میں رہوں گا۔“

”ایسے کیسے جانے دیں باہا..... آپ بھی غائب ہو گئے تو ہماری پیشیاں اتر جائیں گی۔“ ساحل نے اب بڑی لہجے سے آفیسر کی طرف دیکھا تھا۔

چند لمبے سوچا..... پانچ، پانچ ہزار کے آٹھ نوٹ اس کے والٹ میں موجود تھے۔ اس نے پرس کھول کر سب لے سب نکال لیے۔ ساتھ ہی شاخنی کارڈ بھی.....

”یہ رکھ لیجیے..... مجھے تو لگ رہا ہے کورٹ یہیں لگ گئی ہے..... زرخیزانیت کے طور پر رکھ لیں..... یہ میرا اور کچنل شناختی کارڈ ہے، کا پی نہیں ہے۔ چیک کر لیں۔“ سامنے کروڑوں، اربوں نظر آرہے ہوں تو چالیس ہزار تک برابر لگتے ہیں۔ آفیسر کو پہلے ہی سائل کی بات پر یقین تھا..... مگر ساری بحث شاید اسی مقصد کے لیے تھی۔ اس کے منہ تل کا لڈو پڑ گیا تھا..... منہ بند ہو گیا اور سائل عطا کردہ اپنی لکڑی کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

سائٹ آفس میں دن نکلا ہوا تھا۔ ساری لائسنس آن تھیں اور تمام متعلقہ افراد یوں جاگ رہے تھے گویا آج کے بعد قیامت تک جاگتے رہیں گے۔

☆☆☆

”ایکچھ نیلی اس چویشن میں بچے بہت گھبرا جاتے ہیں..... اس کو پریشانی میں بس انکل یاد آئے۔“ پرنس نے اہم کٹوتیاں کرتے ہوئے مختصر اپنی غیر موجودگی کی وجہ بیان کر دی تھی۔

اب سب کے چہروں پر اطمینان نظر آرہا تھا بلکہ پیار بھری نظروں سے ٹوبان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”اسپتال میں اس کی ماما کے ساتھ کون ہے؟“ سفینہ نے ایک خیال کے وارد ہوتے ہی سوال کیا تھا۔

زارا نے سفینہ کو یوں دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ ”تمہیں بہت فکر ہے۔“

”ڈاکٹر ڈکی نے ایک نرس اپائنٹ کر دی ہوگی..... ان کو ساری چویشن پتا ہے۔ وہ ہینڈل کر لیں گے۔“ پرنس کو سفینہ سے براہ راست ہوتا اچھا لگا..... جواب دیتے ہوئے خوب دیکھا بھی..... حسن سادہ کی بلائیں بھی لیں.....

اس استحقاق کے احساس کے ساتھ کہ وہ اس کی ہی تو ہے۔

خادمہ نے تیسری مرتبہ آکر مطلع کیا کہ کھانے کی میز تیار ہے۔

لیڈی صوفیہ نے ٹوبان کی طرف دیکھ کر پرنس کو مخاطب کیا۔

”ٹوبان کو بہت توجہ سے کھانا کھانا ہوگا..... پتا نہیں بچے نے کب سے کھانا نہیں کھایا۔ جیسا کہ ابھی اس نے بتایا کہ گھر کے نوکر چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔“

”کیا یہ عجیب و غریب بات نہیں کہ سارے نوکر ایک ساتھ چھٹی پر چلے گئے ہوں ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔“

زارا کا سارا مزہ کر کر اہو چکا تھا..... اس کے دماغ کا تنقیدی حصہ بڑی سرعت سے کام کر رہا تھا۔ ٹوبان تو اسے کانٹنے کی طرح کھنک رہا تھا، جس نے اس کی ساری منصوبہ بندی خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔

وہ جس رومانس اور غنیمت کو اپنے حق میں موڑنے کے درپے تھی وہ تو ہوا ہو گئی تھی۔ بدترین زمینی حقائق اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اور تو اور لیڈی صوفیہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

البتہ سفینہ کے جذبات مزید خوشگوار ہو چکے تھے۔ پرنس کی خوب صورت شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا تھا..... وہ مطالعے کی شوقین تھی..... اس نے کبھی پڑھا تھا کہ بچوں پر پیار آنا اللہ کی رحمت کی نشانی ہوتی ہے۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہے جسے مستقبل میں بہترین شخصیت کا جیون ساتھی ملے والا ہے۔ ایسا سا بھی جس کے ساتھ زندگی مکمل ہو جاتی ہے اور ذات روحانی مسرت کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتی ہے۔

تا جور کے خیالات بھی سفینہ سے مختلف نہیں تھے، ایک روحانی اطمینان محسوس کر رہی تھیں..... خود بخود ایسا کچھ سامنے آیا تھا کہ مزید کھوج و تجسس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

اگر لیڈی صوفیہ کھانے کی میز پر شادی کا وقت معین کرنے کی بات کرتیں تو اب وہ مکمل طور پر تیار تھیں۔ لاؤنج سے اٹھنے اور ڈائننگ تک جانے کا فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں تھا..... مگر وہ فیصلہ کر چکی تھیں۔

پرنس، ٹوبان کا ہاتھ پکڑ کر نشست سے اٹھا تو وہ سفینہ نے سرعت سے آگے بڑھ کر ٹوبان کا دوسرا ہاتھ تھام

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

لیا..... ثوبان اب پرس اور سفینہ کے درمیان تھا۔
سفینہ کی یہ بے ساختگی پرس کو اچھی لگی۔

"love you" اس نے پیار کی پہلی سرگوشی سفینہ کے کان میں کی..... سامان باندھنے سے لے کر دوڑیں لگانے تک کی تھکن پلک جھپکتے اتر گئی تھی۔ یہ اس نے کیا سنا؟ گویا اب ساری کائنات اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

زارا کو ٹیکل کر اس کر کے ان کے نزدیک آنے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہوئی مگر نظارہ اس نے کر لیا تھا۔
وہ ایسے کڑھے میں جا پڑی جس میں سوائے شعلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

ساحل مینول گاڑی بھگاتا تا جور کے گھر پہنچا تھا۔

گارڈ نے اسے پہچان کر بہت احترام سے سلام کیا۔

"بیکم صاحبہ اگر سو رہی ہیں تو انہیں اٹھا دو....." ساحل نے لا حاصل تفصیلات و تکلفات کو پرے کر کے مطلب کی بات کی۔

"بیکم صاحبہ تو گھر نہیں آئے..... او..... تو کسی دعوت میں گیا ہے۔" گارڈ نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں مطلع کیا۔

"اوہ نو....." ساحل کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"شاید اسی وجہ سے ان کے تمام نمبرز آف مل رہے ہیں۔" یہ گتھی تو کھڑے، کھڑے سلجھ گئی۔

"یار گھر میں جو بھی ہے اس سے بات کر آؤ....." وہ کوفت کے عالم میں گویا ہوا۔

"کوئی نہیں آئے....." گارڈ نے صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ ہاتھ کو پیچھے کی طرح پھیلا کر بھی حرکت دی۔

"مائی گڈ نیس....." ساحل نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "کیا میں اندر بیٹھ سکتا ہوں؟" ساحل نے بے بسی سے چاروں اور نظر دوڑائی۔

"نہیں..... اندر کوئی نہیں آئے..... ام کدھر سے تم کو جانے دے گا؟" گارڈ نے ڈی کے انداز میں کھڑا ہو کر صفا چٹ انکار کر دیا.....

"تمہارے پاس ان کی بیٹی کا نمبر ہے.....؟" اسے پھر ایک راستہ سوچا۔

"کون سا بیٹی.....؟ اس کا ایک بیٹی لاہور میں پڑھائی کرتا ہے..... دوسرا ادھر ہوتا ہے۔" گارڈ نے اب اس کا ایک کرنا شروع کر دیا تھا۔

"کسی کا بھی دے دو یا....." ساحل جھلایا۔

"کیسے دے، دے؟ کسی کا بیٹی کا نمبر غیر مرد کو کیسے دے گا؟" الٹی آنتیں گلے پڑ چکی تھیں..... ساحل کا دماغ الٹ ہونے لگا۔

"ام کو بتا ہے تم بیکم صاحبہ کے دفتر میں کام کرتا ہے..... مگر لڑکی کا معاملہ آئے..... ام کسی کا بھروسہ نہیں کرے ابھی تم جاؤ....." گارڈ نے اب ہری جھنڈی لہرا دی۔

"گھر میں کوئی تو کر ہے تو اس سے بات کر آؤ۔"

"ام کو معاف کر دو صاحب..... آپ کچھ بھی بولو ام کچھ نہیں کرے گا۔ امارا ڈیوٹی گیت پر آئے..... اندر نہیں جائے گا۔"

ساحل اب سچ مچ اس کے سامنے لاچار ہو چکا تھا۔

"غوش رہو یا..... اللہ تمہیں اس گیت کے سائے میں لمبی عمر عطا فرمائے۔" ساحل تملاتا ہوا اپنی گاڑی کی

طرف بڑھ رہا تھا۔ طے کر لیا تھا گاڑی میں بیٹھ کر تاجور کا انتظار کرے گا۔

☆☆☆

ٹوبان نے آج کی رات اپنے نام کر لی تھی۔ زارا کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے لیڈی صوفیہ پر اثر انداز ہونے کے لیے جو کچھ سوچا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کا کوئی راستہ نہ ملا..... اندر ہی اندر تملار ہی تھی۔ ٹوبان کھانے کی میز پر بھی سفینہ اور پرنس کے درمیان بیٹھا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے..... اور وہ نانائوس چہروں کے درمیان بہت گھبرایا ہوا تھا۔ سفینہ مسلسل خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ سفینہ اور پرنس، ٹوبان کے حوالے سے بھی اس وقت بہت قریب ہو رہے تھے۔ پرنس، ٹوبان کو کچھ کھلانے کی کوشش کرتا..... وہ انکار کرتا تو سفینہ ذمہ لے لیتی اور اصرار کرتی..... ٹوبان کو خود سے شناسا کرنے کے لیے اس نے ایک دو پیگمانہ لطفے بھی سنائے تھے۔ لیڈی صوفیہ، ٹوبان پر ایک نگاہ ڈال کر پھر تاجور کو کوئی ڈش پیش کرنے لگتیں۔ ان کی نگاہوں میں اس کے لیے بہت اپنائیت و پیار نمایاں طور پر جھلک رہا تھا۔

”بھئی، ہمیں نہیں پتا تھا کہ آج کا ڈنر ٹوبان کے آئرن میں ہے۔ ورنہ میں اس کے لیے کوئی گفٹ ضرور لے آتی۔“ ٹوبان کے حوالے سے بات کر کے زارا نے سب کو گویا اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لہجہ میں کوئی بات نہیں تھی مگر ایسا کچھ ضرور تھا کہ سفینہ نے چونک کر زارا کی طرف دیکھا تھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا ڈنر ٹوبان کے آئرن میں ہے..... مگر یہ کیا یہ تو کچھ کھا ہی نہیں رہا۔“ تاجور نے بھی خوب صورت، صحت مند اور گھبرائے ہوئے بچے کی طرف خاص توجہ کی..... بلکہ انہیں کھانے کی میز پر ایک پیاسے سے بچے کو دیکھ کر ایک عجیب سی مسرت محسوس ہو رہی تھی..... یوں جیسے اس کی وجہ سے محفل کو چار چاند لگ گئے ہوں۔ ٹوبان مگر، مگر سب کی طرف دیکھ رہا تھا..... مصحوم بچے کا ذہن تو اپنی ماں میں الجھا ہوا تھا..... دوسرے پرنس کے گھر کے شاہانہ انداز بھی اسے بہت نانائوس لگ رہے تھے۔ لیڈی صوفیہ کو تو وہ بار بار دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے اتنی بوڑھی مگر جی سنوری خاتون پہلی بار دیکھی تھی۔ جب وہ ان کی طرف دیکھتا تھا وہ ایک مسکراہٹ ضرور نچھاور کرتی تھیں۔ پرنس نے ایک حسین سنہری گلاس میں ٹوبان کو پائیاں اچھل جوس پلانے کی کوشش کی تو اس نے پرنس کا ہاتھ پرے کر دیا۔ سفینہ نے فوراً پرنس کے ہاتھ سے گلاس لیا..... دونوں کی انگلیوں میں ہلکا سا تصادم ہوا اور دل نے ایک حادثے کی طرح محسوس کیا۔

آج پہلی بار دونوں ایک دوسرے کے لمس سے آشنا ہوئے تھے۔ سفینہ کے چہرے پر گلابیاں تیر گئیں۔ پرنس کا جی چاہا اپنا ہاتھ چوم لے۔ ”بھئی، ہم اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں مگر ابھی تک وہ بات نہیں ہو پائی جس کے لیے آج ساتھ بیٹھے ہیں۔“ لیڈی صوفیہ کو موعا خیال آیا۔ ورنہ ٹوبان کی وجہ سے ان کی روبہک چچی لگی..... وقتی طور پر بوڑھے حافظے نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”لیڈی صوفیہ..... ہم آپ کے پلانے پر آگئے ہیں، آپ جو بات کرنا چاہیں حاضر ہیں۔“ تاجور نے مؤدبانہ انداز میں بات کی تھی۔ زارا کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہونے لگیں۔

”اسوالات یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والے پر پوڈزل کے بعد ہاں یا نہ میں جواب دیتے ہیں یا تو بات بڑھتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے.....“ لیڈی صوفیہ نے پیار سے سفینہ کی طرف دیکھا۔

”بات آگے بڑھائیں گریڈ ۸.....“ پرنس نے برجستہ کہا تو سفینہ محبوب انداز میں مسکرا پڑی۔ تاجور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ٹوبان سر اٹھا کر پرنس کی طرف دیکھنے لگا۔ زارا کو یوں محسوس ہوا وہ کسی خزاں رسیدہ باغ میں آنکلی ہو اور پاؤں تلے خشک پتے چر چر رہے ہوں۔

یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

”تو پھر بہت مختصر بات کرتے ہیں..... یہ بتا ہے سفینہ کو انگلی پھٹانے کب آئیں؟“ لیڈی صوفیہ نے ایک اٹھا کر تاجور کو پیش کی گویا اپنی بات منوانے کے لیے لاشعوری طور پر کوئی رشوت پیش کر رہی ہوں۔

”آپ جب مناسب جھینیں تشریف لائیں..... بس یہ خیال رہے کہ سفینہ کو لاہور سے آنا ہوگا۔“ تاجور نے...

الٹکلف جواب دیا۔ گویا ہل میں ہاں ہو گئی تھی۔

سفینہ کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا اس نے پرنس کی جانب دیکھنا چاہا مگر دیکھنا نہ گیا۔

زارا کو کھانے کی پلیٹوں میں کھانے کے بجائے زہر نظر آنے لگا۔

”ویسے تو اس ٹکلف کی کوئی ضرورت نہیں..... سفینہ کے فائل ایگزام ہونے والے ہیں۔ ایگزام کے بعد شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ میری اماں کہتی تھیں جب لڑکی کا رشتہ طے ہو جائے تو اسے رخصت کرنے کی جلدی ہونا چاہیے۔ وہ تو خیر یہ بات شری پوائنٹ سے کہا کرتی تھیں۔“

”stay blessed always“ آپ کی اماں کتنی اچھی باتیں کرتی تھیں۔“ پرنس نے تاجور کا جملہ جس برجستگی سے اچک لیا تھا..... تاجور اور لیڈی صوفیہ بے ساختہ ہنس پڑی تھیں..... سفینہ یوں شرمائی گویا دلہن بنی پرنس کے پہلو میں بیٹھی ہو..... زارا نے بھی ہنسنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

”یہ کیا یہاں تو ایک دم شادی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ اُف..... کہیں یہ لوگ تاریخ رکھ کر ہی یہاں سے نہ اٹھیں۔“ زارا تو رشتہ ہی روکنا چاہتی تھی..... اب شادی روکنے کا مرحلہ سر پر آ پڑا تھا۔

”as you wish ...ok!“ لیڈی صوفیہ نے پرنس سے انداز میں کہا۔

”یہاں آنے سے پہلے میں نے سفینہ کے ساتھ پراپر میننگ کی تھی، اس کو لاہور سے بلانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس لیے اب میں بہت کا فیڈ بک ہو کر آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ تاجور نے اب اپنی بات مکمل کی۔

”تھینک یو سفینہ.....“ لیڈی صوفیہ نے اپنا منسوب مہذبانہ خاندانی پس منظر ثابت کیا۔

”تھینک یو سفینہ.....“ پرنس نے بھی سفینہ کی طرف غور سے دیکھ کر روحانی مسرت میں ڈوب کر شکر یہ ادا کیا تھا۔

سفینہ نے گھبرا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

”تاجور، سفینہ میرے بیٹے کا ڈریم ہے..... مجھے یاد نہیں پرنس نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش کی ہو پھر اصرار کیا ہو..... ایڈوشن بلیک میل کیا ہو..... صرف سفینہ اس کی پہلی فرمائش ہے۔“ لیڈی صوفیہ اپنے مخصوص صاف گو اور... ”لوگ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

زارا کو یوں لگا گویا اس کا دل کسی اتھاہ میں ڈوبتا جا رہا ہو۔ اس نے بیزاری سے ٹوبان کی طرف دیکھا جو کھانا نہیں کھا کر دے رہا تھا مگر اس کا قیمتی وقت کھا گیا تھا۔

”سفینہ اس شہر کی ٹوسٹنگی ہو گئی ہے تاجور..... یقین کریں..... جس طرح لڑکیوں کے پروپوزل آتے ہیں، پرنس کو اس طرح پروپوز کیا گیا ہے۔ مگر یہ بھی کہتا تھا گرینڈ مام شادی ایک بار ہوتی ہے اور ہونا چاہیے..... اور اسی لڑکی سے ہونی چاہیے جس کی طرف دل جاتا ہو۔“ لیڈی صوفیہ، پرنس کے جھکے کام کر رہی تھیں۔

سفینہ کو ان کے سامنے حیا آ رہی تھی..... اس کی ماں کے سامنے کلمے انداز میں پرنس کے احساسات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔

”آج کل آپ کون سی بک پڑھ رہی ہیں گرینڈ مام.....“ زارا نے ماحول کے برعکس بے ہنگام سوال کر کے سب کو اپنی طرف حیرت سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ عموماً ایسے موقع پر چھوٹی بہن ہونے والی دلہن سے زیادہ جذباتی نظر آتی ہے۔ شادی کے حوالے سے ڈمیروں باتیں کرتی ہے۔

”ارے..... زارا..... کیا ہو گیا ہے تمہیں..... یہ باتیں تو تم جب مرضی آ کر لیڈی صاحبہ سے کر سکتی ہو۔“

تاجور کو اتنی زیادہ حیرت تھی کہ بات کرنے کے بعد بھی زارا کی صورت تک رہی تھیں۔

”اوہ آئی ایم سوری..... میں بھی آپ لوگوں کی بات ختم ہوگئی۔“ زارا نے فوراً ہنستے ہوئے معذرت کی۔ زارا کی ہنسی میں مرحوم ارامنوں کے نوچے تھے۔

”بہت بے وقوف ہے یہ..... چنانچہ کب بڑی ہوگی؟“ تاجور نے لاڈ دلار کے انداز میں زارا کا بے لکچا پن محو کرنے کی کوشش کی۔

ڈھیروں باتوں کے دوران عشاءِ ختم ہوا..... ٹوبان نے سب کی باتیں یوں غور سے سنی تھیں گویا ڈنر کے اختتام پر بطور منصف اس نے کوئی فیصلہ سنانا یا محفوظ کرنا ہو۔

”آئی..... آپ کی اجازت سے میں سفینہ کو اسٹوڈیو لے جانا چاہتا ہوں۔“ پرنس نے اٹھتے ہوئے تاجور سے درخواست کی..... ہاتھ آئے ان حسین لچات سے وہ مکندر س کشید کرنا چاہتا تھا..... سفینہ اس کی تھی، وہ تنہائی میں اس سے اکثر ہم کلام ہوتا تھا..... آج رو برو تھی..... بس تھوڑا سا وقت ہاتھ میں رہ گیا تھا اور یہ لچات امر ہونے کے لیے میسر آئے تھے۔

”میں بھی چلتی ہوں.....“ زارا فوراً کھڑی ہوگئی کیونکہ وہ تاجور کے پہلو میں تھی اس لیے تاجور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دیا۔

سفینہ کے دل میں اٹھتے جوار بھانے..... جھاگ کی طرح بیٹھنے لگے۔

پرنس کو یوں لگا..... کشتی میں پاؤں رکھنے سے پہلے ہواؤں نے کشتی کو ساحل سے دور کر دیا ہو۔ اس نے حیرت آمیز نگاہوں سے زارا کی طرف دیکھا تھا۔

اب اتنی بھی بچی نہیں تھی..... اسے تو اس موقع پر بہن کے لیے خود کوئی موقع فراہم کرنا چاہیے تھا۔

”اوہ کے پرنس.....! ہم لوگ لیڈی صوفیہ کی مہنی انجوائے کرتے ہیں..... مگر خیال رہے ہم آل ریڈی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔“ تاجور نے ابھی تک زارا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ مبادا وہ ہاتھ چھڑا کر کہیں بھاگے گی ہو۔

پرنس نے جھک کر ٹوبان کے گال پر پیار کیا..... جو ابھی تک گویا سانٹے میں تھا کسی طور بول کر نہ دیا تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے میں ٹوبان کو اپنے ساتھ لے جاؤں.....“ سفینہ نے اپنی مسرت کو ٹوبان کے حوالے سے منسوب کرنے کی کوشش کی تاکہ دیکھنے والی نگاہوں کو الجھا کر رکھ دے اور کوئی اس کے دل کا بھید نہ پائے..... یہ ایک فطری حیا کا ردِ عمل تھا۔

”کہاں..... لاہور؟ شور ہو جائے گا وہاں..... پروٹسٹ ہو جائے گا۔“

”وہ کیوں.....؟“ سفینہ کو پرنس کی طرف دیکھنے کا بہانہ مل گیا۔

”سب یہی کہیں گے کہ اتنا بوڑھا، ضعیف اسٹوڈنٹ نہیں چلے گا۔“ پرنس کی بات پر سب ہنس دیے سوائے زارا کے.....

سفینہ، پرنس اور ٹوبان کے ساتھ باہر کی طرف جاری تھی۔ زارا اپنی جگہ بت کی طرح استادہ تھی۔ یونانی شہزادے جیسا وجہ، مردانہ حسن کا شاہکار، دنیا کے بہترین دھاگوں سے بنے کپڑے کا قیمتی لباس جو عموماً کرتا با جامہ ہی ہوا کرتا تھا سو تک صرف گھر سے باہر کی تقریبات میں ہوتی تھی۔ وہ بھی اتنے اہتمام سے کہ شیونگ کریم، گولون، پرفیوم، سوپ، سب ایک فیلٹی پروڈکشن ہوتی تھیں۔ ایک خوشبو، ایک مہک، مختلف اقسام کی خوشبو یا تھلا ملط نہیں ہوتی تھیں..... بہت سے لوگ یہ شناخت بھی رکھتے ہیں۔

اس طرزِ زندگی کو عام انسان ایک خواب کی بات گردانتا ہے۔ مگر اسی دنیا میں لوگ فاقے کی وجہ سے خودکشی بھی کرتے ہیں اور اسی دنیا میں لوگوں کے جہاز بھی چلتے ہیں۔

اور نوٹ یا کرنسی کو ہاتھ میں لیے بغیر کروڑوں، اربوں کی تجارت بھی کرتے ہیں اور سرمایہ دار کے دولت

بہ کہاں بیٹھ کر دل ہے

کدے پر مریض کی چار پائی رکھ کر اپنی ہی محنت کی اجرت لینے کے لیے احتجاج کرتے بھی نظر آتے ہیں..... جہیز میں چاندی ملنے کا امکان نہیں ہوتا..... بالوں میں چاندی نظر آتی ہے..... جبکہ کسی محل میں ہیرے کا نگینا دھڑا دھڑا پھینک کر نئے نگینے کی خریداری کے لیے کمر کھی جاتی ہے۔

انسانوں کے انگوٹھے کے نشان آپس میں نہیں ملتے..... اسی طرح مقدر کی تحریر بھی الگ، الگ ہوتی ہے۔

حیرت، ہمیشہ بقدر علم و آگاہی ہوتی ہے.....

”ایسا تو بس شہر میں ایک ہی ہے..... اور یہ بھی ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔“ زارا کا دل چاہ رہا تھا وہیں کھڑے، کھڑے چلا، چلا کر رونے لگے۔

بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ حسد کی شدت سے لوگ بری طرح رو پڑتے ہیں کیونکہ اللہ کی رحمت سے دور ہوتے ہیں اس لیے مایوسی اور غم بہت زیادہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

”یہ یہ.....؟“ سفینہ نے دُورِ شوق سے بولتی تصویر پر دھیرے سے ہاتھ بھیرا۔ ”آپ نے تو کمال کر دیا۔“ آسمانی اور بہت بلند رومان پروان چڑھ رہا تھا..... پرنس کی آنکھوں کی چمک سفینہ کو اتنے حسین پیغامات ارسال کر رہی تھی جو بہت انوکھے تھے۔ اس ہنسی پھل کی طرح جس کا ذائقہ گویا موت سے پہلے ہی چکھ لیا ہو۔

”کمال تو اس کا ہے جس نے آپ کو بہت پیار سے میرے لیے تخلیق کیا۔“ پرنس نے ٹوبان سے پہلو بجا کر آہستگی سے سر گھٹی کی۔ سفینہ کا جی چاہا کہہ دے۔ ”بس کریں کہیں یہیں کھڑے، کھڑے مر ہی نہ جاؤں۔“ مگر فطری حیاء نفع تھی۔

”بہت شاعرانہ..... کیا میں اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں؟“ ایک الہٰی معصومہ خواہش نے ہلکان کیا۔

”ماہین دیکھیے گی تو حیران رہ جائے گی.....“

”آف کورس! مجھے کسی میڈم وائس کی ضرورت نہیں..... آپ نہیں ہوتیں..... مگر پھر بھی صرف آپ ہی ہوتی ہیں.....“ پرنس نے ٹیکل پر رکھے گلدان سے ایک پھول نکال کر ٹوبان کو تھمایا۔

”انگل، ماما.....!“ پھول لیتے ہی ٹوبان نے خود کو اذیت ناک غم سے نجات دلانے کی سعی کی۔

اتنی دیر سے وہ اندر ہی اندر بہتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا ان ہنسنے مسکراتے لوگوں کو آخر خیر یا ماں کب یاد آئے گی۔

”ٹوبان بیٹا..... یقین کرو، میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں بھولا ہوں، ابھی ڈاکٹر کی کال آئے گی اور ہم آپ کو ماما کے پاس لے چلیں گے.....“ پرنس انتہائی اعلیٰ درجے کے مضبوط اعصاب کا مالک تھا..... اتنی دیر سے وہ اپنے مہمانوں کے ہمراہ تھا مگر ذہن کے پروے پر ٹوبان کی بے ہوش ماں مسلسل متحرک تھی۔

وہ اس کمال سے اپنا کردار نہا رہا تھا کہ سفینہ کو ہلکا سا بھی شبہ نہ گزرے کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہے۔

کردار کی چمکی اور روحانی سکون انسان کو بھی کم ظرف پیمانے کی طرح چمکنے نہیں دیتے۔

اگر سفینہ کے پاس انسانوں کے دل پڑھنے کی صلاحیت ہوتی تو شاید آج رات ہی اس کی محبت، عشق و عقیدت میں تبدیل ہو جاتی۔

”پراس.....؟“ ٹوبان نے چھوٹا سا ہاتھ پرنس کی طرف بڑھایا۔

”پراس!“ پرنس نے اس کا ہاتھ تھام کر ہاتھ پر بوسہ بھی ثبت کیا۔

”ٹوبان..... آپ میرا ایک کام کریں.....“ پرنس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ کائنات کے حسین ترین لمحات سفینہ کی گرفت میں تھے۔ اس نے جھکی، جھکی نظروں سے پرنس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ پرنس کی شوخی کچھ کہہ رہی تھی۔

”جی انگل.....!“ ٹوبان نے سیاہ بھونسا آنکھیں پوری کھول کر پرنس کی طرف دیکھا۔

”سفینہ سے کہو مجھ سے پراس کر لے۔“ سفینہ نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ کیا کر رہے ہیں؟

”سفینہ، آپ پراس کریں۔“

ٹوبان talky doll کی طرح بول پڑا۔

پرنس نے سفینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ سفینہ نے حیا آمیز ادا سے پرنس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ٹوبان نے معصومانہ خوشگوار حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ گاڑی کا اسی آن کر کے سیٹ پر لمبی تان کر سو بھی سکتا تھا۔ مگر سیل فون پر وقتے، وقتے سے آنے والی کالز اسے ڈھنگ سے آنکھیں بند کرنے نہیں دیں۔۔۔۔۔ تھکاوٹ، فطری نیند کا غلبہ۔۔۔۔۔ اچانک ہی دماغ میں جیسے دھماکے ہونے لگے۔۔۔۔۔ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس انداز میں باہر آیا گویا گاڑی کی گردن دبوچنے اور اسے جان سے مارنے کا مقصد ارادہ کر لیا ہو۔

تیر کی طرح اڑ کر۔۔۔ گویا گاڑی تک پہنچا تھا۔

”الحق، جاہل انسان، دماغ کی جگہ پر پتھر سیٹ کیے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ اندھے نظر نہیں آ رہا ایک گھنٹے سے گاڑی میں مرا پڑا ہوں۔۔۔۔۔ انسان ہو یا ڈنکر موٹی، ابھی پولیس کی چار گاڑیاں آجائیں گی۔ تمہاری کن چین گریٹ کا تالا توڑ دیں گی۔۔۔۔۔ پھر کیا کرو گے تم۔۔۔۔۔؟ مجھے کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے۔۔۔۔۔ روڈ پر گاڑی میں سونے کی نہیں۔۔۔۔۔ پاگل آدمی۔۔۔۔۔ موٹی عقل میں اتنی بات۔۔۔۔۔ بھی نہیں آتی کہ میں اپنا گھر بستر چھوڑ کر گاڑی میں کیوں مرا پڑا ہوں۔۔۔۔۔؟“ اوتھنا جھومتا گاڑی تو یوں مستعد ہوا گویا اسے کن سیدھی کر کے۔۔۔۔۔ واردات کے لیے آنے والے ڈاکو کا نشانہ لینا ہو۔ ہٹا ہٹا ساحل کی شکل دیکھ رہا تھا۔

”لو۔۔۔۔۔ پ۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔ کدراے؟“ گاڑی نے بڑے فرض شناس پہرے دار کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

”اگر بیگم صاحبہ سے رابطہ نہیں ہوا تو پولیس ادھر بیگم صاحبہ کو گرفتار کرنے آجائے گی۔۔۔۔۔“ ساحل نے ہراساں کر کے کام نکالنے کی کوشش کی۔

”ام کو سمجھ نہیں آیا۔۔۔۔۔“ گاڑی، بیگم صاحبہ کی گرفتاری کا سن کر بدحواس ہو گیا۔

”مجھے پتا ہے، پتا ہے مجھے۔۔۔۔۔ میں اس وقت پاکستان کے سب سے ذہن، روشن دماغ سے سر پھوڑ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ بیگم صاحبہ کی فیکٹری دسم سے گر گئی ہے۔۔۔۔۔ مزدور مر گیا ہے۔۔۔۔۔ پولیس بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔“

”ابھی تو تم بولا پولیس گرفتار کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔“ گاڑی کی نگاہ میں ایف آئی اے کے ڈائریکٹر کی طرح شک جھلکنے لگا۔

”ارے علامہ کی اولاد۔۔۔۔۔ اندر کسی نوکر کو چکاؤ۔۔۔۔۔ وہ بیگم صاحبہ سے بات کرائے گا۔“

”تم تو بولا بیگم صاحب کا نمبر بند ہے۔۔۔۔۔ اوکدر سے بات کرائے گا؟“

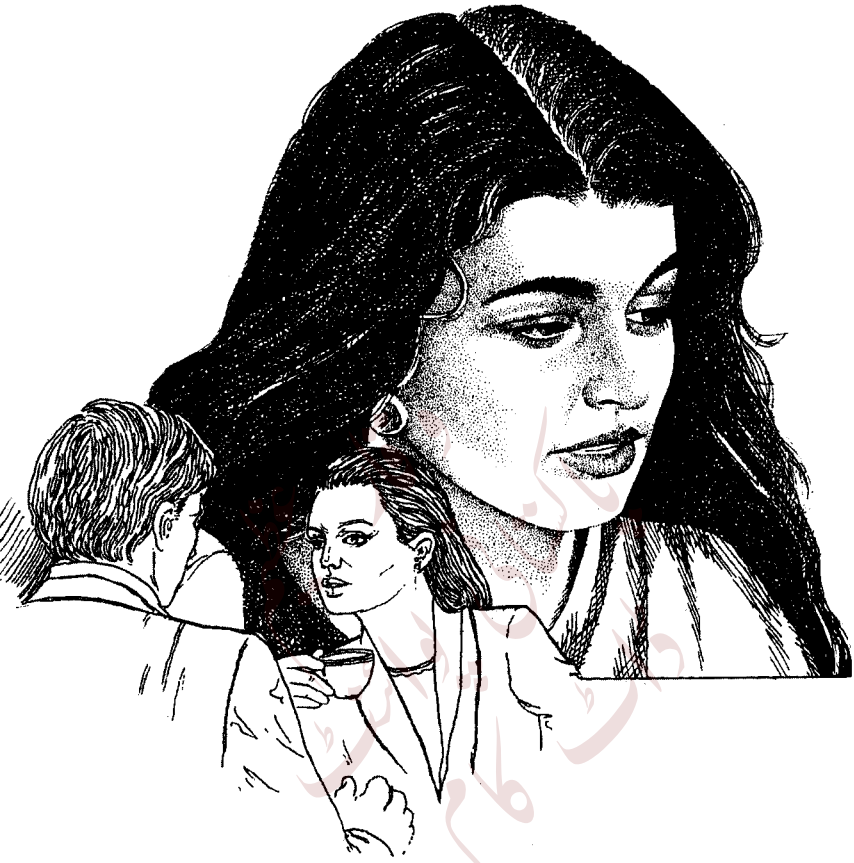
”جہاں وہ گئی ہیں اس جگہ کا نمبر تو کسی کو معلوم ہو گا ناں۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ کا کوئی اور نمبر بھی ہو جو صرف کسی خاص نوکر کو پتا ہو۔۔۔۔۔“

”ام کو تمہارا بات سمجھ نہیں آتا۔۔۔۔۔ ام کو لگتا ہے تم بس اندر جانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ کوئی بھی بہانہ کر کے۔۔۔۔۔“ گاڑی نے بات کرنے کے بعد رخ بھی پھیر لیا ساحل نے گویا سر پیٹ لیا تھا۔۔۔۔۔ معا اسے خیال آیا کہ پھر ٹرائی کرے ہو سکتا ہے تاجور نے اب سیل آن کر دیا ہو۔

اس نے اللہ کا نام لے کر نمبر پھر پریس کیا۔

معا آنکھیں چپکنے لگیں۔۔۔۔۔ بیل پاس ہو رہی تھی۔

(جاری ہے)



دشمن

باحبرہ ریحان

”تم نے تو کہا تھا کہ یہ تمہارا اور تمہاری محبت کا دشمن ہے؟ ایک تو تمہاری محبوبہ موقع پرست قسم کی تھی، تمہارے دشمن کو بھی قریب کر رکھا ہے اور تمہیں بھی الگ نہیں ہونے دے رہی..... اوپر سے یہ نام نہاد دل بھی تم نے دنیا جہان کا الوکھا ہی ڈھونڈا..... محبت میں صرف محبوب ہی نہیں، عاشق، اپنے دشمنوں سے بھی جانا پہچانا جاتا ہے..... کیا پڑھا نہیں؟ ہیر کا چچا کیسا چالاک، تیز طرار..... اور رانجے کے بھائی کیا

مکڑے..... بات کے پکے اور دہنگ کر رہے تھے۔ پھر اپنے رومیو، جولیٹ کوئی لے لو، بہن کو مر جانے دیا مگر رومیو کی جولیٹ نہ ہونے دی..... تو ایسے ہوتے ہیں دو محبت کرنے والوں کے دشمن..... عرف و لن..... ارے کچھ تو دیکھ بھال کر محبت کی ہوتی..... تم نے تو ناک کٹوا دی..... کہاں تو کبھر رہے تھے کہ یہ بد معاش ہے تمہاری محبوبہ کو محبت کا جھانسا دے رہا ہے، ارے ایسا ہوتا تو ابھی نکل پورا وقت وہ میرے پہلو سے چپکا کیوں بیٹھا رہتا..... نہ ہی اس نے اپنی محبوبہ کو تمہارے ساتھ دیکھ کر کسی قسم کا اکتہار کیا..... اوپر سے یہ خط..... آف اللہ..... اب میں کیا کروں گی؟ کچھ تو کہو..... گو نگے کیوں بنے بیٹھے ہو؟“

ساجدہ کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور میں حواس باختہ سمجھ ہی نہیں پار رہا تھا کہ کہانی کا سرا کہاں سے پکڑوں کہ تمام راز خود بخود ہی نکلتے..... چلے جائیں..... میرے ہاتھ میں ساجدہ کا دیا ہوا خط تھا جس میں بہت ہی ملائم اور درواں لفظوں میں ساجدہ سے محبت کا اکتہار کیا گیا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا..... واقعی یہ میرا دشمن..... اس نے تو میری محبت کی ناک ہی کٹوا دی ہے۔ میں نے تو ساجدہ کو کل شام کی دعوت میں یہی دلا سادے کر اس کے ساتھ بٹھایا تھا کہ مجھے رومی کے ساتھ وقت بتانے کا موقع مل جائے گا پھر بھی مجھے تھوڑا سا احتمال تھا کہ مجھے اور رومی کو ایک ساتھ پورے ہال میں ادھر ادھر جھکتے دیکھ کر نہیں یہ ساجدہ کے قہقہے سے نکل نہ بھاگے..... میں ساجدہ کو خوب سکھا پڑھا کر لایا تھا اور کئی روز تک ہم دونوں ہر ایک پہلو، ہر بات اور طریقہ کار پر غور کرتے رہے تھے..... مگر مجھے اسی وقت کھٹکا سا ہوا تھا جب میں نے دیکھا کہ کس طرح ساجدہ اس کو لے کر کوئی ایکلی میز پر چلی گئی تو وہ بھی کسی بے دام غلام کی طرح ساجدہ سے ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوا۔ پہلے تو مجھے لگا کہ ساجدہ کے مسلسل منہ چلانے کی وجہ سے وہ بیچارہ توجہ کہیں اور کر ہی نہیں پار رہا مگر جب میں جان بوجھ کر رومی کو ان

دونوں کے سامنے سے لے کر ایک نہیں کئی بار گزرا اور اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر رومی کو نہ دیکھا تو مجھے حیرت کے ساتھ، ساتھ ایک اور قسم کی جلن ہونے لگی..... میرے دل میں ایک ہی خیال آیا۔

”کیا ان دونوں کی محبت اس بچ پر پہنچ چکی ہے کہ ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد ہو چکا ہے کہ کوئی بھی پہلو سے آگے..... دوسرا اطمینان سے رہتا ہے کہ بالآخر اس کو میرے ہی پاس واپس آنا ہے۔“ یہ سوچتے، سوچتے مجھے ایک اور سوچ نے جھٹکا دیا۔ ایسا اعتماد تو صرف مشہور و معروف ایکٹریسوں کے جیون ساتھی کو ہوتا ہے..... وہ جانتے ہیں کہ ہمارا شوہر یا بیوی کی کئی طرح کی فلمی جوڑیاں ہیں..... ہر روز مختلف قسم کے مردوں، عورتوں سے عشقیہ سین بھی فلم بند کرائے جاتے ہیں..... مگر آنا تو اس نے رات گئے اپنے گھر ہی ہے ناں.....

”تو کیا رومی میرے ساتھ ناک کر رہی ہے؟“ مجھے خود پر غصہ آنے لگا..... میں تو چاہتا تھا کہ اپنے دشمن کو جلاؤں گا..... اس کو ساجدہ کے قبضے میں دے کر رومی کو آزادانہ لیے پھروں گا..... اور بعد میں وہ رومی کو یہ بات یاد دلا، دلا کر ستائے گا..... بہت ممکن ہے یہی بات دونوں کے درمیان دوری کا سبب بن جائے..... اور میرا راستہ صاف ہو جائے لیکن اگر دونوں کے درمیان اس قدر اعتماد ہے تو میں لاکھ کوشش کر لوں میرا کچھ نہیں بننے والا..... مگر پھر..... مگر پھر یہ خط؟

”تمہیں یقین ہے کہ یہ خط تمہیں شعیب نے ہی دیا ہے؟“ میں نے چونک کر کئی بار پوچھا گیا سوال پھر دہرایا..... اور ساجدہ پھر سے ریل کی طرح شروع ہو گئی۔

”ارے دماغ سو گیا ہے کیا؟ اتنی دیر سے بکواس کر رہی ہوں سنائی نہیں دے رہا؟ ایک تو دو عاشقوں کے درمیان ڈڈلتی اس قدر لوٹا ٹاپ کی محبوبہ پسند کر لی ہے، اوپر سے اس کے اتنے دل پھینک عاشق سے مجھے ملوایا ہے۔ میں بتا رہی ہوں وہ مجھے بہت سنجیدہ لگ رہا تھا اگر

کے جال میں پھنسا رکھا ہے دوسری طرف ساجدہ سے بھی پیٹک بڑھانے کا سوچ بھی کیسے لیا اس خبیث نے۔“ غصے کی لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔

”ہاں روپی کا شعیب سے کوئی لینا دینا نہیں یہ خود ہی ہر خوب صورت لڑکی کو پھانسا پھرتا ہے اور جو اس کے دام میں نہیں پھنستی اس کو بدنام کرتا ہے جیسا کہ روپی کے بارے میں اندر ہی اندر لوگوں میں باتیں پھیل رہی ہیں۔“ یقیناً روپی نے اس کو اسی دن دور فٹے منہ کر دیا ہوگا۔“ مجھے اپنا اعتماد بحال ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے

چند ہی لمحوں میں روپی کو ایک بہت ہی معصوم، نیک اور شریف انسان کے طور پر دوبارہ سے دل میں زندہ کر لیا اور اپنا تمام تر غصہ شعیب کی طرف موڑ دیا۔ یہی بات ہو سکتی ہے ورنہ روپی جیسی سمجھدار۔۔۔۔۔ نیک سیرت اور

شریف لڑکیاں شعیب جیسے دل پھینک مردوں کو کہاں پسند کرتی ہیں۔۔۔۔۔“ مجھے روپی کے ساتھ چند لمحے گزار کر ہی اس کی عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ گو کہ

جانتا تو میں روپی کو بس اتنا ہی تھا کہ وہ چند بیٹھے ہوئے اپنے والد کے ہمراہ ہمارے برابر والے گھر کے نیچے کے پورشن میں کرایے پر رہنے آئی تھی۔ امی کو تو ویسے ہی محلے بھر سے راہ و رسم رکھنے کا شوق تھا لہذا ایک دو

دن میں ہی دونوں باپ، بیٹی ہمارے گھر چائے پر مدعو کر لیے گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنی جاب کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔۔۔۔۔ اور میری

غیر موجودگی میں ہی میرا خاندان اور روپی اور اس کے والد محل مل گئے تھے۔۔۔۔۔ اور روپی اکثر میرے گھر آنے لگی تھی۔۔۔۔۔ وہ میرے سامنے بھی کئی بار آئی اور ہر بار اس کے آنے سے جو مجھے خوش محسوس ہوتی وہ میں کسی کو

بتا بھی نہیں پاتا مگر چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”پر دمی لکھی۔ خوب صورت۔۔۔۔۔ اچھے خاندان کی۔۔۔۔۔“ میں نے امی سے اپنی پسند کا بے دھڑک اظہار کر دیا۔۔۔۔۔ امی کچھ سوچنے لگیں۔۔۔۔۔ اور میرا دل ڈوب گیا۔۔۔۔۔ میں تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ لہذا امی

مجھے کبھی کسی بھی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں اور ان کو

امی، باپ تک بات پہنچ گئی تھی تو میں ان لوگوں کو سب کچھ بتا دوں گی۔۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔ ساجدہ کو گونگی نہ سمجھوتم۔۔۔۔۔“

”اوہو۔۔۔۔۔ بات کا ٹیکڑا بنا لو تم تو بس۔۔۔۔۔ بات آئی یا انکل تک پہنچے نہ پہنچے۔۔۔۔۔ خود ہی منہ سے اگل دو

گی تم۔۔۔۔۔ پیٹ میں بھی رہی ہے زندگی میں کبھی کوئی بات؟“ میں نے جھنجھلا کر ساجدہ کو ڈانٹا۔

”ارے واہ۔۔۔۔۔ دیکھو تو ذرا۔۔۔۔۔ کیسا مذاق بنا رہا ہے یہ شخص میری سچ بولنے کی عادت کو۔۔۔۔۔ بھائی

جی، میرے والدین نے میری تربیت ہی ایسی کی ہے۔ میں اپنے والدین سے۔۔۔۔۔ کوئی بھی بات

نہیں چھپاتی۔ میرے دل میں کوئی چور تھوڑی ہے۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔“ وہ اپنی بڑی، بڑی آنکھیں منکلی چمکتے ہوئے بولی۔

”والدین کو ہی بتاؤ تو کوئی بات بھی ہو۔۔۔۔۔ تمہاری تو یہ عادت ہے کہ بات کوئی ہونہ ہو مگر پہنچا دو

پورے جہان میں۔۔۔۔۔ ہے ناں؟ یہ سکھایا ہے ماں باپ نے؟“ میں نے بھی دو ٹوک جواب دے

ڈالا۔۔۔۔۔ ساجدہ۔۔۔۔۔ مجھے غصے سے گھورتی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

”اچھا ہوا چلی گئی۔“ میں نے ایک سکون بھری سانس لی۔

”اب کم از کم ٹھنڈے دماغ سے حالات کا جائزہ تو لے سکوں گا۔“ کئی سوال دل میں پھانسنے

مانند چھپے ہوئے تھے۔

”کیا روپی میرے ساتھ ٹانگ کر رہی ہے؟ کیا اس کے بارے میں مشہور ہونے والی چہ گوئیاں

درست ہیں؟ کیا واقعی وہ موقع پرست۔۔۔۔۔ ہے؟ نہیں، نہیں۔“ دل نے خود ہی بہلایا۔ ”روپی کی صورت،

عادت، رکھ رکھاؤ، کچھ بھی تو ایسا نہیں کہ یہ کہا جاسکتا کہ وہ مکار اور بقول ساجدہ لوٹا ٹائپ محبوبہ ہے۔ ایسا

نہیں ہے بات تو کچھ اور ہی ہے اور مجھے ابھی جا کر اس معاملے پر شعیب سے بات کرنی چاہیے۔ اسے کم از کم

شرمندہ تو کر ہی سکتا ہوں۔۔۔۔۔ ایک طرف تو روپی کو محبت

مجبوراً جب انکار کرنا ہوتا تھا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھیں..... بہر حال میرا فرض تھا کہ میں پسند و انسخ کر دوں کیونکہ مجھ پر نوکری کے کئے ہو جانے کے بعد سے شادی کے لیے زور پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں قسمت سے روٹی لکرائی..... اور مجھے جیسے سب کچھ گھر بیٹھے مل گیا..... ابھی تو امی کی طرف سے رضامندی کا معاملہ ہی اٹکا ہوا تھا کہ یہ شعیب آن دم کا..... منحوس، دشمن کہیں کا شعیب بھی محلے کا نوار د تھا..... وہ دوسرے شہر سے نوکری کے سلسلے میں یہاں رہنے آیا تھا..... اس کے بارے میں معلومات پورے محلے میں اس کے آنے کے ساتھ ہی محلے بھر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے ملیں..... ایسے میں ساجدہ کی اس سے ٹھن گئی تھی..... شعیب کے آنے سے پہلے پورے محلے میں ساجدہ ہی تمام بچوں کو ٹیوشن دیا کرتی تھی..... اور اکثر بچوں کو وقت کی کمی اور بچوں کی زیادتی کی وجہ سے کئی، کئی مہینے اس کے ٹیوشن سینٹر کو جوائن کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ شعیب کے آنے سے فارغ رہ جانے والے بچوں کو بھی ٹیوشن ملنے لگا..... اور چند ہی دنوں میں ساجدہ کے ٹیوشن سینٹر سے بھی کچھ بچے شعیب کے پاس دوڑ گئے..... کہ وہ زیادہ سہولت اور وقت دے کر پڑھایا کرتا تھا۔

ساجدہ میری بچپن کی کلاس فیلو، محلے دار..... اور مجھ سے ایک سال بڑی بہن کی چیت پی سہیلی تھی..... لہذا ہم دونوں میں بے تکلفی بھی ایسی ہی تھی..... اور مجھے اسی سے پتا چلا تھا کہ کس طرح شعیب نے ساجدہ کے اچھے خاصے کاروبار میں نقب لگانا شروع کر دیا ہے..... یوں تو ساجدہ، شعیب سے کبھی نہیں ملی مگر اس کی ٹوہ میں ہر وقت رہتی اور ہر بات مجھے بتا کر جلتی کڑھتی رہتی مگر اس کا کوئی حل بھی نہیں تھا لہذا میں ساجدہ کو دلا سادے کر بہلا دیا کرتا تھا۔ میں نے شعیب کو اس قدر مکار، چالاک اور پہنچا ہوا کب سمجھا تھا مگر جو بات ابھی چند دنوں پہلے مشہور ہوئی تھی اس میں سب کچھ نہ سہی مگر کچھ تو صداقت ہوگی کہ ایسے تو کسی کے لیے یوں بات مشہور نہیں ہوتی ناں! پہلے تو یہ سننے میں آیا کہ روٹی کے

بوڑھے والد ایک دن نان کی دکان پر ہال بنوا رہے تھے کہ شعیب بھی حجامت بنوانے پہنچ گیا..... بڑے میاں ابنی کرسی چھوڑ نان کی کوپرے ہٹا..... شعیب کو باقاعدہ تیز لہجے میں غصے سے کچھ سنانے لگے..... جس کا لب لباب یہ تھا کہ شعیب ان لوگوں کا چچھا کرتا یہاں تک آ گیا ہے مگر بڑے میاں اس کی کوئی چال پوری نہیں ہونے دیں گے۔ ان کی بیٹی یعنی روٹی نے جو کچھ بھی سہا ہے اب بڑے میاں اپنی بیٹی کو دوبارہ اس دور سے گزرنے نہیں دیں گے..... لہذا شعیب فوراً سے بیشتر اس محلے کو چھوڑ جائے۔ اس وقت دکان میں شعیب، بڑے میاں اور نان کی علاوہ کوئی نہیں تھا کہ بات پھیلتی..... مگر بات پھر بھی پھیل گئی تھی اور پھر دوسری چہ گونئی..... یہ دوسری جان لیوا سی افواہ جو مجھے کئی بار توڑ کر رکھ چکی تھی۔ جس نے کئی راتوں مجھے جگا دیا تھا۔ جس نے مجھے پہلی بار جلن، حسد جیسے جذبے سے روشناس کرایا تھا۔ ہاں یہ ایک ذرا سی افواہ جو مجھ تک ساجدہ کے ذریعے ہی پہنچی تھی کہ وہ ہی ہر وقت شعیب کی ٹوہ میں لگی رہتی۔ سردی کی اس اندھیری خاموشی شام بھی ساجدہ اسی طرح اپنی چھت پر چڑھی شعیب کے گھر پر ٹیوشن پڑھنے آنے والے بچوں کو گن رہی تھی کہ ایک، ایک کر کے بچوں کو فارغ کر کے شعیب اسے گھر سے لکلا اور خراماں، خراماں سیدھا روٹی کے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا..... اور چند ہی لمحوں میں دروازہ کھولے جانے پر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بات جب ساجدہ میرے اور میری بہنوں کے ساتھ بیٹھی بتا رہی تھی تو مجھے یاد آیا کہ اس دن روٹی کے والد اپنی پٹن کے کسی کام کے سلسلے میں میرے ہی والد کے ساتھ نکلے ہوئے تھے اور ای کو ہدایات تھیں کہ روٹی کا خیال رکھیں..... میری بھٹی بہن نے اسے گھر پر بلایا بھی تھا مگر روٹی سر درد کا بہانہ کر کے گھر پر ہی لگی رہی تھی..... میں نہیں جانتا کہ اس دن ساجدہ کی اس بات اور پھر ہمارے گھر پر روٹی کے اکیلے ہونے پر جو بات چیت ہوئی تھی اس کی کڑی سے کڑی میری بہنوں نے جوڑ کر

سے بیگانہ بیٹھا رہا..... ایسے میں مجھے کئی بار ساجدہ پر غصہ بھی آیا تھا..... یقیناً ساجدہ جھوٹ بول رہی تھی، وہ اس کی ایک بھونڈی افواہ ہی تھی..... روپی ایسی ہرگز نہیں ہو سکتی مگر پھر مجھے ساجدہ پر بھی یقین تھا۔ بہر حال ساجدہ تھوڑی منہ مٹھ، بہت سی بدزبان اور ہر بات کھول، کھول کر بیان کر دینے والی تو ضرور تھی مگر وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی، نہ ہی کسی پر بلا وجہ الزام لگاتی..... اور اب اس بات کو کہاں کس کڑی سے ملاؤں کہ کل رات محض چند گھنٹے ساجدہ کے ساتھ گزار کر شعیب میاں کو ساجدہ اس قدر پسند آگئی تھی کہ اب وہ ان سے عشق فرمانے کی باقاعدہ اجازت طلب کر رہے تھے..... میں نے ہاتھ میں پکڑے خط پر نظر ڈالی..... شعیب نے صاف لفظوں میں ساجدہ کو لکھا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس کی اجازت سے اپنے گھر والوں کو اس کے گھر بھیجنے کی اجازت چاہتا ہے..... اجازت ملنے ہی وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دے گا۔

”واقعی یہ تو ایک نمبر کا لپٹا لٹکا.....“ میں نے تاسف سے سر ہلایا اور تیار ہو کر شعیب کے گھر کی طرف چل پڑا..... آج اس سے دو، دو ہاتھ ہو ہی جائیں..... ”یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ دماغ ٹھکانے لگانا ہی پڑیں گے اس کے۔“ میں یہی کچھ سوچتا... اس کے گھر تک پہنچتا ہی تھا کہ وہ بھی جیسے ہی میرا ہی منتظر تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

”تم کہیں جا رہے ہو کیا؟“ میں تھوڑا گھبرا کر اور بے دھیانی سے ہاتھ ملاتے پوچھ بیٹھا۔

”ہاں، جا تو رہا ہوں..... آئیے آپ بھی چلیے..... کوئی حرج نہیں اب تو آپ بھی اپنی ہی پارٹی کے بندے ہیں۔“ وہ مسکراتا ہوا مجھے اپنے ساتھ لیے آگے بڑھتا ہوا چکا۔

دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ میں چونک گیا..... ہم روپی کے گھر جا رہے تھے۔

ایک دل تو ہوا کہ اس کو نہیں بچ راستے میں ہی پیٹ ڈالوں..... کس بے حیائی سے ابھی ساجدہ کو

امی کو بھی بتایا کہ نہیں..... مگر میں جیسے پوری کہانی سمجھ چکا تھا..... روپی کے والد گھر پر نہیں تھے اور روپی اکیلے ہو کر بھی شعیب کو گھر کے اندر بلا لیتی ہے..... میں بات سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا..... کئی بار خود کو سمجھا چکا تھا کہ ساجدہ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی..... یا پھر یہ انکل کی غیر موجودگی والے دن کی بات نہیں ہوگی، کہیں ساجدہ کچھ ایسی بات بتانا بھول رہی ہے یا جان بوجھ کر چھپا رہی ہے کہ شعیب تو چلو پدنام ہو ہی رہا ہے مگر روپی.....؟ اس بیچاری کا کیا قصور.....؟

”روپی ایسی نہیں ہو سکتی۔“ میں خود کو دلاسا دیتا..... اور شاید اسی ایک گمان کی تصدیق کرنے کے لیے میں نے ساجدہ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس روز محلے کی ایک شادی تھی اور یقین تھا کہ روپی اور شعیب بھی بلائے گئے ہیں۔ میں نے ساجدہ سے..... بے تکلفی کے باعث پہلے ہی دن سے روپی کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا اور اس کی شعیب والی افواہ کے بعد میں نے اسے زبردستی آمادہ کیا تھا کہ وہ شادی میں شعیب کو مصروف رکھے گی۔ یہاں میں روپی کو ساتھ، ساتھ رکھوں گا..... ایسے میں اگر روپی اور شعیب میں کوئی بندھن ہوا تو یقیناً دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کے لیے بے چین ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ روپی، ساجدہ اور شعیب کو ساتھ دیکھ کر اپنی بے چینی ظاہر کر دے اور ایسا ہی کچھ شعیب بھی کر سکتا ہے..... میں اور ساجدہ کئی دنوں تک ایک دوسرے سے ہر پہلو پر بات کرتے رہے۔ نت نئے طریقوں سے شعیب اور روپی کے معاملے کو بے نقاب کرنے کی منصوبہ بندی کرتے رہے مگر ان دونوں نے تو حد ہی کر دی۔ کچھ اس طرح مجھے اور ساجدہ کو گھن چکر بنایا کہ اب بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ آیا میں اور ساجدہ ان دونوں کو سبق سکھانے کی مہم پر تھے یا شعیب اور روپی ہم دونوں کے ہوش ٹھکانے لگانے شادی میں آئے تھے۔ روپی مرے میں میری امی، بہنوں اور میرے ساتھ مصروف رہی اور آدھر شعیب، ساجدہ کی قربت پا کر دنیا جہان

کی طرح اپنی ہی دھن میں.....“ شعیب کچھ اور بھی کہتا کہ اب کی بار انکل بول پڑے۔

”روبی اس کو کہو کہ یہ ہم سے کوئی امید نہیں رکھے۔“
 ”اباجی پلیز..... اتنی معافی تو مانگ چکا ہے اور پھر میں بھی اس کی شرارت میں برابر کی شریک ہوں اور اس کو سچ ہی سمجھتی ہوں تو آپ صرف اس کو ہی کیوں سزا دے رہے ہیں؟“ عجیب مبہم باتیں ہو رہی تھیں۔
 انکل، روبی کی اس کی طرف داری پر بے چین ہو کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

”بیٹا تم ہی انصاف کرو..... اپنی بہن کے لیے ایک پڑھے لکھے شریف آدمی کے رشتے کو کوئی سمجھدار، بہن سے محبت کرنے والا بھائی یوں ذلیل کر کے لوٹا سکتا ہے؟ روبی تو چھوٹی ہے..... نا سمجھ ہے..... مگر یہ مسئلہ..... دیکھو کیسے دھڑلے سے معافی مانگ رہا ہے..... بہن کا مستقبل تاریک کرتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی اسے؟“

”اباجی کہاں کا شریف پڑھا لکھا؟ اس کو بیوی نہیں جہیز اور سامان سے بھرا گھر چاہیے تھا اور فرض کریں آپ اپنی جمع پونجی نکال کر سب کچھ کر بھی دیتے پھر بھی کیا گارنٹی تھی کہ وہ آپ کی بیٹی سے شادی کے بعد کوئی ڈیمانڈ نہ کرتا..... اباجی اب ایسے جذباتی فیصلے نہ پنتے نہیں ہیں..... انسان کی زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں..... میں روبی کو کبھی اس جہنم میں نہیں دھکیل سکتا تھا“ شعیب اب کی بار ٹھہرے ہوئے اٹل لہجے میں بات کر رہا تھا..... پھر وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”زندگی تو روبی نے ہی گزارنی ہے مگر روبی میری بہن ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والے انسان کو مکمل طور پر دیکھ بھال کے، پرکھ کے رشتہ قائم کروں..... بہر حال اتنا تو ہو کے خواہش مند، میری بہن کو شادی کر کے اپنے گھر لے کر جائے نہ کہ اسے بندجوری کی چابی مجھ کو خرخانہ ہی سینٹا رہے۔“

عشقیتہ خط لہر سال کر کے اب روبی کے گھر کو نکلا ہے اوپر سچے مجھے اپنی پارٹی کا کہہ رہا ہے..... ذلالت کی بھی حد ہوتی ہے..... میں ابھی کچھ سمجھتا کہ روبی کا گھر آگیا..... اور اس سے پہلے کہ میں پیچھا چھڑاتا گھر کا دروازہ کھل چکا تھا۔

”اُف میرے مالک..... کاش یہ ایک افہ ہی رہتی..... یہ حقیقت مجھ پر قیامت بن کر نہ اترتی.....“ میں حد سے زیادہ حساس ہونے لگا اور لٹا ہوا دل و دماغ لیے شعیب کے پیچھے، پیچھے اندر داخل ہو گیا..... گھر کا پورچ بس چھوٹا سا احاطہ ہی تھا جس کے ایک طرف چھوٹا سا باغ تھا اور اسی میں ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں بھی کھلتی تھیں اور ان ہی کھلی ہوئی ایک کھڑکی سے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ آج تو انکل بھی مزے سے ڈرائنگ روم میں براجمان تھے..... روبی تو دروازہ کھول کر چائے بنانے کا کہہ کر غائب ہو گئی جبکہ وہ..... بے تکلفی سے مجھے ڈرائنگ روم میں لے کر پہنچا..... انکل نے مجھ سے خوش دلی سے سلام دعا کر لی مگر اس سے منہ پھلائے پیشے رہے کہ وہ پھر چکا۔

”بھائی صاحب آپ ہی معافی دلوا دیں بڑے میاں سے..... یہ تو میری سنا ہی نہیں چاہتے.....“
 روبی کمرے میں چائے کے لوازمات ٹرے میں سجائے داخل ہو چکی تھی۔ اس نے لفظ ”بڑے میاں“ پر تنبیہ کرنے والے انداز میں گلا تھکھارا..... شعیب اب کی بار روبی سے گویا ہوا۔

”یار پولوٹاں اباجی کو تو کر معاف کر دیں..... کب تک وہاں اکیلے پڑا رہوں گا؟“ روبی ہمیں چائے اور دیگر چیزیں پیش کرتے دھیمے سے مسکرائی۔

”اکیلے پن کو دور کرنے کا علاج تو تم ڈھونڈ ہی چکے ہو اب ہم سے کیا غرض تمہیں.....“

”کیا ہو گیا ہے..... میں تو تمہارا کام آسان کر رہا ہوں اور پر سے تم مجھے ہی الزام دے رہی ہو۔“
 ”ویسے ابھی نہیں لگی کیا؟“ روبی ہلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”ہاہا، ہاہا اچھی تو ہے مگر بولتی بہت ہے..... ریل

شرمندگی سے ابھی نکلا نہیں تھا کہ یہ افتادہ..... ساجدہ کو حقیقت کا پتا چلے گا تو یہ تو میرا حشر ہی نکال دے گی..... بہر حال ہمت کی۔

”یار کس طرح بتاؤں تمہیں کہ وہ میرا دشمن..... میرا سالانہ.....“ میں نے منہ بسورتے ہوئے اسے بتایا۔

”ہاں ناں..... یہی تو مجھے بھی آج آگنی نے بتایا..... ایک ہم دونوں ہی انجان تھے یہاں تو پورا محلہ جانتا ہے کہ شعیب، روبی کا سگا بھائی ہے اور اس کے والد کی ناراضی کے باعث دوسرے مکان میں اکیلا رہتا ہے..... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے..... کس قدر فضول انسان ہو تم..... کچھ خبر نہیں تھی اور کیسی فضول حرکت کروائی ہے تم نے مجھ سے..... اللہ معافی دے۔“ ساجدہ کانوں کو انگلی لگاتے بولی..... اب کی بار میں نے اسے دلاسا دیا۔

”چلو کوئی بات نہیں..... شعیب تمہارے لیے واقعی سنجیدہ ہے..... اب تم دونوں مل کر ٹیوشن سینٹر چلایا کرنا..... کتنا مزہ آئے گا ناں.....“ میں نے ساجدہ کو بہلانے کی ناکام کوشش کی..... ساجدہ حسبِ عادت لڑا کا عورتوں کی طرح کربر ایک تھیلی رکھے دوسرا ہاتھ میرے منہ کے آگے نہلاتی چلی۔

”دماغ ٹھکانے نہیں لگتا مجھے تمہارا.....؟ جس؟ محبت نے مت مار دی ہے تمہاری..... ساجدہ اور کسی اور کے ساتھ اشتراکی کاروبار کرے.....؟ ابھی یہ دن نہیں آئے ساجدہ پر..... سمجھے تم..... تم نے تو بڑی چالاک سی اپنا دشمن میرے سر منڈھ دیا مگر بیٹا دیکھ لیتا میرا نام بھی ساجدہ ہے..... تمہاری طرح ڈرپوک نہیں ہوں، میں سولو فلائٹ کرتی ہوں..... ہاں نہیں تو..... ارے، ارے بات سننے بغیر ہی بھاگے جا رہے ہو..... ٹھیک ہے سب سمجھ رہی ہوں..... میں ہوں.....“

میں ساجدہ کی قہقہی جیسی زبان سے بارمان کر اس کو ویسے ہی بات کرتا چھوڑ کر اپنے کمر میں گھس گیا تھا۔

انگل کی حد ہو چکی تھی انہوں نے مجھ سے الوداعی ہاتھ ملایا اور روبی کو اپنے کمرے میں دودھ پہنچانے کا کہہ کر ہلکے قدموں سے ہم تینوں کو بیٹھا چھوڑ گئے..... شعیب نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”فکر نہیں کرو بھائی..... انشاء اللہ جلد غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا..... تم بس ان کے ساتھ ترکی بہ ترکی سوال جواب نہ کیا کرو.....“ انگل کے نکتے ہی روبی نے شعیب کو دلاسا دیا۔

”یار ابا جی تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح کرنے لگے ہیں..... اب بھلا بتاؤ، منگنی ہی ہوئی تھی ناں ٹوٹ گئی کوئی بات نہیں..... مگر ان کو صرف منگنی کے ٹوٹے جانے سے بدنامی کا ایسا ڈر کہ جھٹ یہاں شفٹ ہو گئے..... اور پھر اب یہاں بھی مجھے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں..... اب اس طرح میں کوئی تمہارے معاملے میں ناگت اڑانا چھوڑ دوں گا.....؟ میرا جو فرض ہے وہ تو پورا کروں گا ہی..... چاہے ان کو اچھا لگے یا نہ اچھا لگے تم بڑے میاں کو اچھی طرح سمجھا دینا۔“ شعیب نے اب کی بار مصنوعی غصے سے جواب دیا..... میں سب کچھ سمجھ کر اور سن کر ایک بار پھر سے حواس باختہ ہو رہا تھا..... سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس تمام صورت حال کو کس طرح ہضم کروں..... پھر ابھی تو محبت کا صرف ایک ہی سرا ہاتھ لگا تھا..... ابھی تو امی کو بھی منانا تھا، روبی کے والد اور یہ میرا سالانہ.....“ اُف..... ابھی تو سمجھو کہانی شروع ہی ہوئی ہے اور میں ابھی سے گھبرا گیا ہوں کہ مجھے ایک بار پھر اکیلے ہونے کی جستجو ہوئی اور میں بھی تھوڑی ہی دیر میں بھائی، بہن کو ایک دوسرے کے دلاسون میں..... چائے کا شکر یہ ادا کر کے گھر سے نکل پڑا۔

ابھی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تھا کہ بھگم بھاگ ساجدہ آتی نظر آئی۔

”یہ کیا..... کیا..... تم..... شعیب کے ساتھ روبی کے گھر میں چلے گئے تھے؟“ ساجدہ نے ہانپتے ہوئے پوچھا تو میں کڑ بڑا گیا..... میں اپنی غلط فہمی کی

بوجھ

شہناز وسیم



احساس اور جذبے کے صرف دیکھ رہا تھا۔ بیڈروم کی کھڑکی کے شیشے کے اس پار نظر آنے والی دھند کے آنسو شیشے پر لگا تار بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنی ناک شیشے پر ٹکا کر اسے محسوس کرنا چاہا مگر بخ بستہ شیشے کی چادر اسے برف کی سل کی طرح محسوس ہوئی۔ اُود، کوٹ پہن کر اس کے بٹن بند کر کے اس نے مقرر اپنے کانوں اور گردن کے گرد لپیٹا اور بیڈروم سے ٹیکسٹری کی طرف کھلنے والے دروازے سے باہر آ گیا۔

رات کے تین بج چکے تھے مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پاکستان سے آئی ہوئی وہ ٹیلی فون کال بھی کچھ ایسی تھی کہ اس کے بعد سے وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ سڑی اپنے عروج پر تھی، لندن شہر کو کبھ نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شاہراہوں پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹس دھندلائی محسوس ہو رہی تھیں۔ مرکزی لندن کے معروف علاقے میں بنے اپنے خوب صورت اپارٹمنٹ کے بیڈروم کی کھڑکی سے اس پار کا منظر وہ بغیر کسی



کھلتے چلے گئے۔ اس کی ماں کی مانگی ہوئی ہر دعا نے عرش پر جیسے اپنے رب سے قبولیت کا وعدہ لے لیا۔ وہ دعائیں جو اس نے رات کے اس پہر رو، رو کر اس کے لیے مانگی تھیں۔ جب سارا زمانہ میٹھی نیند سو رہا ہوتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی ترقی، کامیابی، صحت، زندگی اور خوشحالی کے لیے اپنے رب کے آگے گز گڑا رہی ہوتی تھی۔ اپنے آنسوؤں سے مانگی جانے والی دعاؤں کو نہلا رہی ہوتی تھی اپنے پروردگار کو منارہی ہوتی تھی۔ اس کو راضی کرنے کے لیے اس کے حضور سرخ رہی ہوتی تھی۔ ایک ضدی بھکارن کی طرح اس کے در پر پڑی رہتی تھی کہ لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ اور وہ سوچتا کہ کتنا خوش نصیب ہوں میں... اس کرہ ارض پر ایک وجود ایسا بھی ہے جس کا خلوص بے پایاں ہے۔ جس میں کھوٹ نہیں ہے جو سچ ہے... صرف سچ... وہ خاموشی سے دور کھڑ اپنی ماں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ اسے اپنی ماں پر فرخ تھا، وہ اپنی ماں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر دم اپنی ماں کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا... مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ حکومت کی جانب سے ملنے والی اسکارلشپ کی وجہ سے اسے لندن آنا پڑا۔ لندن اسکول آف اکنامکس میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک مخنتی نو جوان تھا۔ وہ بچپن سے سونے کا چمچ منہ میں لے کر بھی نہیں پیدا ہوا تھا نہ ہی وہ پشیمتی رئیس تھا کہ باپ، دادا کی چھوڑی ہوئی دولت پر اپنے مستقبل کی عمارت کھڑی کر لیتا۔ وہ تو سرکاری اسکول میں پڑھانے والی ایک معمولی اسکول ٹیچر کا بیٹا تھا۔ جو بیوہ تھی جس کی اس کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی میں ایک معمولی سا گھر ضرور بنالیا تھا جو سر چھانے کو کافی تھا باپ کی پشن کی معمولی رقم سے گزارہ مشکل تھا اس کی ماں کو ایک ہمدرد رشتے دار نے اپنے اثر رسوخ سے سرکاری اسکول میں ملازمت دلوا دی تھی۔ اس نے ٹیوشن پڑھا، پڑھا

سڑک پر تیز رفتاری سے کئی گاڑیاں آگے پیچھے زن سے گزر گئیں۔ خاموش اور پرسکون رات میں لمبے بھر کے لیے ایک ارتعاش سا پیدا ہوا وہ زیادہ دیر گیلیری میں کھڑا نہیں رہ سکا۔ کھر کی تندہی اس کی ناک کے حساس حصوں میں سرسراہٹ سی پیدا کرنے لگی اور اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ویسے تو وہ لندن کی اس خون جمادینے والی سردی کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ گزشتہ پندرہ سال سے یہاں مقیم تھا۔ تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے لیے یہاں کی فضا سازگار ہو چکی تھی۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے شاندار نمبروں سے گریجویشن کرنے کے بعد فنانشل ایکسپرٹ کی حیثیت سے وہ اپنی شناخت بنا چکا تھا۔ مختلف اخبارات کے لیے کالمز اور تجزیاتی رپورٹس تو وہ زمانہ طالب علمی سے ہی لکھتا چلا آ رہا تھا۔ جس کی پزیرائی بھی اس کے علم میں تھی۔ قارئین اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس کام کا اسے معقول معاوضہ بھی ملتا تھا۔ جہاں اسے ان اخبارات کی ضرورت تھی وہاں وہ بھی دھیرے، دھیرے اخبارات کی ضرورت بننا جا رہا تھا۔

پھر ایک دن اچانک خوش قسمتی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے بھی زیادہ سوچ بچار سے کام نہ لیا اور فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ خوش قسمتی ہر انسان کے دروازے پر ایک بار دستک ضرور دیتی ہے اگر وہ دروازہ کھول دے تو اندر چلی آتی ہے ورنہ کسی دوسرے در پر چلی جاتی ہے۔ امریکا کے مشہور اخبار وال اسٹریٹ جنرل نے ایک مرکزش چیک کے ساتھ اسے لندن میں اپنا نمائندہ بنانے کی آفر کر دی۔ جس کا وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ مگر یہ خواب نہیں ایک حقیقت تھی۔ وال اسٹریٹ جنرل کی انتظامیہ نے اس کی تجزیاتی رپورٹس اور کالمز کو سراہتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اخبار کی خواہش ہے کہ وہ اسے جوآن کر لے... اس نے کچھ شرائط کے ساتھ اپنی خدمات انہیں پیش کر دیں اور پھر جوں، جوں وقت گزرتا گیا لوگوں پر ہی نہیں خود اس پر بھی اپنے جوہر

میں تھی۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ کوئی کی نہیں تھی۔ وہ ہر سال باقاعدگی سے ماں سے ملنے جاتا اپنی ساری چھٹیاں وہ ماں کے ساتھ ہی گزارتا..... اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے دل پر ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا۔ یہ بوجھ وہ اپنے ساتھ لندن بھی لے کر آیا تھا۔ وہ اس بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا تھا، اسے وہ موقع ہی نہیں مل پارہا تھا کہ اس بوجھ کو اتار پھینکتا۔

مگر رات کو پاکستان سے آنے والی مخدوم خاور کی کال نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مخدوم خاور سے بات کرنے کے بعد سے اب تک وہ صرف اور صرف سوچ رہا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے کافی میکر میں کافی تیار کی، فریج سے بریڈ نکال کر اس پر پیپر سلاکس سلاڈ لکھ کر اور کچپ لگا کر کھانے لگا۔ اسے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ مخدوم خاور نے اسے فون پر کہا تھا کہ تمہارے وطن کو تمہاری اور تمہارے جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اپنے وطن کے لائق نوجوانوں کو وطن آواز دے رہا ہے۔ تم پہلی دستیاب فلائٹ سے پہنچنے کی کوشش کرو۔“

خضر نے زندگی میں بس ایک ہی دوست بنایا تھا۔ ”مخدوم خاور حیات.....“ اسے خاور سے دوستی پر ناز تھا۔ نفع و نقصان سے بے غرض تھی، خاور نے کبھی اپنے اور خضر کے درمیان طبقاتی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ خاور ایک نامی گرامی سیاسی خاندان کا فرد تھا۔ مگر وہ اتنا خلص تھا کہ خضر اس کے خلوص کے آگے ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ خاور سے کہتا۔ ”تم ایک ڈھارس بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہنا، تمہیں دیکھ کر میں اپنے اندر ازربتی اترتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔“

خاور مسکراتے ہوئے جواب دیتا۔

”اچھا، اچھا میرے پاس اتنے خوب صورت الفاظ نہیں اپنے جذبات تم تک پہنچانے کے لیے..... خیر چھوڑ دو میں تمہارے گھر اماں جی کے ہاتھ کی دال کھانے آیا تھا۔ بڑا ذائقہ ہے یار ان کے ہاتھوں میں۔“ خضر گھر کے اندر جاتا اسے یقین ہوتا کہ گھر میں دال ہی پکی ہوگی۔ گوشت کی عیاشی کہاں ہو سکتی تھی۔

کراچی تعلیم کا بوجھ خود اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنیاد پر وظائف بھی لیتا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے سلیقے سے کبھی کسی کو یہ نہیں محسوس ہونے دیا کہ اس گھر میں اکثر تنگدستی کا سیرا رہتا ہے۔ اس نے گھر کا بھرم بنائے رکھا۔ وہ کچھ وقت نکال کر راتوں کو کمرابند کر کے اجرت پر کپڑے سیتی، مردانہ کرتوں پر نفیس کڑھائی کرتی سردیوں میں سوئٹرن بنتی..... اسے بہترین کیک بنانا آتے تھے اور مختلف بیکری آئٹمز بھی..... لوگ اجرت پر اس سے اپنی پسند کا سامان بنا لیتے تھے۔ اس نے محنت کش عورت کی طرح اپنے بچوں کے منہ میں ہمیشہ لقمہ حلال ڈالا اور اس کو اتنا موقع بھی نہ ملتا کہ وہ اپنے آرام کے لیے بھی تھوڑا وقت نکالتی۔ اس کی ماں کو یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کی زندگی پر اس کا اپنا بھی کچھ حق ہے۔ وہ اپنے لیے کچھ سوچتی ہی نہیں تھی۔ بس بچے، بچوں کا مستقبل، بچوں کی صحت، بچوں کے لیے خواب جو اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی طرح چمکتے تھے۔ اس کی زندگی کے شب و روز بچوں سے شروع ہو کر بچوں پر ہی ختم ہو جاتے تھے۔ زندگی کی گاڑی کے دو پیسے مرد اور عورت کو کہا جاتا ہے مگر وہ تو ایک ہی پیسے سے زندگی کی گاڑی کو سمجھ رہی تھی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چلنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی اپنی گاڑی کو کھینچے چلی جا رہی تھی۔

خضر کو اس رات ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات یاد آ رہی تھی۔ اس کی ترقی اور اس کے یہاں تک پہنچانے میں اس کی محنت اپنی جگہ لیکن وہ سارا کریڈٹ اپنی ماں کو دیتا تھا۔ آج اس کے پاس سب کچھ تھا قابل رشک بینک بیلنس، کراچی کے پوش ایریا میں بنا ہوا ایک خوب صورت گھر، شاندار گاڑی، ماں کے لیے ہر آرام کو آسائش..... دونوں چھوٹی بہنیں صباحت اور مدحت اپنے، اپنے گھروں میں خوش، ایک بہن کینیڈا میں اور ایک بہن پاکستان میں تھی جو ماں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے گھر کے ایک پورشن میں ان کے ساتھ رہتی تھی، آج ہر چیز خضر کی پہنچ اور رسائی

میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھاتا۔“ خضر نے تڑپ کر ماں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

”ارے نہیں بیٹا..... میں نے رات کو گرم پانی سے ٹکڑ کر لیا تھا۔ اور دودھ میں ہلدی ڈال کر پی لی تھی۔ خواہ مخواہ ڈاکٹر کے پاس فضول پیسے ضائع ہو جاتے۔ دو دن کی تو بات ہے، میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو پھر پرسوں سے اسکول چلی جاؤں گی، تم ہیڈ مسٹر بس مسز حکیمین کو اطمینان دلادینا کہ میں پرسوں ضرور آ جاؤں گی۔ بس بیٹا جلدی سے چلے جاؤ اللہ کی رحمت تمہارے ساتھ رہے گا میرے بچے دیر نہ کرو۔“

جب وہ اسکول پہنچا تو اسمبلی شروع ہو چکی تھی۔ نائب قاصد نے اسے انتظار کرنے کو کہا مسز حکیمین اپنے آفس میں آئیں تو چپڑا اسی کے ذریعے اسے اندر بلا لیا، اس نے سلام کے بعد درخواست ان کے سامنے رکھ دی۔ درخواست پڑھتے ہی ان کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

”تمہاری ماں کو نوکری کرنی ہے یا نہیں.....؟ مذاق سمجھ رکھا ہے نوکری کو..... جب دل چاہا چھٹی کر لی جب دل چاہا گھر بیٹھ گئیں، درخواست بچ دی۔ بھلا بتاؤ معمولی سی چوٹ پر دو دن کی چھٹی مانگ لی۔ ارے میں کہتی ہوں ایک ہی مرتبہ تمہاری ماں کی ٹانگیں کیوں نہیں ٹوٹ جاتیں ہماری بھی جان چھوٹے ان سے..... ہر روز بھانے، ہر روز بھانے، میں پوچھتی ہوں اگر نوکری نہیں کرنی ہے تو گھر بیٹھے، ہمارا دماغ خراب نہ کرے۔“ ان کے منہ سے غصے میں کف اڑ رہا تھا۔ خضر نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”میڈم وہ تو بہت ریکور اسکول آتی ہیں، صرف دو دن کی ہی تو بات ہے آج ہی کچھ اتنی تکلیف.....“ مسز حکیمین نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور غصے میں چیخنے لگیں۔

”تمہاری ماں ایک مکار عورت ہے وہ کام کرنا ہی نہیں چاہتی اگر وہ اس وقت میرے سامنے ہوتی تو میں اسے بتاتی کہ میں کون ہوں، میرے اختیارات کیا

مخدوم خاور کے والد مخدوم دلاور حیات اپنے علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ کئی سال سے قومی اسمبلی کا ایکشن جیتتے چلے آ رہے تھے۔ خاور نے آنکھ کھولی تو گھر میں دولت کی ریل پیل اور نوکروں کی فوج ظفر موج ہی دیکھی مگر وہ فطرتاً ایک سادہ انسان تھا۔ خضر کے لیے تو وہ جان بھی دے سکتا تھا، اسے خضر کی ذہانت اور قابلیت پر ایسے ہی فخر ہوتا جیسے وہ اپنی ذہانت اور قابلیت پر فخر کر رہا ہو۔

اگرچہ عزیز از جان دوست کی آفر کو نظر انداز کرنا خضر کے لیے اتنا آسان ہرگز نہیں تھا اور یوں بھی وہ اپنی زندگی کے موجودہ سیٹ اپ سے مطمئن تھا، اسے اب سب کچھ میسر تھا مالی آسودگی تھی اور دینی بے فکر بھی مگر پندرہ سال سے اس کے دل پر پڑے اس بوجھ نے اٹھرائی کی اور جاگ اٹھا۔ اس کی پرسوج نگاہیں کسی خاص نکتے پر مرکوز تھیں۔ بھاپ اڑائی مگر ماگرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے ماضی کی کسی تکلیف وہ یاد سے نیر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی وہ لاشعوری طور پر دائیں ہاتھ کی مٹھی بائیں ہاتھ کی پھٹی پر مار رہا تھا، وہ دن اس کے نہ بھولنے والے دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسی تکلیف وہ یاد میں غرق تھا جس کا اس کے دل پر پڑے اس بوجھ سے گہرا اور نمٹ تعلق تھا، وہ کیسے بھلا سکتا تھا اس دن کو.....؟ وہ ایک بار پھر ماضی میں جا گھسا۔

☆☆☆

”خضر بیٹا.....“ اس کی ماں ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی اس کے بستر تک آئی اور کنارے پر بیٹھ کر بولی۔

”رات کو میرے پیروں میں چوٹ لگ گئی تھی۔ لائٹ نہیں تھی اندھیرے میں مجھے نظر نہیں آیا میز کا نوکیلا کو تا میرے گھٹنے میں لگ گیا اور نیل پڑ گیا ہے توڑا سا زخم بھی آیا ہے۔ سردی کی وجہ سے درد زیادہ ہو رہا ہے، چلا نہیں جا رہا۔ تم میری چھٹی کی درخواست اسکول دے آؤ۔“ وہ تکلیف سے بول نہیں پا رہی تھی۔

”امی آپ نے رات کو ہی مجھے کیوں نہیں بتایا“

پتھارے چچ..... چچ..... ان کی اوقات ہی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ کر سکیں۔ بھلا بتاؤ.....؟ ایک معمولی اسکول ٹیچر کا بیٹا..... اور باتیں سن لو..... ہم زندگی میں ایک بار پھر آنے سامنے ہوں گے۔ ہونہ.....“

یہی وہ بوجھ تھا جو وہ پندرہ سالوں سے اپنے دل پر لیے پھر رہا تھا۔

”سرسر جگمگنے نے اس طرح کیوں کیا؟ کیا امی کے ساتھ ان کے مراسم ٹھیک نہیں ہیں؟ صرف دو دن کی چٹھی مانگنے پر اتنا شدید غصہ؟“ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ”شاید امی کی غربت کی وجہ سے وہ انہیں کمتر سمجھتی ہوں گی۔ غریب آدمی کو تو ہر ایک اپنی جوتی تلے ہی رکھنا چاہتا ہے۔“ ”آف.....“ اگر وہ چاہتا بھی تو، ان باتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا، دل پر دھرایہ بوجھ اسے ہمیشہ سوئی کی طرح چھتا رہے گا۔ سوچ، سوچ کر اس کا دماغ تھک رہا تھا۔

وہ گھر آیا تو اس کی ماں باورچی خانے میں اس کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ آہٹ پا کر مڑی۔ اس نے دیکھا انہوں نے گھٹنے پر بیٹی باندھی ہوئی تھی۔ ”آگے بیٹا کچھ کہہ تو نہیں رہی تھیں میڈم؟“

ماں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”جی نہیں کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔“ اس نے لہجہ کو نارمل کر کے جواب دیا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ضبط کر کے پوچھا۔

”آپ کے ساتھ ان کے مراسم کیسے ہیں امی؟“

”ٹھیک ہیں بیٹا..... اور اصل ان پر کام کا بوجھ بہت ہے۔ اور بھی کئی لحاظ سے انڈر پریشر رہتی ہیں۔ اصل میں ایک پوری آرگنائزیشن کو پنڈل کرنا آسان نہیں، کبھی کبھی ٹیچر لوڑ کر جاتی ہیں، ویسے وہ بہت ہمدرد ہیں، خدا ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔“ وہ آلیٹ پلیٹ میں نکالتے ہوئے بولیں۔

”لو جلدی سے ناشتا کر لو آج تمہیں بھی دیر ہوگئی میری وجہ سے۔“

”نہیں امی.....! آج مجھے ضروری کام سے خاور

ہیں، دونوں ٹانگیں توڑ دیتی ہیں اس کی، نہ رہتا بٹاس نہ بچتی پانسری.....“ انہوں نے درخواست پھاڑ کر اسٹین میں ڈال دی اور گرج کر کہا۔

”جاؤ اور اسے فوراً بھیجو، میں اس کی درخواست منظور نہیں کر رہی ہوں اور ہاں یہ بھی سن لو..... اگر وہ نہیں آئی تو اس کی دودن کی تنخواہ کٹوا دوں گی یا پھر اسے میڈیکل سٹوفکٹ دینا ہوگا۔ مائنڈ اٹ کہ C.R پر بھی میرے ہی ریمارکس ہوتے ہیں۔“

خضر نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون سے وہ قطعی یہ امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس قدر جاہلانہ طرزِ مخاطب؟ اتنا اخلاق سے گرا ہوا رویہ؟ صرف دو دن کی چٹھی مانگنے پر ایسا رد عمل جبکہ چٹھی حاصل کرنا تو اس کی ماں کا قانونی حق تھا پھر..... سرگمگن کا ایسا شدید رد عمل اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اپنی عقلمی ماں کے بارے میں اتنے تکلیف دہ جملے..... ایک، ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہوتا چلا گیا۔ قوم کے معماروں کو زبورِ تعلیم سے آراستہ کرنے والے ادارے کی سربراہ سے اس رویے اور مخاطب کی وہ توقع بھی کیسے کر سکتا تھا۔

”تھینک یو میڈم پرنسپل..... انشاء اللہ ہم زندگی میں ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں گے مگر اس وقت ہم دونوں کی حیثیتیں مختلف اور جدا ہوں گی کوشش کروں گا کہ آج کا یہ قرض مع سود لوٹا سکوں..... میری والدہ دو دن اسکول نہیں آئیں گی تو مطلب کہ نہیں آئیں گی۔ میڈیکل سرٹیفکٹ کچھ دیر بعد آپ کی فائل پر ہوگا۔“ ایک زخمی ناگن کی طرح اس کی آنکھوں کے کیمروں نے میڈم جگمگن کی تصویر محفوظ کر لی، وہ باہر نکلا تو اس کا جوان خون جسم کی ہر ہر ورید سے سنسنا تا ہوا سرخ رہا تھا۔ نکلنے وقت اسے اپنے پیچھے سے سرگمگن کی آواز سنائی دی۔

”ارے جاؤ، جاؤ یہ گیدڑ بھکیاں کسی اور کو دینا۔“ متوسط فمیلیز کے بچوں کا یہی تو المیہ ہے کہ وہ دنیا کو الٹ دینے کے خواب دیکھتے ہیں مگر پتھارے کچھ کر نہیں سکتے،

کے ساتھ جانا ہے۔“ وہ بہت مشکل سے خود کو کمپوز کیے ہوئے تھا۔

مرزجکین کی چٹکھاڑتی ہوئی آواز ابھی تک اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ خانہ دل میں ایک شور سا برپا تھا۔ ”کتنی نیک ہے میری ماں..... ان پر بھی خدا کی رحمت سا یہ فلن دیکھنے کی تمنا رکھتی ہے۔“ خضر کو اس وقت ایک مخلص دوست کی ضرورت تھی سو کچھ دیر بعد ہی وہ غم آنکھوں سے خاور کے پاس بیٹھا اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔ خاور نے پوری توجہ سے خضر کی بات سننے کے بعد سر اٹھا دیا

”خضر میری جان، جس کا خاور جیسا دوست ہوا ہے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آؤ میرے ساتھ.....“ اور کچھ دیر بعد ڈاکٹر کی ایڈوائس کے ساتھ ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست مرزجکین کی ٹیبل پر موجود تھی۔ اسکول سے نکل کر وہ دونوں ایک کیفے میں جا بیٹھے۔

”خضر، اماں جی کی سروس کتنے سال کی ہو گئی ہے؟“ خاور نے اچانک پوچھا۔

”کیوں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ خضر نے چند منٹ کی خاموشی کے بعد اسے غور سے دیکھ کر کہا۔

”اماں جی اب نوکری نہیں کریں گی جس کے خضر اور خاور جیسے دو جوان، جوان بیٹے ہوں اسے نوکری کی کیا ضرورت.....؟ اس ایک ماہ کی چھٹی کے دوران میری پوری کوشش ہو گئی کہ اماں جی کی پری میچور ریٹائرمنٹ کی تمام کارروائی مکمل کرادوں آخر چاچا جی تعلیم کے وزیر ہیں، وہ ہمارا اتنا سا کام بھی نہیں کریں گے اور وہ بھی جائز کام اماں جی اب گھر بیٹھے پنشن وصول کریں گی۔ میں کوشش کروں گا کہ اماں جی کے واجبات بھی جلد مل جائیں۔“ خضر نے کچھ دیر کی بحث کے بعد بالآخر اپنی ماں کو راضی کر لیا۔ خاور نے اپنے رسوخ کے ذریعے ان کا کام جلد تکمیل تک پہنچا دیا۔

☆☆☆

خضر نے کافی کا خالی گلاسک میں رکھا اور پھر سے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اگرچہ ابھی رات تھی مگر سڑکوں پر

تھوڑی سی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ اخبار ڈالنے والے ہاکرز اور دودھ کی بوتلیں سپلائی کرنے والوں کی گاڑیوں کا شور فضاؤں میں گھلنے لگا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ فضا میں برف کے باریک ذرات مرغولے کھاتے نظر آ رہے تھے اور وہ ایک بار پھر ماضی میں جا گھسا۔

☆☆☆

”امی.....! چائے.....“ وہ گھٹنوں کے بل اپنی ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا اس کی ماں مسہری پر سونے دھاگے پھیلائے کچھ کام کر رہی تھیں۔

”ارے بیٹا..... تم سوئے نہیں ابھی تک؟“ وہ پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ارے نہیں امی، وہ کل مجھے اپنا اسائنمنٹ جمع کرانا ہے ناں تو اسی لیے جاگ رہا تھا۔ چائے کی طلب ہونے لگی باہر نکلا تو دیکھا آپ کے کمرے کی لائٹ جلی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا ہم دونوں مل کر چائے پیئیں تو ایک کپ آپ کے لیے بھی بنالایا آپ اور میں مصروف بھی تو اتنا ہو گئے ہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھنے اور چائے پینے کے لیے کتنا اچھا وقت اور موقع مل گیا ہے، ہے ناں امی.....؟“

”بیٹا.....! انہوں نے ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ ”بیٹا مجھے تو آج یہ معلوم ہوا کہ تم اتنی اچھی اور خوشبودار چائے بنا لیتے ہو، ابھی مزہ آ گیا اس وقت..... واہ۔“ وہ خوش ہو کر چائے پینے لگیں پھر بولیں۔ ”ویسے چائے کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ لب دوز ہو، لب سوز ہو اور لبریز ہو، یہ تینوں خوبیاں ہوں تو پھر چائے..... چائے ہے یعنی اپنی مٹھاس سے ہونٹ چپکانے والی اپنی حرارت سے ہونٹ جلانے والی اور کناروں سے چھلکنی ہوئی لب ریز یعنی بھری ہوئی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تو پھر بتائیں امی میری بنائی ہوئی چائے میں یہ تینوں خوبیاں ہیں ناں.....“ وہ امی کی ریشمی تارکشی سے بھری ہوئی باسکٹ میں جھانکنے لگا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

میں ان مردوں کی وجہ سے بڑی شرمندگی محسوس کرتا ہوں جو اپنا گھر بسانے کے لیے دوسروں کا سہارا لیتے ہیں یا ان پر بوجھ ڈالتے ہیں آپ صرف صباحت ہمیں دے دیں، آپ کے گھر میں صرف وہی سب سے قیمتی ہے۔“ وہ لیٹی ہوئی چھت کے کچلے کودیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے امی.....؟“ وہ رنگ برنگے تارکشی رنگی کپڑوں سے نکھلتے ہوئے اپنی ماں سے پوچھنے لگا۔

”بھئی میں نے کچھ سے یہی کہا کہ میں اپنے ولی عہد سے مشورہ کر لوں پھر تمہیں جواب دوں گی..... اب جیسے تم کہو بیٹا؟ اپنے باپ کے بعد اب تم ہی اس گھر کے مرد ہو اور بہنوں کے لیے باپ کی جگہ ہو۔ تمہارے دم سے تو میں نے زندگی کا یہ ٹکڑا سزا سانی سے طے کر لیا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ہمیشہ حفاظت فرمائے۔“ پھر اُسے ہوئے شوہر کو یاد کر کے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگیں۔

”ای پلیز! آپ..... آپ روئیں نہیں، آپ کو پتا ہے میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، امی میں ابا جان کی کمی تو پوری نہیں کر سکتا مگر میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کی آنکھوں میں سب سے ہر خواب کو تعبیر ضرور ملے گی۔ میں..... میں دوں گا یہ تعبیر بس..... آپ میرے لیے دعا کیا کریں اور پریشان نہ ہوا کریں۔“ اس نے اپنی ماں کے گھٹنوں پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ کچھ لمحے پونہی چپ چاپ گزر گئے..... بیٹا آہٹ کیے، سنبھلنے کے لیے اتنا وقت تو درکار تھا ہی دونوں کو خضر نے سراٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”ای آپ پہلے صباحت کا عندیہ لیں، وہ کیا کہتی ہے پھر ماموں میاں سے طے کریں کوئی بھی مناسب دن۔“

”ہاں بیٹا.....“ انہوں نے ایک دہلی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ ”صباحت سے میں پوچھ چکی ہوں، وہ میری بڑی مبر والی بچی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے، وہ کہتی ہے اماں اور بھائی جو بھی فیصلہ کریں گے اسے

”وہ امی آپ دن میں صباحت کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں کہ فرصت میں کرنے والی بات ہے، میں اس وقت فرصت سے ہوں بتائیں کیا بات ہے؟“

”وہ بیٹا..... دراصل تمہارے ماموں میاں صباحت کے لیے کہہ رہے تھے۔ بیچ ماشاء اللہ برسر روزگار ہو گیا ہے، وہ چاہتے ہیں اب جلد از جلد اس کا گھر بسا دیں۔ مجھے بھی بیچ بہت اچھا لگتا ہے بہت پیارا اور نیک لڑکا ہے وہ۔“ وہ بہت خوش ہو کر اپنے دل کی بات خضر سے کر رہی تھیں۔

”ای یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے..... مگر..... کیا ہم اتنی جلدی شادی ارنج کرنے کے قابل ہوں گے؟“ اس نے فکر مند سے پوچھا۔

”بیٹا.....! میں تو اپنا ہر معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کر دیتی ہوں، اسی سے مدد اور رہنمائی مانگ لیتی ہوں۔ اور میرے اللہ نے کبھی مجھے مایوس بھی نہیں کیا۔“ وہ ذرا سا کھسک کر خضر کے قریب ہو کر بولیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئیں۔

”کل بیچ میرے پاس آیا تھا، وہ بہت سادگی سے صرف نکاح اور رخصتی چاہتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صباحت کے لیے ضرورت کی ہر شے اور ہر خوشی فراہم کرنا اس کی ذمہ داری ہے، آپ نے یہی کیا کم ڈتے داری پوری کی ہے کہ صباحت کی بہترین تربیت کی ہے۔ اپنی اچھی لڑکی کی تو ہر شخص تمنا کر سکتا ہے کہ تو پھر میں کیوں نہیں، آپ تو میری پچھو ہیں آپ سے تو میں ضد بھی کر سکتا ہوں۔“ خضر کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی وہ کچھ دیر خاموش مسکراتا رہا۔

”مگر آپ..... نے کچھ تیاری تو ضرور کی ہوگی

ای..... اس نے جھک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

”ہاں بیٹا.....“ وہ نیچے پر سر رکھ کر لیتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹیوں کا جنم تو ان کی پیدائش کے ساتھ ہی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا میں اپنی بچیوں کے لیے پس انداز کرتی رہی، کچھ نہ کچھ بناتی رہی مگر کچھ بھی لینے کو تیار نہیں ہے، وہ کہہ رہا تھا کہ

قربانی دینے کو تیار ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس دنیا میں رہنے والوں کو آسمان پر ایک چاند اور نظر آئے اور وہ میرے بیٹے... خضر کا چہرہ ہو۔“ محبت اور شفقت سے لبریز جملے ان کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

”امی میری پیاری امی.....“ خضر نے ماں کے سینے میں منہ چھپالیا۔

”امی آپ کی دعائیں ہی مجھے جانے کس مقام پر لے جائیں گی۔ اپنی دعاؤں سے مجھے کبھی محروم نہیں کیجئے گا امی.....“ وہ ماں کی گردن میں دونوں بازوؤں کا گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔

”یہ کہنے کی ضرورت تھی بھلا؟“ وہ نم آنکھوں سے مسکرائیں۔

”بس بیٹا وہاں کے آزاد ماحول سے خود کو اس طرح بچائے رکھنا جیسے ہم پاک حالت میں خود کو گندی چھینٹوں سے بچاتے ہیں۔“

”ہوں..... اور آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت تھی بھلا؟ آپ کو یہ سب کیوں کہنا پڑا امی؟ آپ نے خود ہی تو ہمیں بتایا تھا کہ آپ نے اپنی اولاد کو ہمیشہ با وضو ہو کر دودھ پلایا اور ہمیشہ لقمہ حلال کھلایا۔ آپ کا وہ پاکیزہ دودھ زندگی بن کر آج بھی میری رگوں میں موجود ہے پھر آپ کو یہ اندیشے کیوں ہوئے امی..... اور دیکھیے میری طرف۔“ اس نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔

”آپ کی بلندی کو تو میں کبھی نہیں چھو سکوں گا“ میری جگہ ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہے گی کیونکہ جنت یہیں ہے۔“ خضر نے کہتے ہوئے سوچا۔

”میرے لیے بھی امی کے بغیر رہنا کتنا دشوار ہوگا۔ کاش امی جیسا حوصلہ میرے اندر بھی آجائے، مجھے یقین رکھنا چاہیے کہ صباحت اور ماموں میاں امی کا بہت خیال رکھیں گے مگر امی ان کی نہیں میری ذمہ داری ہیں، میرے معبود مجھے حوصلہ دے۔“

انسان کا ماضی اچھا ہو یا برا..... اسے یاد ضرور رہتا ہے، ماضی کے شب و روز تکلیف دہ ہوں یا طمانیت سے بھرے۔ بچپن کے کچھ اور کھلونوں کی

قبول ہوگا۔ فحج، قدرت کی طرف سے اس کے صبر کا انعام ہوگا..... اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا کوئی فرمائش نہیں کی، گھر کے حالات جانتی تھی ناں..... ہر حال میں راضی رہی۔ اب اس کی زندگی میں رنگ بکھرنے والے ہیں، اللہ سب کی بچیوں کو خوش رکھے اور ان کے صدقے میں میری بچیوں کو بھی۔“ انہوں نے سر پر دو پٹا درست کرتے ہوئے بیٹے کو اطمینان دلایا۔

صباحت کی رخصتی اور نکاح کی تقریب اس قدر مبارک ثابت ہوئی کہ چھوٹے ماموں نے مدحت کے لیے دست سوال دراز کر دیا ان کے بیٹے کو کینیڈا میں اچھی جاب مل گئی تھی، ماموں، مہمانی اسے اکیلے بھیجتے ہوئے ہنچکا رہے تھے۔ چھوٹے ماموں نے اماں اور خضر سے یہ اقرار لے کر چھوڑا کہ مدحت ان کی ہو چکی۔

”ارے بھی جہیز کی چنداں فکر نہ کرنا مدحت کا جہیز تو پہلے ہی ہمارے گھر میں موجود ہے، تم لوگ جو بھی دو گے وہ اضافی ہوگا۔ ویسے بھی مدحت کینیڈا چلی جائے گی۔ تم لوگ تو سیدھے سجاد ہمیں وہ مبارک دن بتا دو جب ہم مدحت کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جائیں۔“ مدحت کے کینیڈا جانے کے بعد امی پھول کی طرح ہلکی اور بے فکر ہو کر اپنے رب کے آگے سجدہ ریز ہو گئیں۔

”واقعی رب کریم تیرا حسن انتظام حیران کر دینے والا ہے تو بہترین منتظم اور منصوبہ ساز ہے تو نے اس دنیا اور تمام کائنات کو سنہال رکھا ہے آخر تو مجھے کیسے بھول جاتا؟“ ان کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

☆☆☆

لندن اسکول آف اکنامکس کے لیے اسکالرشپ ملنے کی خبر سننے کے بعد امی خوش ہونے کے ساتھ رنجیدہ بھی ہو گئیں۔

”بیٹے.....! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی کے بہت سارے دن تمہارے بغیر بھی گزاروں گی۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوگی مگر خیر زندگی آزمائشوں کے درمیان ہی تو گزری ہے، تمہارے عروج، ترقی اور کامیابی کے لیے میں ہر

دکھا دوں گی۔“ خضر نے بہن کو تاکید کی کہ ”سلطانہ آپا کو مستقل گھر پر بلاؤ، وہ ایک بیوہ اور بے اولاد درشتے دار تھیں ویسے بھی امی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔“

”سلطانہ آپا ہر وقت ان کے ساتھ رہیں گی تو ان کی اچھی دیکھ بھال بھی ہو جائے گی۔ اور سلطانہ آپا کو بھی تحفظ اور سہارا مل جائے گا۔ اور میں بھی یہاں مطمئن رہوں گا۔ اجرت پر دیکھ بھال کے لیے رکھی جانے والی نرس سے کہیں زیادہ سلطانہ آپا ان کا خیال رکھیں گی اور صباحت! تم سے تو مجھے کچھ نہیں کہنا تم تو امی کی کیئر کرتی ہی ہو..... تم پیسوں کی بالکل فکر نہیں کرنا۔“

”تم اپنی امی کے لیے فوراً واکر اور وھیل چیئر منگالو۔“ اپنی ماں کی تکلیف کا سوچ کر اسے ہیڈ مسٹریس مسز ٹکین کا خیال آیا اسے اپنے پاؤں میں سونیاں سی چھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

”امی میں آپ کے لیے ہی تو ہوں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں اب میں آپ کی دعاؤں سے اس قابل ہوں کہ بہترین طبی سہولیات کا آپ کے قدموں میں ڈھیر لگا دوں..... اماں جانی میری زندگی کے سارے رنگ آپ سے ہیں، بس آپ خود کوچ رکھیے، میں بہت جلد آپ کے پاس ہوں گا۔ بہت جلد..... بس آپ ابھی سے انتظار شروع کر دیں، آئی سوئیر امی میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنی ماں کی تصویر کو ڈبڈبانی آنکھوں سے دیکھنے لگا، بس چلتا تو وہ اپنی ماں کو اپنے ساتھ ہی رکھتا مگر اس کی نیچر آف جاب ایسی تھی کہ وہ کئی، کئی دن گھر سے باہر رہتا۔ پھر بھی وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے اپنی ماں کے پاس تھا۔

☆☆☆

ڈور بیل کی تیز آواز نے اسے ماضی کی بھول بھلیوں سے نکال کر ایک بار پھر لمحہ موجود میں لا کھڑا کیا۔ میڈ کام پر آچکی تھی اور آتے ہی بکھرے ہوئے گھر کو سینے لگی۔ آسمان پر بادلوں کے غول بدست ہاتھیوں کی طرح جھومتے پھر رہے تھے۔ برف باری کچھ دیر کے لیے رک کر پھر شروع ہو جاتی۔ لندن کے رہنے

طرح ہوتے ہیں کبھی، کبھی انسان ان سے کھیلتا ضرور ہے خضر نے خاور حیات کا فون کیار یہ سو کیا ماضی کی۔۔۔ لہٹا اچھی بری یادوں نے اسے دبوچ لیا۔ اگر خاور جیسا پر خلوص دوست اس کی زندگی میں نہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟ ”خاور حیات..... اوہ خاور کے فون کا کیا جواب دوں..... اس کا فون کسی بھی وقت آجائے گا مجھے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔“ وہ اپنی زندگی کے موجودہ سیٹ اپ سے بالکل مطمئن تھا۔ اگر کہیں کوئی چین تھی ہی تو دل پر پڑے ہوئے اس بوجھ کی بھی جسے وہ اٹھائے، اٹھائے تھک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی غیر مرمی نکتے پر مرکوز تھیں ”شاید..... شاید قدرت مجھے اس بوجھ کو اتارنے کا کوئی موقع دینا چاہتی ہو، مجھے سوچنا ہوگا۔ بلکہ مجھے ضرور سوچنا چاہیے، وہ گرم، گرم کافی کا ایک اور گ تیار کر کے پھر کھڑکی میں اکھڑا ہوا..... لندن میں ان دنوں رات چودہ گھنٹے کی اور دن دس گھنٹے کا ہونے لگا تھا..... اس نے آنکھوں میں ٹھکن اترتے ہوئے محسوس کی اور اعصاب چٹختے ہوئے پائے۔ اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اس نے ویلیکس ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سوچ، سوچ کر اس کے دماغ کی چولیس مل چکی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے کپٹیاں اور کندھے دہاتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے ماضی کے آئینے میں اتر گیا ایک اور تکلیف وہ یاد کا سامنا کرنے۔

☆☆☆

خضر کو لندن آئے ہوئے ابھی پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ اسے اطلاع ملی کہ امی کے پیروں کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے، وہ اب چل پھر بھی نہیں سکتیں۔ پیروں پر بہت درم آگیا ہے۔ صباحت نے فون پر بتایا۔

”امی میں بہت صبر ہے بھائی، وہ اب بھی یہی کہتی ہیں جس نے تکلیف دی ہے وہی حوصلہ بھی دے گا۔ اور شفا بھی شکر الحمد للہ میرے پاؤں تو ہیں وہ جب غدا سے گا تو اپنی پیروں پر چل کر تم سب کو

والوں کو کبھی، کبھی طویل عرصے تک سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ کبھی، کبھی بارش غیر متوقع طور پر ایسے برس جاتی جیسے بغیر کسی وجہ کے یا معمولی سی بات پر مشرقی لڑکیوں کی آنکھیں برس جاتی ہیں۔ بارش سے سڑکیں کیلی ہو جاتیں اور سردی بڑھ جاتی۔ منہ سے دوران گفتگو نکلنے والی بھاپ کچھ دیر فضا میں نظر آنے کے بعد فضا میں تحلیل ہو جاتی۔

خضر کے اندر ایک بے چینی سنناتی پھر رہی تھی۔ اسے لگا اس کی طبیعت اچاٹ ہو رہی ہے۔ خاور حیات کے فون نے اس کی ذہنی فضا کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ جس طرح سوچ رہا تھا خاور کا فون آنے سے پہلے وہ اس طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ دل پر دھرے بوجھ کی گھڑی ہر گزرتے دن کے ساتھ بھاری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ ایک مطمئن زندگی گزارنے کے باوجود غیر مطمئن کیوں ہو جاتا تھا۔ وہ منتہم مزاج ہرگز نہیں تھا مگر ایک قرض تھا جسے وہ ہر صورت اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ ساڑھے چھ ارب انسانوں کے ہجوم میں سے ایک چہرہ ”مسز تمکین“ اس کی آنکھوں کے کیمروں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ ”مسز تمکین کا چہرہ.....“ وہ جھٹکے سے اٹھا اور ریسور اٹھالیا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے واپس جانا ہے اور کچھ ہی دیر بعد وہ وال اسٹریٹ جنرل کی ایڈن کو بتا رہا تھا کہ اسے پاکستان طلب کر لیا ہے۔ اسے کوئی اہم ذمے داری سونپی جا رہی ہے اسے جانا ہوگا۔ وال اسٹریٹ جنرل کی انتظامیہ نے اسے یہ بتا کر حیرت میں ڈال دیا کہ اگر وہ چاہے تو اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ جب بھی واپس آنا چاہے اخبار اسے ویکم کہے گا۔ بیٹ آف لک.....

وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے امی کے سامنے موجود تھا۔ اپنی ماں کو اس نے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی، وہ اپنی اچانک آمد کی خوشی سے اپنی ماں کو محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں پیڑوں کے لمبے سائے لان میں بچھے ہوئے تھے۔ پچھلی دن بھر کی تھکان کا احوال سنا رہے تھے۔ امی وکیل چیر

پر بیٹھی سلطانہ آپا کے ساتھ شام کی چائے پی رہی تھیں۔ وہ دوڑتا ہوا ماں کے قدموں میں جھک گیا انہوں نے ہتھیلیوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر اپنا سر اس کے گھنے بالوں والے سر پر رکھ دیا..... کچھ دیر تک ایسا لگا جیسے وہاں کوئی ذی روح ہے ہی نہیں..... خاموشی کی بھی بڑی دلکش زبان ہوتی ہے وہ دونوں بغیر کچھ بولے ایک دوسرے کو سن رہے تھے بغیر لفظوں میں اظہار کیے دونوں نے جان لیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کتنا بے چین رہے ہیں۔

”امی آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“ خضر نے مدھم آواز میں خود پر کنٹرول پا کر پوچھا۔ ”میں اگر ٹھیک نہیں تھی تو اب ضرور ٹھیک ہو جاؤں گی، تم جو آگئے ہو۔“ وہ مسلسل اس کے بالوں اور پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ وہ اس کو نظر بھر کر دیکھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھیں۔ وہ کتنا گرلین فل لگ رہا تھا۔ اس کی صحت قابل رشک ہو گئی تھی اس کے گندمی رنگ میں گلال شامل ہو چکا تھا۔ ذہانت اس کی آنکھوں میں لودے رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ دیکھنے لگیں خوب صورت سڈول انگلیاں عمدگی سے تراشے ہوئے ناخن، صحت مند ہتھیلیاں انہیں خوشی ہونے لگی کہ یہ ان کے بیٹے کے ہاتھ ہیں۔

”بیٹا تم میں سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ اچانک کیسے آگئے؟ میں تو بس خوش ہوں کہ تم آگئے۔ تم نے وہاں رہ کر بھی میرا ایسے ہی خیال رکھا جیسے یہاں رہ کر رکھتے، تمہیں دونوں جہان میں سر بلندی نصیب ہو۔ سلطانہ خضر کے لیے چائے اور اسٹیکس منگواؤ۔ شریف سے کہنا اخروٹ کا حلو ابھی لے کر آئے ساتھ میں..... بیٹا رات میں کیا کھاؤ گے جو کہو گے وہی پک جائے گا۔“ اگر وہ وکیل چیز پر نہ ہوتیں تو خضر کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتیں۔ وہ مسکرا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے ہی دن وہ خاور حیات کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ خاور سمیت اس کے والد

محبت

محبت مر نہیں سکتی
محبت سانس لیتی ہے
لہو میں سرسراتی ہے
محبت بین کرتی ہے
کسی کی یاد لگتی ہے
محبت چپ نہیں رہتی
محبت گنگناتی ہے
محبت کی زمینوں پر
جدا ہوں راستے گر بھی
محبت جیت جاتی ہے

شاعرہ: صائمہ سجاد بگٹش، کوہاٹ

تیرنا سیکھیں گی، اپنے راستے خود بنائیں گی، اپنا رزق خود ڈھونڈیں گی۔ افسوس ہوتا ہے کہ یہاں نا انصافی ہر شعبے میں راج کر رہی ہے۔ سفارش کی وجہ سے نا اہل لوگ آگے آئے ہیں اور میرٹ پیچھے رہ گیا ہے اور یہیں سے عمدہ کارکردگی کے فقدان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کتنے مجھ جیسے غریب گھر کے بچے ایسے ہوتے ہوں گے جو سروائیو کر جاتے ہوں گے یا جنہیں بروقت آکسیجن مل جانی ہوگی اور وہ اپنی منزل پالیتے ہوئے۔ شاید پچیس فیصد..... بلکہ پندرہ فیصد..... یا اس سے بھی کم..... یار خاور دس پندرہ ہزار خواہ پانے والا شخص اپنے بچوں کو پڑھائے پولیٹی بلز بھرے، علاج کرائے یا پیٹ بھرے۔ ظلم ہے یار.....“ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اور مسلسل بول رہا تھا۔

اور خاور حیات کراچی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اس شعبہ بیان مقرر کو دیکھ رہا تھا جس کا نام خضر تھا اور جو اصل میں خضر بننا چاہتا تھا۔ جس کی تقریریں

اور خاندان کے چھ افراد نے قومی اسمبلی کی نشستیں حاصل کی تھیں۔ صوبائی اسمبلی میں بھی ان کی پارٹی اور خاندان کے لوگوں نے کافی نشستیں حاصل کی تھیں..... لوگوں کا رش دیکھ کر خاور اسے اپنے پیڈروم میں لے آیا وہ دونوں بے تکلفی سے کارپٹ پر مشن لگا کر نیم دراز ہو گئے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد دونوں سنجیدہ اور اصل موضوع پر آ گئے۔

”پھر تم نے کیا سوچ خضر.....؟“ خاور نے خضر کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”دیکھو خاور، میں نہ جاہ و حشم کا متنی ہوں نہ عہدوں کا متلاشی، مالی آسودگی بھی مجھے میسر ہے اٹائے بنانے کا شوقین نہیں ہوں، شہرت بن مانگے ہی مجھے بہت مل چکی ہے۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے گریجویشن کرنے کے ساتھ مشہور اور مستند اخبار میں کام کرنے کا تجربہ بھی ساتھ لایا ہوں، فنانشل ایکسپرٹ کے طور پر بڑے پیمبر میں طویل عرصے سے لکھتا چلا آ رہا ہوں، مختلف موضوعات پر میری تجزیاتی اور تحقیقاتی رپورٹس بھی کتابی شکل میں پبلش ہو چکی ہیں۔ پاکستان کا اس وقت اصل مسئلہ غربت، جہالت اور بنیادی سہولتوں کا نہ ہوتا ہے۔ ہر پاکستانی پر امید لگا ہوں سے دوسرے کو دیکھتا ہے کہ شاید میرے دکھ کا مداوا اس کے پاس ہو۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ پاکستان جو ایک زرعی ملک ہے یہاں کبھی آٹے کا بحران ہوتا ہے تو کبھی چینی غائب ہو جاتی ہے۔ مہنگائی اور غربت کے لیے ہوئے لوگ اپنی زندگیاں ختم کر رہے ہیں، اپنے جگر گوشے فروخت کر رہے ہیں، بیماروں کے پاس علاج کے پیسے نہیں ہیں۔ دولت کے حصول کے لیے شارٹ کٹ اختیار کیے جا رہے ہیں۔ جعل سازی، اغوا، ڈکیتی، تادان اور نہ جانے کیا کیا۔ لوگ اپنی سات نسلوں کے لیے دولت کیوں جمع کرتے ہیں یار.....؟ آئندہ نسلیں جب دنیا میں آئیں گی تو وہ کیا کریں گی؟ وہ کچھ نہیں کریں گی؟ ہمیں اپنے بچوں کو صرف اچھی تربیت اور تعلیم دے کر وقت کے دریا میں چھوڑ دینا چاہیے وہ خود

خون کو گرمادیتی تھیں۔ پُر جوش انداز بیان پُر اثر دلیلیں اور الفاظ اس کے منہ سے لاوے کی طرح بہہ نکلتے تھے جس کے بارے میں لوگ یقین سے کہتے تھے کہ یہ چھا جائے گا۔ خاور کو خضر پر غر تھا۔ آج سے نہیں ہمیشہ سے..... خضر نے آج اس کے فیوڈل ازم کو بھی لتاڑا تھا مگر اسے برا نہیں لگا کیونکہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

”معدرت چاہتا ہوں یار.....! میں جذبات میں آکر تہارے طبعے کو بھی برا بھلا کہتا رہا اور تم نے مجھے روکا بھی نہیں۔“ خضر نے خاور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کیوں روکتا تمہیں؟ روکنے والا ہی تو چاہیے اب۔“ خاور نے بوتل سے پانی نکال کر دو گھونٹ بھرے اور پوچھنے لگا۔

”بابا سائیں پوچھتے ہیں تم کس منشری کے ایڈوائزر بننے میں انٹرنل ہو..... تمہارا اسٹیشن منشر کے برابر ہوگا۔ پہلے چاچا سائیں ایجوکیشن کے منشر تھے، اب بابا سائیں کو بتا رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟“ خضر نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر پاؤں سامنے صوفے پر پھیلا دیے۔

”خاور میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں مجھے عہدوں کی تمنا نہیں ہے، میں بابا سائیں کے ساتھ بلا معاوضہ کام کروں گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تم نے فون پر کہا تھا وطن کو تمہاری ضرورت ہے اسی لیے آگیا ہوں۔ میں بگڑے ہوئے اس پورے سسٹم کو بدلنے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ میری ہی طرح اور بہت سے لوگوں کو بھی سوچنا ہوگا تب ہی بات بنے گی۔ بھوک کا احساس کرنے کے لیے بھوکا رہنا مسٹ ہے۔ مجھے خود کو مو بائل رکھنے کے لیے بس ایک گاڑی مع ڈرائیور چاہیے۔ پٹرول کا خرچہ میں خود اٹھاؤں گا اور خضر مگر ضروری اسٹاف چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناسکوں..... میرے پاس کچھ اچھے آئیڈیاز اور تجاویز ہیں جن پر عمل درآمد شروع میں مشکل ضرور ہوگا مگر جلد ہی یہ پزیرائی حاصل کر کے پھل

بھول دیئے لگیں گی۔ میں جانتا ہوں اس ملک کا ایک بڑا طبقہ اس کی شدید مخالفت کرے گا مگر اس ملک کا ایک اور بہت بڑا طبقہ خوش دلی سے اس کا استقبال بھی کرے گا۔ مجھے اس کا غم نہیں ہوگا کہ میں کامیاب ہو یا نہیں؟ میرے لیے یہ اطمینان بھی کافی ہوگا کہ میں نے کوششیں تو کی..... کیونکہ وعدے تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر کوشش کوئی نہیں کرتا..... اور دیکھو یا روعدے اکثر پورے نہیں ہوتے مگر کوششیں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ناکامی کی صورت میں، میں واپس چلا جاؤں گا۔ اس سوچ کے ساتھ کہ میرا نام آگ لگانے والوں میں نہیں بلکہ آگ بجھانے والوں میں لکھا جائے گا۔ وال اسٹریٹ جنرل کے دواڑے میرے لیے کھلے ہوں گے۔ میرا مستقبل تو محفوظ ہی ہے مگر مجھے اپنے..... نہیں پاکستان کے مستقبل کی فکر ہے۔“

”چلو اٹھو پہلے کھانا کھاتے ہیں۔“ خاور حیات نے خضر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کھانے کے بعد وہ واپس بیڈ روم میں آگئے۔ ملکی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں بہت سے ہلکے ہلکے موضوعات پر باتیں کرتے اور تہمتیں لگاتے رہے۔ دونوں کافی عرصے کے بعد ملے تھے۔ خضر، خاور کے لیے کچھ تحائف بھی لایا تھا۔ کچھ دہ بعد خضر نے اچانک سنجیدہ ہو کر خاور سے پوچھا۔

”خاور تمہیں میڈم تمکین یاد ہیں؟“ خاور نے الٹا سوال پوچھ لیا۔ ”خاور تم انہیں بھول سکتے ہو مگر میں نہیں..... وہ میرے ماضی کی ایک بد صورت یاد ہیں۔ ان کا ایک قرض لوٹنا ہے مجھے، انہیں تلاش کرو یا..... میں پندرہ سال سے ان کے کچھ واجبات اپنے دل پر ایک بوجھ کی طرح لیے پھر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تھک کر ٹھہر جاؤں میں اس بار یہ قرض اتار دینا چاہتا ہوں۔ امی کی دونوں ٹانگیں دیکھ کر وہ مجھے شدت سے یاد آتی ہیں۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا خاور.....“ خضر کی آواز اور لہجے میں درد اور اذیت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اچھے..... چھادو وہ میڈم تمکین..... انہیں کیوں

ایک دن اسے پکڑی لیا۔

”چھوڑیں امی.....! میں شادی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔“ اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں پڑنا چاہتے اور میرا بہو لانے کا ارمان کیسے پورا ہوگا۔ بھئی میں تو اس دفعہ تمہاری شادی کر کے ہی بھیجوں گی۔ بس کہہ دیا ہے میں نے۔ ماشا اللہ رزگار ہے، ذتے دار یوں سے فارغ ہو چکے ہو، مالی طور پر آسودہ ہوا اللہ کا کرم ہے پھر کیوں منع کر رہے ہو۔“ وہ پوچھنے لگیں۔

”امی اگر آپ کی بہو آپ کا خیال نہ رکھ پائی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ آپ مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔“ وہ پھر بدکا۔

”لو اگر ہر بیٹا ایسے ہی سوچنے لگے تو پھر بیٹوں کی شادیاں کیسے ہوں گی؟ نہ بھی تمہاری بات میں بالکل بھی وزن نہیں ہے اور میرا خیال رکھنے کے لیے تم جو ہو۔ میں تو اب معذور ہو گئی ہوں تمہارا خیال رکھنے والا بھی تو کوئی ہوا اگر کہیں تمہارا خیال ہے تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ جھک کر راز داری سے پوچھنے لگیں۔

”نہیں امی..... دراصل میں نے کبھی اس طرف سوچا نہیں کبھی کسی خاتون کو دیکھ کر ایسا خیال ہی نہیں آیا۔“ وہ جھینپ رہا تھا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے، تم مجھے اجازت میں تمہارے لیے دہن تلاش کروائی ہوں۔ میں آج ہی صبح کو کہتی ہوں اسے بھی تو بھائی کی شادی کا ارمان ہوگا ناں.....“ انہوں نے طمانیت بھری سانس لی۔

”ٹھیک ہے امی تو پھر آپ ہی لوگ دیکھیے اس معاملے کو..... مجھے کون سا شادیوں کا تجربہ ہے۔“ وہ ماں کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا جہاں جھجکیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

چندرہ سال پہلے جب وہ اسکا لرشپ ملنے پر لندن آیا تھا تو چھریں بے بدن کا ایک نوجوان تھا۔ بالوں کی متوالی اور شریر لہجے اس کے ماتھے پر جھلوتی رہتی

بھولوں گا میں؟“ خاور نے یاد آنے پر کہا۔ ”انہوں نے اماں جی کے ساتھ بڑا مس بی ہو کیا تھا۔ میں بھی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا یار.....“

”خاور میں منتقم مزاج ہرگز نہیں ہوں اور نہ ہی امی نے میری تربیت اس طرح کی، کی ہے۔ میں عورت کا بہت احترام کرتا ہوں دل سے۔ اس دن میڈم حکمین کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں وہیں حساب..... باقی کر دیتا کم از کم اس کے منہ پر کس کر ایک تھپڑ تو مار ہی دیتا مگر خاور ضروری تو نہیں کہ تھپڑ ہاتھ سے ہی مارا جائے، میری امی کے جن ٹانگوں کو توڑ دینے کی انہوں نے دھمکی دی تھی میں انہی بیروں پر انہیں جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں بس اسی دن میری بے چینی اور بے کلی ختم ہو جائے گی۔ میرے دل سے بوجھ سرک جائے گا۔ ان کا پتا کراؤ یا رہو اب کہاں ہیں، میرے خیال میں تو وہ اب تک ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی۔“

”ارے انہیں تلاش کرنا کون سا مشکل کام ہے اگر وہ ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی تو پنشن لینے تو آتی ہی ہوں گی انہیں ڈھونڈ نکالیں گے یار..... تم فکر ہی نہیں کرو۔“ خاور نے خضر کو تسلی دی۔ پھر خاور نے ایک ہفتے کے بعد ہی مکمل معلومات کے ساتھ خضر کو فون کیا۔

”میڈم حکمین واقعی ریٹائر ہو چکی ہیں اور اب اپنا ایک اسکول چلا رہی ہیں اور اتنی ہی بد زبان اور اکھڑ ہیں۔“ خاور نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا بعد میں خاور نے میڈم حکمین کے معاملے میں دلچسپی لے کر خضر کو بتایا کہ ”میڈم حکمین کے اسکول میں ایک فنکشن ہونے والا ہے۔ آج کل چیف گیسٹ کے لیے ناموں پر غور کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک ذریعے سے تمہارے بارے میں کہلویا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں تم hot cake بنے ہوئے ہو اگر کوئی تم سے رابطہ کر لے تو دیکھ لیتا۔ یہ موقع پھر ملے نہ ملے اوکے..... میسٹ آف لک.....“ فون رکھنے کے بعد خضر کافی دیر تک کسی سوچ میں گم رہا۔

☆☆☆☆

”اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“ امی نے

خون کو گرما دیتی تھیں۔ پرجوش انداز بیان پُر اثر دلیلیں اور الفاظ اس کے منہ سے لاوے کی طرح بہہ نکلتے تھے جس کے بارے میں لوگ یقین سے کہتے تھے کہ یہ چھا جائے گا۔ خاور کو خضر پر فخر تھا۔ آج سے نہیں ہمیشہ سے..... خضر نے آج اس کے فیوڈل ازم کو بھی لٹاڑا تھا مگر اسے برائیاں لگا کیونکہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

”معذرت چاہتا ہوں یار.....! میں جذبات میں آکر تمہارے طبقے کو بھی برا بھلا کہتا رہا اور تم نے مجھے روکا بھی نہیں۔“ خضر نے خاور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کیوں روکتا تمہیں؟ روکنے والا ہی تو چاہیے اب۔“ خاور نے بوتل سے پانی نکال کر دو گھونٹ بھرے اور پوچھنے لگا۔

”بابا سائیں پوچھتے ہیں تم کس مشنری کے ایڈوائزر بننے میں انٹرسٹڈ ہو..... تمہارا اسٹیشن مشنری کے برابر ہوگا۔ پہلے چاچا سائیں ایجوکیشن کے مشنری تھے، اب بابا سائیں کو بنارہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟“ خضر نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر پاؤں سامنے صوفے پر پھیلا دیے۔

”خاور میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں مجھے عہدوں کی تمنا نہیں ہے، میں بابا سائیں کے ساتھ بلا معاوضہ کام کروں گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تم نے فون پر کہا تھا وطن کو تمہاری ضرورت ہے اسی لیے آگیا ہوں۔ میں بگڑے ہوئے اس پورے سسٹم کو بدلنے کی تو طاقت نہیں رکھتا۔ میری ہی طرح اور بہت سے لوگوں کو بھی سوچنا ہوگا تب ہی بات بنے گی۔ بھوک کا احساس کرنے کے لیے بھوکا رہنا مسٹ ہے۔ مجھے خود کو موبائل رکھنے کے لیے بس ایک گاڑی مع ڈرائیور چاہیے۔ پٹرول کا خرچہ میں خود اٹھاؤں گا اور مختصر مگر ضروری اسٹاف چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناسکوں..... میرے پاس کچھ اچھے آئیڈیاز اور تجاویز ہیں جن پر عمل درآمد شروع میں مشکل ضرور ہوگا مگر جلد ہی یہ پزیرائی حاصل کر کے پھل

پھول دینے لگیں گی۔ میں جانتا ہوں اس ملک کا ایک بڑا طبقہ اس کی شدید مخالفت کرے گا مگر اس ملک کا ایک اور بہت بڑا طبقہ خوش دلی سے اس کا استقبال بھی کرے گا۔ مجھے اس کا غم نہیں ہوگا کہ میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ میرے لیے یہ اطمینان بھی کافی ہوگا کہ میں نے کوششیں تو کی..... کیونکہ وعدے تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر کوشش کوئی نہیں کرتا..... اور دیکھو یا وعدے اکثر پورے نہیں ہوتے مگر کوششیں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ناکامی کی صورت میں، میں واپس چلا جاؤں گا۔ اس سوچ کے ساتھ کہ میرا نام آگ لگانے والوں میں نہیں بلکہ آگ بجھانے والوں میں لکھا جائے گا۔ وال اسٹریٹ جرنل کے دوازے میرے لیے کھلے ہوں گے۔ میرا مستقبل تو محفوظ ہی ہے مگر مجھے اپنے..... نہیں پاکستان کے مستقبل کی فکر ہے۔“

”چلو اٹھو پہلے کھانا کھاتے ہیں۔“ خاور حیات نے خضر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کھانے کے بعد وہ واپس بیڈ روم میں آگئے۔ ملکی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں بہت سے ہلکے ہلکے موضوعات پر باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ دونوں کافی عرصے کے بعد ملے تھے۔ خضر، خاور کے لیے کچھ تحائف بھی لایا تھا۔ کچھ دیر بعد خضر نے اچانک سنجیدہ ہو کر خاور سے پوچھا۔

”خاور تمہیں میڈیم منجمن یاد ہیں؟“

”کون میڈیم منجمن؟“ خاور نے الٹا سوال پوچھ لیا۔

”خاور تم انہیں بھول سکتے ہو مگر میں نہیں..... وہ میرے ماضی کی ایک بد صورت یاد ہیں۔ ان کا ایک قرض لوٹنا ہے مجھے، انہیں تلاش کرو یا..... میں پندرہ سال سے ان کے کچھ واجبات اپنے دل پر ایک بوجھ کی طرح لیے پھر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں تھک کر بٹھ حال ہو جاؤں میں اس بار یہ قرض اتار دینا چاہتا ہوں۔ امی کی دونوں ٹانگیں دیکھ کر وہ مجھے شدت سے یاد آتی ہیں۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا خاور.....“ خضر کی آواز اور لہجے میں درد اور اذیت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”اچھے..... چھوہ وہ میڈیم منجمن..... انہیں کیوں

ایک دن اسے پکڑ لی۔

”چھوڑیں امی.....! میں شادی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔“ اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں پڑنا چاہتے اور میرا بہو لانے کا ارمان کیسے پورا ہوگا۔“ بھئی میں تو اس دفعہ تمہاری شادی کر کے ہی بھیجوں گی۔ بس کہہ دیا ہے میں نے۔ ماشاء اللہ رزگار ہے، ذتے داریوں سے فارغ ہو چکے ہو، مالی طور پر آسودہ ہوا اللہ کا کرم ہے پھر کیوں منع کر رہے ہو۔“ وہ پوچھنے لگیں۔

”امی اگر آپ کی بہو آپ کا خیال نہ رکھ پائی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ آپ مجھے ایسے ہی رہنے دیں۔“ وہ پھر بدکا۔

”کو اگر ہر بنا ایسے ہی سوچنے لگے تو پھر بیٹوں کی شادیاں کیسے ہوں گی؟ نہ بھی تمہاری بات میں بالکل بھی وزن نہیں ہے اور میرا خیال رکھنے کے لیے تم جو ہو۔ میں تو اب معذور ہو گئی ہوں تمہارا خیال رکھنے والا بھی تو کوئی ہوا مگر کہیں تمہارا خیال ہے تمہاری کہیں اور دلچسپی ہے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ جبکہ کراڑ داری سے پوچھنے لگیں۔

”نہیں امی..... دراصل میں نے کبھی اس طرف سوچا نہیں کبھی کسی خاتون کو دیکھ کر ایسا خیال ہی نہیں آیا۔“ وہ جھینپ رہا تھا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے، تم مجھے اجازت میں تمہارے لیے دلہن تلاش کرواتی ہوں۔ میں آج ہی صباح کو کہتی ہوں اسے بھی تو بھائی کی شادی کا ارمان ہوگا ناں.....“ انہوں نے طمانیت بھری سانس لی۔

”ٹھیک ہے امی تو پھر آپ ہی لوگ دیکھیے اس معاملے کو..... مجھے کون سا شادیوں کا تجربہ ہے۔“ وہ ماں کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا جہاں مچھلیاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

پندرہ سال پہلے جب وہ اسکالر شپ ملنے پر لندن آیا تھا تو چھ پرے بدن کا ایک نوجوان تھا۔ بالوں کی متوالی اور شریٹیں اس کے ماتھے پر جھوٹتی رہتی

بھولوں گا میں؟“ خاور نے یاد آنے پر کہا۔ ”انہوں نے اباں جی کے ساتھ بڑا مس بی ہو کیا تھا۔ میں بھی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا یار.....“

”خاور میں متقم مزاج ہرگز نہیں ہوں اور نہ ہی امی نے میری تربیت اس طرح کی، کی ہے۔ میں عورت کا بہت احترام کرتا ہوں دل سے۔ اس دن میڈم جنکین کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں وہیں حساب.... باقی کر دیتا کم از کم اس کے منہ پر کس کراک یا کپڑا مار ہی دیتا مگر خاور ضروری تو نہیں کہ پھٹا ہاتھ سے ہی مارا جائے، میری امی کے جن ٹانگوں کو توڑ دینے کی انہوں نے دھمکی دی تھی میں انہی چہروں پر انہیں جھکا ہوا دیکھتا چاہتا ہوں بس اسی دن میری بے چینی اور بے کلی ختم ہو جائے گی۔ میرے دل سے بوجھ سرک جائے گا۔ ان کا پتا کراؤ یا روہ اب کہاں ہیں، میرے خیال میں تو وہ اب تک ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی۔“

”ارے انہیں تلاش کرنا کون سا مشکل کام ہے اگر وہ ریٹائر بھی ہو چکی ہوں گی تو پنشن لینے تو آتی ہی ہوں گی انہیں ڈھونڈ نکالیں گے یار..... تم فکر ہی نہیں کرو۔“ خاور نے خضر کو تسلی دی۔ پھر خاور نے ایک ہفتے کے بعد ہی مکمل معلومات کے ساتھ خضر کو فون کیا۔

”میڈم جنکین واقعی ریٹائر ہو چکی ہیں اور اب اپنا ایک اسکول چلا رہی ہیں اور اتنی ہی بد زبان اور اکھڑ ہیں۔“ خاور نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا بعد میں خاور نے میڈم جنکین کے معاملے میں دلچسپی لے کر خضر کو بتایا کہ ”میڈم جنکین کے اسکول میں ایک فنکشن ہونے والا ہے۔ آج کل چیف گیسٹ کے لیے ناموں پر غور کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک ذریعے سے تمہارے بارے میں کہلویا ہے۔ وہ بے بھی ان دنوں تم hot cake بنے ہوئے ہو اگر کوئی تم سے رابطہ کرے تو دیکھ لینا۔ یہ موقع پھر ملے نہ ملے اوکے..... میٹ آف لک.....“ فون رکھنے کے بعد خضر کافی دیر تک کسی سوچ میں گم رہا۔

☆☆☆

”اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“ امی نے

اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیسے کیسے تشریف لانا ہوا؟“

”وہ سر..... اور اصل ہمارے اسکول کا اینڈل فنکشن ہونے والا ہے، ہم اسے بہت اچھے طریقے سے سیلبرٹ کرتے ہیں۔ آپ تعلیم کے مشیر ہیں..... اگر آپ ایذا چیف گیسٹ تشریف لائیں تو یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی سر..... سر دیکھیے پلیز انکار نہ کیجیے گا۔ پلیز سر.....“ ان کے لہجے سے خوشامد ٹپکی پڑ رہی تھی۔ خضر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔
 ”دیکھیے..... بات دراصل یہ ہے میڈم کہ میں خاصا بڑی رہتا ہوں جو تھوڑے سے لمحات فرصت کے ملتے بھی ہیں تو وہ ٹائم میں صرف اور صرف اپنی مدر کے ساتھ گزارتا ہوں، وہ میرا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔“
 خضر کی بھاری اور دلکش آواز کمرے کے چرکوں ماحول میں ایک حسین ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

”یہ تو ہمارے لیے اور بھی اعزاز کی بات ہوگی سر کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ آئیں۔ ایک تو آپ ہی اور پھر آپ کی بھی والدہ ہمارے لیے تو ڈبل اعزاز ہوگا سر..... پلیز انکار نہ کیجیے گا۔“ میڈم حتمی طور پر چل رہا تھا کہ وہ خضر کے قدموں میں پڑ جائیں۔
 ”مگر اپائنٹ شیڈول چیک کیے بغیر آپ سے کوئی پراسس بھی تو نہیں کیا جاسکتا نا.....“ خضر کے اندر نفرت ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

”سر پلیز.....“ وہ تھوڑا سا آگے کو جھک کر بولیں۔
 ”سوری میڈم! ابھی اور اس وقت تو میں آپ کو کوئی پاز یور سپانس نہیں دے سکتا، آپ میرے پی اے سے رابطے میں رہے شاید وہ کوئی تجاوش نکال سکے۔ اوکے میں اس وقت تھوڑا بڑی ہوں، سوری فار دیٹ.....“ اس نے فون اٹھا لیا مطلب کہ آپ جاسکتی ہیں۔

”تھینک یو..... تھینک یو سونائس آف یوسر.....“ میں آپ کے پی اے سے پوچھتی رہوں گی۔ تھینکس اکیں کہ آپ نے مجھے ٹائم دیا۔“

”مسٹر خضر سے ملتی جلتی شکل کس کی ہے؟“ وہ

تھیں۔ اس کی ڈارک گرے کمر کی پتلیوں سے ذہانت چمکی پڑتی تھی۔ ہونٹوں کی بناوٹ ہی کچھ ایسی تھی کہ جیسے مسکان ہمیشہ کے لیے ہونٹوں پر ٹھہر گئی ہو۔ لیکن اب اس کی پرسنالٹی میں ایک گرلیس آچکا تھا۔ جسم بھرا، بھرا سا ہو گیا تھا۔ مالی، آسودگی اور ذہنی بے فکری نے اس کے چہرے پر مزید رنگوں کی آمیزش کر دی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے اور ملنے ملانے میں ایک وقار آ گیا تھا۔ وہ خاصا بدل گیا تھا۔ خاور کے بابا سائیں کے ساتھ وہ مشیر کی حیثیت سے کام شروع کر چکا تھا۔ اس کا اسٹیشن وزیر کے مساوی تھا۔

☆☆☆

میڈم حتمی نے چیف گیسٹ کے لیے خضر کے نام پر بنجیدگی سے غور کیا۔
 ”مسٹر خضر تعلیم کے مشیر ہیں، ان کا اسٹیشن منسٹر کے برابر ہے۔ خاصے پاور فل بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ہمارے اسکول کے لیے کوئی عطیہ وغیرہ.....“ وہ آگے کا سوچ کر ہی مسکرائے گئیں۔

”مجھے خود ہی جانا ہوگا بلکہ مجھے خود ہی جانا چاہیے، اس طبقے کے لوگ پروٹوکول کا شمس بھی تو بہت ہوتے ہیں اور غرہ وخرہ بھی بہت ہوتا ہے مزاج میں۔“ وہ جانے کی منصوبہ بندی کرنے لگیں۔

☆☆☆

”آئیے مسز حتمی۔“ وہ بہت ضبط کے ساتھ احتراماً کرسی سے ذرا سا اٹھا۔

”پلیز تشریف رکھیے۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور فریم کیس گلاسز آنکھوں پر لگا لیے۔

”تھینک یوسر..... تھینک یو دیری میچ..... آپ نے مجھے ٹائم دیا۔“ وہ بیٹھنے کے بعد بولیں بالوں پر ہاتھ پھیر کر دوٹو کو درست کر کے کاندھے پر سیٹ کیا۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے اگرچہ کسی حد تک ان کی عمر کو چھپایا ضرور تھا مگر خضر ان کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے اس دن والے رویے کی وجہ سے خضر کو آج بھی ان کا چہرہ کریہہ اور انتہائی بد صورت لگ رہا تھا۔ مگر

بارلیک کر خضر کے گلے میں ڈالنا چاہا مگر خضر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا اور ہارے کر اپنی ماں کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ سفید پتھر کی کڑھی ہوئی ساڑی میں ملبوس تھیں، کلائیوں میں باریک سونے کی ڈائنڈ جڑی چوڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے پاؤں خاص جوگرز میں ملفوف و ہیل چیئر کے پیڈل پر رکھے ہوئے تھے سر کے بال دودھ کی طرح سفید تھے ساڑی کا پلو سفید بالوں والے سر پر ایک خوب صورت انداز میں منعکس تھا نہ جانے کون سے جذبے کے تحت ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی مگر وہ پھر بھی مسکرا رہی تھیں اور وہاں پر موجود لوگوں کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دے رہی تھیں۔ ایک طمانیت بھرا احساس ان کے چہرے پر سایہ فگار تھا انہوں نے بہت پیار سے اپنے بیٹے کو دیکھا..... بیماری اور بڑھتی ہوئی عمر نے ان کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔ خضر نے جھک کر اپنی ماں کے ورم آلود چہرے کو چوم لیا اور یہ منظر وہاں پر موجود بہت سے کمروں نے محفوظ کر لیا جسے اگلے دن فنکشن کی رپورٹ کے ساتھ اخبارات کی زینت بنا تھا۔ مسز جمکین کچھ سوچ، سوچ کر ایک بار پھر اپنی یادداشت کو الزام دے رہی تھیں۔ ذہن کے کسی گوشے میں کسی یاد، کسی خیال کا جگنو ٹٹٹا ضرور تھا مگر انہیں اس وقت کچھ بھی سوچنے کے لیے زیادہ وقت ہی کہاں مل پارہا تھا۔ کوئی چہرہ، کوئی شکل ان کے حافظے میں ڈبکیاں کھاتی پھر رہی تھی خضر نے اپنی ماں کی وھیل چیئر کو خود چلاتے ہوئے اگلی صفوں تک پہنچایا تو کئی نگاہوں میں ستائش تھی کئی ماؤں نے رشک سے خضر کی والدہ کو دیکھا۔ خضر نے پنچوں کے بل تھوڑا سا بیٹھتے ہوئے اپنی ماں کے جوگرز اتارنے شروع کیے۔

”پلیز مسز جمکین..... ایک چھوٹی ٹیبل منگوادیجیے میری مدد زیادہ دیر چیر لٹکا کر نہیں بیٹھ سکتی ہیں۔“ وہ پیچھے کھڑی ہوئی مسز جمکین سے مخاطب ہوا۔

”سر..... ابھی لیں۔“ وہ پیچھے کسی کو حکم دینے کے لیے دوڑ گئی، ٹیبل آنے کے بعد خضر نے اپنی ماں کے

باہر نکلنے وقت اپنی ناقص یادداشت کو برا کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

”خضر بیٹا آپ کے پروپوزلز تو سبھی اچھے ہیں۔ فوری طور پر سب تو نہیں پر کچھ پروپوزلز کو ضرور اپلائی کریں گے۔ کینٹ مینٹگ میں اس سلسلے میں سب سے مشورہ بھی کریں گے۔ میرا خیال ہے اچھی آؤٹ پٹ ملے گی۔ دراصل ایک دم سے سب کچھ پیچھے نہیں ہوسکتا۔ لوگوں کا ذہن بدلنے میں وقت تو خرچ ہی ہوتا ہے۔ خضر بیٹا..... آپ اپنے وطن کے لیے اچھی سوچ اور جذبات رکھتے ہو، میں قدر کرتا ہوں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔“ مخدوم دلاور حیات نہایت شفیق انداز میں اپنے جیمبر (آفس) میں خضر سے بات کر رہے تھے۔

”پر ائم منسٹر سے دو دن بعد میری دن ٹو دن ملاقات ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ دیر کے لیے میں جہیں بھی اندر بلاؤں، تمہارے پاس خوب صورت الفاظ، دلائل اور کنویں تک پاؤں بھی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”کوئی بات نہیں چاچا سائیں، آپ مجھے اپنے ساتھ موجود پائیں گے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ اسی کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گا۔“ وہ مؤدب ہو کر کرسی سے اٹھ گیا۔ ”ہاں بیٹا سائیں، ضرور، ضرور ماں کی خدمت کرو گے تو دنیا بھی تمہاری اور آخرت بھی تمہاری..... مجھے کوئی کام ہوا تو تمہارا سیل فون کس لیے ہے میں ٹرائی کر لوں گا۔ جاؤ بیٹا..... اللہ والی۔“ دفتر سے گھر کے راستے تک وہ مختلف سوچوں میں گم رہا۔

☆☆☆

گاڑی سے اتر کر خضر اپنی ماں کی وھیل چیئر چلاتے ہوئے جیسے ہی اسکول کے احاطے میں داخل ہوا دونوں جانب پھول سے بچے اور مسکراتے ہوئے چہروں والی نیچرز پھولوں کی پچاں بچھاؤ کرنے کے لیے کھڑے تھے بہت سے بچوں کے ہاتھوں میں استقبالیہ جھنڈیاں بھی تھیں۔ میڈم جمکین نے ایک بڑا سا

”جینک یو سز جملین.....“ وہ کچھ دیر تک مسکراتا ہوا نہیں دیکھتا رہا پھر بولا۔

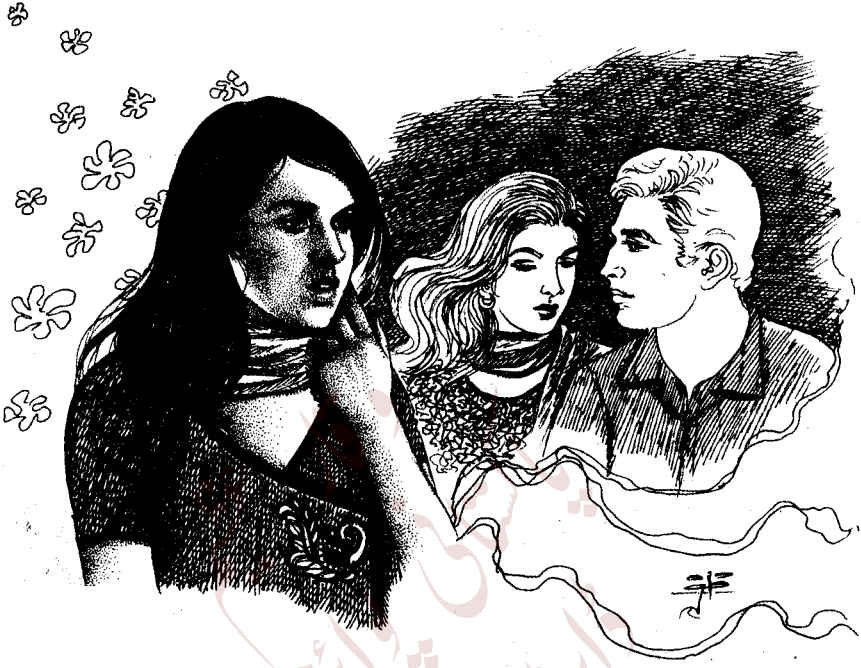
پریشان سی ہیں۔ آپ یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہیں شاید آپ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور یاد نہ آ رہا ہو تو چلیے میں آپ کی ہیلپ کیے دیتا ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا تاں کہ زندگی میں ایک بار پھر ہم آنے سانسے ہوں گے مگر اس وقت ہم دونوں کی حیثیتیں جدا اور مختلف ہوں گی۔“ پھر گھوم کر اپنی ماں کی وکیل جیڑے کے پاس آیا اپنی ماں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر کہا۔

”مجھے پورا یقین ہے میڈم میری نیک دل مائیں کی آنکھوں سے یہ گوہر آبدار آپ کی تکلیف اور اذیت کو محسوس کر کے ہی نکلے ہیں۔“ مائیں کی وصل چیز کو باہر لے جاتے ہوئے وہ خود کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دل پر پندرہ سال سے دھرا ہوا الجھن اتر چکا تھا۔ کافی عرصے بعد رات کو وہ ایک بہترین مسکون اور میٹھی نیند سویا۔

دونوں باؤں پھول کی طرح اٹھا کر میز پر رکھے اور نیچے نشن رکھ دیے۔ نرم آؤنی شال ان کے کندھوں پر پھیلا کر وہ مڑا۔
 ”سوری..... اب میں فارغ ہوں.....“ فرمائیں
 اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

”سوری میڈم..... میری والدہ کے جو گرز غالباً یہاں سے کسی نے اٹھا کر کہیں اور رکھ دیے ہیں۔ آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی ذرا ان کے جو گرز تو منگوا دیں بلکہ اگر آپ کو برا نہیں لگے تو کسی سے کہہ کر ان کو پہنا بھی دیں، یہ خود سے نہیں پہن سکتی ہیں یا پھر سوری آپ منگوا دیں تو میں خود انہیں پہنا دوں گا۔“ وہ مسکراتا ہو چکا۔

خضر کے لیے زندگی کا یہ سب سے خوب صورت لمحہ تھا۔ وہ کافی دیر تک اس خوب صورت اور یادگار منظر کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خواہش کی کہ کئی صدیوں تک یہ منظر یوں ہی ٹھہرا رہے۔ وقت منہدم ہو کر خود بھی یہ منظر دیکھنے کے لیے رک جائے..... مگر جلیمن تھکے ہوئے انداز میں جو گزر پہنانے کے بعد کھڑی ہوئیں۔



بلا عنوان

ام ایسان

آج میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا۔۔۔۔۔
 کم از کم ایک سال تو ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ وہ ماہ مہر تو نہیں تھی بلکہ
 اس کا سایہ ہی لگی مجھے، بے حد کمزور، چہرے کی ساری
 شاد لہریاں جیسے زردیوں میں گھل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد
 حلقے، بہت زیادہ ڈری سہی ہوئی، کالے رنگ کی چادر
 اوڑھے ہوئے اس نے اپنا آدھا منہ نقاب میں چھپا رکھا
 تھا۔ ساتھ میں اس کی ساس بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں
 رک گئیں۔ میں نے اس کی ساس سے حال احوال پوچھا

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

کوشش کی۔ یہاں کے مردانہ وزانہ عملے کی تعیناتی کی ذمہ داری میری تھی۔ میں نے اپنی طرف سے چھانٹ کر ایسے لوگ منتخب کیے جو میری ہی طرح اس ادارے کے ساتھ مخلص ہوں اور کافی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔..... میرے علاوہ ہاسٹل کے عملے میں سات لوگ تھے۔ دو کلک، ایک مالی، چوکیدار، ایک اسٹور کیپر کامران نامی نوجوان تھا۔ جو ضرورت پڑنے پر میرے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا تھا اور ہاسٹل میں کینٹین کی ذمہ داری بھی میں نے اسے ہی سونپی ہوئی تھی۔ دو سو بچہ بھی تھیں جو ہاسٹل کی صفائی کے لیے مخصوص تھیں۔

یہاں کام کرنے والوں کی بھی رہائش ہاسٹل بلڈنگ کے ساتھ ہی تھی۔ کامران بھی وہیں اپنی ماں، بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ سارے ملازمین کو دن کے وقت اپنے، اپنے وقت پر آف دے دیا جاتا تھا کہ وہ گھر چلے جائیں۔ رات کو ہاسٹل کے اندر کسی مرد کے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں خود رات کو بچوں کے رومز جا کر چیک کرتی، ان کے ٹائم ٹیبل، روٹین اسٹڈی پر نظر رکھتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان پندرہ برسوں میں ہزاروں لڑکیاں یہاں سے تعلیم حاصل کر کے گئی تھیں، چھوٹے موٹے مسائل کے علاوہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں پھر ہاسٹل میں داخلے ہو رہے تھے۔ میں بچیوں کے والدین سے خود ملتی، ان کو ہاسٹل کے اصول و ضوابط بتاتی اور اپنی پوری ضابطے کی کارروائی کے بعد ہی ان کو رہائش کی اجازت ملتی۔ موبائل فون جہاں رحمت وہاں زحمت..... اس سہولت کو میں بچیوں کے لیے خرافات سمجھتی تھی سو اس کی اجازت بچیوں کو نہیں تھی۔ ہاں ضروری کام یا کال کے لیے آفس کے فون سے لڑکیاں استفادہ کر سکتی تھیں جس کے ڈیوڑن سے لیے جاتے تھے۔

اس روز میں نے کافی ایڈمیشن کیے اور مس نگہت

”بس جی کیا بتاؤں، میرے بیٹے کی تو جان عذاب میں آگئی ہے، جب سے یہ منخوس ہمارے گھر میں آئی ہے ایک کمانے والا جی ہے میرا بیٹا اور کھانے والے کئی..... اوپر سے اس نامراد کی روز کی بہانے بازیاں.....“ کہتے ہوئے ساس نے دو ہنر بھی اس کی کمر پر سید کیے۔ ”بھئی یہ گر پڑتی ہے تو کبھی اسے چکر آنے لگتے ہیں باپ تو ہمارے سر منڈھ کر چلا گیا۔ اب ساری عمر اس عذاب کو جھیلیں گے۔ اب اس منخوس کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔ پاس کی ڈسپنری سے دوا لینے تاکہ پتا تو چلے آخر بچہ کیا ہے۔“ اس دوران اس کا چہرہ میں نے کئی بار کبھی سفید اور کبھی زرد پڑتے دیکھا۔

”چل مر!“ اس کی ساس بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹے آگے لگئی، جاتے ہوئے اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ کیا نہیں تھا ان ڈیڈ بائی آنکھوں میں..... دکھ، غم، حسرت، بے بسی اور وہ کھشتی ہوئی چلی گئی۔ میری نظروں نے دور تک اس کا چچھا کیا یہاں تک کہ وہ دونوں گیٹ کر اس کر گئیں۔

میں گزشتہ پندرہ سال سے اس ہاسٹل کی وارڈن کے طور پر تعینات ہوں..... پہلے میں اس ہاسٹل سے ملحق گرلز کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے یہاں کے ہاسٹل کی وارڈن کے طور پر تعینات کر دیا گیا اور عمارت کے احاطے میں ہی رہائش کی سہولت بھی دے دی گئی۔ میرے خاوند مجھے دس سال پہلے ہی داغ مفارقت دے گئے تھے اولاد اللہ نے نوازی نہیں تھی سو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے اس کالج اور بعد میں ہاسٹل کی بچیوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا..... دور دراز قصبوں اور شہروں سے آنے والی بچیاں اس ہاسٹل میں مقیم ہوتیں۔ جن کی پوری ذمہ داری میرے اوپر تھی۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی ذمہ داری کو ہمیشہ فرض شناسی سے پورا کرنے کی

بلا عنوان

مسئلے مسائل دریا فوج کے اور حسب معمول نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے کچھ تختیں بھی کیں۔ میں انہیں وقتاً فوقتاً بتایا کرتی تھی کہ لڑکیوں کی عزت کا بچ سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے اس میں ذرا سی بھی ٹھیس سے جو بال آئے وہ ٹھہر بھر کا تادان دے کر بھی نہیں بھرتا۔ اپنے روزمرہ کے کچھ کر کے دوران مجھے پچھلی لائٹوں میں ماہ مہر بھی نظر آئی۔ دوپہر کی نسبت وہ اس وقت پُر اعتماد اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔

یوں ہی بہت سارے دن بیتتے چلے گئے۔ بعد میں، میں نے اسے کئی بار لان میں، روم میں، حاضری کے دوران بہت بار دیکھا تھا۔ اس دوران ہر ایک اینڈ براس کے والد آتے اس سے ملاقات کر جاتے اور کسی، کسی ویک اینڈ پر وہ دیگر لڑکیوں کی طرح گھر بھی جایا کرتی تھی۔

باقاعدہ کارڈ اور حاضری کارڈ جڑ بننا ہوا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں نے ماہ مہر کو کچھ کم صمیم کیفیت میں دیکھا اور اسے بلا کر اس کی خبریت بھی دریافت کی تو اس نے پیپر کی ٹینشن ہے کہہ کر میری تشویش کو مسترد کر دیا۔ ہاسٹل کی ہر لڑکی کی غیر معمولی کیفیت میرے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی، میں ان کے ہر معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتی تھی بعض دفعہ بچیاں اپنے گھر بلو مسائل بھی میرے پاس لے کر آتیں جنہیں میں اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دن میں نے صبح کی حاضری اور بچیوں کے کالج جانے کے بعد ہاسٹل کا چکر لگا کر پھر آفس میں آ کر بیٹھی تھی کہ کامران چلا آیا اس کے اسٹور روم سے کھیل کا کچھ سامان غائب تھا جو لڑکیوں نے ایٹو کر لیا تھا۔ اس نے ہاسٹل کے رومز کو چیک کرنے کی درخواست کی کہ ان ملازماؤں کو میرے ساتھ بھیج دیں تو میں نے اسے ہاسٹل رومز کی ایک، ایک ایکٹر لاک کی چابیاں جو میرے پاس ہوتی تھیں دیتے ہوئے کہا کہ وہ خود جا کر یہ کام کر لے اور واپس آ کر آج مجھے بازار لے چلے، وہ چابیاں لے کر چلا گیا تو چوکیدار نے مجھے ماہ مہر کے والد کی آمد کا بتایا۔ میں نے ان کی آمد

جو میری بی بی اسے کی خدمات انجام دیتی تھیں کو چائے لانے کو کہا اسے میں چوکیدار ایک بارش اور بارعب بزرگ اور ان کے ساتھ ایک لڑکی کو لیے آفس میں چلا آیا کہ وہ اس لڑکی کے والد تھے اور اپنی بیٹی کو ہاسٹل میں داخل کرانے آئے تھے تاکہ وہ اپنی تعلیم آگے جاری رکھ سکے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور اس بزرگ سے تعارف لینے لگی۔ انہوں نے اپنے آپ کو کافی دور ایک قصبے کا سردار بتایا اور کہا کہ اگرچہ ان کے قبیلے میں لڑکیوں کو آگے پڑھانے کا رواج نہیں ہے لیکن چونکہ وہ اپنی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں تو اس کے آگے پڑھنے کی خواہش کو رد نہیں کر سکتے اور قبیلے والوں کی از حد مخالفت کے باوجود وہ اسے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ اس لڑکی کا نام ماہ مہر تھا جس کی عمر تقریباً سترہ، اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ بہت ہی معصوم اور خوب صورت خدو خال کی مالک ماہ مہر مجھے بہت کم گو ملتی... اس نے صرف پوچھے جانے والے سوالات کا جواب دیا اور آدھے گھنٹے کی ضروری کارروائی کے بعد اس کے والد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماہ مہر کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور مجھ سے اجازت طلب کرنے کے بعد چلے گئے۔ میں نے ہیڈ گرل کو بلوا کر... ماہ مہر کو اس کا کمر دکھانے اور چوکیدار کو اس کا سامان پہنچانے کا کہا... اور چونکہ میں بہت تھک چکی تھی سو آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد میں اپنی رہائش گاہ کی جانب چلی آئی۔ شام کو معمول کے مطابق اٹھنے کے بعد ہاسٹل کا ایک چکر لگایا، مرکزی لان میں لڑکیاں موجود تھیں۔ کچھ گروپس کی صورت میں، کچھ شام کی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔ آیا اماں جو میری ذاتی ملازمہ تھیں نے مجھے چائے کا کپ تنہا یا جسے لیے میں کرسی پر بیٹھی اور شام کی حاضری کے لیے تیل بجانے کا اشارہ کیا جو کہ روز کا معمول تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی تمام لڑکیاں مرکزی لان میں جمع ہو گئیں۔ ان میں بی بی پرانی ساری لڑکیاں شامل تھیں، میں نے حاضری لی۔ کچھ لڑکیوں کی ڈاک جو آئی تھی وہ تقسیم کرائی ان سے ان کے

پر حیران ہوتے ہوئے چوکیدار سے انہیں اندر بلانے کو کہا کیونکہ آج وزیر ڈے نہیں تھا سوان کا آنا نہیں بنتا تھا۔ خیر انہوں نے بتایا کہ ”ماہ مہر کے بھائی کی شادی طے پاگئی ہے وہ اسے لینے کے لیے آئے ہیں۔“ میں نے انہیں ماہ مہر کے آج کل ہونے والے امتحانات کے متعلق بتایا کہ آج کل تو وہ ان میں مصروف ہے۔ ہاں دو تین دن میں امتحان ختم ہونے کے بعد وہ اسے لے جاسکتے ہیں ابھی صرف ماہ مہر سے ملاقات کی اجازت دے دی تو وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ایک ساتھ تین دن بعد ہی وہ آکر اسے لے جائیں گے ابھی وہ شہر آئے ہیں تو ایک آدھ ضروری کام نبھاتے ہوئے جائیں گے۔

تین دن بعد میری طبیعت ذرا سست تھی تو میں نے اپنی اسٹنٹ مس نکھت کو فون کیا کہ وہ ویک اینڈ پر جانے والی بیچوں کو لیو کارڈ دے کر ان کے رشتے داروں کے ساتھ اپنی نگرانی میں بھیج دیں۔

موسم بدل رہا تھا۔ سردیاں عروج پر تھیں۔ دن بہت چھوٹے ہو گئے تھے، میں اپنے آفس میں اپنے روٹین ورک میں مصروف تھی کہ سینڈ آئیر کی ایک لڑکی اسما ایک اور لڑکی کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے بے حد سردی لگ رہی ہے۔ میں نے اس کو گرم دودھ منگوا کر اسے پلویا۔ کالج سے ایک ملازمہ کو بلوا کر ایک ہیڈ گرل کے ساتھ اسما کو نزدیکی ڈپنٹری بھیجا۔ وہ دو آئی لے کر واپس آگئیں تو میں نے ہیڈ گرل کو اس کے روم میں چھوڑنے اور جب تک اس کی روم میٹس واپس نہ آئیں اسے وہیں رہنے کو کہا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ہیڈ گرل واپس آئی اور اس نے آکر ایک عجیب بات بتائی کہ اسما کے کمرے کے سامنے جب وہ اور اسما پہنچیں تو جو بی دروازے کے پاس نزدیک ہوئیں انہیں اندر سے ہلکی سرگوشیاں سنائی دیں حیرت کی بات یہ تھی کہ انہیں اندر سے ایک مرد کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ ہیڈ گرل، اسما کو وہیں دھوپ میں چھوڑ کر واپس تیزی سے میرے پاس آئی تھی۔ میں نے چوکیدار، مس

نکھت اور کالج کی پرنسپل کو فون کر کے جلد آنے کو کہا اور ان سب کو لے کر جب روم نمبر بارہ تک پہنچی تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ جن چار لڑکیوں کو وہ روم الاٹ کیا گیا تھا ان میں ماہ مہر بھی شامل تھی، ہم سب..... بے حد خاموش سے کھڑے تھے آخر میں نے ہی ہمت کی اور آٹومیک لاک میں روم نمبر کی چابی گھمائی اور جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ دونوں جو تیزی سے ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حیرت اور صدمے سے میری حالت بے حد بری ہوئی۔ ماہ مہر کو تو پرنسپل صاحبہ نے پکڑ کر پھینکا شروع کر دیا اور کامران اس کی وہی حالت تھی کہ کاتو تو بدن میں ابھوئیں..... مجھے مس نکھت ہنا نہیں کیسے پکڑ کر آفس تک لائیں۔

مختصر دیر میرے حواس گم رہے ذرا حالت سنبھلی تو آفس میں ایک طرف ماہ مہر اور کامران سر جھکائے کھڑے نظر آئے۔ پرنسپل صاحبہ نے مجھے ہاتھ سے سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور بتایا کہ انہوں نے فون کر کے ماہ مہر کے والد کو فوراً یہاں پہنچنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ وہ وہاں سے روانہ ہو گئے ہیں۔ بس پہنچنے کو والے ہوں گے۔

”میں ایسی لڑکی کو یہاں مزید برداشت کرنے کے حق میں نہیں ہوں جو ہاسٹل اور کالج کے ماحول کو خراب کرے اور لڑکیاں اسے دیکھ کر مزید بگڑیں۔“ اسی میں، میں نے ماہ مہر کے والد کو ان کی شکل سے ملتے جاتے ایک اور شخص کے ہمراہ داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دو آئی سخت پریشانی میں تھے۔ اور آتے ہی دریافت کیا۔

”ہماری دھی رانی تو خیریت سے ہے؟“ اس سوال پر پرنسپل صاحبہ نے طنزیہ نظروں سے مہر کو دیکھا اور مختصر آسار اقصہ بیان کیا جسے سن کر دونوں اشخاص کے چہرے پہلے سرخ اور پھر سفید پڑ گئے۔ ماہ مہر کے والد کی نظریں اور سر جھک گیا جبکہ دوسرے کے چچا جو اس کے ہونے والے سر بھی تھے نے سپار لہجے میں کہا۔

”میڈم صاحبہ! آج سے یہ لڑکی ہمارے لیے

خدارا۔ خدارا۔ بے اولاد ماپوسی اختیار نہ کریں

کیونکہ خدا کی رحمت سے ماپوس ہونا تو سخت گناہ ہے۔ آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے۔ خدا کی رحمت سے آپکے گھر بھی چاند سا خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ خواتین کے پوشیدہ مسائل ہوں یا مردانہ کمزوری یا مردوں میں جراثیم کا مسئلہ ہو۔ آپ پریشان ہونے کی بجائے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے بے اولادی کورس منگوائیں۔ خدا کے لئے ایک بار ہمارا بے اولادی کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ خدا کی رحمت سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

دن پر رابطہ 10 بجے سے رات 8 بجے تک

گئی۔ ہم اسے لے بھی گئے تو پہچانت میں اسے مارنے کا فیصلہ ہوگا۔ ہم وہاں یہی جا کر کہیں گے کہ ماہ مہر کا بہت برا ایکسٹنٹ ہوا جس میں وہ مر گئی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ سفر میں لے جایا جاتا سوا سے وہیں دفن کر آئے۔“ اس دوران ماہ مہر دوڑ کر باپ کے سامنے آئی اور زور، زور سے روتے ہوئے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”بابا جان، بابا جان! مجھے معاف کر دیں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں بھٹک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے بھٹک گئی تھی لیکن آپ کی قسم میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”دفع ہو جاؤ آوارہ اور بے حیا لڑکی! مت کہو اس کو بابا جان..... تمہارا بابا اسی وقت مر گیا جب تمہارے کر توت سنے۔“ اس کے چچا نے اسے بازو سے پکڑ کر دوڑ ہٹایا۔ جبکہ اس کے باپادکھ اور اذیت سے کبھی روتی بھلتی ماہ مہر کو دیکھتے تو بھی چہرے پر پتھر لیے تاثرات سجائے اپنے بھائی کو۔

”سنیے بھائی صاحب.....“ خیر نے مداخلت کی۔
”ماہ مہر آپ کی جوان جہاں پچی ہے۔ ایسا کہہ کر کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ کس طرح اس کے وجود سے کر سکتے ہیں۔ ہم اسے یہاں ہاسٹل اور کالج میں بھی نہیں رکھ سکتے، آپ کو اسے ساتھ ہی لے جانا ہوگا۔ اس سے غلطی ہوئی ہے اور وہ اس پر شرمندہ بھی ہے۔“

”نہیں! سردار اگر اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا تو اسے اپنا پورا گاؤں، رشتے دار، سرداری سب کچھ چھوڑنا ہوگا، اس کا اب ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم ایسی بے حیا لڑکی کو ساتھ لے کر نہیں جاسکتے۔ ہماری طرف سے یہ مر گئی ہے، آپ اسے بے شک کسی دارالامان میں بھیجیں یا جہاں کہیں بھی..... ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ یہ کہہ کر اس کے چچا نے سردار کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف جانے کے لیے کھینچا۔

سنیے جتنی قصور وار یہ ہے اتنا ہی ہمارا ملازم بھی ہے میں کا مران کو حکم دیتی ہوں کہ وہ ابھی کے ابھی ماہ مہر

... سے نکاح کرے یا پھر اسے بھی استغفیٰ دے کر ہمارا ادارہ چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ ساتھ ہی اس سے یہ ساری مراعات بھی چھین لی جائیں گی جو ادارے کی طرف سے اسے ملی ہیں۔“

”نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں شادی شدہ اور بال بچوں دار آدمی ہوں۔“ وہ ایک بھڑک کر بولا۔

”کیوں مت کرو۔۔۔۔۔ جب ایک معصوم لڑکی کو درغلا یا تھا تو اس وقت تمہیں بال بچے دار ہونے کا احساس نہیں تھا۔“

مزرخان آپ نکاح کے انتظامات کرائیں، میں کسی طرح اس کے والد اور چچا کو روکنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اس کا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ

میں دے کر جائیں اور تازہ زندگی ان کے دل میں یہ غلط نہ رہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کو لاوارث چھوڑ دیا تھا۔ اگر یہ

رسوم و رواج اور خاندانی و معاشرتی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو سردار ایک باپ بھی ہے۔“ میں نے ممنون نظروں سے پرہیز صاحبہ کی طرف دیکھا۔

بعد کے مراحل تیزی سے طے ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ کامران نے نکاح میں بہت آنا کافی کرنے کی کوشش کی۔ آدھے گھنٹے میں نکاح کے سارے انتظامات ہو گئے تھے۔ اسی دوران ماہ مہر مسلسل روتی رہی۔ روتے، روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اب

اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کیا غلطی ہو گئی۔ وہ بار بار اپنے باپ، چچا کے آگے ہاتھ جوڑ، جوڑ کر معافی مانگتی رہی کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے چلیں وہ

اس شخص سے شادی نہیں کرنا چاہتی، وقتی طور پر شیطان کے بہکاوے میں آ گئی تھی لیکن اس کی التجائیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نکاح کے فوراً بعد اس کے چچا نے اس

کے باپ کو زبردستی اٹھایا۔ جس نے جاتے، جاتے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں آنسو چھپاتے ہوئے تیزی سے باہر نکلتے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ماہ مہر

بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بعد کی ایک لمبی داستان ہے۔ کامران جب ماہ مہر کو گھر لے گیا تو ان کے گھر گویا

قیامت ٹوٹ پڑی اس کی ماں اپنے بیٹے کا قصور ماننے

کو تیار ہی نہیں تھی اسے تو سراسر یہی لڑکی چنڈال آوارہ اور پھل پیری نظر آ رہی تھی۔ جس نے اداؤں کے نہ

جانے کون سے تیر چلا کر اس کے بیٹے کو قابو میں کر لیا تھا۔ وہ تو لڑنے مرنے کے لیے مجھ تک آئیں لیکن

جب بیٹے کی نوکری چلے جانے کا احساس ہوا تو ظلم و ستم کی حد ماہ مہر پر ختم کر دی۔۔۔۔۔ اس کے اس کام میں اس

کی بھانجی یعنی کامران کی بیوی بھی شریک تھی۔ دن رات گالیوں، کوسنوں اور مار پیٹ سے کام لیا جاتا۔

سارا دن کلبوں کے بیل کے مانند وہ جتی رہتی۔ کامران کے بچے الگ اسے ذلیل کرتے، ان کا کوارٹر چونکے

میری رہائش گاہ کے پاس ہی تھا۔ ان کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس کی ماں کو ایک دن اس کے ظلم کا احساس دلانا چاہا تو بولی۔

”جاؤ بی بی! اتنا بڑا ظلم جو تم نے ہمارے اوپر کر دیا اس ظلم سے تو کم ہی ظلم ہے یہ۔“ کامران سے کہا

تو اس نے بھی لاچارگی ظاہر کی یوں شیطان کے دکھائے گئے راستے پر جہاں مرد اور عورت ساتھ چلنا شروع کرتے ہیں، مشکل پڑنے پر مرد تو ہاتھ جھاڑ کر

ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے جبکہ عورت مرتے دم تک اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرتی رہتی ہے۔ اور نہ جانے

کفارہ ادا ہو بھی پاتا ہے یا نہیں۔ ماہ مہر کے گھر والوں نے اسے واقعی مرا ہوا تصور کر لیا تھا وہاں سے پھر کوئی

نہیں آیا تھا یوں وہ ماہ مہر جو اپنے بابا کی لاڈلی تھی، اپنی خواہش زبردستی منوا کر کچھ خواب سجا کر شہر آئی تھی، اس

نے اپنے سارے خواب رہن رکھ چھوڑے تھے۔ ایک چھوٹی سی غلطی اور وقتی کشش کے تحت۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتا

کہ کامران اور ماہ مہر کے ان تعلقات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ میں نے اپنے ہاسٹل کی بچیوں کے حوالے سے

کچھ مزید سخت اصول و ضوابط مقرر کر دیے تھے۔ اب وقتاً فوقتاً انہیں چادر، چار دیواری، عزت و ناموس کے

درس دیتی رہتی ہوں تاکہ کسی اور لڑکی کو ماہ مہر بننے سے بچا سکوں۔

فصل کی محبت

رناقت جاوید



”آپا تم تو قربانی کا خوب پلا ہوا بکرا ہو جس کی سال میں ایک بار قربانی نہیں دی جاتی بلکہ دن میں بار بار دی جاتی ہے۔ پھر بھی اس تو منہ بکرے کے گوشت میں کی نہیں آتی۔“ الوینا تسخرانہ لہجے میں بولی۔

”الوینا تم ہنستی ہوئی کتنی خوب صورت لگتی ہو۔۔۔۔۔ منہ پھلائے تو کسی چڑیل سے کم نہیں لگتیں۔ بیچارہ میرا آدم بھائی تو ایک فرشتہ ہے۔ نہ جانے تمہارے ساتھ گزارہ کیسے کر رہا ہے۔“ وہ بھی مذاق بولی۔

”آپ سب لوگ میرے دکھ اور درد کو

”آف الوینا تم تو حد ہی کرتی ہو۔۔۔۔۔ یہ جو گھر ہے ناں اسے عورت ہی جنت بناتی ہے۔ مرد کا پیار اور توجہ ایک عام سی عورت کو بھی حور بنا دیتا ہے۔“ اس کی بڑی بہن یسری نے پیشانی پر ناگواری سے ہاتھ مار کر کہا۔ ”خدا کے لیے یہ ناجائز ڈیمانڈ چھوڑ دو۔“

”کیوں چھوڑ دوں؟ میں قربانی کا بکرا نہیں ہوں۔“ الوینا تنک کر بولی۔

”اور میرے بارے میں تمہارے کیا خیالات ہیں؟“ وہ جربز ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

زمانہ قدیم کی ایک جاہل اور نادان عورت ہو جس نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا تو پھر تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ تم رشتے میں میری بڑی بہن ہو..... بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔“ الوینا غصے سے بولی۔

”اگر میں تمہاری ہاں میں ہاں ملاؤں تو پھر میں تمہاری دوست بھی ہوں، ہمارا اور ہمدرد بھی ہوں..... لیکن اس وقت جانی دشمن ہوں؟ تمہیں حقیقت سے روشناس کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ جس سے میں ہرگز باز نہیں آؤں گی۔ مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے یار.....“ یسریٰ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”تو پھر آپا، تم بیٹیوں پر احسان عظیم کرو۔ آج سے ہی اپنے بیٹیوں کو اپنی ساس کے حوالے کرو..... دنیا جہاں کی فضول اور پارینہ کہانیاں سنا کر انہیں تمہارے جیسی الوینا نے میں خوب کامیاب رہیں گی۔ تم بھی خوش اور تمہاری بیٹیاں بھی ایک سودمند تربیت حاصل کر لیں گی پرانے گھر جانے کے لیے انہیں پسند نہیں کرتا کرو۔ اور وہ بڑھیا اسی کامیابی پر اترا تی پھرے گی کہ دیکھا میری تربیت کا کمال کہ پوتیاں سرال میں ایسے بن گئیں جیسے آنکھ میں سرمہ.....“

”خبردار جو میری آنٹی کو بڑھیا کہا..... تعلیم نے تمہیں یہ درس سکھایا ہے کہ بڑوں کی عزت و احترام کرنے سے تمہیں تسکین ہوتی ہے..... ان سے پیار و شفقت سے پیش آنے سے تم چھوٹی ہو جاتی ہو..... الوینا میں تم وارننگ دے رہی ہوں۔ اگر تم نے ایسا نامناسب رویہ اپنی سرال میں روا رکھا تو بہت پچھتاؤ گی۔“ وہ فکر مند لہجے میں بولی۔

”کیا ہو جائے گا مجھے..... مر جاؤں گی؟“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”مرنا تو بہتر رہتا ہے میری بہن، تم جس زندگی کی طرف جا رہی ہو موت اس سے بہتر ہے۔ تم یہ مت بھولو کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس کی کچھ قدریں ہیں، قانون اور اصول ہیں۔ تم نہ جانے کس پلینٹ کی باسی ہو۔ اور کن خوش فہمیوں میں رہتی ہو۔“ اس

نہیں سمجھیں گے۔ آدم بھی تو ہر وقت یہی کہتا رہتا ہے کہ میری وینا کی مسکراہٹ موتا لیزا کی مسکراہٹ سے زیادہ نمبر لگتی۔ لیکن وہ بدتمیز یہ نہیں سوچتا کہ میری زندگی کو جہنم رسید کرنے والا۔ صرف اور صرف وہی تو ہے، میں سینے پر پتھر کی سل رکھ کر منافقت نہیں کر سکتی۔ آدم اپنے مطلب کی خاطر میری خوشامدیں کرتا ہے اکیلے میں..... کبھی ماں، بہنوں کے سامنے تو کر کے دکھائے..... تب ہی اسے مکمل مرد سمجھوں گی..... ان کے سامنے بیٹگی بلی اور مجھے شیر کی کھا جانے والی آنکھ سے دیکھتا ہے۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

”بھی تمہیں ان کے سامنے برا بھلا تو نہیں کہتا ناں، تمہاری بیوہ حرکتوں کو برداشت کر لیتا اور ان کے سامنے تمہاری عزت رکھ لیتا ایک شوہر کے لیے خاصا صبر آزمایا کام ہے۔“ انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”آپا..... بس میں نے کہہ دیا ناں کہ میں یسریٰ نہیں بن سکتی..... میں الوینا ہوں اور اسی نام سے بچپائی جاؤں گی۔ تم کیا ہو.....؟ تمہارا تو نام ونشان ہی مٹا دیا ہے بھائی جان نے، یہ بتاؤ کہ تمہاری تعلیم کا تمہیں تو رتی بھر فائدہ نہیں ہوا..... تمہیں دیکھ کر اور تمہاری باتیں اور نصیحتیں سن کر دادی کے زمانے کی کہانیاں یاد آتے لگتی ہیں۔ کبھی پٹی اور بیوہ قسم کی۔“ الوینا بھومیں چڑھا کر بولی۔

”مثلاً کیسی کہانیاں؟ دادی اماں تو کہانی میں ہماری تربیت کی خاطر کیے، کیسے شوخ و شنگ رنگ بھردیا کرتی تھیں۔ جنہیں میں آج تک نہیں بھولی بلکہ میں نے شادی کے بعد وہی رنگ اپنی ازدواجی زندگی میں بھر کر اپنی زندگی کو قابل فخر بنالیا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اوہ مائی گاڈ..... تمہیں اپنی زندگی پر فخر ہے..... میں تو ایسی زندگی پر لاکھوں بار لعنت بھیجتی ہوں۔“ الوینا طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

”اور میں اپنی اس زندگی پر لاکھوں بار دعا و سلام بھیجتی ہوں۔“ یسریٰ نے بے ساختگی سے کہا۔

”اوکے..... تو مجھ پر ایک مہربانی کرو..... آج کے بعد مجھے نصیحتیں اور نصیحتیں دینا بند کرو۔ جب تم.....

اسے غور سے دیکھنے لگا۔ الوینا نے اس کی اس بیہودہ حرکت پر نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔

”بی بی! میں پہلے دن ہی پہلی نظر میں کام چور لوگوں کو پہچان جاتا ہوں۔“ وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔

”میری بات پر غور ضرور کرنا، سمجھ دار ملازم خاتون بہت جلد اپنے ہاس کے تیر جان جاتی ہے۔ میں اس آفس میں دو مہینے سے ہوں..... مجھے بہت ساری عقلمند

دور اندیش لڑکیوں نے پہچان لیا ہے۔ جو بوقت ضرورت خطرے کی بو کو سمجھنے کی قوت رکھتا ہو..... وہ تو

ہوا کامیاب اور جو تمہارے جیسی نابلدہ انا پرست ہو وہ آفس کا کام کیا خاک کرے گی، سنو ہم انسانوں سے ہی

تو سبق سیکھتے ہیں۔ عقل نگل تو کوئی بھی نہیں ہوتا..... بلکہ ہم ایک دوسرے سے بہت جلد زندگی کو کامیاب بنانے

کے کڑکے سکتے ہیں۔ جیسے تم مجھ سے..... اگرچہ تمہارے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یاد

رکھو جب ایک مرد ہاس کے ماتحت نوکری کرنی مجبوری ہے تو پھر انا، غیرت اور خودداری کیسی.....؟ اس کی لوگو

ذرا دم رکھو..... اس لیے کہ یہاں پہلے کام دیکھا جاتا ہے۔“ وہ اسے اچھی خاصی سرزنش کر چکا تھا۔

”جی سر..... میں دوبارہ فائل کو دیکھ لیتی ہوں۔

میں نے اس میں ایک غلطی بھی نہیں چھوڑی.....“ وہ احتیاط سے ایسے لفظ چن رہی تھی۔ جیسے کالج کے

باریک ذرے جن سے معمولی سی بے احتیاطی بھی برتی تو تھاہلہلہان ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

”بہت عجیب لڑکی ہو..... شادی شدہ ہونے کے باوجود نا تجربہ کار، میں بات مشرق کی کر رہا ہوں تم

مغرب کی طرف رواں دواں ہو۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم شوہر کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہو۔ یہ بتاؤ

کہ کیا تمہیں میری باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔“ وہ عجب مکروہ مسکراہٹ سے بولا اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔

”یہ حجاب قید نہیں کہ بات کرنا تک گوارا نہیں۔ حجاب تو آزادی ہے عورت کی..... کیونکہ عزت و کدو فر

لے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اوہو..... بچے اسکول میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارے آفس سے ہوتی

ہاؤں..... لیکن آج مجھے یہ سمجھ آگئی ہے کہ تم سے دماغ کھائی کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔“

”بالکل درست سوچا ہے میری آپانے..... آپا تم بھوں کی آیا، شوہر کی باندی اور لوٹری کے سوا کیا

ہو..... کچھ بھی تو نہیں..... کوئی حیثیت نہیں ہے تمہاری..... آج میری نصیحت کان کھول کر سن لو.....

آج گھر جاتے ہی تمام ڈگریوں اور گولڈ میڈلز کو لان کے درمیان رکھ کر آگ لگا دینا۔ تاکہ اڑوس پڑوس بھی

تمہاری اس عقلمندی پر مدح سرائی کر سکیں۔“ وہ طنزیہ تہقہ لگا کر بولی۔ تو میری سر ہلاتی ہوئی کرسی سے اٹھی

اور الوینا پر تاسف سے بھر پور نظر ڈال کر بڑبڑاتی ہوئی آفس کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

الوینا فائلوں میں ابھی ہوئی تھی۔ آفس بوائے کافی کامگ آدھے گھنٹے پہلے اس کے سامنے رکھ کر جا چکا

تھا۔ لیکن اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ کام میں ہر وقت مصروف رہنے کے باوجود ہاس کی ڈانٹ ڈپٹ نے

اسے مضطرب کر دیا تھا۔ اسی پریشانی اور بار بار ہاس کے طلب کرنے اور اس کے ہر کام میں نقص نکالنے کے

بعد فائل اس کے منہ پر دے مارنے کا مقصد وہ بخوبی جانتی تھی..... کیونکہ یہ نیا ہاس کچھ دکھری ہی طبیعت کا

مالک تھا۔ خواتین سے دبا کر کام لینا اور پھر بھی خوش نہ ہونا بلکہ لعن طعن سے نوازا نا اس کا تیرہ تھا۔ یک دم تیل

کی آواز پر وہ چونکی..... اور اس نے ایک گھری سانس خارج کر کے فائل کو میز سے اٹھایا اور ہاس کے آفس میں چلی گئی۔

”بی بی گھر جاؤ، چولہا جھونکو، بچے پالو، یہ ہے تمہارا رول..... یہاں جھک مارنے آئی ہو.....“ وہ

فائل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ”سراسر بڑھ تو لیجیے۔“ وہ منمنائی۔

وہ شہادت کی انگلی سے کان کو کھینچتے ہوئے ماہنامہ پاکیزہ

اور پہچان بتا دیتا ہے۔ جس عورت پر اس کی مہر ثبت ہو جاتی ہے تا محرم اس کے سائے سے بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔“

”سر آپ نے مجھے سمجھنے اور پرکھنے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ وہ اپنی آشفستہ ہمت کو بحال کرتے ہوئے بولی۔

باس نے اجنبی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اسے نتیجہ تک پہنچنے میں ذرا سی دیر نہ لگی تھی۔

”تم سچ کہتی ہو۔“ وہ ایک دم سے کندھے اچکا کر بولا۔ ”میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے، تم کہاں سے آئی ہو، کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنا چاہتی ہو، کچھ تو فیصلہ

کیا ہوگا اس فیلڈ میں قدم رکھتے ہوئے۔“ وہ زہر آگئیں لہجے میں بولا۔ ”جہابی عورتوں کا نامحرم مردوں میں کیا

کام؟ جاؤ اپنا راستہ نا پو۔۔۔۔۔“ وہ جواب بالصواب سے قاصر اس کھسکے ہوئے لباس کی طرف دیکھنے لگی۔ جس کی

عمر پچاس سال کے لگ بھگ تو ضرور تھی۔

وہ بری طرح (ریزہ ریزہ ہونا) disintegration کے جان لیوا عذاب میں گرفتار ہوتی آفس سے باہر نکل گئی۔

”یہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ یہ نہیں جانتی کہ ہمارے ساتھ کام کرتے وقت ایک گولڈن رول کو۔۔۔۔۔ منظر نہ رہیں تو نوکری سے چھٹی۔۔۔۔۔

acceptance میں ہی تمہاری کامیابی ہے۔ بے وقوف عورت سمجھ جاؤ کہ یہ نوکریاں کیسے کی جاتی

ہیں۔ ترقی کیسے ممکن ہے؟“ وہ اس کے زہل پر گویا بیج و تاب کھا رہا تھا۔

☆☆☆

آج نرم و گداز بستر کس قدر سخت محسوس ہو رہا ہے جیسے پتھر کی چٹان کے اوپر کانٹوں کی چادر۔۔۔۔۔ یہ

بے وجہ نہیں۔۔۔۔۔ ایسے ہی تو نیندیں نہیں اڑتیں آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ وہ اپنی سانس روکتی اور پھر اسے

کمرے کے اندھیرے میں تحلیل کرنے لگتی۔

”لوگ مجھے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ میں بے حد

مطمئن عورت ہوں، ہر وقت ہنسی مسکراتی نظر آتی ہوں۔ لوگو! درحقیقت، ایسا نہیں ہے۔ جب محبت غیر مستحکم اور بے یقینی کے عالم میں گرفتار ہو جائے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور لبوں پر خون میں لبریز مسکان بھری رہتی ہے۔ ظاہر اور باطن کے تصادم کا شور شرابا کسی کی سماعتوں تک نہیں پہنچتا۔۔۔۔۔ یہی تو خوش قسمتی ہے میری کہ کسی کو میرے اصل حالات کی خبر نہیں۔“ وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے نکلی اور لاؤنچ میں صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ تاریکی میں اس کے من کی مشعل روشن ہوئی۔۔۔۔۔ اور ذہن میں ماضی کے نقوش ابھرنے لگے۔

☆☆☆

آدم کے غیر متوقع سوال پر وہ چونکی اور اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ تو وہ گویا ہوا۔

”سچ کہوں گا۔ اس رب کی قسم سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ I love you, I love you“

”گھساٹا اظہار۔۔۔۔۔ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ کوئی نئی بات کرو۔۔۔۔۔ کسی نئے انداز سے۔“ وہ مسخرانہ لہجے میں بولی۔

”اوکے تو سنو۔۔۔۔۔ ذرا غور کرنا میری سچائی پر کہ جب میں نے تمہیں یونیورسٹی میں پہلی بار دیکھا تھا تو

مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کے اندر کسی نے ایک بیج پھینک دیا ہے۔۔۔۔۔ اور ذہن ماؤف ہونے لگا ہے۔ سر

چکرانے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔“ وہ سرشار انداز میں بولا۔

”گڈ ون۔۔۔۔۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“ وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولی۔

”پھر دل کی نرم ملائم زمین میں بیج کھیتا چلا گیا اور پھر بہت جلد اگلے ہی لمحے میرے وجود کی حرارت

اور گرمائش سے بیج سے ننھی منی کونپل نے ذرا سا سر نکالا۔۔۔۔۔ کیونکہ جب زمین میں کاشت کی جاتی ہے تو

پھر پانی کے ساتھ روشنی، ہوا اور دھوپ کی اشد ضرورت ہوتی ہے ناں۔۔۔۔۔ جو بیج دل کی زمین پر گرتا ہے۔ اسے

فصل محبت

”بات ہو رہی تھی کاشتکاری کی، فصل محبت کی اور تم کس لیے کچھ زیادہ ہی فری ہو رہے ہو..... ذرا درخت کو تیار تو ہونے کا موقع دو“ وہ ہتھکڑی لگا کر بولی..... اور موہاں پر نظریں جھکا دیں۔ میٹج کرتے ہوئے اس نے کافی کا آڑو ریا پھر اس کی طرف دیکھ کر ہنس دی۔

”اتنی آسانی سے درخت کا سایہ نصیب نہیں ہوتا۔ ذرا اس کی پرداخت کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ویسے بعض بائیں اشاروں کنائیوں میں کی جاتی ہیں لیکن حقیقت کچھ اس انداز سے وارد ہوتی نظر آتی ہے کہ یقین کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔“

”تم نے سو فیصدی سچ بولا ہے۔ لیکن اب ذرا دلچسپی سے سنو..... سو فیصدی سچ کہنے جا رہا ہوں..... تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔ اور ڈگری کے ساتھ ہی شادی کی ڈگری بھی حاصل کرنے کا پروگرام خاصا روشن ہے۔ بس صرف دیر ہے بیچ بھینکنے والی ہستی کی رضامندی کی۔ پھر دونوں کا فیصلہ ای کے گوش گزار اچانے گا.....“ الوینا کے چہرے کا رنگ ذرا کی ذرا بدلا لیکن منجمل گئی۔

”شادی کا پروگرام گاڑی خریدنے کے مترادف لگ رہا ہے جیسے شوروم جا کر گاڑی کو ٹھوک بجا کر دیکھا..... رنگ اور ماڈل پر لمحے بھر کو سوچا..... اور ماڈل کی ساکھ اور مقبولیت پر بھر دوسا کرتے ہوئے اس میں سواری کر لی؟“

”تم نہیں سمجھو گی..... میں جب سے اس یونیورسٹی میں آیا ہوں تب سے دل میں ایک دیرینہ خواہش پھڑکنے لگی ہے کہ تمہاری مہر ای میں ورلڈ ٹور پر نکل جاؤں..... ایسی بے انت چاہ..... اودہ مائی گاڈ..... اب یہ بتاؤ کہ اپنی نجی، وکھری محبت کو اور کس نئے انداز میں پیش کروں..... لفظوں کو تو خوب چتا ہے میں نے..... یہ تو مان جاؤ ناں.....“

”نیا انداز تھوڑا بہت دل کو بھایا گیا ہے۔“ وہ پھر مذاقاً بولی۔

”لیکن لفظوں سے سچ کی پرداخت کیسے ممکن ہے؟“

”الوینا آئی ایم سیریس..... اور تم ہو کہ اس فصل

جسم کی حرارت اور مثبت سوچ کی بارش کی ضرورت ہوئی ہے، سمجھیں کہ نہیں۔“

”نہیں سمجھی ارے بھائی..... کاشتکاری کس فصل کی..... گندم یا چاول کی یا کسی اور اناج کی۔ کھل کر بتاؤ..... پہیلیاں بوجھنے سے مجھے بہت نفرت ہے۔“

”کونسو..... کاشتکاری، فصل محبت کی..... جب محبت کی فصل تیار ہو جاتی ہے ناں تو روح کو طمانیت مل جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی بتائے دیتا ہوں..... کہ اس کی جڑیں کتنی گہری ہوتی ہیں اس کا تمہیں اندازہ ہے کہ نہیں سچ، سچ بتانا۔“ وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

”نہیں جانتی بابا.....“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”میں بتاتا ہوں۔ الوینا ٹیکم، گندم اور چاول کی فصل کی جڑیں مضبوط اور گہری نہیں ہوتیں۔ فصل اٹھتے ہی کسان ہل چلا دیتا ہے۔ اور جڑوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے مگر فصل محبت کی جڑیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ کائنات تو پھر سے کوہل بھوٹ پڑتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت بن جاتا ہے جس پر خوشبودار پھول کھلتے ہیں اور خوش ذائقہ پھل بھی..... اور جب ہم اس سرسبز سایہ دار تناور درخت کے نیچے سستانے بیٹھتے ہیں تو پھر دودل خوشبوؤں میں نہا جاتے ہیں۔“ وہ اس کی خوب صورت نقاشی آنکھوں میں کم ہوتے ہوئے بولا۔

”فصل محبت کے پھولوں کی مہک کا کیا کہنا؟“

”او کے یہ ہے فصل محبت..... یعنی ایک تناور درخت کا نام ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ بھئی ہمارے لان میں ایسے تناور درختوں کی کمی نہیں۔“ وہ چمپڑنے کے انداز میں بولی۔ ”کسی دن تشریف لانا..... دونوں ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر لطف اندوز ہوں گے۔“

”ہاں..... وہ لوگ بہت خوش بخت ہوتے ہیں جنہیں اس درخت کے نیچے سستانے کا موقع مل جاتا ہے۔“ وہ کیفے ٹیریا میں کرسی اس کے قریب ٹھینٹے ہوئے پُر امید لہجے میں بولا۔ تو الوینا نے اپنی کرسی اس سے دور کرتے ہوئے کہا۔

محبت کے بیج کو میرے دل سے کھرچ کر نکالنے کے درپے ہو..... ویری بیڈ..... کبھی تو سنجیدگی سے بات سن لیا کرو۔“ وہ ہراسا منہ بنا کر بولا۔ ”ہر بار اس اہم موضوع کو مذاق میں اڑا دیتی ہو۔“

”ایسی بات نہیں دراصل آج کل محبتیں اور چاہتیں دل کی زمین میں نہیں آگئیں۔ تم کس دور کی بات کرتے ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”کوئی نئی بات کرو نئے زمانے کی۔“

”تو تم تھوڑی وضاحت کر دو..... ذرا میں بھی تو سنوں.....“ وہ ہمد تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں ہیرے نے کافی کے دو کپ اور دو عدد پیسٹری ان کے سامنے رکھ دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کپ اٹھا کر سوچتے ہوئے ایک چسکی لی۔

”مجھے پارینہ قواعد و ضوابط پر قطعاً یقین نہیں..... کیونکہ آج کے ماڈرن دور میں عورت نے خود کو بدلا تو زمانہ بدل گیا۔ اس کریڈٹ سے مرد تو فارغ ٹھہرے۔“

”اب ہیرا، نگاہ والی سکتی تڑپتی ناکام محبت کرنا تو ہے ہی بے وقوفی اور جہالت.....“ وہ فخریہ انداز میں بولی۔

”اوہو میں ہار مانتا ہوں..... ناممکن، حقیقت نہیں ہوتی۔ یہ تمہاری طرز سوچ ہے۔ تمہارا رویہ اور سلوک ہے۔ محبت کو ممکن بنانا بھی تمہارے اختیار میں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اور ناممکن بنانا بھی تمہارے لیے قطعاً مشکل نہیں۔“

”منطقی باتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اور سیدھی باتیں تمہیں دیا نوسی لگتی ہیں۔ نیا اندازِ بیاں منطقی لگتا ہے، کچھ سمجھا نہیں۔“ وہ جڑبڑ ہو کر بولا..... ”بہت مشکل پسند لڑکی ہو۔“

”میں نے آج کی نوجوان نسل کو بھی پرانے دور کی پزیرائی اور مدح سرائی میں زمین، آسمان کے قلابے ملائے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہے۔ میرے اپنے خاندان میں بھی ایسے

نوجوانوں کی کمی نہیں اور سب سے بڑھ کر میری اپنی آپا..... وہ تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ ہر وقت میرا موبائل چیک کرتی رہتی ہیں۔ جب موقع ملتا ہے آئی پیڈ پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ جبکہ وہ جانتی ہیں کہ میں محبت کے گمن چکر میں پھنسنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ انہوں نے خود تو اپنے کزن سے ہنستے مسکراتے شادی رچا لی..... نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔ اور تین بچے بھی پیدا کر دیے..... اور اب شوہر کی ہاتھ بندھی غلام بننے پر فخر سے تیار رہتی ہیں۔ تمام آزمائشیں میرے لیے کھڑی کرنے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ گھر والے مجھے انقلابی کہہ کر ہر وقت میرا دماغ کھاتے رہتے ہیں۔“ وہ فکر مندانہ لہجے میں بولی۔ ”وہ اس حد تک فرمانبردار..... اور میں پرلے درجے کی انصاف پسند لڑکی..... انقلابی ہی تو ہوئی ناں.....“

”اس میں فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں جو سامنے ہے اس کے بارے میں سوچو اور جلد از جلد فیصلہ کرو..... آخر نئے دور کی نمائندگی کرنے میں ہمیشہ پیش، پیش رہتی ہو۔“ وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”خواہ مخواہ تم نے اپنی زندگی میں مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔ ایک تابعدار بیٹی ہو کر سچی محبت کرنے والے کی زبان پر یقین کرو اور اپنا گھر بسالو..... جیسے سب بساتی ہیں ویسے..... اگر اجازت دو تو کل می کو تمہارے گھر بیچ دوں؟ یونیورسٹی بھی تو ہمیں نکالنے پر تلی ہوئی ہے۔ نوکری ہماری منتظر ہے اور اس کے بعد کا قدم ہے، شادی خانہ آبادی..... ڈھول باجے، مہندی، مایوں، رحمتی، ولیمہ ہنی مون، آہا مزے کے دن آنے والے ہیں۔“

”وہی پرانے رسم و رواج کہ لڑکی دیکھنے لوگ آرہے ہیں بن سنور کر نمائش کے لیے تیار ہو جاؤ..... یہ سب ڈراما میرے ساتھ نہیں ہوگا..... تم سن لو.....“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کس طریقے سے حاصل کیا جائے۔“ وہ پیسٹری کھاتے ہوئے بولا۔

غزل

مشکل پڑی تو لوگ بھی سارے جدا ہوئے
آنکھوں سے اس لیے بھی ستارے جدا ہوئے
غربت جو میرے آنگن میں آکر ٹھہر گئی
مشکل گھڑی میں ہم سے ہمارے جدا ہوئے
تم کو بھی زخم شاید ہماری طرح لگے
تم پہ بھی وقت آیا تمہارے جدا ہوئے
دریا کے پار ہم بھی تو ٹھہرے تھے اس گھڑی
دیکھے تھے ہم نے جب بھی کنارے جدا ہوئے
گھر سے نکل کے روزی کمانے گئے فری
واپس بھی نہ آئے وہ پیارے جدا ہوئے
کلام: فریدہ جاوید فری، اسلام آباد

ہوتی اور چلے ہیں محبت کی پتیلیں جھولنے اور شادی
رچانے..... شادی لطیفہ نہیں کہ پل بھر کو پاگلوں کی
طرح ہنس لیا اور پھر اس لطفے کو بھول گئے۔ ”وہ نخوت
سے بولی اور وہاں سے اٹھنے لگی تو آدم نے اس کا ہاتھ
پکڑ لیا۔ گردو پیش بیٹھے ہوئے کئی لڑکے، لڑکیاں۔۔۔
چہ گوئیاں کرنے لگیں۔ جب ایک زہر کے نشتر میں ڈوبی
ہوئی آواز الوینا کے کان میں پڑی تو وہاں رک گئی۔

”یہ کون ہے، جس نے کہا کہ ”حجاب کے در پردہ
محبت کی رنگ رلیاں۔“ کانوں کو چیرنی اس کی آواز پر
سب کھیلانے ہو گئے..... اور وہ ان سب کو ایسے گھورتی
رہی گویا کھائی جائے گی۔

☆☆☆

”ممی میں شادی اس وقت تک نہیں کروں گی
جب تک آپ پر اپنی میں میرا حصہ میرے نام ٹرانسفر
نہیں کرائیں گی۔“ وہ مستحکم انداز میں بولی۔
”بیٹا آرام سے میری بات سنو..... تمہاری بڑی
بہن کی شادی ہماری مرضی کے مطابق ہوئی۔ اپنی
حیثیت و بساط کے مطابق اسے جہیز دے کر رخصت

”شادی تو ہوگی نہایت سادگی سے نہ اعلیٰ
لبوسات، نہ قیمتی جیولری، نہ جوتے، پرس لاکھوں کے۔
مسجد میں نقد حق مہر پر نکاح، براتیوں کو شربت کا گلاس
اور ایک مہجور دیش لٹ..... یہودہ رسم و رواج کو خیر باد
اور اسلامی قانون کے مطابق نئی زندگی کا جہاں آغاز
ہو، شادی وہاں ہی کروں گی۔ یہ محبت وغیرہ سب
بکواس شے ہے۔ میں اس بے وقوفانہ عمل پر قطعاً
بھروسہ نہیں کرتی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی..... تو وہ
خاموش ہو گیا..... اور کافی پیتے ہوئے اس نے خاصا
وقت لگا دیا جو لڑکی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے وہ
اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام ہی رہتی ہے۔
”کیا سوچ رہے ہو؟“ وہ اسے سوچ کی گہرائی
میں دیکھ کر بڑی اپنائیت سے بولی تو وہ چونک کر اس کی
طرف دیکھنے لگا۔

”الوینا آئی لو یو..... لیکن تمہارے خیالات سے
مجھے اتفاق نہیں۔ میرا اور تمہارا تعلق مڈل کلاس سے
ہے۔ اپنا گھر اور کچھ نہ کچھ شہری پر اپنی بھی ہے۔ گزر
اوقات اللہ کے فضل سے بہترین ہے۔ یہ ہماری کلاس
ہی تو ہے جو اپنے کلچر کو قائم رکھنے میں کمال کا کردار ادا
کرتی ہے۔“ وہ فکر مند انداز لہجے میں بولا۔

”میری یہ بات اپنے پلے خوب کس کر باندھ لو
الوینا تمہارے اس رویے اور خیالات سے کوئی بھی
اگیری نہیں کرے گا۔“

”نہ کرے..... میں کون سا کسی کی منت سماجت
کرنے جا رہی ہوں، تم اس کے بارے میں کچھ نہیں
جانتے۔ قرآن کریم میں کلاس کی تفریق نہیں کی گئی۔
عورت کے بے تحاشا حقوق کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا
گیا ہے۔ عورت مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہو، لوئر کلاس
سے یا اپر کلاس سے..... عورت کے حقوق برابر ہیں۔
پہلے سورہ نسا اور سورہ نور پڑھو۔ اس کے معنی اور ان کی
گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرو پھر محبت کا اظہار
کرتا..... اور شادی کا فیصلہ کرتا..... ایک تو پاکستانی مرد
لو حقوق نسواں اور آزادی نسواں کی رتی بھر شد بد نہیں

کر دیا۔ اس نے تو ایسی بیہودہ ڈیماٹڈ کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ تم تو بہت ندیدی ہو کر حصے پر اتر آئی ہو۔ بھول جاؤ حصے و حصے کو۔“ ماں اس کے خیالات سن کر دہل گئی۔

”وہ ہے یسریٰ اور میں ہوں الوینا۔ دو مختلف قسم کی شخصیات ایک دوسرے سے نوے ڈگری فرق..... پلیز مجھ سے اس قسم کی توقع رکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں..... میں جو بھی ڈیماٹڈ کر رہی ہوں جائز ہے..... میں اپنے ہاتھ پیر کٹوا کر پرانے گھر چل پڑوں گی۔ یہ آپ کی سوچ ہے۔“

”ایک طرف تو نئے زمانے اور نئے خود ساختہ قوانین کی بات کرنی ہو۔ دوسری طرف ہزاروں سال پیچھے چلی جاتی ہو۔ مجھے تمہاری پرنسٹن کا یہ تضاد سمجھ نہیں آتا۔ ہمیں پاگل کر دیا ہے تم نے..... خبردار جو جائداد کی تقسیم کی بات بھائیوں کے سامنے کی۔ وہ تمہیں لان میں دبا کر اوپر درخت لگا دیں گے۔ میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی۔“

”نمی میں نے جو درس سیکھا ہے ناں وہ ہے حقوق نسواں کے لیے بھائیوں کے دو بدو کھڑے ہو جانا۔ اس نئے دور میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے احکام کی پزیرائی نہ ہو تو کیا فائدہ ان درس و تدریس کا..... میں نے قرآن کریم کا ہر لفظ سمجھ کر پڑھ لیا ہے۔ اب..... بے وقوف نہیں بنوں گی۔ ہمیں حقوق کے لیے ثابت قدم ہونے کا جو درس قرآن کریم کے احکامات کو مدنظر رکھ کر دیا ہے۔ سو فیصدی درست ہے۔ ذرا اس پر غور تو کریں اور اپنے حقوق کے لیے آپ بھی کھڑی ہو جائیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ پھر دیکھیں کہ اپنے ہی گھر میں ڈروہم کر زندگی کے دن پورے نہیں کریں گی۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ”نمی زندگی کو مزے میں سکون سے گزاریں۔“

”میں تمہاری طرح پاگل نہیں ہو گئی ہوں..... خالہ کے گھر رشتے سے تم نے انکار کیا۔ ہم نے مان لیا۔ اب شادی کرنے کی شرط ہے کہ پراپرٹی سے اپنا حصہ بٹورنا، ہمارے خاندان میں اس قسم کے رواج نہیں ہیں۔ اس

لیے اس انقلابی آواز کو اپنے من میں ہی دفن کر دو۔“

”میں معاشرے، خاندان اور اس گھر کے رواجوں اور اصولوں کی بات نہیں کر رہی۔ میں رب العزت کی اس کتاب کی بات کر رہی ہوں۔ جس میں آپ کو اور مجھے گوشت پوست، خون، پانی اور جذبات و احساسات سے بھر پور انسان سمجھ کر قوانین کے مطابق چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان احکامات سے انکار کا مطلب ہے کفر، گستاخی اور زیادتی.....“ وہ نرمابھٹ سے بولی۔ ”نمی فدا سوچے کہ ہمارے رب نے ہم پر زندگی تنگ نہیں کی..... بلکہ اسے آزادی اور وسعت بخشی ہے۔ اور ہم کس قدر جاہل اور اناڑی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہونے کے بجائے خود ساختہ پابندیوں اور قید و بند کی صعوبتوں میں زندگی گزارنے کے لیے تیار ہیں۔ وہاں اس مرد کی پکڑ نہیں ہوگی بلکہ ہمیں جہنم رسید کر دیا جائے گا کیونکہ ہم نے اپنی زندگی کے ساتھ انصاف نہیں کیا..... آپ کو اپنی بہن کا بیٹا پسند ہے تو سو بار ہو اور بار، بار ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے آدم پسند ہے، یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھا۔ اس نے آخری دنوں میں مجھ سے رشتے کی بات کی تھی..... لیکن میں نے ٹال مٹول سے گلو خلاصی حاصل کر لی تھی۔ دو سال تک اس کا مجھ سے رابطہ رہا۔ میں قرآن کریم یا ترجمہ پڑھ کر عورت کے تمام حقوق اسے گوش گزار کرتی رہی..... اور وہ سنتا رہا۔ اگر میں غلطی پر ہوتی تو وہ مجھے کب کا بھول چکا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا..... اس نے بھی قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا۔ بند ذہن کی گرہیں کھول کر تمام شرائط ماننے کے لیے تیار ہو گیا ہے جو ناجائز اور غیر مناسب نہیں ہیں۔ آج کل وہ آپ سے بات کرنے آ رہا ہے۔ اسے پہلے چکر میں ہی ہال کر دیتیجئے گا اور شادی مسجد میں نقد حق مہر کے عوض نکاح اور شربت کے گلاس پر..... میں مجبوراً اور ہاری ہوئی مسکراہٹ کے ہمراہ رخصت نہیں ہونا چاہتی۔ اس میں کردار کی مضبوطی پہلی اولین شرط ہے۔ اس میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ لمبی چوڑی

بھی مجھے دے سکتا ہے سو بسم اللہ میں راضی برضا ہوں۔“ وہ ماں کے گلے میں بازو جائل کر کے بولی۔
”ممی لی پریکٹیکل آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں اگر آپ میں سے کسی نے کسی قسم کی کوئی جاہلانہ حرکت کی تو میں حیرت اور تاسف سے ہی مر جاؤں گی۔“

”کرتی ہوں تمہارے بھائیوں سے بات دیکھنا کہ تمہاری ڈولی میں مجھے بھی بٹھا کر رخصت کر دیں گے۔“ وہ پشمر دگی سے بولی۔ ”عورت کی تو تراخ ہمارے معاشرے میں نہیں چلتی۔“

”ذرا تجزیہ کریں اس صورت حال کا کہ آپ کو گھر سے نکالنے کی نوبت کیوں آئے گی؟“ وہ المناک لہجے میں بولی۔ ”جبکہ آپ میری جائز خواہش کا اعتراف کریں گی۔“

”مجھے نہیں معلوم.....“ وہ منمنائیں۔
”میں آپ کو بتاتی ہوں کیونکہ آپ دو بیٹے، دو بیٹیاں پیدا کر کے بھی تہی درست ہیں۔ آپ نے تمام عمر ڈیڑی کی خدمت کی اور سسرالی رشتوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ پھر بھی غیر محفوظ رہیں۔ آپ کا ساتھ کوئی بھی پیارا نہیں دے گا کیونکہ یہ گھر آپ کا نہیں..... عورت کا پیدائش سے لے کر مرتے دم تک کوئی گھر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا فرمان نہیں ہے۔ یہ اس کے بندوں کے فیصلے ہیں ممی..... آپ ایک زمیندار گھرانے کی اولاد ہونے کے ناتے کل ڈیڑی کی اور آج بچوں کی محتاج کیوں ہیں.....؟ نہ چھت ہاتھ میں، نہ کوئی ہنر اور نہ ہی جیب میں پھوٹی کوڑی..... ذرا سوچ کر بتائیں ممی.....“ وہ نہایت نرمی سے بولی۔

”ہاں بیٹا..... کیونکہ میں نے نہ تو حق مہر نقد لینے کی ضرورت محسوس کی تھی نہ ہی سیکڑوں ربووں پر شتمل ابا کی جائداد سے شرعی حصہ مانگا تھا۔ تہی دست ہی اس پرائے گھر میں آگئی اور تہی دست ہونے کے احساس میں عمر بھر ہر زیادتی اور بے انصافی پر مرجاں مرنج ہونے میں عافیت سمجھتی رہی۔ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی؟“ ماں نے اسے گلے لگا کر کہا۔

تمہید باندھ کر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”ہاں ممی اس سے پہلے میرا حصہ میرے حوالے..... ٹھیک ہے ناں.....؟“

”میں تمہاری تمام بکواس سن رہی ہوں..... اس قدر باغیانہ سوچ اور لالچ میں تو حیران ہوں کہ تم میری بیٹی کیسے کہلا سکتی ہو..... ناز و نعم میں پالنے کے نتیجے میں سب تم تو خاندان بھر میں ناک کنوا کر ہی دم لوگی اور یہ جودو بھائی ہیں ناں تمہارے جن کی تم چیتوی اور لاڈلی بہن ہو، ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جائیں گے۔ ان کے سامنے یہ منطقی اور حقیقت پسندانہ دلائل ناکام ہی رہیں گے اس لیے چپ کار روزہ رکھو اور اپنے گھر جاؤ۔“

”ممی، آدم حق مہر میں تھری بیڈروم فلیٹ میرے نام کر رہا ہے جس کے کرایے پر میرا حق ہوگا۔ جن کی میں چیتوی اور لاڈلی بہن ہوں ان سے کہیں کہ شریعت کا احترام کرتے ہوئے مجھے مضبوط اور پائدار بنا کر غیروں کے حوالے کریں نہ کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کے آگے ڈال دیں۔“ وہ ماں کے ہاتھ پر بوسہ دے کر بولی۔

”یہ جو تم نے تعلیم حاصل کی ہے، لاکھوں کا جہیز اور شادی کا خرچہ الگ..... یہ سب کیا ہے؟ تمہارے حصے کے پیسوں سے ہی تو ہوا۔ مزید کون سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ایک لاکھ تنخواہ اور یہ گاڑی، یہ بھی تو اسی تعلیم پر خرچ کرنے کی وجہ سے تمہاری آسانی اور سہولت کا سامان نہیں۔“ ماں نے تڑی سے احسان جتلانے کی کوشش کی۔

”ممی تعلیم و تربیت تو آپ کے فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ باقی جہیز جیسی لعنت آپ اپنا نام و ناموس اونچا کرنے کے لیے میری زندگی میں داخل کر رہی ہیں۔ مجھے یہ شوبازی نہیں چاہیے۔ اگر رسول اکرم کی بیٹی کا جہیز صرف لوٹا اور جانماز ہو سکتی ہے تو کیا میں حضرت فاطمہؑ سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ہوں..... نعوذ باللہ..... مجھے جہیز میں قرآن کریم، جانماز اور لوٹا ہی چاہیے۔ میں جس کے گھر جا رہی ہوں ناں وہی میرے نان و نفقے کا ذمہ دار ہے۔ اپنی بساط کے مطابق وہ جو

”مئی، قرآن کریم اس دین و دنیا کے تمام اصولوں سے آگاہی دیتا ہے۔ یقین جانیں اگر عورت اللہ کی اس مقدس کتاب کی صرف دو سورتوں کے ہر لفظ کو سمجھ لے تو زندگی آسانی اور خوشحالی میں بیت جائے۔ گھروں میں ہر وقت کا کھچاؤ اور تناؤ ہمیشہ کے لیے رفو چکر ہو جائے اور ہمارے گھر جنت کا گہوارہ کہلانے لگیں۔ بس اب ہمت ہم نے پکڑنی ہے مئی..... ہم غلطی پر نہیں ہیں۔“

☆☆☆

شادی الوینا کی پسند و خواہش کے مطابق سر انجام پائی۔ والدین کی طرف سے بھائیوں نے طوعاً و کرہاً اسے شرعی حصہ سوئپ دیا لیکن قبضہ اپنا ہی برقرار رکھا۔ آدم نے فلیٹ اس کے نام کر دیا تھا لیکن کرایہ مئی کی جیب میں جاتا رہا۔ سسرال میں اسے جوائنٹ فیملی سسٹم میں گزارہ کرنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی لحاظ داری میں دو سال گزر گئے۔ آخر ایک دن اس نے اپنے فلیٹ میں شفٹ ہونے کا اعلان کر دیا تو گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ الوینا نے اس سب کے لیے کیا کیا سہا یہ الگ داستان ہے کرایے دار کو فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس دے دیا گیا تھا۔ جونہی فلیٹ کی چابی اس کے ہاتھ میں آئی۔ اس نے اپنے آفس میں کام کرنے والوں کی خدمات حاصل کیں اور فلیٹ ایک ہفتے کے اندر وائٹ واش بھی ہو گیا اور سچ دھج بھی گیا۔ اپنے فلیٹ میں پہلی رات گزارنے سے قبل اس نے آدم کو ایک محبت بھری ای میل بھیجی۔

”آدم آج ہم دونوں اپنے فلیٹ کی انسپیکشن کے لیے جا رہے ہیں۔ کرایے دار، چابی میرے آفس پہنچا گیا ہے۔ آئی لو یو آدم! چٹھی کے بعد میرے آفس ہی آ جانا۔ ہائی ٹی کے لیے کسی فائیو اسٹار چلیں گے۔ اور پھر ہم اپنے فلیٹ پر جائیں گے۔“ آدم ہائی ٹی کا پڑھ کر چونکا کہ وہ تو اس قسم کی فضول خرچیوں کے اس قدر خلاف ہے کہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔ آج اتنی مہربانیاں اور نوازشیں کیوں؟ یہ سوچتے ہوئے وہ معمولی سا فکر مند ہوا کہ پراپرٹی ڈیلر سے آج تو نہیں

کل بات کروں گا..... نہ جانے کتنے مہینے فلیٹ خالی پڑا رہے۔ اس کا کرایہ تو امی کی جیب میں جاتا تھا۔ اب مجھے اپنی تنخواہ میں سے امی کو خوش کرنا پڑے گا۔ خیر جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا سب سے پہلے تو اپنی بیگم کی دعوت کو خوب انجوائے کروں..... جو شادی کے بعد پہلی بار مجھے دی جا رہی ہے۔ اسے یہ سوچ کیسے آگئی کہ کبھی نکھار میاں، بیوی بھی تو مل کر ریٹورنٹ جاتے ہیں۔ ذائقہ بدلنے کے لیے ہی سہی۔ ماحول بدلنے کے لیے ہی سہی، چلو کچھ بھی ہے شاید میری محبت کا اثر ہے کہ اس کی خشک مزاجی دھیرے، دھیرے کا نور ہونے لگی ہے۔ وہ گنگنا تا ہوا اپنے آفس سے لکھا تو کئی کو لیکڑنے اس کی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔

☆☆☆

فلیٹ کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی آدم نے اچنبھے سے سلیپے وقرینے سے سجے ہوئے کاریڈور کی طرف دیکھا۔ تو الوینا نے اک خوشگوار قہقہہ لگایا۔ ”کیسا لگا سر رائز.....؟“

”بہت زبردست لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی کہ تم نے نئے کرایے دار کے لیے اسے اتنا سجا دیا۔ یہاں فرنشڈ گھروں کا رواج نہیں..... جس نے بھی بے وقوفی کی وہ ہمیشہ ہی پچھتایا۔“ وہ حیرت و افسوس سے کمروں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا..... تو وہ پھر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر بولی۔

”آج سے ہم اسی گھر میں رہیں گے مائی لو۔“

”وہ کس لیے..... امی کی اجازت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ بے ساختگی سے بولا۔ ”اور اس فلیٹ کا کرایہ بھی وہی وصول کیا کرتی تھیں۔ آخر انہوں نے رشتے داروں میں لین دین بھی رکھنا ہے، بیٹیوں کی ضروریات کا خیال رکھنا ہمارے ہی فریضے کے زمرے میں آتا ہے۔ گھر میں پوتے، پوتیوں کی ڈیما انڈر، داوی پوری نہ کرے تو تم کر دو گی۔“

”یہ تو ناممکن ہے آدم کہ وہاں رہوں۔ کہاں لکھا ہے کہ مجھے سسرال میں ہی جل بھن کر زندگی گزارنی

فصل مصیبت

وہ اس کے قریب بیٹھ کر زماہٹ سے بولی۔ ”تم ایک اچھے انسان ہو۔ اپنے عہد کی خلاف ورزی مت کرو۔“

”بھئی الگ تھلک رہنے کا عہد میں نے کب کیا تھا؟ تم نے حق مہر میں غلیٹ کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے فوراً یہ شرط پوری کر دی جبکہ امی اور تمام رشتے دار اس کے خلاف تھے۔ ہمارے خاندان میں ایسا آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور نہ ہی تمہارے خاندان میں ایسا ہوا ہوگا۔“ لہجہ ہنوز غصیلہ ہی تھا۔

”اب میں نے اس قرآنی حکم کی شروعات کر دی ہے۔ اب دیکھنا کہ ہر لڑکی اپنے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو جائے گی۔ بھائیوں نے طوعاً و کرہاً دس دکانوں میں سے ایک دکان میرے نام کر دی ہے۔ جبکہ میرا حصہ زیادہ بنتا تھا۔ اس پر بھی قبضہ تو ان کا ہی ہے۔ میں نے اپنی دکان خالی کر کر اپنے دار کو دے دی ہے۔ اب کرایہ میرے ہاتھوں میں آئے گا۔ اسی کی پگڑی کی رقم سے میں نے اپنا گھر سیٹ کر لیا ہے۔ گھر کی چار غیر ضروری چیزیں جہیز کی صورت دے کر بہت بے وقوف بنالیا، ان میکے والوں نے۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”تمہیں اب اپنے اس روپے سے سمجھ تو آگئی ہوگی کہ عورت کو مالی طور پر کمزور کیوں رکھا جاتا ہے؟“ وہ غصے سے لال بھجھوکا ہوتے ہوئے بولا۔

”اس لیے کہ وہ خود مختار ہو کر اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کے خود قابل نہ ہو جائے۔ آدم میں نے کوئی بھی نیا کام نہیں کیا بلکہ کوئی غلط کام نہیں کیا..... ہم نے ہی احکامات الہی کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنے، اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے جن کے نتائج بھی بھگتے تھے۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے قانون کے مطابق چل رہی ہوں۔ میں نے تمہارے گھر والوں کی عزت و احترام کرنے سے انکار تو نہیں کیا ہے۔ پھر اعتراض کیوں؟ آدم تم بتاؤ کہ میں ان قوانین سے ایک انچ بھی آگے پیچھے ہوئی ہوں۔ پردہ، حجاب، ہر م و حیا اور کردار کی مضبوطی میں تم نے مجھے کہیں بھی کمزور دیکھا ہو تو

ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑنے لگی تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ سٹ پٹا کر پرے ہٹ گئی۔ اب وہ انگریزی جھاڑنے پر آگئی۔ ”کہاں گئے تمہارے وعدے اور میری شرطیں.....“

”مجھے تم سے والہانہ محبت ہے۔ اس لیے میری اس بات پر یقین کرو کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم سے شادی کر کے عمر بھر تمہارے سنگ رہنا چاہتا ہوں۔“ آدم کی آنکھوں میں انتہائی حیرت سے سرخی دوڑ گئی۔ وہ لحظہ بھر اسے دیکھتے ہوئے بچن کی طرف بڑھ گیا۔ حقارت و نفرت کا اک طوفان اٹھا اور اس نے چو لھے پر رکھی ہوئی کیبل کو فرش پر دے مارا.....

”ایسا بھی نہیں ہوگا۔“ اس نے فریج کھولا تو وہ

بھی کھانے پینے کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔

”خبردار جو کسی ایک شے کو بھی ہاتھ لگایا۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ فریج بند کرتے ہوئے چیخی۔

”اس وقت تم ہوش میں نہیں ہو۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اس میں قصور وار تم نہیں ہو، میں ہوں۔ میری بات غور سے سنو کہ یہ کہاں لکھا ہے کہ اپنے تمام رشتے داروں سے کٹ کر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی جائے۔ اس زندگی میں انسان مل جل کر نہ رہے تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ بے شک ہم سب کے مزاج اور طبیعتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کچھ شکایات و اعتراضات بھی لازماً ہوں گے۔ لیکن ان کو نظر انداز کر کے خوش اسلوبی سے تمام رشتوں کو بھانا ہمارا فرض ہے۔“ وہ لاؤنج میں نرم گداز صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تم پانی پیو..... غصے کو ٹھنڈا کر دھیر میں تم سے بات کروں گی۔“ وہ پانی کا گلاس اسے حملتے ہوئے بولی۔ ”انگریز میں نے شریعت سے ہٹ کر الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے تو مجھے سزا دینے کے تم محظرا ہو۔ لیکن سزا سوچ کر دینا جو قانون کے مطابق ہو نہ کہ قانون سے آزاد ہو کر۔ مجھے مجرم ٹھہرانے لگو۔ عدل سے کام لو آدم..... عدل، ظلم، زیادتی اور زور آوری میں نہیں۔“

کرنے والی، پیٹھ کے پیچھے نگہبانی کرتی ہیں، اللہ کی حفاظت سے اور جن عورتوں سے تمہیں اندیشہ ہو کہ سرکشی کا۔ تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستر پر تنہا چھوڑ دو۔ اور ان کو سزا دو۔“

”آدم، تم مجھے کس گناہ کی سزا دینے کے حقدار ہو۔ میں نے اپنے سرسالی اور میکے کے کسی رشتے دار کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا۔ فقط اپنے لیے ایسی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں جس پر میرا حق ہے اور تم بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگر اُمی اس گھر میں تنہا ہوتیں تو پھر میں الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کے گھر میں ماشاء اللہ دو بیٹے اور بہویں، چار پوتے اور دو پوتیاں ان کا دل بہلانے کے لیے کافی ہیں۔ ہم سنڈے کا دن ان سب کے ساتھ گزار لیا کریں گے۔ مہینے کے ایک سنڈے ان سب کو اپنے گھر میں کھانے پر مدعو کر لیا کریں گے۔ وہ بھی خوش اور ہم بھی شاداں و فرحاں..... ہے ناں درست..... کبھی کبھار ملنا بھیتیں بڑھاتا ہے آدم! اور میں ان کے مسائل سے بے پروا ہونے کو تھوڑی کہہ رہی ہوں۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھا کر بیٹھ گئی..... اور وہ گہری سوچ میں چلا گیا۔

الوینا وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ خوشیوں کے ہلکے لیتے ہوئے اس نے جائے دم پر رکھی اور فریج سے کباب نکال کر فرانی کرنے لگی۔ مشہور معروف بیکری کے عمدہ سینڈ وچز اور بسکٹ پلیٹ میں رکھ کر ٹرائی لگائی اور تنگنائی ہوئی ٹرائی دھکیلتی ہوئی باہر نکلی تو آدم کو غائب باکر اس نے آواز دی کروں اور ہاتھ رومز میں جھانکا تمہیں وہ نظر نہیں آیا۔ باہر کے دروازے کی طرف بھاگی، دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کاریڈور سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر آدم کی گاڑی زیرو کی رفتار سے چل رہی تھی۔ بالکل ایسے گمان ہو رہا تھا جیسے اس سے گاڑی چلانا مشکل ہو گیا ہو۔

”یہ تھی تمہاری محبت..... جس کے تم راگ الاپا کرتے تھے۔ وعدے و وعید کالج کی چوڑیاں نہیں کہ

بتاؤ.....“ وہ باوثوق لہجے میں بولی۔ ”تم مجھے کسی بات اور عمل پر پکڑ نہیں سکتے۔ میری ساکھ کے بارے میں ہر جگہ سے پوچھ سکتے ہو۔“

”تم درست کہہ رہی ہو لیکن یہ قانون ہمارے معاشرے میں نہیں چل سکتے کیونکہ صدیوں سے خود ساختہ رواج لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہو چکے ہیں، وہ ان کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتے۔ اپنے مانوس طریقوں کو چھوڑ کرنے طریقے اپنانا ان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تم اس معاشرے میں انقلاب نہیں لاسکتیں۔ بھول جاؤ ایسی باتیں..... یہ سامان کل ہی اٹھوا کر امی کے گھر پہنچا دینا۔ امی بھی خوش ہو جائیں گی۔ وہ اس گھر کے سال خوردہ پوسیدہ سامان کی جگہ تمہارے جہیز کا سامان سجانا چاہتی تھیں..... وہ خواب تو ادھر اور ابی رہ گیا تھا۔“ وہ زبردستی مسکرا کر بولا۔

”یہ ناممکن ہے آدم! میں آج کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہوں۔ اپنے دین کے اصولوں سے بھی نابلد نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ کئے ہوئے ہیں، نہ ہی میری سوچ پر تمہارا پہرہ ہے۔ میں انسان ہوں تمہاری طرح کی، مجھے بھی آزادی چاہیے۔ اپنی زندگی کے ساتھ انصاف کرنے کا مجھے بھی حق حاصل ہے۔ میرے پاس جو بھی پیسہ آتا ہے۔ وہ شریعت کے مطابق کسب معاش کا صحیح ذریعہ ہے۔ اس میں چوری، دھوکا، جھوٹ، رشوت اور سود کی ایک پائی بھی شامل نہیں..... رزقِ حلال سے ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کیوں نہ کریں۔ اس کا جواب دو۔“

”کیا یہ بھول گئی ہو کہ مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے اور جو عورتیں سرکشی پر اتر آئیں شوہر کی بات ماننے سے انکار کرتی رہیں تو ان کے احکامات بھی تو دہراؤ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ اور طفرے نشتر چلاتے ہوئے طفریہ ہنسا۔

”سورۃ نسا میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ اس بتا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کیے جو نیک عورتیں ہیں، وہ فرمانبرداری

فصل مصیبت

مہینوں پر محیط ہوتے گئے۔ تعلقات میں سکوت چھا چکا تھا۔ انہی دنوں آفس میں نئے باس کی آمد ہوئی تو ایک تبدیلی کا احساس بلندنگ میں قدم رکھتے ہی ہو جایا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی تخلیق میں ہر طرح کی فطرت کے انسان بنائے ہیں۔ پہلا باس پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار انسان تھا۔ اور آفس کے اس فرحت بخش ماحول میں خواتین کا کام آتا آسان ہو گیا تھا۔ خصوصاً جو حجاب لینے والی خواتین تھیں ان کے لیے تو کافی سہولت تھی۔ اور یہ نئے صاحب ان باپردہ خواتین کے پیچھے ہاتھ دھو کر ایسے پڑے کہ الامان..... صاف محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان خواتین کی پاکیزگی کے پرچے ان کی مجبور یوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اڑنا چاہتے تھے۔ دو تو کمپنی ہی چھوڑ گئیں۔ کچھ اسے خوش کرنے کی خاطر اس کے آگے پیچھے منڈلانے لگیں۔ لیکن کچھ خواتین اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کی پروا کیے بغیر اپنی ڈیوٹی خوش اسلوبی سے نبھاتی رہیں..... جب کچھ کی مجبوری تھی اور کچھ کا شوق.....

ٹوٹ گئیں تو نئی خرید لائیں گے اور نہ ہی نکاح نامے کی حیثیت و اہمیت کا غد کا ایک ٹکڑا ہے کہ پھٹ گیا تو پھر سے نیا بھر لیں گے۔ یہ ایسا ورق ہے جس پر ہم دونوں نے اللہ کے مقدس گھر میں ایک ساتھ جینے مرنے کا وعدہ کرتے ہوئے سب کے سامنے دستخط کیے تھے۔“ چند ٹائیے کی پریشانی نے اسے ٹھنجنے میں جکڑ لیا تھا۔ فلیٹ جو ہنگامی طور پر خوب سج گیا تھا۔ اس کی ہر شے سے اب نحوست ٹپکنے لگی تھی۔ اپنا بیٹا یا لپٹ ہوتا ہوا پروگرام اسے اضطرابی کیفیت میں مبتلا کرتا گیا۔ ”میرے مالک! میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ تو میری راہنمائی فرما۔ آدم کو میں بھی تو دل و جان سے چاہتی ہوں لیکن مجھے اپنی زندگی سے بھی پیار ہے جو تو نے تجھے کی صورت میں مجھے بخشی ہے جو انسان تجھے کی اہمیت کو نہیں جانتا اس کی تقدیر کی لوح پر کالے حروف سے۔ بد نصیب، نامراد لکھ دیا جاتا ہے۔ یا اللہ میری مدد فرما۔ کیا میں غلطی پر ہوں۔“ صوفے پر سر جھکا ئے بیٹھی وہ رات گئے تک سو جتی رہی۔



اپنے فلیٹ میں جہاں وہ سمجھتی تھی کہ خوشیاں اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ چند دن میں ہی بولائی، بولائی سی پھرنے لگی۔ نہ آدم کا فون آیا نہ ہی کسی سسرالی رشتے دار کا..... نہ آپا نے چکر لگایا نہ می نے۔ بھائی اور بھابھیاں تو مرنا جینا اس سے پہلے ختم کر چکی تھیں۔ وہ صبح آفس جاتی، کام میں دل نہ لگتا..... کوئی کزن سے بات کرنا تو درکنار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی..... اس کی روشن پیشانی پر اب بیزار کن سلوسٹیں ہر وقت نمایاں رہتیں۔ اس کی سوچ کے مطابق کہ آدم تو اپنی ہی دھن میں سرشار ماں اور بھائیوں سے خوب خاطر مدارات کر دار ہا ہوگا لیکن ایسا ہرگز نہ تھا۔ وہ آفس سے فارغ ہو کر دوستوں میں جا بیٹھتا..... انہی کے ساتھ کھانا کھاتا اور انہی کے ساتھ رات گئے تک ڈرنک کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر جو طمانیت سے بھرپور سرخی پھیلی رہتی تھی اس پر زردی کی تہ جننے لگی تھی۔ دن، ہفتوں اور

الویتا نے باس کی آج کی بیہودہ گفتگو کے بعد کمپنی کو خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک اور جگہ کی خالی ویکسینی پر غور و خوض کرنے لگی۔ آخر ایک دن ہمت بحال کرتے ہوئے اس نے لیٹر تیار کیا اور باس کے آفس میں چلی گئی تو اس کا لیٹر پڑھ کر وہ چونکا۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا؟ میں بہت حیران ہوں..... اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو مجھے بتاؤ.....“ وہ پہلے تو کھڑا ہو گیا پھر فوراً ہی کرسی پر واپس بیٹھ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ تیری یہ مجال کہ جس نے نوکری کی پروا کی نہ اپنے باس کی..... ”سر مسئلہ ہی تو نہیں..... ورنہ مجبوراً یہاں رکنا پڑتا۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔

”تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں..... خاتون مجھے پہیلیاں بوجھانے والی عورتوں سے بہت چڑ ہے۔ اپنا مدعا بیان کرو سیدھے سادے لفظوں میں..... میرا وقت ضائع مت کرو۔“ وہ بھوسیں چڑھا کر بولا۔

بہر اور گزر جانا چاہیے پھر دیکھو آدم کہ وہ سر کے بل چل کر آئے گی۔ وہ جو وقت تھا جب میں اس کی خوشامدیں کرتے نہ تھکتا تھا، وہ گزر گیا۔ اور اب میں آزادی میں شاداں و فرحاں رہنے لگا ہوں۔ یہ طوق غلامی بھی ایک عذاب ہی ہے۔“ پھر نبل بچی..... اور بار، بار بچی لیکن آدم نے اسے سبق سکھانے کے لیے کال کو بار بار بند کیا..... تو آدھے گھنٹے بعد الوینا کا میج آ گیا۔ وہ فطری لاعلمی کی کیفیت میں الوینا کا میج پڑھنے لگا۔

”اے ایمان والو تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی اپنی میراث میں لے لو..... نہ ان کو اس غرض سے روکے رکھو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ ان سے لے لو..... مگر اس صورت میں کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کریں..... اور ان کے ساتھ اچھی طرح گزر بسر کرو..... اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لیے بھلائی رکھی ہو اگر ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس کو بہت سامان دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ واپس لے لو..... پھر اگر وہ اس میں سے کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیں اپنی خوشی سے تو تم اسے ہنسی خوشی سے کھاؤ۔ سورہ نسا.....

”آدم! تمہیں گئے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا۔ تم نے پلٹ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ کیا میں تمہاری بیوی نہیں کوئی رکھیں تھی۔ جس کے ساتھ دو سال تک دل بہلایا اور پھر نا کردہ گناہ کی پاداش میں اسے جدائی اور دوری کی سزا دے ڈالی۔ تم نے مجھے خود سے الگ تو کر ہی دیا ہے ناں..... صرف ایک پیچہ پر مہر اور تمہارے دستخط لگانے کی ضرورت ہائی رہ گئی ہے۔ میں تمہیں اس فلیٹ کی قیمت ادا کر کے ہمیشہ کے لیے اس رشتے سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ جس مرد پر میرا کوئی حق نہیں رہا..... میں اس کے پیسے پر اپنا حق کیونکر جتاؤں..... مجھے جلد از جلد آزاد کر دو تا کہ میں انتظار کی جان لیوا.... گھڑیوں سے چھکارا حاصل کروں۔ مجھ جیسی عورتیں جو فضول خرچی کو گناہ کبیرہ

”آپ کا وقت بہت قیمتی ہے، میں جانتی ہوں سر..... دراصل آپ کا کارآمد اور دلکش مشورہ میرے دل کو جالگا..... میں گھر میں ہانڈی چولھے کو اس غلیظ نوکری سے ہزار ہا درجے باعزت اور قابل ستائش سمجھنے لگی ہوں۔ آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی..... میں اس تنخواہ کے بغیر بھی گھر میں بیٹھ کر قابل عزت زندگی گزار سکتی ہوں، مجھے نہ تو شوہر کی تنخواہ کی ضرورت پڑے گی نہ ہی میکے، سرال کی کسی قسم کی مالی امداد کی حاجت محسوس ہوگی۔“ وہ نہایت کاٹ دار لہجے میں بولی۔ ”کیونکہ میری ڈیمانڈ زندگی میں بہت کم ہیں جن کے بغیر گزارہ ناممکن ہے۔ بس وہی اہم ہیں.....“

”بیٹھو..... اور کھل کر بات کرتے ہیں..... ایسی جلدی بھی کیا ہے۔“ ہاس کی مسخرانہ ہنسی اسے زہر کے نشتر کی طرح لگی۔ وہ تھلا کر میز سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اسے تنقید آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”میں آپ کو ایک آخری بات سمجھانا چاہتی ہوں، شرافت اور آدمیت کو صرف چہرے پر سجانے سے فطرت نہیں بدلتی جناب..... جس کا آپ سے پالا پڑا ہے ان سے اپنی شرافت کے قصے سنیں..... ایسے اداپاش انسان کے زیر سایہ میرے نزدیک تو نوکری کرنا ہی حرام ہے۔ آپ جیسے دوغلی فطرت رکھنے والے افسروں کو صرف اپنی ذات سے پیار ہوتا ہے۔ انہیں نہ تو کسی کی عزت و تحریم سے سروکار ہوتا ہے نہ ہی ان کے جذبات کی پروا ہوتی ہے۔“ الوینا کی مردنی آنکھوں میں یہ فقرے بولنے کے بعد بجلی کوندی اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ ہنسی دق اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اسی لمحے اس نے میز پر رکھے ہوئے لیٹر کو اٹھایا اور اس کے بیسیوں ٹکڑے کر دیے۔

☆☆☆

موبائل پر الوینا کا نمبر دیکھ کر آدم کے لبوں پر فتح مندانہ مسکان پھیل گئی۔ اس نے کال رجسٹریٹ کر دی۔ ”دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہو گا محترمہ کا..... خود کو تیس مار خان سمجھتی ہے کیا..... اگر ایسا ہے تو سال

فصل محبت

کھول کر بار، بار عبارت پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اسے الوینا سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اب جو وہ چپ سادھے سال گزار چکا تھا اس کا سامنا کیسے کرتا۔ وہ تو اپنا منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں تھا۔

وہ یہ سچ کہا کرتی تھی کہ نئے انداز سے نئی نویلی بات کرو..... وہ بڑ بڑایا۔ عجیب میسج تھا کہ بیڈ ایسے ہچکولے کھا رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اتر آ۔ اسے زمین اپنے پیروں تلوں سے سرکئی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ریفریجریٹر کی طرف بہ مشکل بڑھا۔ اس کا دروازہ کھول کر بیڈ کے کینز نکالے اور سیدھا ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔ تمام کینز کھول کر اس نے مشروب بینس میں بہا دیا اور خالی ٹن ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ کمرے میں آ کر اس نے سیف کھولی اور کل رات جوئے میں جیتی ہوئی رقم نکالی اور گیراج کی طرف چل دیا۔

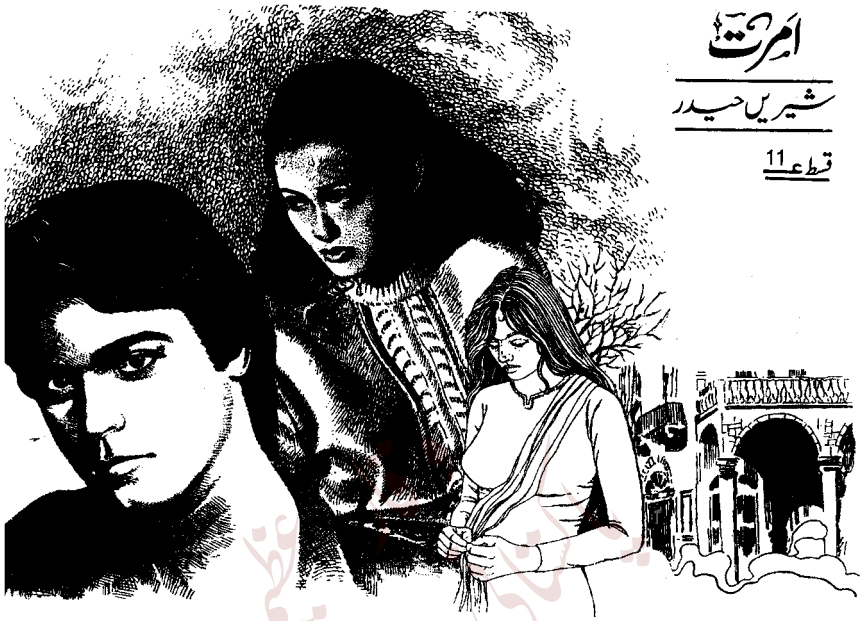
گاڑی میں بیٹھ کر اس کے دل کو سکون اور ذہن کو قرار سا آگیا۔ وہ فلیٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور ہزار ہزار کے نوٹ نزدیکی چچی آبادی میں پھینکا گیا۔ فلیٹس کی مارکنگ میں پہنچ کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا..... جگمگاتے ہوئے ستاروں سے بھرا ہوا آکاش اور اس کے درمیان دو دھیا کھکشاں دیکھ کر وہ لمحہ بہ لمحہ نشے میں بیٹھتا ہوا الوینا سے غصہ و درگزر کی عرضداشت تھا۔ ڈور بیل پر انگلی رکھ کر صبر و تحمل سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا..... الوینا میسج لکھنے کے بعد پُرسکون نیند میں جا چکی تھی۔ بیل کے مسلسل بجنے سے وہ چونک کر اٹھی اور تیزی سے مین ڈور کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اندر سے ہی آنے والے کا نام بلند آواز میں پوچھا۔

”میں ہوں فصل محبت کا کا شکار..... ہر بڑی علت کو چھوڑ کر تمہارے در پر آیا ہوں..... دروازہ کھول دو.....“ الوینا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ دروازہ کھول کر سر جھکا کر بولی۔

”زہے نصیب.....“

سمجھتی ہیں اور شرعی اصولوں کو اپنی عزت و تحریم گردانتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کی قربت اور دوستی کی محتاجی نہیں ہوتی۔ وہ جنگل میں گھرسا کر بھی بھیڑیوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ میرے پاس نے میرے اندر کی عورت کو بہت مشکل سے پہچانا۔ وہ میرے من سے کمزور عورت کے کردار کا بیج ڈھونڈتے ہوئے ناکام ہو گیا۔ اور جب میں نے ریزائن کیا تو اس کے بدلے میں میری پروموشن کر دی..... آدم ایک شریف انٹنس اور مضبوط و بلند کردار کی مالک عورت کو عزت، جان کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ہم میرے بھائیوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ میں نے ان کی طرف پلٹ کر اس لیے نہیں دیکھا کہ انہوں نے تو مجھ سے دھوکا کیا تھا۔ مجھے شرعی حصے میں سے بہت کم دیا۔ اس پر بھی ناراضی اور گلے شکوے مجھ سے جبکہ میں نے صبر کا کڑوا گھونٹ پی لیا۔ محی کو ملنے نہیں دیا۔ لیکن میں نے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ برادری نے بھائیوں سے بائیکاٹ کر دیا۔ اپنے خاندان اور رشتے داروں کا بھی تو فائدہ ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انصاف دلانے پر ضرور اتر آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرا پورا حصہ مجھے دلایا بلکہ بھائی مجھے ہاتھ جوڑ کر راضی کرنے بھی چلے آئے..... تم کو اپنے رشتے داروں پر بہت مان تھا۔ انہوں نے بھلا تمہارے لیے کیا، کیا..... تم کو شراب اور جوئے کی طرف مائل کرنے والے یہی رشتے دار ہیں۔ میں تمہاری ہر خامی اور برائی کو معاف کر سکتی ہوں لیکن اس جہنمی علت کو برداشت کر سکتی ہوں نہ معاف کر سکتی ہوں۔ تمہارا اور میرا رشتہ تو اس وقت ہی ٹوٹ گیا تھا جب تم نے رب کے احکامات کی خلاف ورزی کی تھی۔ اسی نشے میں تم اس عورت کو بھول گئے۔ جس نے اس معاشرے سے مقابلہ کر کے اپنی ہم جنس کے لیے رستہ کھول دیا ذرا سوچو کہ یہ تھا تمہارا پیارا اور فصل محبت کی گہرائی۔“

وہ میسج پڑھ کر حیران و سراسیمہ لیٹا رہا۔ اس نے جو کچھ پڑھ لیا تھا اسے یقین نہیں آیا تھا وہ آنکھیں کھول،



تخلیق کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ان کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو پس کر گزارتے ہیں یا روکر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دار و مدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر.....



زندگی جز خواب ہے گویا

شامیر کا اپنی یونٹ میں تبادلہ ہوا تھا..... اموجان کو کال کرتے ہوئے میرادل بھر آیا کہ اس کا تبادلہ ایک مشکل محاذ پر ہو گیا تھا، اموجان اس کی طرف سے متشکر تھیں۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک بڑی جنگ لڑنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ان کے دل میں انجان اندیشوں نے گھر کر لیا تھا، ماؤں کے لیے اپنے بچوں کی صورت میں طرح، طرح کی فکریں ہی تو ہوتی ہیں۔ جتنے بچے اتنی ہی اقسام کے مسائل، اسی لیے تو وہ بھی سکھ کی سانس نہیں لے پاتیں۔ فوجیوں کی مائیں، بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں ہوتا اور بھی مشکل کام ہے۔ انہیں دعائیں بھی دیتی ہیں، ان کی سلامتی کے لیے جھولیاں پھیلا، پھیلا کر رب سے مانگتی ہیں۔ ان کا مادر وطن کا محافظ ہونا ہمارے لیے باعث فخر بھی ہوتا ہے اور خوف کا موجب بھی.....

مرنے سے کون نہیں ڈرتا، پیاروں سے چھڑ جانے کا خوف کسے نہیں ہوتا؟ شاید سب کو مگر ہمارے فوجیوں کے سوا جو ہمہ وقت عزت کی موت کی خواہش دل میں رکھتے ہیں، اس دنیا سے اور اس دنیا کے رشتوں سے محبت فطرت سہی مگر ان کے دل شاید بہت خاص مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ وہ مٹی جس میں ماں سے وفا ہے، حب الوطنی کی تڑپ ہے، مادر وطن کی حفاظت کا خیال ہے۔ وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرنے والے پروانے ہیں، جن کے دلوں میں وہ شمع محبت فروزاں ہوتی ہے، جو ان سے دوسروں کی تاریک زندگیوں میں اجالے بھرنے کا کام کرواتی ہے۔

”آپ اس کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا کیا کریں اموجان.....“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”تم تو ٹھیک ہونا بیٹا؟“ انہوں نے تشویش سے میری خبریت پوچھی۔

”میں ٹھیک ہوں اموجان..... بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہیں تسلی دیتے ہوئے مجھے اپنے دل پر ہتھر رکھنا پڑا تھا۔

”اب مجھے تمہاری طرف سے سب سے زیادہ فکر رہتی ہے.....“ میں جانتی تھی کہ اس وقت وہ سب سے زیادہ فکر مند شامیر کی طرف سے تھیں مگر پھر بھی وہ مجھے کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی پریشانی میں شریک کر کے مجھے ٹینشن نہیں دینا چاہتی تھیں، جانتی تھیں کہ مجھے خوش اور سکون میں رہنے کی ضرورت ہے۔ شاید ترازو کے پلڑوں میں ماؤں کی ساری اولادیں ایک جہتی بنتی ہیں..... بالخصوص جب وہ تکلیف میں ہوں۔

”وہ کیوں اموجان؟“ میں نے بننے کی کوشش کی تھی۔ ”میری فکر کیوں رہتی ہے، میں کوئی جنگ لڑ رہی ہوں کیا؟“

”ہر انسان اپنی، اپنی جنگ ہی تو لڑ رہا ہے، کسی کی جنگ آسان ہے اور کسی کی مشکل۔ تم بھی ایک مشکل محاذ پر جنگ لڑ رہی ہو۔“ اموجان نے گہری بات کی۔ ”ایک تو تمہاری حالت.....“ وہ گویا ہوئیں۔ ”پھر تم لاکھ کہو کہ تم خوش ہو، میں جانتی ہوں کہ تمہارے لہجے کی گہرائی میں کچھ ٹوٹا ہے، تم نے باپ کی بات کا مان رکھنے کو مصالحت اور مفاہمت تو کر لی مگر میں جانتی ہوں تم خوش نہیں ہو.....“

”ایسا نہیں ہے اموجان..... میں خوش ہوں، میں نے ابو جان کے اس فیصلے کو ان کی خوشی کے علاوہ اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کیا ہے اس لیے مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”بس آپ میرے لیے آسانوں کی دعا کیا کریں۔“

”میں زبانا بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اس کا رویہ بھی میں نے اس گھر میں رہ کر دیکھا ہے.....“ وہ فکر میں مبتلا تھیں۔

”ان کے رویتے سے اتنا فرق نہیں پڑتا اموجان!“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”ان کے علاوہ بھی گھر میں بہت لوگ ہیں، جو مجھے پیار کرتے ہیں، توجہ دیتے ہیں، مجھے چاہتے ہیں اور میرا خیال رکھتے ہیں۔“ انہیں تسلی دے رہی تھی مگر میرادل تو جانتا تھا کہ چاچو کے علاوہ شاید ہی کسی کو میری فکر ہوتی ہوگی..... کسی کو میرے ہونے یا نہ ہونے سے

کوئی فرق پڑتا ہوگا کسی کو علم ہوگا کہ میں اس گھر میں کیوں تھی اور کس حوالے سے؟ اگرچہ زمین کی وجہ سے میں وہاں تھی، جو کبھی تولہ اور کبھی ماشہ والی شخصیت کا حامل تھا۔ زائندہ اور حسنہ پر اپنی ماں کی سوچ اور تربیت کا پورا اثر تھا۔ عارب اور حسن غیر جانبدار تھے، جیسے انہیں اس سے کم ہی غرض تھی کہ ان کے گھر میں کسی ایسے فرد کا اضافہ ہوا ہے جس کی ان کی زندگیوں میں کوئی اہمیت بھی تھی۔ صرف یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں غیر جانبدار رہتے تھے اور بولنے کم ہی تھے، نہ کسی کی حمایت میں، نہ مخالفت میں۔ بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ کے بولنے کا حق اس گھر میں صرف ماما کو تھا، وہ سامنے والے کو رکید دیں، جوتوں سمیت کسی پر چڑھائی کر دیں تو بھی کوئی انہیں منع نہیں کر سکتا تھا، چاچو سمیت..... سب کو اپنی عزت پیاری تھی۔

”جمال کا کیا حال ہے؟“ انہوں نے بھی بات بدلی۔ ”اور باقی سب لوگ؟“

”چاچو ٹھیک ہیں..... کہہ رہے تھے کہ آپ سے پھر آنے کا کہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”باقی لوگ بھی ٹھیک ہیں۔“

”اب ایک ہی بار آؤں گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”جب تمہارا وقت آئے گا۔“ میں تصور میں انہیں اس وقت کا سوچ کر مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”اموجان، شامیر آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آئے گا ناں اپنی نئی یونٹ میں ڈیوٹی پر جانے سے پہلے؟“ میں نے سوال کیا۔ سوچ رہی تھی کہ وہ آتا تو میں اس سے ملنے کے بہانے ایک بار گاؤں کا چکر لگاتی۔ اس سے میری بھی ملاقات ہو جاتی اور ذرا چار دن اس ماحول سے دور گزر جاتے، اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو میں اسے کہتی کہ مجھے ملتا ہوا چلا جائے۔ زندگی کی بساط بھی کیا بساط ہے، ایک ہی گھر میں سے کھیل شروع ہوتا ہے، ایک جوڑائی زندگی کا آغاز کرتا ہے، وہ ایک مکان ہوتا ہے جس کے کلین اسے گھر بناتے ہیں۔ اس گھر آگن میں وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ نئے نفوس کا اضافہ ہوتا ہے، پیار بانٹنے کوئی پیارے، پیارے بچے آ جاتے ہیں۔ ایک ماں کے جنے وہ بچے ماں باپ کی گود اور ہاتھوں پل کر بچپن اور لڑکپن کی حدود سے نکلتے ہیں۔ وقت کی ہر چال کے ساتھ یوں بھر جاتے ہیں کہ دوبارہ سب کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا خواب ہو جاتا ہے۔

”کچھ علم نہیں بیٹا..... میرا خیال ہے کہ وہ جانے سے پہلے نہیں آسکے گا کیونکہ اسے فوری طور پر یونٹ میں رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔“ وہ پھر ادا اس ہونے لگی تھیں۔

”مکمل کا کیا حال ہے؟“ ان کے لہجے میں ادا اسی محسوس کر کے میں نے بات ان کے پسندیدہ موضوع کی طرف بدلی۔

”بہت تیز ہو گیا ہے اب وہ..... بچتا ہے ہم سب کو!“ کھٹکنا ہوا اور ناز بھرا لہجہ۔

”اسے اپنے ساتھ بچ کر میرا پیار نہیں اموجان..... اس سے کہیں پھپھو اسے بہت یاد کرتی ہیں۔“ میں نے جذب سے کہا۔

”کہہ دوں گی پیاری..... تم نہ کہو تب بھی اسے علم ہے۔“

”ایسے کیسے علم ہو سکتا ہے اموجان، بچوں کو کہنا پڑتا ہے تو انہیں یقین ہوتا ہے۔“

”پیارے اپنے آپ کو اپنی طاقت سے منواتا ہے۔“

”رائی کا کیا حال ہے، اموجان؟“ مجھے اچانک اس کی یاد آئی۔

”بہت خوش ہے..... ٹھیک ہے، آج کل میں اس کی ڈیوٹی ہونے والی ہے، ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچہ آپریشن سے ہوگا.....“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اور ہاں ایک اور اچھی بات، اس کے ہاں بیٹے کی ولادت متوقع ہے۔ اللہ کا لاکھ،

لاکھ شکر ہے، شہر بانو نے تو اتنی منتیں مانی تھیں کہ اس کے ہاں پہلا پوتا ہو۔“
 ”چلیں اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے اموجان کہ ان کے دل کی مراد پوری ہوئی..... اللہ انہیں مکمل... صحت مند اور
 لمبی زندگی والا پوتا دے۔“ میں نے دل سے دعا دی۔

”ارے ہاں..... اب تو تمہیں بھی ڈاکٹر نے بتا دیا ہو گیا کہ تمہارے آنے والے بچے کی.....“
 ”پلیز اموجان.....“ میں نے ان کی بات کاٹی۔ ”مجھے اس کے بارے میں کوئی تجسس نہیں ہے، جو اللہ کی رضا
 ہے میں اس پر خوش اور راضی ہوں گی۔“
 ”چلو ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی..... بس اس لیے پوچھا تھا کہ ذرا تیاری میں سہولت ہو جاتی ہے اس لیے
 پوچھا تھا بیٹا!“ انہوں نے رساں سے کہا۔

”آپ کوئی تیاری نہ کریں اموجان، اپنے گھر اور اپنے باقی اہم کاموں پر دھیان دیں، وقت آنے پر تیاری
 کو بھی دیکھا جائے گا۔“

”تم سوچ رہی ہو گی کہ زیبا کوئی تیاری کر لے گی؟“
 ”میں ان سے کوئی توقع وابستہ ہی نہیں کرتی اموجان!“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”آپ کیا چاہتی ہیں، نواسہ
 یا نواسی؟“

”جو بھی ہو..... خیریت اور سلامتی والا ہو، تم بالکل ٹھیک رہو..... مجھے تو سب سے زیادہ تمہارے بارے میں
 فکر رہتی ہے بیٹا!“

”آپ میری طرف سے بالکل فکر مند نہ ہوا کریں اموجان..... انسان کے اختیار کی کوئی حد ہوتی ہے.....
 بے نیاز اور حد سے زیادہ اختیار والا صرف وہی ہے جو ہماری حدود کو متعین کرتا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے لہجے
 میں کہا۔

”جب تم یوں قنوطیت سے بات کرتی ہو پیاری تو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے.....“
 ”ہا ہا..... اموجان، ایک تو آپ اتنی مشکل اردو بولتی ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”قنوطیت کیا ہوتی ہے؟“
 ”خوش رہا کرو تم..... حالات سدا ایک سے نہیں رہتے پیاری!“
 ”خوش رہتی ہوں امو!“ میں نے لہجے میں بٹاشت پیدا کر کے کہا۔ ”کم از کم کوشش تو کرتی ہوں۔“ میں نے
 دل میں سوچا۔

”اللہ تمہیں ہمت دے میری جان!“
 ”اچھا اگر شامیر کے پروگرام کا علم ہوا تو بتائیے گا مجھے اموجان، اسے ملنے کے لیے آنے کا پلان بنالوں گی میں۔“
 ”تمہارے لیے اس حالت میں بار، بار سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے..... وہ اگر آیا۔ پھر تو اسلام آباد کے راستے ہی
 واپس جائے گا تو میں اسے کہوں گی کہ تمہیں ملتا ہوا چلا جائے۔“

☆☆☆

”اوہ میرے پیارے بھائی.....“ میں نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔ میں اپنی حالت کو بھی بھول گئی اور بالکل
 بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی۔

اموجان نے بتایا تھا کہ وہ فقط دو دن کے لیے گھر گیا تھا اور واپسی پر اسے جی ایچ کیو میں دو دن کا کام تھا، اس
 نے اموجان سے کہا تھا کہ وہ ان دو دنوں میں مجھے ملنے کی کوشش کرے گا۔ اگرچہ میں اس کے آنے کی توقع نہیں کر
 رہی تھی مگر دل میں خواہش تو تھی کہ وہ مجھے ضرور ملے آتا۔ وہ اپنے کام سے ہی چھٹی کر کے آیا تھا اس لیے دردی میں

تھا اور ایسا پیارا اور بانٹا لگ رہا تھا کہ میری نظر نہ ٹھہر رہی تھی، میں نے اپنی آنکھوں کو اسے نظر بھر کر دیکھنے سے روکا کہ کہیں اسے میری نظر ہی نہ لگ جائے۔ جونہی مجھے یاد آیا کہ میری حالت کیا تھی، میں سمٹ کر اس سے علیحدہ ہوئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرا، اسے درازی عمر کی دعا دی۔

”کیسی ہو؟“ اس نے اتنے پیار سے پوچھا کہ میرے دل سے غبار اٹھا۔ ہم دونوں کی عمروں میں تھوڑا ہی فرق تھا، سال سوا سال کا..... میں نے کبیر بھائی کو اسے نام سے بلاتے سنا تو بچپن سے ہی اسے نام سے بلایا۔ وہ احترام جو ہم دونوں بہنیں کبیر بھائی کو دیتی تھیں وہ شامیر کو نہیں ملا۔ ایسا نہیں کہ ہم اس سے کوئی بد تمیزی کرتے تھے..... ہم میں دشمنی ہم آہنگی تھی، عزت کرتے تھے کہ تو تراق سے بات نہ کرتے تھے مگر آپ جناب کا سلسلہ بھی نہ تھا۔

”ٹھیک ہوں..... بھلی چٹکی ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”زبردست بھئی جوان..... ماشاء اللہ!“ چاچو نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا، اسے بھیج کر ملے، اس کی وردی پر ہاتھ پھیرا۔ ”آج بھائی صاحب زندہ ہوتے تو تمہیں دیکھ کر اُن کا سیرو خون بڑھ جاتا۔“ شامیر کے آنے کی خبر سن کر دن کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جو استراحت گھر کے باقی سب لوگ باری، باری لاؤنج میں آنے لگے تھے۔ چاچو اور ماما گے پیچھے اپنے کمرے سے نکلے، چاچو نے شامیر کو لپٹا لیا تھا جبکہ ماما نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عارب اور حسن بھی آکر اس سے گلے ملے اور اس کی پیٹھ تپتپائی۔

”کوئی چائے پانی کا بندوبست کروایا ہے تم نے بھائی کے لیے؟“ انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ مجھے اپنی سماعت پر شک ہوا۔ ”بہت اسارٹ لگ رہے ہو۔“ انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر پھر اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ ”کتنے دنوں کی چھٹی پر آئے ہو بیٹے؟“

”بس تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں چچی جان.....“ اس نے جواب دیا۔ ”مشکل سے وقت نکال کر..... گل کو“ وہ کہتے کہتے کچھ سوچ کر رکا۔ ”میرا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو ملنے کے لیے آ گیا۔“ اس نے بھی الفت کے تقاضے نبھائے۔

میں نے جگن میں جا کر خانساہاں کو چائے کے ساتھ لوازمات کا بتایا اور واپس لوٹی تو حسنه بھی وہیں بیٹھی تھی اور شامیر سے مسکرا، مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ مجھے اچھا لگا کہ کم از کم میرے بھائی کو اس گھر میں کچھ تو پروڈو کوئل مل رہا ہے، اختیار پروڈو کوئل اور توجہ تو امو جان کو بھی نہیں ملی تھی۔

”آج تو تم یہیں رکو، یونٹ میں بتا دو بیٹا کہ تم صبح آ جاؤ گے..... جانا تو تمہیں کل ہی ہے ناں!“ چاچو نے اسے رکنے پر اصرار کیا۔

”نہیں چاچو، ایسا ممکن نہیں!“ اس نے معذرت کی۔ ”ممکن ہے کہ ہمیں رات کو ہی نکلنا پڑ جائے اور یوں بھی میرا سارا سامان میس میں ہے، وہاں تک کافی فاصلہ ہے، صبح میں لیٹ ہو جاؤں گا۔“

”زیادہ دنوں کے لیے آتے ناں بیٹا!“ ماما نے کہا۔ ”آئندہ زیادہ دنوں کے لیے آنا، بچے تو تمہیں دیکھ کر کیسے خوش ہو گئے ہیں..... وردی تم پر بہت جج رہی ہے۔“ انہوں نے تعریف میں بجل سے کام نہ لیا تھا۔

”جی شکر یہ چچی جان! اصل میں پہلی بار یونٹ میں رپورٹ کر رہا ہوں، چھٹی اتنی آسانی سے نہیں ملتی..... حال آئندہ کوشش کروں گا۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔ ”چلتا ہوں ابھی!“

”کس طرح جاؤ گے بیٹا؟ بچے چھوڑ آتے ہیں تمہیں.....“ انہوں نے پیش کش کی۔

”نہیں، میں جب پر آیا ہوں چچی جان..... یونٹ کے کام سے نکلا تھا اس لیے۔“

”اوہو..... پھر تو تمہارے ساتھ ڈرائیور بھی ہو گا؟“ چاچو نے کہا۔ ”کسی نے اسے چائے پانی دیا ہے کہ

نہیں..... چپک کر دے!“

”تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ بیٹا!“ ممانے اتنی شائستگی سے کہا کہ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اسے روک کر وہ بچن کی طرف لپکیں، میں شامیر کے پاس بیٹھ گئی، جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چلا جائے..... میں خود اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکی۔

”اپنا خیال رکھنا پیاری!“ جاتے ہوئے اس نے اپنے بازو میرے شانوں کے گرد حائل کیے اور میرے سر پر بوسہ دیا۔ اس طرح ابو جان ہم بیٹیوں سے ملا کرتے تھے۔ میری آنکھیں بھر آئیں، میں نے سیلاب بھری آنکھوں سے اسے باہر نکلنے، ڈرائیور کو اسے سیلوٹ کرتے اور آگے بڑھ کر اس کے لیے جیب کا دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا۔

”اللہ تمہیں سلامت رکھے اور نظر بد سے دور رکھے میرے پیارے!“ دل ہی دل میں میں نے کتنی آیات کا ورد کر کے دور جاتی ہوئی اس کی جیب کی طرف پھونک ماری۔

☆☆☆

”ایک اور سٹ کر دانا پڑے گا امرت!“ ڈاکٹر یاسمین نے لکھتے ہوئے کہا۔ ”عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے جیسا کہ تم بتا رہی ہو۔“

”پہلے تو میں سمجھی کہ میٹر حیاں وغیرہ زیادہ چڑھنے کی وجہ سے اس نوعیت کا درد ہوتا ہے مگر اب تو جب سے آپ نے کہا ہے تب سے میں نیچے کے کمرے میں شفٹ ہو گئی ہوں۔“

”میں بھی اسے تھکاوٹ کا نتیجہ ہی سمجھ رہی تھی مگر لگتا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسے سٹ ہیں جو ہم عموماً اس حالت میں نہیں کرواتے مگر اب چونکہ مجھے اپنا ٹمک رفع کرنا ہے اس لیے مجبوراً مجھے یہ ٹیسٹ کر دانا پڑے گا۔“

”کوئی تشویش والی بات ہے؟“ میں واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ ”اور ان ٹسٹوں سے آنے والے بچے کو کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟“

”سٹ کر دانا لازمی ہے..... تشویش کی بات ہونا یا نہ ہونا، اس کا فیصلہ سٹ کا نتیجہ دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔“ میرے لہو کے اندر کچھ رینگنے لگا، پیٹ میں حضور سے پڑنے لگے۔

”کچھ بہت برا تو نہیں ہونے والا میرے ساتھ؟“ میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”اللہ خیر کرے.....“ ان کے لہجے میں یقین کا فقدان تھا۔

”میرے بچے کو تو کچھ نہیں ہوگا؟“ میں نے اپنے اندیشے کو زبان دی۔

”تم اگر اسی طرح پریشان ہو گئی تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”اگر ریلیکس رہو دوا کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ!“

”میں بہت بہادر ہوں ڈاکٹر یاسمین، جو کچھ سچ ہے مجھے بتا دیں، میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔“ میرا لہجہ میرے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ ”سب سے برا کیا ہو سکتا ہے؟“

”ایک تو اب تم بالکل اکیلی آتی ہو اس لیے ہر بات تم سے براہ راست اور بغیر کسی گلی لپٹی کے کرنا پڑتی ہے.....“ ڈاکٹر صاحبہ نے کہا۔ ”تمہاری ساس کیوں نہیں اب تمہارے ساتھ آتیں؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”وہ مصروف ہوتی ہیں.....“ میں نے فوراً کہا۔ ”آپ کو علم تو ہے کہ وہ سوشل ورک وغیرہ کرتی ہیں۔“

”سوشل ورک گھر سے شروع کیا جائے تو سب سے بہتر ہوتا ہے ناں.....“ وہ نہیں۔ ”وہ کیا کہتے ہیں۔“

”charity begins at home

”ممکن ہے کہ گھر سے باہر کے لوگ ان کی توجہ کے زیادہ مستحق ہوں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔
 ”یہ سٹس جس قدر جلد ہو کر والینا.....“ انہوں نے پرچہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ ”تین دن میں اس کی رپورٹ آئے گی، جو نئی رپورٹ ملے، مجھے دکھانا۔“ اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہی ہوں کہ اب میں جاسکتی ہوں۔

☆☆☆

”تم اکیلی کیوں ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھیں آج؟“ ممانے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔
 میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا کیونکہ میں آرام کر رہی تھی، اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال کیا۔
 ”وہ میں.....“ میں ہلکا سی، سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ان کے اس سوال کا مطلب کیا تھا۔ ”اصل میں، میں اب اکیلی ہی توجاتی ہوں ممانا.....“

”کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ میں نہ جاسکی ہوں گی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ہر بار اکیلے جانے لگو۔“ انہوں نے میرے قریب بیٹھ کر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھوں میں آنسوؤں کو اٹھاتے ہوئے محسوس کیا۔ ”ویسے کیا بتاتی ہے ڈاکٹر یا سیمین، سب ٹھیک تو ہے ناں..... اب تک تو اس نے بچے کا gender (جنس) بھی بتا دیا ہوگا؟“ ان کی استغما میہ نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

”جی سب ٹھیک ہے.....“ میں نے خود پر قابو پایا۔ ”میں نے ان سے بچے کی جنس نہیں پوچھی۔“
 ”ارے آج کل کی بچوں کو تو سب سے پہلے یہی جاننے کا شوق ہوتا ہے..... کیونکہ نام سوچنا ہوتا ہے، بچے کے لیے خریداری کرنا ہوتی ہے!“
 ”جی.....“ میں اور کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

”چلو میں خود ڈاکٹر یا سیمین سے پوچھ لوں گی۔“ انہوں نے میری مشکل آسان کی۔ ”ویسے کوئی نام دام تو سوچے ہوں گے تم میاں بیوی نے؟“
 ”نہیں ممانا، آپ اور چاچو ہیں ناں!“ میں فوراً بولی۔

میں یہی سوچتی تھی کہ وہ لوگ اس بچے کا نام رکھیں گے کیونکہ زین تو ابھی تک شاید اس حقیقت کو ہی تسلیم نہ کر پایا تھا کہ وہ باپ بن رہا ہے اور اگر بن رہا ہے تو کیوں۔ اسے ناموں کے بارے میں بھی کچھ علم نہ تھا۔ اس کے ساتھ مل کر نام سوچنا ایک ایسا خواب تھا جو صرف میں دیکھ ہی سکتی تھی اس کی تعبیر نہیں پاسکتی تھی، ہمارے بچ و مکی محبت پر دان نہ چڑھی تھی۔ ”جو بھی نام آپ لوگوں کو اچھا لگے گا، جو فیصلہ آپ کریں گے۔“

”لو بھئی یہ عجیب کہی، فیصلہ ہم کریں گے بھی تو انہی ناموں میں سے جو تم اور زین سوچ کر ہمیں بتاؤ گے..... بہت سستی کر لی تم لوگوں نے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”زائینہ نے تو اپنی بیٹی کا نام سوچ بھی لیا اور اس کی خریداری بھی کر لی، ڈھیروں ڈھیروں گلابی چیزوں کی۔“ انہوں نے ہنس کر بتایا۔

”اچھا..... ماشاء اللہ!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اللہ نیک اور نصیبوں والی کرے ممانا!“ اس سے زیادہ میں کچھ کہہ بھی نہ سکی، جانے کس وقت وہ کس بات کا الٹا مطلب نکال لیں۔
 ”اگلی دفعہ ڈاکٹر یا سیمین سے ہم بھی پوچھ لیں گے.....“

”یہ اچھا نہیں ہے ممانا کہ اسے سر پر انزرنے دیا جائے..... آپ اور چاچو دونوں طرح کے نام سوچ لیں!“

”اور خریداری کا کیا ہوگا؟“ انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

”خریداری تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے ممانا.....“ میں نے رسان سے کہا۔ ”اگر پہلے کرنا ہو تو ہم ایسے رنگ خرید سکتے ہیں جو لڑکے اور لڑکیاں دونوں پہن سکتے ہیں.....“

”ہاں..... یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”ویسے اگر لڑکیاں نیلا یا لڑکے گلابی رنگ پہن لیں تو کیا ہو جائے گا ماما؟“ میں نے ان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر

سوال کیا۔

”ہوگا تو کچھ نہیں..... بس ذرا عجیب لگے گا لڑکا گلابی رنگ پہنے ہوئے یا لڑکی۔“

”آج کل تو سارے جوان اور ادھیڑ عمر کے لڑکے تھری پیس سوٹ کے ساتھ کاسنی اور گلابی رنگ کی شرٹ پہنتے

ہیں اور نیلا رنگ..... وہ تو اس وقت میں نے بھی پہنا ہوا ہے۔“

”سو تو ہے.....“ انہوں نے تائید میں سر ہلایا۔ ”مگر بچوں میں ذرا پہچانا آسان ہو جاتا ہے۔“

مجھے ان کی بات پر دل ہی دل میں ہنسی آئی۔

”اچھا..... چلتی ہوں، تم آرام کرو، میں خریداری کی لسٹ بنانا شروع کر دوں گی اب!“ وہ انھیں، گویا کہنا

چاہ رہی ہوں کہ مجھ سے بحث نہ کرو۔ ”عائشہ کب آ رہی ہیں؟“ انہوں نے باہر نکلتے ہوئے مڑ کر سوال کیا۔

”امو تو وقت پر ہی آئیں گی ماما..... کہہ رہی تھیں کہ جب اسپتال جانے کا وقت آئے تو انہیں بتا دیں وہ چند

گھنٹوں میں پہنچ جائیں گی۔“ میں نے انہیں اسی طرح بتایا جس طرح اموجان نے مجھ سے کہا تھا۔

”لو بھلا..... یہ کیا بات ہوئی، انہیں اسپتال جاتے ہوئے بتائیں؟“ وہ حیرت سے گویا ہوئیں۔ ”وہ کیا اڑ کر

پہنچیں گی اتنے وقت میں اور اتنی غیریت کیوں برت رہی ہیں وہ؟“

”جی میں کہہ دوں گی اُن سے۔“ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... اگلی بار کب جانا ہے ڈاکٹر کے پاس؟“ آخری سوال۔

”جی دو دن کے بعد.....“ میں نے بتایا۔ ”ایک شٹ لکھ کر دیا تھا انہوں نے، وہ میں لیبارٹری میں سپہیل دے

آئی تھی، جو نبی اس کی رپورٹ ملے گی تو انہیں دکھانا ہوگی۔“

”ڈاکٹر کو تو موقع چاہیے ہوتا ہے پیسے کمانے کا..... کبھی کوئی دوا بے مقصد لکھ دیتی ہیں کبھی شٹ..... سب

آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں، لیبارٹریوں والے، میڈیکل اسٹور والے..... دوا ساز کمپنیاں اور ڈاکٹر۔“

”جی!“ اس سے بہتر کوئی جواب مجھے کبھی ان کے سامنے.. بوجھائی نہ تھا۔

”چلو اسی دن واپسی پر کچھ خریداری بھی کر لیں گے اپنے پیارے سے بے بی کی۔“ انہوں نے اس ان دیکھے

بچے سے لاڈ کیا۔ وہ باہر نہ نکل جاتیں اور ایسی ہی کوئی ایک بات اور کرتیں تو میں یقیناً بے ہوش ہو جاتی۔

☆☆☆

جب سے میں مہمان خانے میں منتقل ہوئی تھی تب سے زین اور بھی بے قاعدگی سے گھر آنے لگا تھا۔ کبھی کبھار تو

مجھے یہ بھی علم نہ ہو پاتا کہ وہ رات کو آیا یا صبح، میں تو اپنے ہی مسائل میں الجھی ہوئی تھی، ماما کا بدلا ہوا رویہ میرے لیے

ایک خوشگوار تجدید ملی کا حامل تھا اس لیے مجھے اور چڑوں کی پروا کم ہی تھی۔ زین جن عادات کے ساتھ پروان چڑھا تھا

اسے میں اتنے کم عمر سے میں تو تبدیل نہیں کر سکتی تھی، امید ہی کر سکتی تھی کہ آنے والا بچہ اس کی توجہ حاصل کر سکے گا۔

”تم ٹھیک تو ہونا پیاری.....؟“ اس نے میرے گرد اپنے بازو جمائے کیے۔

”ہوں.....“ میں نے مختصر آ کہا۔

”ڈاکٹر کو باقاعدگی سے دکھا رہی ہو.....؟“ اگلا سوال، مشینی سا انداز۔

”جی.....“ اتنا ہی میکانیکی سا جواب۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں؟“ پھر سوال۔

”اگر ہو تو؟“ میرے منہ سے پھسل گیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ بازوؤں کی گرفت نرم ہوئی۔ ”پیسوں کا ہی مسئلہ ہوگا..... مہما سے لے لیا کرو۔“

”پیسہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے زین!“ میں نے گہری سانس لی۔ ”چاچو دے دیتے ہیں کچھ رقم مجھے ہر ہفتے اور جب ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا ہے تب بھی۔“

”اچھا..... گڈ!“ وہ بٹاش ہوا۔ ”پھر تو کوئی مسئلہ نہ ہونا!“ اس نے مجھے سیٹا۔
”مسئلہ تو پھر بھی ہے۔“

”اور کیا مسئلہ ہے؟“ حیرت سے اس نے سوال کیا۔

”زین میرا دل چاہتا ہے کہ تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جایا کرو.....“ میں نے جی کڑا کے کہا۔ ”سب عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں..... میرے ساتھ پہلی دودھ ماما گئی تھیں، اس کے بعد سے میں تنہا جاتی ہوں، خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔“

حقیقت میں ایسا ہی تھا۔ اسپتال کی انتظار گاہ میں ساری عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ہوتیں، ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کا انداز ہی فاخرانہ ہو جاتا۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر پوچھتے کہ وہ تھک تو نہیں گئیں۔ ان کے لیے کبھی کچھ کھانے کو لاتے، کبھی جوس اور کبھی پانی۔ جن کی گود میں پہلے سے کوئی بچہ ہوتا تھا وہ پہلے بچے کو بھی سنبھالتے۔ ڈاکٹر کے کمرے میں بیویوں کے ساتھ جاتے اور یقیناً ڈاکٹر کے ساتھ اس کی صحت کے بارے میں بات بھی کرتے ہوں گے۔

”اچھا.....“ اس نے بیزاری سے کہا۔ ”اور جن کے خاوند نہیں ہوتے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں ہوتے..... کیا مطلب؟“ میں نے سمجھ کر بھی سوال کیا۔

”میرا مطلب ہے کسی کی کوئی مصروفیت ہو..... کوئی پردیس میں ہو یا کوئی مر ہی گیا ہو تو؟“

”مجھے اس طرح کے خاوندوں کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے زین!“ میں نے بحث کی۔ ”جب میرا خاوند..... میرے پاس ہے..... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ چاہے تو میرے ساتھ جاسکتا ہے کیونکہ وہ ایک ایسی ملازمت کرتا ہے جس میں اسے ایسے اہم کاموں کے لیے سہولت سے چھٹی مل سکتی ہے۔“

”یہ تو تم سمجھتی ہونا امرت.....“ اس نے دہرایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ کون سا کام اہم ہے اور کون سا نہیں۔“

”تم میرے ساتھ جانے کا بہانہ کر کے بھی تو چھٹی لے لیتے ہو.....“ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کیا۔
مجھے یاد آ گیا کہ چند دن پہلے مہما نے مجھے اس وقت کال کی جب میں لیبارٹری میں خون کے ٹسٹ کا نمونہ دینے کے لیے انتظار کر رہی تھی۔

”اگر جمال تمہیں کال کر کے پوچھے کہ زین تمہارے ساتھ ہے تو کہہ دینا کہ وہ تمہارے ساتھ ہے۔“

”مگر وہ تو میرے ساتھ نہیں ہے مہما.....“ میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں کہہ رہی ہوں کہ ایسا ہی کہنا تو ایسا کہہ دینا سمجھیں!“

”اگر چاہو نے کہا کہ بات کرواؤ تو؟“ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کس کھیل کا حصہ بنانا چاہ رہی تھیں۔

”کہنا کہ.....“ وہ سوچ رہی تھیں شاید۔ ”کوئی بہانہ کر دینا!“

”مگر زین ہے کہاں مہما..... اور چاچو کے ساتھ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تمہیں تو کوئی بات سمجھانا اتنا مشکل کام ہے امرت.....“ وہ جھنجھلا گئیں۔ ”اس کے ایک دوست کا ایکسٹنٹ

ہو گیا تھا، اسے لے کر اسے اسپتال جانا پڑا..... اسے بھول گیا کہ کسی پارٹی کے ساتھ کوئی اہم میٹنگ تھی، جمال نے

اسے نہ پا کر فون کیا تو میں نے فوراً ہی تمہارے ساتھ ہونے کا بہانہ کر دیا۔“
 ”آپ چاچو کوچ بتا دیتیں ماما..... جانے ہمیں ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کتنے جھوٹ بولنا پڑیں گے۔“
 ”جمال کو تو اس کے دوستوں سے اللہ واسطے کاہر ہے اس لیے اسے سچ نہیں بتایا جاسکتا۔“
 ”مگر چاچو اگر اس سے ڈاکٹر کے بارے میں کچھ پوچھیں گے تو زین کے پاس کیا جواب ہوگا؟“
 ”تم اتنا دور کا نہ سوچو..... فی الحال جو مصیبت گلے پڑی ہوئی ہے اس سے چھٹکارا مل جائے، جمال کا پارہ ہائی ہے، تم انہیں مطمئن کر دو، باقی میں بعد میں دیکھ لوں گی۔“

ان کا فون بند ہوتے ہی چاچو کا فون آ گیا، مجھے وہی کہنا پڑا جو ممانے کہا تھا..... ”کتنی دیر میں فارغ ہو کر آ جائے گا وہ؟“ انہوں نے اس سے بات کروانے کو تو نہ کہا البتہ اس سے بھی مشکل سوال کر دیا۔
 ”دیر ہی ہو جاتی ہے چاچو ویسے تو..... لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو میں اس کو واپس دفتر بھجوا دیتی ہوں، ڈاکٹر کو میں اکیلے ہی.....“ میں یہ فقرہ کہتے ہوئے کتنی خوفزدہ تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔

”نہیں تم رہنے دو، اگر وہ ناخجائز تمہارے ساتھ پہلی بار ڈاکٹر کے پاس چلا ہی گیا ہے، اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا ہے تو رکنے دوا سے وہیں..... میں خود ہی مینٹک اینڈ کر لیتا ہوں۔“ چاچو نے کہا۔ ”تم اپنا خیال رکھنا میری بیٹی!“ فون بند کر کے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، میں نے اپنے اتنے پیارے چاچو کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔

”کب میں نے تمہارا بہانہ کر کے چھٹی لی ہے؟“ وہ اتنی زور سے بولا تھا کہ میں اپنے خیالات سے چونک گئی۔
 ”جس روز تمہارے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور تم جلدی میں اسے اسپتال لے کر گئے تو یہ بھی بھول گئے کہ تمہیں دہی سے آنے والی ایک پارٹی کے ساتھ مینٹک اینڈ کرنا تھی۔“ میں نے اسے یاد دلانا چاہا۔
 ”دوست کا ایکسیڈنٹ؟ کون سے دوست کا ایکسیڈنٹ؟“ اس نے پُر خیال نظروں سے مجھے گھورا۔ ”مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”مجھے ممانے کا ل کر کے کہا تھا کہ میں چاچو سے کہوں کہ تم میرے ساتھ ہو۔“ میں نے اسے تاریخ کے حوالے سے یاد کروایا۔

”اوہ..... وہ!“ اسے یاد آ گیا۔ ”ممانے تمہیں کیا بتایا تھا؟“
 ”جو میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے.....“ میں نے دُہرایا۔ ”کیا کوئی اور بات تھی؟ تم اپنے دوست کے ساتھ نہیں تھے؟ کہاں تھے تم، مجھے سچ بتاؤ زین!“
 ”سو جاؤ ابھی میری جان.....“ اس نے لہجے ہوئے کہا۔
 ”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“

”تمہارا نہ جاننا ہی بہتر ہے پیاری.....“ اس نے میرا ہاتھ تھپکا۔ ”اس حالت میں تم سہار نہ پاؤ گی۔“ وہ کروٹ بدل کر سو گیا اور میں خیالوں میں زین کے حوالے سے ہر وہ بات سوچنے لگی جو مجھے اس حالت میں کسی بڑے صدمے سے دوچار کر سکتی تھی۔ ان باتوں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ میں ان میں سے ترجیحات متعین کرتے کرتے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

وہ مجھ سے لڑ رہی تھی..... جج، جج کر بات کر رہی تھی۔ میں نے اس سے قبل اسے کبھی نہ دیکھا تھا، وہ ایک انجان مگر بے حد حسین چہرہ تھا۔ مجھ سے یوں چلا، چلا کر بات کرنے کی کیا وجہ تھی وہ بھی میں نہیں جانتی تھی۔

”اپنے جوتے مجھے دے دو تم!“ وہ چیخ رہی تھی۔

”اگر میں اپنے جوتے تمہیں دے دوں تو پھر میں کیا پہنوں گی؟“ میں نے اپنے جوتے مضبوطی سے اپنے ہڈوں تلے جما لیے۔ ”نیچے بہت کانٹے ہیں اور میں ننگے پاؤں نہیں کھڑی ہو سکتی۔“ میں نے بیچارگی سے کہا۔

”دیکھو پلیز..... مجھے تمہارے جوتوں میں کھڑے ہونا ہے۔“ اس نے انگریزی میں کہا تھا۔

”تم صرف میرے جوتے پہننا چاہتی ہو یا اس بات سے تمہارا وہی مطلب ہے جو میں سمجھی ہوں؟“ میں نے بھی انگریزی میں سوال کیا تھا۔

”ایک بار..... فقط ایک بار، مجھے اپنے جوتے پہننے دو۔“ وہ التجا کر رہی تھی۔

میرا دل ہنسنے لگا تھا، میں نے نیچے جھک کر اپنے جوتے دیکھنا چاہے، کون سے ایسے خاص جوتے تھے جو اسے پہنیں۔ مگر اپنی جسمانی حالت کی وجہ سے مجھے جوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اور اس کے پاس تو رنگدار تھے مگر جب میں نے زمین پر دیکھا تو مجھے سب کچھ سفید اور سیاہ نظر آیا تھا، پتھر، گھاس، نگر اور زمین، کچھ گاڑھا سا بہتا ہوا سیاہ سیال مادہ نظر آیا۔ اب میں اپنے جوتے اتار کر اسے دیتی تو میرے قدم اس سیال مادے میں ڈوب جاتے۔ وہ سیال مادہ گرم تھا، چھپچھپایا کیسا؟

”میں جوتے اتار کر تمہیں نہیں دے سکتی، زمین پر کچھ گندا سا بہہ رہا ہے، جانے کیا ہے یہ.....“

”میں بھی تو اسی گندگی میں کھڑی ہوں، برداشت کر رہی ہوں..... بس تھوڑی دیر کے لیے دے دو۔“ اس کا ہر حکم سے التجائیہ ہو گیا تھا۔

”اگر تمہارے پاؤں گندے ہیں تو پھر میرے جوتے بھی گندے ہو جائیں گے..... اور میں تو کسی کے صاف جوتے بھی نہیں پہن سکتی اور نہ اسے جوتے کسی کو پہننے کو دیتی ہوں۔“ میں نے سختی سے کہا تھا۔

”اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو میں کھائی میں چھلانگ لگا دوں گی۔“ اب اس نے غصے سے کہا تھا۔

”کھائی بہت گہری ہے.....“ میں نے خوف سے کہا، مجھے نیچے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کھائی بہت گہری ہے۔

”تمہیں اس سے کیا؟“ وہ کھائی کے کنارے کی طرف اٹھتے قدموں سے جا رہی تھی۔ میں لرز رہی تھی، جیسی

میں نے زمین اس کے عقب میں نظر آیا۔ زمین نے اپنے بازو پھیلا رکھے تھے جیسے وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر قابو

رہنا چاہ رہا ہو، زمین نے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں خاموش رہوں یعنی اسے اندازہ نہ ہو کہ زمین اس کے پیچھے تھا۔

”تم ہی اپنی ضد چھوڑ دو امرت، اپنے جوتے اتار کر اسے دے دو۔“ مجھے اپنے کان میں زمین کی آواز آئی،

نہ نے مجھ سے کیسا عجیب مطالبہ کیا تھا۔ میں اس بات کا کیا جواب دیتی؟

”میں چھلانگ لگا رہی ہوں زمین!“ اس نے مرکز زمین سے کہا تھا، زمین اسے سیٹھنے کو لپکا۔ اسے اپنے بازوؤں

میں لے لیا، اگلے ہی لمحے اس نے زمین کے بازوؤں کے حلقے سے جمونک دے کر، بھاگ کر کھائی میں چھلانگ لگا

گئی۔

زمین نے خوفناک چیخ ماری تھی..... زمین نے چیخ کر اس کا نام لیا تھا۔ خوف سے لرزتے ہوئے میری آنکھ

لی، میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا تھا؟ میں خود سے پوچھ رہی تھی۔ زمین بھی جاگ گیا تھا کیونکہ میں نے حقیقت

چیخ ماری تھی۔

”تم خواب میں ڈر گئی تھیں کیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا اور میں نے خود کو سنبھالا۔ کہیں میں بے وقوفی میں کوئی غلط

نہ نہ کہہ دیتی۔

”شاید!“

”کیا خواب دیکھا تم نے؟“ اس نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیر کر پسینے کے قطرے صاف کیے۔
 ”مجھے خواب کبھی یاد نہیں رہتے زین!“ کہہ کر میں اٹھی۔ جس لڑکی کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، اسے تو میں جانتی تھی، وہ ایسی لڑکی تو نہیں لگتی تھی کہ یوں اپنا خاتمہ کر لے..... میں نے ایسا سوچا تھا کبھی اس کے بارے میں کیا؟ کیوں؟ وہ تو ایک بے ضروری دوست تھی زین کی۔ غسل خانے میں جا کر اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے میں سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

”مبارک ہو بھئی امرت..... رانی کے ہاں بیٹا ہوا ہے، شہر بانو کا پوتا..... پہلا پوتا!“ ماما کے چہرے پر خوشی یوں ہی لگ رہی تھی جیسے کسی اناڑی میک اپ آرٹسٹ کا کیا ہوا میک اپ۔ وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر اداکاری اتنی اچھی نہ تھی۔

”آپ کو بھی مبارک ہو ماما.....“ میں نے جواب دیا۔ ”چاچو چلے گئے دفتر؟“ میں نے جوش سے سوال کیا۔

”ہاں وہ چلے گئے.....“ انہوں نے مختصر کہا۔

”میں فون کر کے چاچو کو بتاؤں؟“ میں نے جوش جذبات سے پوچھا۔

”انہوں نے ہی تو بتایا ہے مجھے.....“ ماما نے مسکرا کر کہا تھا۔

”چلو..... تیار ہو جاؤ، یاد ہے ناں کیا آج تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

”اوہ یاد آ گیا۔“ میں واقعی بھول گئی تھی۔

”کتنے بجے کا وقت ہے..... میں شاور لے کر تیار ہو جاتی ہوں۔“ ماما نے کہا۔

”اصل میں مجھے پہلے لیبارٹری سے اپنی بلڈ رپورٹ لینا ہے ماما!“ میں نے بتایا۔ ”ڈاکٹر نے آج صرف

رپورٹ دیکھنی ہے۔“

”اچھا..... چلو پھر بھی چلتی ہوں میں۔“ وہ کرسی تھکٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں تیار ہو جاتی ہوں، بارہ

بجے تک نکل جائیں گے..... رپورٹ لے کر ڈاکٹر کو دکھالیں گے۔ پھر باہر بیچ کر کے کچھ خریداری کرتے ہوئے شام

تک لوٹ آئیں گے۔“ وہ پروگرام بتا رہی تھیں۔

”میں چلی جاؤں گی ماما رانیہ کے ساتھ، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے تکلف سے کہا۔

”بڑی عجیب بات ہے بیٹا..... تم مجھے ساتھ نہیں لے کر جانا چاہتیں؟“

”ارے نہیں ماما..... میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کو زحمت ہوگی۔“ میں شرمندہ ہو گئی۔

”ایسی غیریت والی بات کیوں کرتی ہو تم؟“ اپنے غلوں بھرے فقرے کی مار دے کر وہ چلی گئیں۔

☆☆☆

”آپ نے دیکھا ہے اموجان اسے؟“ میں نے اموجان کو مبارک باد کے لیے کال کی تھی کیونکہ بڑی پھوپھی

کال تو مل ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً ناں کا نمبر مبارک باد کی کالوں کی وجہ سے مصروف ہوگا، سرمد بھائی کو کال نہ کرنے کی

میرے پاس ٹھوس وجہ تھی، اس لیے اموجان کو کال کر لی۔ ”کس کی طرح لگتا ہے؟“

”اتنے چھوٹے بچے کی شکل کا کیا اندازہ ہوگا بیٹے!“ وہ نہیں۔ ”البتہ ماں، بیٹے کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔“

”اچھا اس کا نام کیا رکھیں گے؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”بھئی تم تو سب سے زیادہ انا دلی ہو رہی ہو..... نام بھی رکھ ہی لیں گے وہ لوگ۔“

”کچھ نہ کچھ سوچا تو ہوگا ناں؟“

”ہاں جنہوں نے سوچا ہو گا وہ رکھ لیں گے تو بتا دیں گے۔“

”اموجان.....“ میں نے یونہی پوچھا۔ ”آپ کو کون سے نام پسند ہیں؟“

”ہاں جیسے وہ مجھ سے پوچھ کر ہی تو نام رکھیں گے ناں.....“ وہ نہیں۔

”ان کا نہیں کہہ رہی.....“ میں نے کہا۔ ”میں تو سوچ رہی تھی کہ اگر آپ کو میرے بچے کا نام رکھنا پڑے تو.....!“

”تمہارے بچے کا نام اور میں رکھوں گی؟“ انہوں نے اداسی سے کہا۔ ”جن کا پوتا یا پوتی ہوگی وہ رکھ لیں گے۔“ میں جانتی تھی کہ انہوں نے بات پلٹی تھی۔

”وہ رکھیں یا نہ رکھیں..... میں تو خود جاننے کے لیے پوچھ رہی ہوں۔“

”انہیں سوچنے دو پیاری.....“ اموجان نے کہا۔ ”دامع کو ان کاموں میں ضائع نہ کیا کرو جو تمہارے کرنے کے نہیں۔“

”کیا ہتا اموجان..... وہ مجھ سے کہیں کہ تم اپنے بچے کا نام خود رکھو۔“ میں نے مذاق سے کہا۔

”ہاں ہو بھی سکتا ہے۔ مگر زیبا کو جانتے ہوئے اس کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔“

”کیا ہتا وہ کہیں کہ بچے کا نام اس کی نانورکھیں گی پھر.....“ میں نے ہنس کر کہا۔

”جہیں دن میں خواب دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے گل.....“ وہ بھی کھل کر نہیں۔

”خواب دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں اموجان..... چاہے دن میں دیکھیں یا رات میں۔“ میں نے کہا تو میری

دامی وہ خواب چمکا، دل چاہا کہ اموجان کو وہ خواب سناؤں مگر اچھی عادت میری کہ میں اپنے خواب کسی کو بھی نہیں

ناتی تھی۔

☆☆☆

”کہاں کھانا کھانا چاہو گی؟“ ممانے مجھ سے پوچھا تھا۔ گاڑی وہ خود ہی چلا رہی تھیں، پہلے ہم لیبارٹری گئے

تو علم ہوا کہ ان کی کسی مشین میں خرابی کے باعث شٹ نہ ہو سکا تھا، میرا خون کا ٹیسٹ بھی ضائع ہو گیا تھا، اس لیے

میں نے دوبارہ ایک اور لیبارٹری میں سبیل دیا، اس کی رپورٹ دو دن بعد ملنا تھی۔ ممانے اس لیبارٹری کے استقبالیہ

ہاٹ کروایا کہ اس شٹ کی رپورٹ ڈائریکٹ ڈاکٹر یا سیمین کو بھجوا دی جائے۔ ڈاکٹر یا سیمین کو کال کر کے انہوں نے

پوچھا تھا کہ بغیر بلڈ رپورٹ کے ہمیں ان کے پاس جانے کی ضرورت تھی یا نہیں، اس پر انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں

نے فی الحال صرف بلڈ رپورٹ ہی دیکھنا تھی، معمول کا چیک اپ پندرہ دن کے بعد ہوتا تھا۔

رپورٹ نہ ملنے اور ڈاکٹر کو نہ دکھانے کے باعث ہمیں کھانے کے وقت سے پہلے خریداری کا وقت مل گیا تھا۔

ایک بڑے مال میں بچوں کے ایک بہت مشہور اور بڑے برانڈ کے ہٹور میں جا کر ممانے کئی ایک چیزیں خرید ڈالیں،

میں خریداری کرنے جاتی تو سو، سو بار سوچتی مگر وہ کھلے دل سے بچوں کے استعمال اور ضروریات کی اشیاء لیتی چلی

ہا رہی تھیں۔

سامان اٹھا کر لانے والے لڑکے کو ممانے ہرے رنگ کا نوٹ ٹپ میں دیا تو وہ انہیں ماتھے تک ہاتھ لے جا کر

لہو رانداز میں سلام کر کے چلا گیا۔

گاڑی کی ڈکی اور پچھلی سیٹ بھی سامان کے تھیلوں اور ڈبوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنا سامان دیکھ کر ممانے خلوص

اور پیار پر مجھے یقین آنے لگا تھا، میں چشم تصور میں ایک ننھے سے گل کو تنہے وجود کو ان چھوٹے، چھوٹے ملبوسات

میں لپیٹ کر دیکھنے لگی۔ اس سے قبل میری چشم تصور کے لیے کوئی ٹھوس چیز نہ تھی، ایک دم مجھے وہ نرم، نرم کھل میں لپٹنا

اٹھا کر تولیے میں لپیٹنا ہوا وجود اپنے پاس محسوس ہونے لگا۔ بچوں کے ننھے وجود سے جن قدرنی خوشبوؤں کو میں

نے کبھی محسوس کیا تھا، وہ خوشبو مجھے اپنے ارد گرد پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جہاں آپ کا دل چاہے مما.....“ میں نے اپنے خیالوں سے چونک کر کہا۔ ”مجھے تو اسلام آباد میں کھانے پینے کی اچھی جگہوں کا اندازہ نہیں ہے۔“

”اچھا تو تمہیں کیا نور پور میں کھانے پینے کی اچھی جگہوں کا اندازہ ہے؟“ اپنی طرف سے انہوں نے مذاق کا تھا مگر اتنا بھونڈا مذاق کہ میرا دل چاہا کہ میں ان سے گھر واپس چلنے کو کہوں۔ مصلحتاً خاموش رہی، ان کا موڈ اگر کچھ دنوں سے اچھا چل رہا تھا تو میں اسے اچھا ہی رہنے دینا چاہتی تھی۔

”سوری مذاق کر رہی تھی۔“ میری خاموشی سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے ان کی حس مزاح پسند نہیں آئی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”میرے لیے نور پور سے تعلق ہونا کوئی طعنہ نہیں ہے۔“

”اچھا بتاؤ کہ تمہیں کہاں کے باہر کے کھانوں کا اندازہ ہے؟“ انہوں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔

”کالج کے بعد زیادہ تر لاہور میں رہے مما..... پھر پڑھائی ختم ہوئی تو بھی لاہور جانا آنا زیادہ رہا، وہاں ہم

پھپھو اور گل پھپھو ہیں..... اسلام آباد تو ہم صرف زائسہ کی شادی پر آئے تھے یا بہت پہلے چاچو کو جب ہارٹ اٹیک ہوا تھا پھر جب دادا جان اسپتال میں تھے۔“

”اچھا.....“ انہوں نے کہا۔ ”چلو بعد میں تم سے پوچھوں گی کہ تمہیں لاہور میں کون سی جگہ کا کھانا پسند ہے

کیونکہ مجھے لاہور کا بالکل آئیڈیا نہیں ہے۔ پہلے بتاؤ کہ کس طرح کا کھانا کھایا جائے.....“

”سب کھا لیتی ہوں مما.....“ میں نے کہا۔ ”جو آپ کا دل چاہ رہا ہے وہ کھاتے ہیں آج!“

”چائیز کھائیں؟“

”جی ٹھیک ہے.....“ میرے اثبات میں سر ہلانے پر انہوں نے گاڑی کا رخ میریٹ کی طرف موڑا۔ حالت

تو میری کوئی نہیں تھی یوں اور، اور پھرنے والی، کوئی واقف مل جاتا تو میں شرمندہ سی ہو جاتی تھی۔ ایسے چلیے میں آرا سے گھر بیٹھنا چاہیے۔

”اچھا..... تو لاہور میں تمہیں سب سے زیادہ کیا پسند ہے مطلب کہاں کا کھانا؟“ کھانے کا آرڈر دے کر

انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ ویٹر انگور کا تازہ جوس میز پر کرشل کے خوب صورت گلاسوں میں رکھ کر گیا تھا۔

”سچ پوچھیں تو..... مجھے اپنی یونیورسٹی کی کینٹین کے سموے اور چاٹ ابھی تک سب سے اچھے لگتے ہیں۔“

انہیں بتاتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنوں میں کچھ اتار چڑھاؤ آئے۔

”بھئی میں وہاں جا کر تو سموے اور چاٹ نہیں کھا سکتی بیٹا.....“ انہوں نے ہنس کر کہا۔

”کیوں نہیں کھا سکتیں؟“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔ ”میں اور تمنا جا کر لے آئیں گے۔“

”اصل میں میں ایسی الہا چیزیں کھاتی بھی نہیں..... یہ ٹھیلوں اور ریڑھیوں والی چیزیں.....! انہوں نے

الفاظ کے پھر پھینکے۔ ”کوئی اچھی جگہ بتاؤ لاہور کی؟“ جوس کا گلاس خالی کر کے انہوں نے نزاکت سے اپنے منہ

ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

”لاہور تو گڑھ ہے مما..... کھانے پینے والی چیزوں کا! آپ جیسے sophisticated لوگوں سے لے

ہم جیسے ٹھیلوں اور ریڑھیوں سے کھانے والے لوگوں تک کے لیے.....!“

”ارے تم برا مان گئیں.....“ انہوں نے میرے گال کو تھپکا۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں خاموش رہی۔

کھانا میز پر لگا دیا گیا تھا، اس کی ورائٹی اور مقدار اس سے کہیں زیادہ تھی جو ہم کھا سکتے تھے۔ اس سے

یہاں کا کھانا میں نے اپنی شادی کے بعد کی دعوتوں میں ہی کھایا تھا۔ کھانا اچھا تو تھا مگر اس کی مقدار..... بہت

کھانا بچ گیا تھا۔

”ہم بچا ہوا کھانا پیک کروالیں ماما؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”ارے نہیں بیٹا..... ہم بچا ہوا کھانا پیک نہیں کرواتے.....“ انہوں نے نخوت سے کہا۔

”کیوں ماما؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کھانا آپ نے خریدا ہے..... اس کے لیے آپ بھاری رقم ادا کریں گی، اگر آپ کھانا پیک کروا کے ساتھ نہیں لے جائیں گی تو کیا یہ آپ کی وہ رقم واپس کر دیں گے؟“ ہم نے تو میز پر پڑے کھانے کا پچیس فیصد بھی نہ کھایا تھا۔

”بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کہیں..... کھانا نہ کھانے پر رقم کہاں واپس ہوتی ہے؟“

”بہت سا کھانا تو ہم نے چھوا بھی نہیں ماما.....“ میں نے تاسف سے کہا۔ ”اس کھانے کو یہ لوگ کیا کریں گے؟“

”بھئی جھوٹے کھانے کو پھینک دیں گے اور جو کھانا ہم نے چھوا بھی نہیں اسے کسی اور کے آرڈر پر سرور کر دیں گے..... یا ممکن ہے کہ یہ ویٹرو وغیرہ کھالیتے ہوں۔“

”یہاں دن بھر سب میزوں پر جانے کتنا کتنا کھانا بچتا ہے ماما..... ویٹروں کو کمی نہیں ہوگی مگر یہ کھانا دو بار بیچا جائے اور ہوٹل کو اس کی قیمت دو بار ملے مگر ان کے ریکارڈ میں ایک بار لکھا جائے..... یا اسے کوڑے دانوں میں پھینک کر ضائع کر دیا جائے، مجھے دونوں طرح سے دکھ ہوگا۔“ میں نے افسوس سے کہا۔ ”کاش یہ کھانا کسی مستحق کو مل جائے۔“

”گھر پر سب کو تازہ کھانا کھانے کی عادت ہے امرت.....“ انہوں نے حتی انداز سے کہا۔ ”پیک کروا کے لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”کوئی نہ کوئی مستحق مل جائے گا ماما..... آپ پلیز مجھے یہ کھانا پیک کروالینے دیں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”میں ذرا واش روم تک جا رہی ہوں۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیومر ادا لٹ..... میری غیر موجودگی میں جو کرنا ہے وہ کروا کر دے منٹ کر کے گاڑی میں آ جانا، میں واپس یہاں ٹیبل پر نہیں آؤں گی۔ تم اپنی ضد پر قائم ہو لیکن میرے لیے یہ کروانا ناممکن ہے اور اگر تم میری یہاں موجودگی میں ایسا کرواؤ گی تو میرے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔“ اپنا دالٹ میز پر رکھ کر وہ واش روم چلی گئیں، میں نے شکر کیا کہ انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ کھانا پیک کروا کے میں نے بل ادا کیا۔ کچھ ٹپ ویٹرو کو دی، پیک کیا ہوا کھانا لیا اور گاڑی کی طرف چل دی۔

راستے میں سوچ رہی تھی کہ جیسے دو برابر ڈن نوٹ میں نے اس کھانے کے بل کے دیے تھے، ویسے چار نوٹ..... مہینہ بھر محنت کر کے، موسموں کی شدتیں اور تین، تین باس کے مزاج برداشت کر کے کبھی میں کمایا کرتی تھی۔ اتنے ہی نوٹ ساجدہ اور مقبول چاچا کو مہینہ بھر اپنا خون پسینہ ایک کر کے اور ماما جیسی سخت مزاج مالکن کی جھڑکیاں اور سختیاں برداشت کر کے ملتے ہیں۔ باقی ملازمتیں کی بھی کئی بار گھر کے سب لوگوں کے ہاتھوں معمولی غلطیوں پر درگت بنتے دیکھ چکی تھی۔ صرف انہیں زد و کوب کرنا باقی رہ جاتا تھا، کئی بار تو غلطی اتنی معمولی ہوتی کہ صرف ایک آواز پر وہ اڑتے ہوئے کیوں نہ چلے آتے تھے۔

☆☆☆

”باجی..... ایک درخواست کروں آپ سے؟“ اس دن میں کچن میں گئی تھی کہ مقبول چاچا سے ذرا بھاری وٹی پکوا کر اموجان کی ہدایت کے مطابق، چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے کر کے باہر پرندوں کو ڈالوں، (ان کا کہنا تھا کہ یوں صدقہ کرنے سے اللہ تعالیٰ بچے کی پیدائش میں آسانی فرماتا ہے) ساجدہ وہاں ایک ملازم لڑکے کے ماتھل کر رات کے کھانے کے برتنوں کی تیاری کروا رہی تھی، مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

”ہاں، ہاں کہو ساجدہ!“ میں نے مقبول چاچا کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ ”چاچا جانے کہاں گئے ہیں، روٹی پکوانا تھی۔“ میں بولی۔

”آپ سے درخواست کرنا تھی جی ایک.....“

”ہاں.....“ میں نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ جی..... آپ جو تازہ روٹی پکوا کر باہر دن میں تین دفعہ پرندوں کو ڈالتی ہیں ناں اگر اس کے بجائے پنجا ہوئی باسی روٹیاں بھگو کر پرندوں کو ڈال دیں۔ وہ باہر وہاں ٹوکرے میں ہر روز کی پنچی روٹیاں رکھی جاتی ہیں..... اگر کوئی نہ لے کر جائے تو اگلے دن بڑے کوڑے دان میں چلی جاتی ہیں۔“

”اوہو.....“ میں نے باہر جا کر ٹوکرے میں سوکھی روٹیاں دیکھ کر تاسف سے کہا۔ ”کتنا رزق ضائع جاتا ہے اس طرح، روٹی حساب سے کیوں نہیں پکاتے، جتنی کھائی جاتی ہے؟“ رزق کی ناقدری پر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا کیونکہ ہم نے بچپن سے یہ دیکھا تھا کہ ایک نوالہ رزق بھی ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔

”اصل میں جی بیگم صاحبہ کا آرڈر ہوتا ہے..... روٹیاں پکتی تو حساب سے ہی ہیں مگر کوئی کھاتا ہے کوئی نہیں کھاتا۔ کوئی میز سے ادھورا کھانا چھوڑ کر اٹھ جاتا ہے، کوئی ناپسندیدہ سالن دیکھ کر پزایا برگر آرڈر کر دیتا ہے اور یوں یہ روٹیاں ضائع چلی جاتی ہیں۔“

”ان روٹیوں کا کوئی نہ کوئی مصرف تو ہو سکتا ہے..... ضائع کیوں جاتی ہیں، ملازمین کیوں نہیں کھاتے یہ روٹیاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ملازمین کھانا مغرب کے فوراً بعد کھا لیتے ہیں، ان کے لیے روٹیاں تنور سے آتی ہیں کیونکہ اتنی زیادہ روٹیاں پکانا ایک بندے کے بس کا کام نہیں۔“ ساجدہ نے بتایا۔ ”اگر آپ لوگوں کا کھانا ختم ہونے کا انتظار کریں تو نصف رات ہو جاتی ہے.....“ واقعی وہ درست کہہ رہی تھی، ہمارے رات کے کھانے کے اوقات میں بڑی بے ترتیبی تھی۔

”تو کیا ہر روز اتنی ہی روٹیاں ضائع جاتی ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ جی.....“ وہ ہچکچائی۔ ”کچھ تو میں لے جاتی ہوں اور کچھ کوڑے میں ضائع چلی جاتی ہیں۔“ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی۔ رزق..... جسے اللہ کی کوئی بھی مخلوق کھا سکتی ہو اسے کوڑے کی نذر کر دینا، ہم نے تو یہی سنا تھا کہ جہاں رزق کی قدر نہیں کی جاتی وہاں رزق سے برکت اور خیر اٹھ جاتی ہے۔

”آپ ان روٹیوں کا کیا کرتی ہو ہر روز؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کچھ روٹیاں کیوں لے کر جاتی ہو ساری کیوں نہیں لے جاتی ہو؟“

”رات کو جو روٹیاں لے کر جاتی ہوں وہ صبح تک ذرا سخت ہو جاتی ہیں، پانی اور تیل لگا کر بچوں کو پرائے بنا دیتی ہوں اور کبھی ان پر مین کا مسالا چڑھا کر کھل کر اسکول کے لیے انہیں ہمراہ بھی کر..... دیتی ہوں۔ زیادہ سخت نہ ہو جائیں تو بیچ کر چار پیسے آ جاتے ہیں۔“ اس کی بات سے میرے اندر دکھ بھر گیا۔ اس گھر میں میرے اختیار کا ایک حد تک ورنہ میں جو روٹی پکوا کر پرندوں کو ڈالتی تھی، وہ تو میں اسے دے دیتی۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا..... ہاں میں ایسا کر تو سکتی ہوں! تین روٹیاں..... بھاری سی میں ہر روز پکواتی تھی، اس بات کا تو ماما کو علم تھا۔ اگرچہ ہم انہیں معلوم نہ تھا کہ ہر رات کو گھر میں بچے والی روٹیوں کا کیا مصرف ہوتا تھا۔

”کتنے بچے ہیں تمہارے ساجدہ؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”جی تین ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”چلو میں چاچا کو بتاؤں گی کہ تین چار پرائیڈوں کے لیے کوئدھا ہوا آٹا ہر روز رات کو جاتے ہوئے چھپیرا

”دیا کریں گے..... پرندوں کو میں سوکھی روٹیاں بھگو کر ڈال دوں گی۔“
 ”وہ جی..... میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔“ وہ گھبرا کر بولی، غالباً ڈر گئی تھی۔
 ”جانتی ہوں کہ تمہارا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے ساجدہ!“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم فکر نہ کرو، پرندوں
 کا زیادہ تمہارے بچے پیارے بھی ہوں گے، اللہ کی بہتر اور زیادہ ضرورت مند مخلوق بھی اور نرم روٹی کے مستحق
 بھی!“ وہ ممنون ہوئی۔ خوشی تو تب ہوئی جب چاچا کو میں نے ایسا کہا تو وہ بھی مشکور ہوئے اور مجھے ڈھیر ساری
 اما میں دیں۔

”ساجدہ میری سگی بھانجی ہے جی..... اور بڑی تنگی اور غربت سے جواں عمری کی بیوگی کے ساتھ اپنے بچے
 ال رہی ہے، انہیں بڑھار ہی ہے..... کوثر تو ملا ہوا ہے مگر اور بڑے اخراجات ہوتے ہیں غریب کے، میں بھی اپنی
 لاء میں سے اس کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا ہوں۔“ میں دل سے مطمئن ہوئی تھی۔
 اس روز ہوٹل سے جو کھانا میں نے پیک کروایا تھا، اس کا ایک مقعد تھا، وہ بلاشبہ ساجدہ کے گھر جانا تھا، اس
 لے بچوں کو بھی کبھی کبھار اچھا کھانا کھانے کا حق تھا ناں! جب سے مجھے ساجدہ کے حالات کا علم ہوا تھا میں کسی نہ کسی
 طرح اس کے بچوں کے لیے کچھ کھانے کو بھجوا دیتی تھی۔

☆☆☆

”باجی میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ وہ کھانا میرے بچوں کے لیے کتنا زیادہ اور کس نعمت جیسا تھا.....“ ساجدہ
 اگلے روز بتا رہی تھی۔ ”اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے.....“
 ”بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرو مجھے ساجدہ! اللہ تعالیٰ میرے لیے آسانیاں کرے۔ جوں، جوں وقت
 آ رہا ہے مجھے زیادہ ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”ڈرنے کی کیا بات ہے باجی!“ وہ ہنسی۔ ”بچے پیدا کرنا تو عورت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے.....“
 ”اتنا بھی آسان نہیں ہے.....“ میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے لیے یہ پہلا، پہلا تجربہ تھا مگر وہ تو تین بچے بہت
 پہلے پیدا کر کے بھول بھی چکی تھی، اسی لیے اس طرح کہہ رہی تھی۔
 ”آپ اتنی اچھی ہیں، بہت سے لوگ آپ کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں۔“ وہ خلوص سے کہہ رہی تھی۔
 ”گھر کے سارے ملازمین آپ کی اچھی عادتوں کی تعریف کرتے ہیں، صرف آپ ہیں اس گھر میں جو ہم سب کو
 زمین کے علاوہ انسان بھی سمجھتی ہیں۔“
 ”تم سب اس گھر کے لوگوں کی خدمت کرتے ہو، اس کے صلے میں ہماری طرف سے بھی کچھ نہ کچھ کرنا تو
 آئے ناں۔“ میں نے اسے کہا۔ ”بعض اوقات تو چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ہی بہت زیادہ ڈانٹ پڑ جاتی ہے تم
 لوں کو۔“

”ارے نہیں باجی..... ہم خدمت گار کیا، تنخواہ کے عوض کام کرتے ہیں اور جو ہمیں تنخواہ دیتے ہیں،
 چھانے کو کھانے دے رکھے ہیں، ان کی ڈانٹ ہمیں بری نہیں لگتی۔“ وہ کہہ رہی تھی مگر میں سوچ رہی تھی کہ وہ
 رے تنخواہ دار ملازم تھے، زر خرید غلام تو نہیں..... ”بڑے صاحب تو بہت اچھے ہیں، ہم سب لوگوں کی ضرورتوں کا
 ل رکھتے ہیں، وقت بے وقت تنخواہ کے علاوہ بھی مدد کر دیتے ہیں اور کیا چاہیے ہمیں اس کے علاوہ..... کہیں اور
 نے کا سوچتے ہی نہیں، کیا معلوم وہاں اس سے برے حالات کا سامنا ہو۔“ باتوں ہی میں وہ کہہ تو گئی تھی ناں کہ
 ل حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ شاید اس کا سبب یہی تھا کہ اس گھر میں انسانوں کے انسان ہونے کا معیار مختلف
 اور ملازمین ایسی کیٹیگری میں نہیں آتے کہ ان کے ساتھ انسانوں کی طرح بات چیت کی جائے۔

”اچھا..... بچے تو خوش ہوئے ناں تمہارے؟“ میں نے بات بدلی۔

”بہت زیادہ باجی! آپ سوچ نہیں سکتیں باجی.....“ اس نے آنکھیں میچ کر کہا۔ ”اور ہاں آپ کو ایک زندہ لطیفہ سناؤں؟“

”ہائیں..... یہ زندہ لطیفہ کیا ہوتا ہے بھی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ کو نہیں پتا؟“ وہ شیشائی اور حیرت سے سوال کیا۔

”نہیں بھی..... تم بتاؤ!“

”کچھ لطیفے تو بنائے جاتے ہیں، جھوٹ پر مبنی، یوں ہی کسی بے عزتی کرنے کے لیے!“ اس نے وضاحت کی۔

”کسی کی دل آزاری کر کے دوسروں کے ہنسنے کا سامان کیا جاتا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے ہنکارا بھرا۔

”مگر زندہ لطیفہ وہ ہوتا ہے جو کوئی مزاحیہ بات کوئی اپنی معصومیت یا سادگی میں کہہ جائے..... مثلاً جیسے میں

آپ کو اپنے بیٹے کا لطیفہ سنانے لگی ہوں۔“

”تم پر بھی لکھی ہو ساجدہ؟“ میں اس کی وضاحت سے متاثر ہوئی تھی۔

”جی ہاں..... میٹرک کیا ہے میں نے۔ پھر ماں باپ مر گئے اور ماموں نے اپنے جیسے کسی کے ساتھ بیاہ دیا

بہت اچھا تھا، میری بہت پروا کرتا تھا..... زین صاحب جیسا بے پروا نہیں تھا.....“ میں نے اسے حیرت سے دیکھ

مگر اس کے اس بیان کو اہمیت نہ دی، اسے نظر انداز کیا تاکہ وہ اس بات کو نہ اہم سمجھے اور نہ ڈہرائے۔ مجھے یک

سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کی اس بات پر کیا رد عمل ظاہر کروں، کیا کہوں۔ ”تھا بچہ دل کا دائی مریض، انہی حالات

میں پتے، روتے بیٹے اور غربت سے جنگ لڑتے، تین بچے بھی پیدا ہو گئے۔ ان بچوں کو بھی کوئی خوشی دینا ہمارا

بس میں نہ تھا، خود غشی سے گزارہ کرتے تھے۔ اس کے علاج کی سکت نہ تھی، سرکاری اسپتالوں میں تو آپ جانتی ہیں

کہ کیسا علاج ہوتا ہے، بس جی اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اب میری ساری زندگی اور اس کا محور میرے بیٹے

ہیں.....“ وہ اداسی سے بولی۔

”تم کوئی زندہ لطیفہ سنانے والی تھیں ساجدہ؟“ میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

”آپ کو برا لگا زین صاحب والی بات کا ناں..... کیسی کائیاں تھی وہ۔“ سوری باجی! اصل میں مجھے بہت

ہوتا ہے جب میں یہ سب دیکھتی ہوں، کیسے نا قدرے لوگ ہیں۔“

”ساجدہ.....“ میں نے اسے گھر کا۔

”وہ اصل میں، جب میں گھر کھانا لے کر گئی تھی ناں باجی!“ وہ شروع ہوئی۔ ”تو وہ ناں، نوڈلز (چاؤمر

دیکھ کر میرا بیٹا ڈر گیا!“ وہ کبھی، کبھی کر کے ہنسی۔

”ڈر گیا وہ کیوں بھی؟“

”کہنے لگا..... بڑی کوشی والے لیے، لمبے کیڑے کیوں پکا کر کھاتے ہیں؟“ اس کی ہنسی ہی نہ رک رہی تھی

مجھے بھی ہنسی آ گئی، میں تو یہ سوچ کر ڈر گئی تھی کہ کہیں کھانے میں کوئی کیڑا نہ نکل آیا ہو اور وہ غریب پوری پلیٹ کو

کیڑوں کی پلیٹ سمجھ گیا تھا۔ مگر جی اس نے کیڑے سمجھ کر نوڈل تو نہ کھائے مگر ندیدے نے ان میں سے چکن

بوتیاں ساری چن، چن کر کھالیں.....“

”اور تم نے کیڑوں کا کیا، کیا؟“ میری بھی ہنسی نہ رک رہی تھی۔

”وہ جی میں نے خود کھا لیے.....“ اس نے ہنستے، ہنستے کہا۔ ”اتنے سارے تو نہیں کھا سکتی تھی، اس لیے با

مسل کران میں آلو بال کر ڈالے اور سالے وغیرہ ڈال کر ان کے کباب بنالیے..... آج رات کو کھانے میں انہی کیڑوں کے کباب کھائے گا مگر اسے علم بھی نہ ہوگا کہ وہ کیڑوں کے کباب کھا رہا ہے.....“ وہ اور زور سے ہنسی۔
”جب کھا چکے گا تو پھر اسے بتاؤں گی!“

”ایسے نہ کرنا ساجدہ..... بچوں کو ایسے چھوٹے، چھوٹے دھوکے سے کر اگر ان کی تربیت کرو گی تو وہ بھی یہی سمجھیں گے۔“ میں نے اسے رد کیا۔ ”میں تمہیں کچھ نوڈلز کا ایک پیکٹ دوں گی، وہ لے جانا اور اسے تفصیل سے بتانا کہ نوڈلز کیا ہوتے ہیں، کچے اور پھر بال کر اسے دکھانا۔“ اس کے لطیفے کو تو میں نے انجوائے کیا مگر اس بچے کو علم تو ہونا چاہیے کہ نوڈلز کیا ہوتے ہیں۔ غربت کے بھی کیا، کیا درجے ہیں۔

☆☆☆

”ہمیں گاؤں نہیں جانا چاہیے کیا زبیا.....؟“ چاچو نے کھانے کی میز پر کہا تھا۔ ”سرد کا بیٹا، بڑی آ پا کا پہلا ہوتا، ان کے گھر کا پہلا چشم و چراغ، اسے ملنے اور انہیں مبارک باد دینے کو جانا چاہیے نا!“
”ہاں، ہاں..... کیوں نہیں، میں تو خود سوچ رہی تھی اور میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ وہ کل اس بچے کا عقیدہ کر رہی ہیں، ساتھ ہی ارد گرد کے سارے گاؤں اور اپنے گاؤں میں بھی مٹھائی تقسیم ہوگی، ہمیں بھی دعوت دی ہے انہوں نے..... اور تو کوئی نہیں جاسکتا، میں اور آپ چلتے ہیں۔ ویسے بھی میں سوچ رہی تھی کہ کتنے عرصے سے ہم عائشہ بھابی کی طرف نہیں گئے۔“ ماما کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا تو لگا ہی مگر ساتھ ہی دل ہلکنے لگا کہ میں بھی چلی جاتی، سب سے ملاقات ہو جاتی۔ میں دیکھتی کہ رانی پر ماں بن کر کیا روپ آیا تھا اور سرد بھائی کے ساتھ وہ خوش بھی ہے کہ نہیں مگر ظاہر ہے کہ کمر کے درد کی وجہ سے سفر کی اجازت نہ تھی، اس لیے تڑپ کر رہ گئی۔
”میں چلوں ساتھ ماما؟“ حسہ کے سوال پر میں نے ہی نہیں بلکہ سب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”تم..... تم کیا کرو گی وہاں؟“ ممانے فوراً کہا۔

”اگر بچی جانا چاہتی ہے تو اسے کیوں منع کرتی ہو؟“ چاچو نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”ویسے بیٹا تمہیں گاؤں جانے کا شوق تو بھی نہیں رہا تو آج کیسے؟“

”پاپا مجھے گاؤں برائیں لگتا مگر اب تو میں چھوٹے سے بے بی کو دیکھنے جانا چاہتی ہوں!“

”چلو بھئی تیاری کرو، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ چاچو نے خوش دلی سے کہا۔ ”اور ہاں..... رات رکنا ہو

گا، اپنا سامان اسی حساب سے ساتھ رکھ لیا!“

”رات رکنے کی کیا ضرورت ہے؟“ ممانے اعتراض کیا۔ ”سویرے نکلیں تو شام تک آرام سے واپس آ

تے ہیں!“

”بھئی میں گاڑی خود چلاؤں گا اور میں ایک دن میں جانے اور آنے کا سفر نہیں کر سکتا!“

”گاڑی خود کیوں چلائی ہے..... ڈرائیور جو ہے۔“

”گھر پر گاڑی اور ڈرائیور کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے، امرت کے لیے، اس لیے اسے گھر پر

بھونڈوں گا۔“ چاچو کی بات پر میرا چہرہ لال ہو گیا، یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ایسی کوئی ایمر جنسی نہیں ہے۔

”زین ہے ناں یہاں پر کسی ایمر جنسی کے لیے جمال!“

”جیسے میں زین کو جانتا نہیں..... اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے، اسے اتنی پروا ہوتی تو مسئلہ ہی کیا تھا۔“ چاچو

اور ماما کے درمیان معرکہ شروع ہو چکا تھا، حسہ اٹھ کر چلی گئی اور باقی لوگ تماشائی بنے خاموشی سے کھانا ٹوٹتے رہے۔

☆☆☆

”پاپا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں لے کر علیحدہ ہو جاؤں۔“ زین نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے انکشاف کیا۔

”چاچو نے؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔

”تمہارے چاچو کو میں پاپا کہتا ہوں اور تمہیں علم ہے کہ میرے ایک ہی پاپا ہیں۔“ اس نے چڑ کر کہا۔

”سوری..... میرے منہ سے بونہی نکل گیا۔“ مجھے اس کا موڈ غارت کرنے کا شوق بھی نہیں رہا تھا۔ ”اصل میں مجھے حیرت ہوئی کہ چاچو ایسا کیوں کہیں گے۔“

”یہ تو انہی کو علم ہو گا میری جان.....“ اس نے لاڈ سے کہا۔ ”میں تو جانا چاہتا ہوں کہ تمہیں کیسا لگا سن کر، اگر ایسا ہو جائے تو؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کسی بھی حال میں اور کسی بھی جگہ پر تمہارے ساتھ رہنے میں مگر.....“

”مگر کیا؟“ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم کہاں جائیں گے..... کس طرح گزارہ ہو گا اور کل کلاں کو بچے کے ساتھ، میں کس طرح تنہا بچے کو سنبھالوں گی؟“

”بچے تو دنیا کی ساری مائیں سنبھالتی ہیں..... تمہیں ماں بننے کا اتنا شوق تھا تو یہ علم ہونا چاہیے کہ بچوں کو مائیں ہی سنبھالتی ہیں۔“

”ہوں.....“ میں اس کے اسی فقرے میں الجھ گئی کہ مجھے ماں بننے کا شوق تھا۔ جیسے مجھے ماں بننے کا بچپن سے شوق تھا اور میں نے اب تک کی ساری محنت ماں بننے کے لیے ہی کی تھی۔

”رہی بات گزارہ کرنے کی تو وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو پاپا کو علم ہو گا، وہی تو یہ تجویز دے رہے ہیں بلکہ شاید جلد ہی فیصلہ صادر کر دیں گے..... انہیں ہی سب کچھ دینا ہو گا۔ میں اپنی خواہ میں تو کچھ نہیں کر سکتا، میں تو اب بھی ماما سے ہر مہینے پیسے ادھار لیتا ہوں.....“ وہ ہنسا۔ ”وہ ادھار جو کبھی واپس ہوئے نہ ہوں گے۔“

”تو ایسا کیسے اور کب تک چلے گا؟“

”یہی تو مسئلہ ہے جو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، میری کم عقل اور پیاری، پیاری بیوی.....“

طرز یہ لہجہ۔

”مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟“ میں نے بچا رنگی سے کہا۔ ”اگر چاچو نے فیصلہ کر لیا ہے تو۔“

”چاچو کے فیصلوں کو اس گھر میں دھونس سے ماما اور پیارے تم تبدیل کروا سکتی ہو۔“

”چاچو کے بچوں میں سے جو چاہے ان سے فیصلوں میں چلک پیدا کروا سکتا ہے..... والدین کا ہر فیصلہ اولاد کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ ہر وہ اولاد جو ماں باپ کی فرمانبرداری اور اطاعت گزار ہوتی ہے۔ ان سے پیار کرتی ہے، وہ اپنے والدین سے جو چاہے منوا سکتی ہے۔ اولاد ہی تو ماں باپ کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے!“ میں نے اسے سمجھایا۔

”اس کے لیے اولادوں کا تمہاری طرح خوش قسمت ہونا ضروری ہوتا ہے، میرے جیسے بچے تو صرف لعن طعن ہی پاسکتے ہیں والدین کی سبالتھو ص باپوں کی۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہو زین؟“ میں نے حیرت سے پلٹا کھایا۔

”ایسا ہی ہے امرت..... میری کوئی خواہش پاپا نے آج تک پوری نہیں کی۔“

”تم یقیناً مذاق کر رہے ہو زین، تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا، اس کے بات کرنے کے

انداز سے مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سنجیدہ ہوتا تھا یا طنز کر رہا ہوتا تھا۔

”تم بتاؤ..... کیا دیا ہے انہوں نے مجھے، کیا لکھا ہے میرے لیے انہوں نے؟“ وہ چبا، چبا کر بول رہا تھا، ایسا وہ مذاق کی حالت میں بھی کبھی نہیں کرتا تھا۔

”تم نے جو چاہا اور جہاں سے چاہا پڑھا..... اس کے لیے چاچو نے تم پر لاکھوں نہیں کروڑوں خرچ کیے ہیں.....“ میں نے دو بدو کہا۔ ”تم نے چھ سال تک ملک سے باہر رہ کر پڑھا ہے، ایک دن بھی تم نے کہیں کام نہیں کیا اور تمہاری تعلیم کے علاوہ رہائش اور باقی تمام اخراجات چاچو نے یہاں بیٹھے ہوئے اٹھائے ہیں..... تم دیکھ لو۔ ابھی عارب نے باہر جانے کا کہا ہے تو چاچو نے اسے انکار کر دیا ہے کہ وہ چار سال یہاں پر پڑھ کر پچھل کرے اور پھر ماسٹرز کرنے کے لیے باہر جائے۔ تم تو چاچو کی سب سے پہلی اور بڑی اولاد ہو، ان کا پیارا سا بیٹا، ان کی چاہتوں اور امیدوں کا مرکز.....“

”ہونہہ..... ان کی پھٹکاروں اور جھڑکیوں کا واحد نشانہ!“ اس کے لہجے میں کتنی حقارت تھی، چاچو دیکھ لیتے تو۔ سن لیتے تو پریشان ہو جاتے۔

”کون سی چیز ہے جو تم نے مانگی اور انہوں نے نہیں دلوائی..... تمہارے کس دوست کے پاس تمہارے جیسی گاڑی ہے، تم جیسے لباس کوئی خریدنا انورڈ کر سکتا ہو، تمہارے ہاتھ پر باندھی ہوئی گھڑی جیسی گھڑی خریدنے کی اوقات رکھتا ہو اور تم جیسا موبائل رکھتا ہو؟ جو نیا ماڈل آتا ہے اسے خریدنے والوں میں ملک بھر میں چند پہلے لوگوں میں تمہارا شمار ہوتا ہے۔“ میں نے اسے آئینہ دکھایا۔ ”اور تم سمجھتے ہو کہ ہر ماہ جو رقم تم اپنی خواہ کے علاوہ ماما سے لیتے ہو وہ ماما کہیں اور سے لے کر آتی ہیں؟ یقیناً وہ چاچو سے لیتی ہیں اور وہ جان بوجھ کر تمہیں نہیں جتلاتے..... تمہاری بھوی اور آنے والے بچے کے سارے اخراجات بھی چاچو ہی بالواسطہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھائیں گے، تم نے تو کبھی خود ان پر کچھ خرچ نہیں کیا۔“

”ہونہہ..... گاڑی، گھڑی، موبائل فون، لباس اور جوتے..... تمہیں لگتا ہے کہ یہی سب کچھ زندگی ہے؟“ اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”اور کیا ہوتا ہے زندگی میں؟ اور کیا خواہشات ہوتی ہیں نوجوانوں کی؟“

”انہوں نے مجھے کبھی اپنی خوشی سے جینے نہیں دیا..... مجھے وہ نہیں دلایا جو میں چاہتا تھا۔“

”رہنمائی؟“ اب طنز سے ہنسنے کی باری میری تھی۔

”تم نے سب کچھ اپنی خوشی اور مرضی سے کیا زین..... پڑھائی سے لے کر شادی تک، سب کچھ تم نے اپنی خوشی سے کیا!“

”انہوں نے مجھے کہا کہ بزنس پڑھو تو میں نے بزنس پڑھا حالانکہ میری خواہش ادا کار اور ماڈل بننے کی تھی، انہوں نے کہا کہ شریف گھروں کے بچے ایسے کام نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ پڑھنے کے لیے باہر چلے جاؤ، میں اٹھارہ برس کی عمر میں کھر سے نکال دیا گیا۔ پڑھ چکا تو میرے لیے اس ملک میں درجنوں آفرز اور بہترین آفرز تھیں جہاں سے میں نے جان مار کر اچھے گریڈز کے ساتھ ڈگری لی تھی۔ مگر انہوں نے کہا کہ مجھے لوٹ کر واپس آنا ہے..... میں واپس آ گیا۔ میں اس ماحول میں خود کو کس فٹ پاتا ہوں امرت جہاں سے میں اتنی کم عمری میں ہی نکالا گیا تھا۔ انہیں میرے طور طریقوں، میرے دوستوں، میری عادتوں پر اعتراضات ہیں امرت، میں یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتا، یہ سب کچھ میرے لیے اہم ہے، یہ چیزیں میری فطرت ثانیہ بن چکی ہیں۔ میں جس عمر میں کھر سے نکالا گیا اس عمر میں نوجوانوں کو ماں باپ کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے نہیں ملتی تو مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ سرگرمیت،

شراب اور جنس مخالف سے دوستی کی کوئی حدود ہوتی ہیں، میں جس ماحول میں تھا وہاں سے میں نے یہی سب کچھ سیکھا اور اپنایا۔“

”تو تم شراب بھی.....“ اس سارے لیکچر میں مجھے اس کی یہی بات نئی لگی تھی، سگریٹ اور لڑکیوں سے دوستیاں تو میں جانتی تھی، ان کی حدود کیا تھیں..... اس کا علم نہ تھا۔

”رہی بات شادی کی..... تو وہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔“ اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ”پھر کبھی

سناؤں گا۔“

”ابھی سناؤ زین..... اس وقت اتنا کچھ سن رہی ہوں تو وہ بھی سنا دو۔“

”اس شادی میں میری مرضی شامل نہیں تھی، جہاں میں شادی کرنا چاہتا تھا وہاں پاپا کو منظور نہ تھا۔ ان کی ضد تھی کہ خاندان کی کوئی لڑکی ان کی بڑی بہو بنے گی، انہوں نے مجھے عباس چاچا کی بیٹیوں، تینوں بھیبو کی بیٹیوں اور تم دونوں بہنوں میں سے کسی کا انتخاب کرنے کا ”حق“ دے دیا تھا۔“ وہ رکا۔ ”یہ بھی ان کا بڑا احسان تھا۔“

”تو ان سب میں سے تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟“ میں نے یہ مشکل سوال کیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہمارے بچے مجبوراً کی رشتہ قائم ہوا، میں سمجھی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔“

”تمنا کو یثاق، تحریم کو اس کا ایک کلاس فیلو، فاطمہ کو کبیر بھائی اور تمہیں.....“ وہ رکا، میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا، میری نظروں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ”حرا کی شادی ہو گئی، طوبی بہت چھوٹی ہے، عباس چاچا کی دو بیٹیاں متکئی شدہ ہیں باقی دو مجھے پسند نہیں تھیں۔“

”تم میرے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔“ میں نے جی کڑا کے کہا۔

”سرمد بھائی کی خواہش تھی تم!“ اس کے کہنے پر میرے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”جانتا ہوں یار کہ ان کی خواہش یک طرفہ تھی، تم سے پوچھا گیا تھا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ تمہارا دل ان چھوٹا تھا، اسی لیے تمہارا آپشن مجھے بہتر لگا۔“

”بس؟“ دل میں شکر ادا کیا کہ اسے کامل کے بارے میں علم نہ تھا..... ان چھوٹا دل! میں نے اس کی طرف چور نظروں سے دیکھا، دل میں خیال آیا کہ میری اس سے شادی ہوئی جب کہ وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا، میں بھی ماضی میں ایک ایسے ہی خواب کو آنکھوں میں سجا چکی تھی۔ اس نے مجھ سے پورا بچ کہہ دیا تھا، مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ ایسا کرتی کیونکہ ہمارے ہاں عورت کا ماضی بے داغ ہونا اہم ہے، مرد کے ماضی پر حال کی گرد پڑ جاتی ہے۔

”تم مجھے اچھی بھی لگیں ان سب میں، خوب صورت، سادہ، بے نیازی اور ذہین بھی!“ اس نے مجھے پسندیدگی کی سند دی۔ ”سو چاہتا کہ ساتھ رہیں گے تو کچھ لگاؤ بھی ہو جائے گا اور یوں بھی اس کی اتنی ضرورت تو نہ تھی، وہ تو ماما کا اصرار تھا کہ پاپا کو ناراض نہ کروں کیونکہ وہ بیمار اور دل کے مریض ہیں اور یہ کہ وہ مجھے عاق بھی کر سکتے تھے اور اس صورت میں، میں سڑک پر آ جاتا۔“

”تو صرف اپنے بچاؤ اور ذاتی مفادات کے لیے تم نے مجھ سے شادی کر لی؟“

”کچھ اس سے بھی اہم ہے۔“

”وہ بھی بتا دو زین!“ میں نے کمال ضبط سے لب بھیپنے۔

”ممانے کہا تھا کہ تمہاری ماں کے اندر ایثار کا مادہ ہے، انہوں نے مشکل حالات اور ضرورت کے تحت، اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی۔ اس لیے جب کچھ وقت گزرے گا، پاپا کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور

میں دوسری شادی کرنا چاہوں گا تو تم بھی مجھے اجازت دے دو گی.....“ وہ رکا۔ ”اسی لیے یہ بچہ چھ مہینے میری زندگی کے اس حصے کے پلان میں نہیں تھا۔“

”کیا.....؟“ میں چپٹی۔ ”تم دوسری شادی کرو گے؟“ میں ہچکائی کیفیت میں آ گئی۔ ”چھوڑ دو گے تم مجھے؟“ ”مجبوری ہے، پاپا مان جاتے تو میں تم سے پہلی شادی ہی نہ کرتا، اسی سے کرتا۔“ وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے ٹائی تھدیل کرنے کی بات کر رہا ہو۔ ”اب حالات ایسے ہیں کہ اس سے شادی دوسری شادی ہوگی، کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اسے اپنے خون سے لکھ کر عہد دیا تھا۔“ اس کی مجبوریوں کی داستان میں ماؤف ہوتے ہوئے ذہن سے من رہی تھی۔ ”جس دن ممانہ تمہیں میرے کسی دوست کے ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا، میں اسی کے ساتھ تھا، اس نے میرے دودن فون نہ کرنے پر غصے میں آ کر اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی۔“ میں پھٹی آنکھوں سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی، میرے وجود میں زلزلے آ رہے تھے، میرے منہ سے یہ سوال بھی نہ نکلا کہ وہ کس سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

”امرت..... تم سے ایک اہم بات کرنا تھی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”وقت ہے تمہارے پاس، تنہا ہو تو بات ہو سکتی ہے؟“ فون پر سارہ تھی۔

”ہوں!“ میں نے کسمسا کر کہا، آنکھیں ابھی تک بند تھیں، جسم تھکان سے چور تھا۔

”سورہی ہو اب تک؟“

”ہاں.....“ میں نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر۔ وقت دیکھا، ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ”اوہو، اتنی دیر ہو گئی ہے؟“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے پیاری؟“

”ہاں وہ رات دیر تک جاگتے رہے تو.....“ میں نے بات کہنے کے بعد احساس ہوا کہ کچھ غلط کہہ دیا تھا میں نے کیونکہ وہ فوراً کھلکھلا کر ہنسی مچائی۔ ”چاچو اور ماما گاؤں گئے ہیں تو!“

”کوئی بات نہیں یار..... تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ رات دیر تک جاگنے سے کون منع کر رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تم کہو، کچھ خاص بات کرنا تھی تمہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہ.....“ وہ کچھ کہتے، کہتے جھجک گئی۔

”کیا بات ہے سارہ؟“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا، جانتی تھی کہ وہ کسی مسئلے سے دوچار ہے۔

”ہم مل سکتے ہیں کیا؟ مجھے لگتا ہے کہ فون پر میں بات نہ کر سکوں گی۔“

”ہوں.....“ میں سوچ میں پڑ گئی۔ رات کافی ٹینشن اور سوچوں میں سوتے جاگتے گزری تھی، دل میں

الہامانے دسو سے تھے۔

”چلو اگر تم مصروف ہو یا.....“

”ارے نہیں پیاری!“ میں نے فوراً کہا۔ ”سوچ رہی تھی کہ میں کتنی دیر میں شاہرے لے کر تیار ہو سکوں گی۔“

”ساڑھے دس بجے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ایک بجے قریبی مال میں ملیں؟ اڑھائی گھنٹے کافی ہیں تیار ہونے کے لیے؟“

”کافی ہیں باس!“ میں نے لہجے میں بٹاشٹ پیدا کی، بستر چھوڑا تا کہ کاہلی ختم ہو۔ دروازے پر دستک

ہوئی، ساجدہ تھی۔

”آپ ٹھیک ہیں ناں بالکل باجی؟“ اس نے متشکر لہجے میں پوچھا۔

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جمائی لے کر کہا۔

”جب سے آپ کی شادی ہوئی ہے آج پہلی بار آپ فجر کی نماز کے وقت نہیں جاگیں۔“ اس نے کہا تو میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“

”آپ کے ہاتھ روم کی کھڑکی کی طرف میرا کوارٹر ہے، جب آپ ہر روز سویرے جاتی ہیں تو اس کی روشنی ہمارے کوارٹر کی کھڑکی پر پڑتی ہے اور میں بھی جاگ جاتی ہوں..... آج میری نماز بھی قضا ہوگئی کیونکہ آپ نے نماز مس کر دی۔“ اپنی نماز کے چھوٹ جانے کا دکھ تو ہوا ہی مگر یہ جان کر اور بھی دکھ سوا ہو گیا کہ میری وجہ سے کما اور کی نماز بھی قضا ہوگئی۔

”مجھے ایک کپ دودھ لا دو ساجدہ..... میں تیار ہوتی ہوں، مجھے کسی دوست سے ملنے جانا ہے۔“

”آپ ہاتھ روم جا میں بستر تہ کر کے جا کر لے آتی ہوں۔“ وہ بستر کی ٹکلیں دور کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے.....“ میں اسے کمرے میں چھوڑ کر غسل خانے چلی گئی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ زندگی نے میرے ساتھ کس طرح کا مذاق کیا تھا، کس طرح کی لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی شدہ مردوں کو پھانس لیتی ہیں۔ مگر وہ تو پہلے سے ہی اس کے ساتھ بچسا ہوا تھا..... میں کہیں سے بچ میں حائل ہوگئی ہوں۔ چلا جو بھی کچھ شادی سے پہلے تھا وہ اپنی جگہ، دوستی، بے تکلفی، محبت یا الفت..... جو بھی تھا وہ ہماری شادی کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کس طرح کی مائیں ہوتی ہیں جو اپنی بیٹیوں کو یوں بے جا آزادی سے لڑکوں اور مردوں سے ملنے اور دوستیاں رکھنے دیتی ہیں۔ اگر معاملہ بھی خراب ہو لیا زین نے واقعی اس لڑکی سے شادی کا معمم ارادہ کر لیا تو میں ایک بار اس لڑکی اور اس کی ماں سے ضرور ملوں گی، ان سے پوچھوں گی کہ ایک بٹے ہوئے مرد کے ساتھ وہ کیوں خود کو ملوث کیے ہوئے ہے۔

PAKISTANIPRINT

”باجی..... دودھ لے آئی ہوں۔“ ساجدہ نے دروازہ کھٹکٹا کر کہا تھا۔ میں نے اسے چلے جانے کا کہا۔ تیار ہو کر بال سمیٹ کر باہر نکلی تو ٹرے میں دودھ کے گلاس کے ساتھ، ایک پلیٹ میں بریڈ کے سلاکس پر ٹھنڈا لگا کر، اس میں آلیٹ اور چیز کا ایک سلاکس رکھ کر ساجدہ نے نفاست سے سینڈویچ بنا کر رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ ہمارا منہ خالی جانے نہیں پھنی چاہیے، بالخصوص اس حالت میں۔ میں نے مسکرا کر ناشتا کیا، ساتھ ساتھ فون پر اپنے پیغامات چیک کر کے لگی۔

فون کی کھنٹی بجی..... ڈاکٹر یاسمین کا فون تھا۔ ”کتنی جلدی میرے پاس آ سکتی ہو تم؟“ انہوں نے میرے فون اٹھاتے ہی پوچھا۔

”ابھی کے ابھی!“ میں نے ان کی آواز سے اندازہ کیا کہ ان کی کال کسی اہم وجہ سے ہے۔

”اوکے، ریلیکس رہو..... اور اکیلی نہ آنا!“ انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں ہولے، ہولے کا پھنے لگی۔ اس وقت کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟ دل چاہا کہ اموجان کو کال کروں مگر انہیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔ چاچو اور مرثیہ شام کو ویسے ہی لوٹ کر آنے والے تھے۔ زین دفتر جا چکا تھا..... اور کون!

”سارہ!“ میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔ ”تم گھر پر ہو یا روانہ ہو چکی ہو؟“

”بس نکلتے ہی والی تھی.....“ اس نے کہا۔ ”خیریت تو ہے، تم کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو؟“

”ہاں، ہاں..... خیریت ہی ہے، تم گھر پر کو، میں تمہیں گھر سے لے لیتی ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے..... یہ اچھا ہے، میں تو یوں بھی ٹیکسی منگوانے والی تھی۔“ میں نے فون بند کیا، اپنے بیگ میں
 اکثر کی فائل رکھی اور ساجدہ سے کہا کہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہے۔ سارہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو وہ باہر ہی
 کھڑی ملی۔

”یہ تم نے اچھا کیا۔“ میں نے اس کے یوں انتظار میں باہر کھڑے ہونے پر اسے داد دی۔
 ”یہ ہم مال کی طرف تو نہیں جا رہے؟“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں..... ہم کہیں اور جا رہے ہیں، میں چھوٹا سا کام کر لوں، اس کے بعد ہم وہیں کہیں قریب بیٹھ جائیں
 گے اور تم بات کر لیتا۔“

”مجھے تم سے بہت ہی اہم، بہت خاص بات کرنا تھی امرت!“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔
 ”مجھے ڈاکٹر نے کسی اہم کام کے لیے بلایا ہے صرف چند منٹ لگیں گے۔“ اس نے منہ بسورا۔
 ”سوری!“ میں نے کہا تو وہ جیسے زبردستی مسکرائی۔ ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر چاچا نے گاڑی لگائی۔
 ”تم جا کر مل آؤ ڈاکٹر سے، میں یہیں گاڑی میں انتظار کرتی ہوں!“

”نہیں بھئی، تمہیں کسی وجہ سے ساتھ لانی ہوں، تمہارا ساتھ جانا ضروری ہے۔“ میں نے اسے ہاتھ سے کھینچ
 کر باہر نکالا۔ اندر پہنچنے تک تیزی سے چلنے کی کوشش میں میں ہانپ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر میں نے اپنی فائل وہاں بیٹھی
 لاک کی کو دی۔

”آپ بیٹھیں، اس مریضہ کے نکلنے کے بعد آپ کو بھیجواتی ہوں، ڈاکٹر صاحبہ نے ہدایت دی تھی کہ جو نبی آپ
 پہنچیں میں آپ کو اندر بھیجوا دوں مگر معذرت خواہ ہوں کہ ابھی اندر ایک مریضہ کا ایمر جنسی میں معائنہ ہو رہا ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں..... میں انتظار کر لیتی ہوں۔“ میں اور سارہ انتظار گاہ میں بیٹھ گئیں۔

”آپ جائیں اندر.....“ اسی لڑکی نے پاس آ کر مجھ سے کہا تو میں اور سارہ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف
 بدھیں۔ اندر سے باہر آنے والی کے چہرے پر چھائیوں کے داغ تھے، وہ شکل سے ہی بہت کمزور لگ رہی تھی، جس
 بچے کا بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھی وہ اس کی سکت سے باہر لگ رہا تھا، وہ مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ اسے چند
 لمحوں میں، میں نے غور سے دیکھا۔ اس کے عقب میں ڈاکٹر کے کمرے سے نکلنے والے مرد کو دیکھ کر سارہ کہتے ہیں آ
 گئی تھی، میں نے اس کے چہرے پر نقش ہونے والے تاثرات کو دیکھا۔ اس مرد نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔
 ”سارہ.....“ میں نے اسے پکارا تو وہ چونک گئی۔ ”تم ٹھیک تو ہونا؟“

”ہوں..... ہاں!“ اس نے خیالوں میں گم جواب دیا۔
 ”تم جانتی ہو اسے؟“ میں نے اس سے سیدھا سوال کیا۔
 ”ہاں.....“ اس نے گہری سانس لی۔ ”مجھے وہ میرا سب کچھ تھا، اب وہ میرا کچھ بھی نہیں۔“ وہ یقیناً اس کا

سابقہ شوہر تھا۔

”اندر چلیں؟“ دروازے میں استادہ اس کا بت متحرک ہوا۔

”آؤ، آؤ.....“ ڈاکٹر یا سمین نے کہا۔ ”بیٹھو تم!“

”شکریہ!“ کہہ کر ہم دونوں نے نشستیں سنبھالیں۔

”میں سمجھی کہ تمہاری سانس تمہارے ساتھ آئیں گی۔“

”وہ گاؤں گئی ہوئی ہیں جی!“

”یہ کون ہیں؟“ ڈاکٹر نے سارہ کے بارے میں پوچھا۔ ”تمہاری بہن؟“
 ”بہن ہی سمجھیں..... بہت اچھی دوست ہے میری!“
 ”سارہ نام ہے میرا!“ سارہ نے مسکرا کر اپنا تعارف کروایا۔
 ”آپ کا چہرہ بھی دیکھا ہوا لگ رہا ہے۔“ ڈاکٹر یاسمین نے مسکرا کر کہا۔
 ”ہم دونوں ساتھ ہی جا رہے ہیں!“ میں نے بتایا۔
 ”اوہ اچھا..... اسی لیے!“

”یہ جو ابھی باہر گئے ہیں.....“ سارہ نے اچانک کہا۔ ”مجھے ان کا چہرہ کچھ دیکھا سا لگا۔“
 ”یہ..... ہاں، ممکن ہے! یہ ان صاحب کی دوسری بیگم ہیں، اس کے ہاں اس سے پہلے دو مردہ بچے پیدا ہو

چکے ہیں، اب یہ تیسرا ہے، تینوں بیٹے!“

”تو کیا یہ والا؟“ سارہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... یہ بھی مرچکا ہے، میں نے اس کے لیے ڈیوری کی تاریخ دینا تھی۔“ ڈاکٹر یاسمین نے وضاحت کی۔ سن کر دکھ ہوا مگر میں نے کسی طرح کی بات نہ کی۔

”ان کی پہلی بیوی.....؟“ سارہ نے جانے کیوں سوال کیا تھا۔

”وہ چند سال پہلے مر گئی تو انہوں نے اس خاتون سے شادی کر لی تھی ابھی تک اس سے ان کی کوئی اولاد زندہ نہیں بنی، پہلی بیوی سے جو بچے تھے وہ خضیاں والوں کے پاس ہیں۔“ سارہ کا رنگ فق ہوا۔

”اوہ.....“ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے دبا کر اسے دلا سہ دیا۔

”ارے ہاں، میں نے تمہیں کال کر کے کیوں بلایا تھا، تم نے پوچھا ہی نہیں؟“

”جی وہ اصل میں اور بات شروع ہو گئی تھی ناں؟“

”تم کیسا محسوس کر رہی ہو.....“ انہوں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اب میٹر حیاں نہ چڑھنے کی وجہ سے

تمہیں درد میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے؟“

”نہیں..... اب تو بلکہ درد ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔“

”ہوں.....“ ڈاکٹر یاسمین نے سانس خارج کی۔ ”میرا بھی یہی اندازہ تھا۔“

”ایسا کیوں ہے ڈاکٹر یاسمین؟“ میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

”میں جو کچھ تمہیں بتانے جا رہی ہوں اسے حوصلے سے سننا امرت!“ ڈاکٹر یاسمین کے الفاظ نے میرا جسم سن

کر دیا۔ ”تمہارے شٹ کی رپورٹ آگئی ہے میرے پاس، میرا اندیشہ بالکل ٹھیک نکلا ہے۔“ کچھلا ہوا والا تھا جو

میرے اوپر اٹھایا جا رہا تھا، میرے پیروں پر بھی کوئی گرم سیال بہہ رہا تھا۔ ”ہمیں سب سے پہلے چیک کرنا ہے کہ

اس موڈی مرض نے کہاں تک اپنی جڑیں پھیلارکھی ہیں۔“

دھک دھک..... ہلک ہلک..... ٹھک ٹھک..... چھک چھک! آوازیں شور میں تبدیل ہو گئیں..... پھر مجھے

آوازیں آنا بند ہو گئیں، صرف ڈاکٹر یاسمین کا منہ کھل اور بند ہو رہا تھا۔ ”لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ اس کا کوئی علاج نہیں

ہے..... مجھے تمہیں بتانے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں! تم سمجھ رہی ہو ناں؟ سارہ آپ اپنی دوست کو سنہا لیں،

اس طرح تو اس کے بچے کی جان کو.....“ وہ کیا کہہ رہی تھی، مجھے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ ”دھڑام“ کی آواز آئی تھی،

چھت گری تھی یا آسمان!

(جاری ہے)

محبّت زادِ راء

میا بھاری



جبکہ وہ واپس آ رہا تھا، ہمیشہ کے لیے..... کبھی دوبارہ
اس مٹی کو چھوڑ کر نہ جانے کے لیے پھر بھی نہ جانے
کیوں دل پھٹنے کو ہو رہا تھا۔
سب کچھ دیا تھا..... حالانکہ ان دس سالوں

اگر پورٹ ویسے ہی لوگوں سے بھرا ہوا تھا جیسے
اُس دن تھا جب وہ اسے وداع کرنے یہاں آئی تھی۔
اُس دن بھی وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی اور
آج بھی نہ جانے کیوں آنکھیں بھیگنے پر مصر تھیں۔ آج

کر کے معصومہ کو سہارا دے کر چار پائی سے اتارا۔
 ”تسیم، بھابی کے لیے کچھ لے کر آ۔۔۔۔۔ نہ جانے
 کچھ کھایا بھی ہے صبح سے یا نہیں۔“ انہوں نے فکر مندی
 سے بیٹی کو آواز دی تھی۔

☆☆☆

اور اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ صرف روپ کی ہی
 نہیں، دل کی بھی شہزادی ہے۔ ساتوں مندریں، ساس
 اور شوہر سب اس کی تعریف کرتے نہ جھکتے تھے۔ اتنی
 اچھی سسرال ملنے پر وہ بھی خدا کا شکر کرتی رہتی سب کچھ
 ٹھیک تھا لیکن پھر اس نے اماں کو پریشان رہتے دیکھا۔

”اماں، کیوں پریشان ہے؟“ رات کو اس کی
 ٹانگیں دباتے اس نے پوچھا تو فریدہ حیران رہ گئیں۔
 جو ان کی اولاد نہ جان سکی، وہ ان کی بہو نے ان کے
 چہرے سے پڑھ لیا، دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔
 ”بڑی دو کے لیے خالہ زبیدہ نے بڑے اچھے
 رشتے بتائے ہیں۔ کھاتے پیتے خاندانی لوگ ہیں لیکن
 ایک سال کے اندر ہی شادی چاہ رہے ہیں۔ اب تو بتا
 معصومہ، پریشان نہ ہوں تو کیا کروں۔۔۔۔۔“ اماں اٹھ کر
 بیٹھ گئیں۔

”سات بیٹیوں کا بوجھ، کمانے والا ایک اور پھر
 اتنے چنگے رشتے کہاں ملتے ہیں بار، بار۔“ معصومہ سر
 ہلا گئی۔
 ”پر کوئی تو حل ہوگا ناں اماں۔“ وہ سوچتے
 ہوئے بولی۔

”آج اسلم بھرا آیا تھا کہہ رہا تھا کہ نسیم کو اس کے
 ساتھ دینی بیچ دوں۔۔۔۔۔ اتنا کمالے گا کہ سارے مسئلے ختم
 ہو جائیں گے۔ دس بارہ سال کام کر لے پھر بے شک
 یہاں اپنا کاروبار جمالے۔“ اماں بتانے لگیں۔
 ”دینی اماں۔۔۔۔۔“ وہ بچھڑی گئی۔

”ہاں پتر۔۔۔۔۔ پر تو فکر نہ کر، تیرا خیال ہے
 مجھے۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
 ”اپنی اولاد کے سکھ کے لیے میں تجھے، اپنی دمی
 کو دکھی کر سکتی ہوں بھلا۔“ اماں مسکرائیں۔

میں کیا کچھ نہیں بدلاتھا۔۔۔۔۔ پھر بھی اسے سب کچھ ویسا
 ہی لگ رہا تھا گویا کل کی ہی بات تھی۔ سامنے بھاگتے
 پر منظر کی طرح گزرے لمحوں کی یادیں بھی تو بہت واضح
 تھیں۔۔۔۔۔ پھر کیسے کچھ بدل سکتا تھا۔ اور پھر سامنے لگے
 برنی بورڈ نے جہاز کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔ کچھ دیر
 بعد اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا وہ آ رہا تھا۔

اسے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب وہ جا رہا تھا۔۔۔۔۔
 مسکراتا، آنکھیں صاف کرتا، مڑ، مڑ کر نگاہوں کی زبانی
 بہت کچھ کہتا۔۔۔۔۔ لیکن اب واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا۔

☆☆☆

دندر (پلاسٹک کی پلکی سخت ری) سے بیٹی چار پائی
 پر بیٹھے، بیٹھے اس کے نرم جسم پر نشان پڑنے لگے تھے۔
 ”ہائے، فریدہ، کڑی تو بڑی پیاری ڈھونڈ کے
 لائی ہے تو اپنے پتر کے لیے۔“ سانولی سی رنگت والی
 اس عورت نے اسے دیکھتے ہی تعریف کی تو سرخ
 ہوتے رخسار انگاروں کی سی لودھینے لگے۔
 ”ماشاء اللہ کہہ۔“ فریدہ مسکرائی۔ ”میرا ایک ہی
 پتر ہے۔ شہزادی نہ لانی بھلا۔“

”ماشاء اللہ تو تب کروں ناں جب دل کی بھی
 پیاری نکلے۔۔۔۔۔ سات بہنوں کے اکھوتے بھائی کی بیوی
 بن کر آئی ہے۔ دیکھ کب تک گزارہ کرتی ہے اور گزارہ
 کرتی بھی ہے کہ نہیں۔“ معصومہ کو پہلی بار اس عورت
 کی شکل بے انتہا بری لگی۔ جو آتے ہی اس کے پیاروں
 کے دل میں اس کے لیے میل ڈالنے لگی تھی۔
 ”خیر بولی رشیدہ۔۔۔۔۔ ایسی باتیں نہ کر۔“ اماں
 فریدہ بھی برا مان گئیں۔

”جیسی اوپر سے دکھتی ہے دل کی بھی اتنی ہی
 روشن ہوگی میری چندا۔۔۔۔۔ تو فکر نہ کر۔۔۔۔۔“ انہوں نے
 ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک انداز میں منہ کیا۔

”لے۔۔۔۔۔ میں نے تو بس ایک بات کہی تھی۔ تم
 تو برا ہی مان گئیں۔“ وہ منہ بنانے لگی۔
 ”اچھا ہٹ۔۔۔۔۔ تھک گئی ہوگی میری شہزادی، میں
 اسے کمرے میں لے جاؤں۔“ انہوں نے اسے اشارہ

غزل

یہ جو عشقِ دل کی نماز ہے
بھی سوز ہے بھی ساز ہے
تو بلند اور میں ہوں پست تر
یہ عجیب رسمِ نیاز ہے
مجھے خواہشوں پہ گرفت ہے
مرے واسطے یہ اعزاز ہے
کبھی کھل مہیا، کبھی نہ کھلا
یہاں آدمی کوئی راز ہے
تو نے مارنے میں کمی نہ کی
یہ تو میری عمرِ دراز ہے
میں تو خاتمِ اپنے خدا کی ہوں
مجھے اس کی ذات پہ ناز ہے

کلام: فریدہ خانم، لاہور

”اماں.....“ معصومہ ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے بھی اسے خود میں سمولیا۔

☆☆☆

اور پھر سوچتے سمجھتے نہ جانے کب وہ خوابوں جیسی لڑکی حقیقت کا آئینہ بن گئی۔
”تو دبی چلا جائیو“ اور وہ حیران رہ گیا۔
”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”تیرے جانے سے گھر کا خرچہ آسان ہو جائے گا ناں..... باجیوں کی شادی ہو جائے گی، اماں کی دوائی بھی وقت پر آئے گی..... ہے ناں.....!“ وہ سوچوں میں گم ہوئی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“

”تو پھر تو چلا جا۔“ اس کی ہلکیں نم ہو گئیں۔

”سچ کہہ رہی ہے؟“ وہ تشکر آمیز لہجے میں پوچھنے لگا۔ وہ سر ہلا گئی۔

”میرے بغیر رہ لے گی؟“ اس نے معصومہ کے نرم، نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔

”یہاں تو اماں ہے، باجیاں ہیں، میرا دل تو پھر بھی بہلا رہے گا لیکن.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو میرے بغیر رہ لے گا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تیری محبت ہے ناں میرے پاس.....“ اس کی آنکھوں میں صرف محبت تھی۔

”میری، ہم سفر، میری زاد راہ..... تیرے بغیر رہ ہی لوں گا۔“ وہ مسکرایا۔ معصومہ نے نم آنکھیں بند کر کے سر اس کے چوڑے سینے میں چھپا لیا، نعیم نے اس کے گرد پناہیں گھیر لیں۔

☆☆☆

اور پھر اس کے جانے کا دن آ گیا..... وہ امید سے تھی۔ ان سب کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ اسے اتر پورٹ چھوڑنے ساتھ گئی تھی۔

دونوں مسکرا رہے تھے۔ خاموشی کی زبان سن اور بول

رہے تھے اور دونوں کی آنکھیں نم بھی تھیں اور پھر وہ چلا گیا۔ وقت کے بھی عجیب ڈھنگ ہیں..... نہ گزرنے پر آئے تو لمحے بھی ٹھہر جاتے ہیں اور جو پرکھول لے تو ٹھوں میں صدیاں مٹھی میں بھر کر اڑان بھر لیتا ہے۔

اللہ نے اسے بیٹا دیا تھا، سلیم نے اس کی تنہائی بانٹ لی تھی۔ نعیم صرف ایک بار آیا تھا تین سالوں میں، جب سلیم دو سال کا ہوا تھا۔ پھر تین سال بعد جب دو اور بہنوں کی شادی ہوئی تھی۔ اماں کی صحت اچھی ہونے لگی تھی۔ سلیم اسکول جانے لگا تھا، پرائیویٹ اسکول اس کے کپڑے، اس کا سامان دیکھ کر بچے رشک کرتے، معصومہ کے روپ میں سادگی سی اتر آئی۔

بوجھ ایک، ایک کر کے اترنے لگے لیکن اس کی شخصیت میں نہ جانے کیوں اداسیاں اور سجد گیاں اترنے لگی۔ ان آٹھ دس سالوں میں وہ عمر سے بڑی دکھنے لگی تھی۔

آخری دو بہنوں کی شادی بھی اچھی جگہ ہوئی تھی..... نعیم اس بار نہ آ سکا تھا۔ اس نے معصومہ کو بتایا تھا۔

”لو بھلا..... یہ بھلا میں بھول سکتی ہوں؟“ وہ بھی مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

اور آج وہ آرہا تھا۔ اس نے کافی محنت کی تھی۔ ماں، بہنیں، بیٹا، سب کا حق ادا کر دیا تھا۔ بس خود کو اور معصومہ کو تھوڑا خوار کیا تھا۔ مگر کیا تھا..... اب تو وہ ہمیشہ کے لیے مل رہے تھے ناں..... آج سب ساتھ تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں سب کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ اس کی سات سہاگن بہنوں کی آنکھیں..... بیوہ بوڑھی ماں کی منتظر آنکھیں..... اور باوقار..... ہر طرح کے بوجھ سے آزاد معصومہ کی آنکھیں بھی.....

وہ رفتہ، رفتہ ان کے قریب آرہا تھا۔ مگر وہاں سے نہیں جہاں سے تمام مسافر آرہے تھے۔ اور پھر وہ اپنا ان اپنوں کے سامنے تھا خاموش سا..... ایوبوئیس میں رکھے تابوت میں لیٹا، وہ ایسے تو نہیں گیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکان تھی اور اس کی دائیں آنکھ کھلی تھی۔ شاید معصومہ کو دیکھنے کے لیے۔

اماں، بہنیں سب اس کے تابوت سے لپٹ، لپٹ کر رو رہی تھیں۔ اور وہ سلیم کا ہاتھ تھامے بس خاموشی سے اس کا چہرہ نگے جا رہی تھی۔

”میرے بغیر رہ لے گی؟“ شری سرگوشی اس کے کانوں میں گنگنائی تھی..... اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

سلیم کے ہاتھ پر گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

”تیرے بغیر سہی..... تیری محبت تو ساتھ ہے ناں میرے۔“ وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

”ارے میرے مسافر بیٹا، محبت زاد راہ ہے۔ زندگی کٹ ہی جائے گی۔“ وہ چپکے، چپکے رو رہی تھی..... محبت نے عشق کی صورت پالی تھی..... وجود اور صورت کی چاہ پہ روح کی تعلق کو جاودانی ملی تھی۔ محبت زاد راہ تھی..... راستہ آسان تھا..... مگر..... کیسے؟ یہ حقیقت تو وہ ہی جان سکتی تھی۔

”بس اس بار پکا ہی آؤں گا۔ کبھی نہ جانے کے لیے۔“ اور اس کا دل جھوم، جھوم اٹھا۔

”سب فرض اتر گئے۔ اب مجھے تیرے فرض پکانے ہیں بس..... ایک سال اور بس..... اتنا کمالوں کو تو سلیم اور میں ایک اچھی زندگی بسر کر سکیں۔ پھر دیکھنا..... ہمیشہ تیرے ساتھ ہی رہوں گا۔“ وہ وعدے کرنے لگا۔

”تو آ جا..... میرے لیے تیرا ساتھ ہی اچھی زندگی ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ اس نے التجا کی۔

”اوہ بنگلی..... اوروں کے لیے اتنا صبر کر لیا، کچھ صبر سلیم کے لیے کر لے، تجھے مجھے نہ سہی، سلیم کو تو ضرورت ہے ناں اچھی زندگی کی۔“ معصومہ نے سوتے سلیم کو ایک نظر دیکھا۔

”پہل ٹھیک پر پکا وعدہ کر کہ اگلے سال آئے گا۔“ وہ اداس ہوئی۔

”تیری قسم.....“ اور اس رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

وقت صدیاں نہیں دیکھا، ایک سال کیا تھا..... لیکن نہ جانے کیوں یہی سال بھاری لگنے لگا تھا۔ لمحے محم سے گئے تھے وقت تھا کہ کفن کا نام نہیں لیتا۔ وہ روز رات کونون کرنے لگا تھا۔ بیک میں بھی جانے والی رقم بھی تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔

”تیری ترقی ہو گئی ہے کیا؟ جو اتنے پیسے بھیجنے لگا ہے؟“ وہ پوچھتی۔

”نہیں، اور تاؤم لگانے لگا ہوں، دن رات کام کرتا ہوں تاکہ جلدی سے تیرے پاس آ جاؤں۔“ اس کے لہجے میں اس کی بے تابیاں کرا لیتیں۔ وہ شرماسی جاتی۔ پھر فکر مند بھی۔

”ایسے تو تم بیمار پڑ سکتے ہو، میں نے کہا ناں جو ہے کافی ہے۔“

”تو فکر نہ کر..... اب تو بہت کم دن رہ گئے ہیں، بس اتر پورٹ مجھے لینے آنا نہ بھولیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

خواب گزیدہ

درد اسے نو شین



”رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے
اماں.....“ ادھیر عمر غلام احمد نے کلچا تو ڈکڑ کر شمیری گلابی
چائے میں ڈبو پایا اور ضعیف اماں کے منہ کے پاس لایا۔
اماں اونچا سنتی تھی مگر اس نے سن لیا تھا وہ بیٹے کو دیکھتی
اور نوالے چباتی رہی۔ اماں کو کھانا صبر و تحمل سے کھلانا
پڑتا تھا وہ ایک، ایک نوالے کو وقت لگاتی پر چند لقمے ہی
کھاتی تھی۔

غلام احمد چائے میں جچ ہلاتے کھڑکی کے پار

بزرے سے ڈھکے میدانوں پر بے دھیان نظر جمائے
خواب کے ککڑے جوڑ رہا تھا۔

”میں نے سنا ہے پنجاب کا ایک شہر ملتان ہے،
اس کے پاس چھوٹا سا قصبہ مظفر آباد ہے۔“

بوڑھی ماں نے کھڑکی کے پار سدھال گلی روڈ پر
نظریں ٹکائیں۔

”یہ والا نہیں اماں..... پاکستان میں ہے۔“

خالی پیالہ رکھ کر غلام احمد نے چٹائی میں اماں کے
ہاتھ دھلائے۔ اماں نے نیچے ہٹانے کا اشارہ کیا، وہ
اب لیٹنا چاہتی تھی۔ آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں وہ نسل
ورنسل رہتے چلے آ رہے تھے، غلام احمد ابھی بات جاری
رکھنے کے موڈ میں تھا۔

”بھیمیر سے آیا ہوا بابا ونگا جو ماتھے پر گارالیپ کر

لیکیریں پڑھتا تھا۔“

”تو مسلم ہو کے..... ہندو وادی گل مندا
ہے..... مدتیں ہوئیں صبور اچل بسی..... ترے نہ ہوئی
اولاد..... نہ تھی مقدر میں۔“ اماں نے گویا بات ختم کر
کے کروٹ بدل لی۔

غلام احمد نے برتن سیٹ کر کڑی کی چھوٹی سی
ٹرے میں رکھے اور باورچی خانے میں لے گیا۔ کام
کاج اسے خود کرتا ہوتا تھا۔ برتن، دھوئے، سنک اور
کھڑکی صاف کی ساتھ کے ساتھ خود کلامی جاری رکھی۔
”وہ بولا تھا..... بستی پھول، ہری نیاں..... گلام

احمد..... پتری تری گل زعفران..... صبور..... مظفر
آباد..... جا، جا.....“ اس کی تنگی پیٹھ پر سفید لکیریں کھینچی
تھیں۔ وہ کوئی چیز کا درخت تھا جہر بیٹھا رہتا ہندو مسلم
سب اس کے پاس جاتے تھے۔ سب کہتے جو بتائے ہو
کے رہتا ہے۔ پھر پتا نہیں کدھر کو چلا گیا..... ہماری
شادی کے کوئی چھ سال بعد صبور کو حمل ہوا۔ اس کے
بطن میں ہی ہم نے اس کا نام گل زعفران رکھ دیا تھا۔ یہ
کس سن کی بات تھی بھلا؟“

وہ صافی سے گیلے ہاتھ پونچھتا اماں سے یقین
طلب کرنے آیا مگر اماں کو خراٹے لیتا دیکھ کے پلٹ

گیا۔ ترکاری کی ٹوکری اتاری اور باہر چلا گیا۔ نرم
بادلوں کے سائے میں سرد خشکی تھی۔ گلی کی ٹھنڈی اینٹوں
کی ٹمکن چپل کے پار محسوس ہو رہی تھی، چپل بھی تو بھٹی
ہوئی تھی۔ چپل موہنی کو دے کے وہ اپنے دوست
اسامہ راج کی دکان پر جا بیٹھا۔

”مظفر آباد کیسے جاؤں؟“ اس کا دماغ تو اسی
جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا جبکہ اسامہ راج اسٹور کی صفائی
میں لگا ہوا تھا۔ ابھی ابھی تو دن چڑھا تھا۔ اکا دکا
وکانیں کھل رہی تھیں۔ سلام کا تبادلہ ہوا۔ غلام احمد پھر
سے سوچ میں کھو گیا..... ”کیا پتا صبور نہ مری
ہو..... مظفر آباد؟ نہیں۔“

”تم پنجاب گئے تھے ناں.....؟“

”ہاں..... مدتوں پہلے گیا تھا۔“

”میں جانا چاہتا ہوں۔“

”کہاں.....؟“

”ہے ایک مظفر آباد.....“

”وہ تو یہ رہا.....“

”اس کی بات نہیں کر رہا..... پنجاب میں بھی ہے۔“

”خیر تو ہے، کچھ فکر مند لگ رہے ہو؟ اسامہ راج
آب گرم کا گلاس لے کر کمرش پر آ بیٹھا۔ ”بسم اللہ.....“
اس کو پیش کی۔

”نہیں ابھی چائے پی کر آ رہا ہوں۔“ غلام
احمد نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر اپنا اعتماد بحال کیا،
بات کا سرا پکڑا۔

”میں جاسکتا ہوں ناں؟“

”پر بات کیا ہے؟“

”بات بتاتا ہوں..... مگر اماں کو کس طرح
چھوڑوں.....؟ کس کے پاس چھوڑوں.....؟ اماں کی
فکر ہے مجھے۔“

”اماں کی فکر نہ کر..... تھوڑے دن لگانے ہیں
تو تری بھابی خیال خاطر کر لے گی۔ بلکہ ادھر ہی رہ
جائے گی..... اب بتا بات کیا ہے؟“ راج نے
ڈھارس بندھائی۔

خواب گزیدہ

یار..... وہم ہے تیرا.....“ اسامہ راج اٹھ کر آنے والے گا ہک کی طرف بڑھ گیا۔ غلام احمد مصافحہ کر کے نکل آیا۔

☆☆☆

”اماں..... سن رہی ہو؟“ لحاف کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے غلام احمد نے اپنا رخ اماں کی طرف موڑا۔
”ہو دوں۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے گل زعفران نے کسی دوسری صورا کے کٹن سے جنم لے لیا ہو؟“
”کھڑکی بند تو کر دی ہے۔“

”ہاں اماں، سب کچھ بند کر دیا ہے..... میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔“ کچھ ٹاپے کمرے میں سرد خاموشی رہی..... اماں کھانسی پھر ہوئے، ہوئے بولنے لگی۔

”میرے پتر غلام احمد..... تجھے اولاد کی چاہ تھی۔ ہر کسی کو ہوتی ہے۔ پانچ سال سے دعائیں مانگ رہے تھے..... ہم تینوں جنے..... اللہ سوہنے نے خوشی دی..... صورا بہت خوش رہتی..... کھلی کھلی رہتی تھی..... مگر اصل مالک تو اللہ ہے..... مالک کی مرضی تھی..... ہم راضی اس کی رضا پر.....“

”وڈیا جوتش نے میرے سامنے بیٹھ کے..... صورا کا ناں (نام) میرا ناں..... گل زعفران کا ناں بولا تھا..... تو وہ میری بیٹی پیدا ہوئی تھی ناں..... وہ پیدا ہوئی ہے۔ مجھ سے دور ہے..... اپنے باوا کو ڈھونڈتی ہے۔“

”تو تو پاگل ہو گیا ہے، شہیا گیا ہے..... کلہ پڑھ کے سو جا..... جھوٹے سچ خواب، وہم..... وڈیا پہ یقین..... تو بہ، تو بہ کر..... اللہ سے معافی مانگ..... جھلا نہ ہو.....“ غصہ نکالتے، نکالتے اماں کو پھر کھانسی آنے لگی۔
غلام احمد نے چپ اوڑھ لی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار خواب کا منظر سوچتا..... اس کے معنی نکالتا، کروٹیں بدلتا..... دے قدموں اٹھا..... ٹین کا بکسا دھیرے سے کھولا۔ بائیں طرف رکھی پونجی کی تھیلی

”تمہیں شاید یاد نہ ہو..... میں نے صورا کے فوت ہونے کے بعد ایک خواب دیکھا تھا۔ تمہیں بتایا تھا..... وہی خواب کافی بار دیکھتا رہا۔ کبھی سال بعد..... کبھی مہینوں بعد..... کل پھر وہی خواب دیکھا۔“
”کیا..... تھا؟“

”میں بس میں بیٹھا ہوں..... کہیں جا رہا ہوں..... سڑک کے کنارے مظفر آباد کا بورڈ دیکھتا ہوں تو شور مچا دیتا ہوں، مجھے ادھر جانا ہے۔ میں اتر جاتا ہوں، اپنا کھرا اپنی بیوی ڈھونڈ رہا ہوں..... راستے، گلیاں، مکان اجنبی انجانے ہیں..... پھر ایک مسجد کے سبز مینار نظر آتے ہیں..... اس کے ساتھ کوئی مکان ہے جس میں گھوڑے کا درخت باہر سے دکھتا ہے..... اس کی چھت کی چار دیواری میں نو سوراخوں والے نہیں بلکہ تین اور تین چھ..... اور نیچے تین اور تین چھ..... بارہ سوراخوں والے مربع نمائے ہوئے ہیں۔ وہاں سے مجھے ”بابا..... بابا“ میری بچی بلاتی ہے..... میں بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ پھر میں اس کا نام لیتا ہوں..... زعفران گل..... ”وہ اڑ کے آ جاتی ہے۔ ایسی پیاری سی..... کوئل..... ملوک زادی..... سبز آنکھوں والی..... وہ میری بیٹی ہے۔“

راج کے چہرے پر خوف اتر آیا۔
”غلام احمد..... تری گھر والی فوت ہو گئی تھی اور..... اس کی لاش بھی مل گئی تھی۔“

”ہاں..... پر.....؟“
”بس کر لالہ..... چودہ سال گزر گئے تجھے چاہیے تھا تو شادی کر لیتا۔“

”اس بات کا اب کیا مطلب؟“
”دیکھ ناراض نہ ہوئیو..... مرد آپس میں بات کر لیتے ہیں تو کسی عورت کے پاس گیا ہوگا اور تجھے وہم.....“

”نہیں، نہیں حرام کی راہ تلاش کرنے کی ضرورت کیا تھی، نکاح کر لیتا، مجھے کوئی روکتا تھا؟“
”تو پھر..... یہ بیٹی والا خواب..... چھوڑو

ٹٹول، ٹٹول کر رقم کا اندازہ کیا، تھیلی رکھ کر یکساں بند کیا اور سفر کا ارادہ بناتے، بناتے آنکھ لگ گئی۔

دھوپ کی ہلکی حرارت پہ اماں کٹھولے پر تکیہ کے سہارے بیٹھی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ بیرونی دروازے سے اسامہ راج کی گھر والی، رفعت آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی غلام احمد صبحے کے پیچھے والے کمرے سے اپنا بیک لینے چلا گیا۔ رفعت تپاک سے اماں کو ملی اور پانکٹی بیٹھ کر ٹائیس دبا نے لگی۔

غلام احمد آکر رکا..... اماں کی قدم بوسی کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”اماں پیاری..... آج جمعہ ہے نماز پڑھ کر نفلوں کا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگلا جمعہ لوٹ آؤں گا زیادہ دیر لگی تو دوسرے جمعہ ہر حال میں تیرے قدموں میں حاضر ہوں گا، اگر زندہ رہا۔ رفعت بھابی کو سارا کام سمجھا دیا ہے۔ تری دوائیں، کھانے پینے کا سامان، ایندھن میں نے مہیا کر رکھا ہے..... فکر نہ کرنا اماں..... مجھے خوشی سے اجازت دے دو.....“ اس کا سراماں کے پیروں پر جھک گیا۔

”جس کی نیت ہو گئی..... اس کو کیا روکنا..... اللہ تمہارا سفر آسان کرے پتر..... خیر سے لوٹو..... اپنا وعدہ یاد رکھنا، جیسے کا سینچر ہوا تو بڑھی ماں مرجائے گی۔“

”اللہ نہ کرے اماں جی۔“ رفعت بھابی نے روکا۔ ”خیر کی دعائیں دیں..... اسے بھی خود کو بھی..... آپ میری خالہ ہیں، بوا ہیں، ماں ہیں..... میں آپ کا غلام احمد بھائی سے زیادہ خیال رکھوں گی۔ جاویر جا..... فکر نہ کرنا۔“

اور.....

ایک مجنون اپنے خواب کو پکڑنے نکل گیا۔

باغ سے مظفر آباد، وہاں سے ایبٹ آباد، اسلام آباد، ملتان اور پھر..... وہی خواب والی پرانی بڑی بس اور قصبہ مظفر آباد کی کم چوڑی سڑک..... جاگتی آنکھوں وہ اپنے خواب میں داخل ہو چکا تھا۔ سوچ کے تانے

بانے البھاوے نے آنکھ طاری کر دی۔ ساتھ والے نے بس کی چھت پر ہاتھ مار کر زور سے کہا۔

”مظفر آباد روکنا۔“

غلام احمد کی عازم خواب روح چھلانگ مار کر حواس میں کودی اور وہ ہڑ بڑا کر جاگا..... بیک سنبھالا اتر گیا..... اترتے، اترتے کنڈیکٹر سے تصدیق مانگی۔ ”بھرا..... یہ مظفر آباد ہے ناں ملتان والا؟“

کنڈیکٹر نے گیٹ میں پاؤں پھنسا یا اور بس کو چلنے کا اشارہ دے دیا۔

غلام احمد ہونٹ بنا بس کو جاتا دیکھتا رہا..... اس کے ساتھ اترنے والے نے کہا۔

”ہاں بابا..... مظفر آباد ہے۔ کدھر جانا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟“

”میں بہت دور سے..... مظفر آباد سے۔“

”او کوئی نشہ وشہ تو نہیں کر رکھا..... یہی تو مظفر آباد ہے۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔ غلام احمد یوں اس کے پیچھے لپکا جیسے وہ کھو گیا تو مظفر آباد کھوجائے گا۔

”رکو بھائی..... میں آزاد کشمیر سے آیا ہوں..... یہاں کوئی..... غلام احمد ہے جس کا گھر مسجد کے ساتھ ہے۔ مسجد جس کے گھر کے ساتھ ہے۔“

وہ شخص رک کر اسے غور سے دیکھنے کے بعد بولا۔

”کیا کرتا ہے غلام احمد؟“

”یہ..... تو بتائیں۔“

آس پاس کچھ اور فارغ البال بھی اکٹھے ہو گئے..... غلام احمد عام سامان تھا، مظفر آباد کوئی پچاس

مکانوں کی بستی تو نہیں تھی۔ لوگوں کے طرح، طرح کے سوالات تھے اور وہ کسی کا جواب نہ جانتا تھا۔ لوگ کمر

پھس کرنے لگے اسے مشکوک یا کم عقل سمجھنے لگے۔

اچانک اس کو ایک راہ بھائی دی، وہ تیزی سے ایک

رکشے کی طرف بڑھ گیا۔

”اس شہر میں جتنی بھی مسجدیں ہیں..... مجھے

باری، باری وہاں لے چلو..... تمہارے جتنے پیسے

بنیں گے دوں گا۔“

خواب گزیدہ

والے کو رک کر دیکھتا پا کر جانے کا اشارہ کیا..... وہ چاہتا تھا کہ اس کا تماش بین کوئی نہ ہو..... وہ کبھی اوپر دیکھتا..... کبھی اِدھ کھلے دروازے کو دیکھتا..... اندر سے جھاڑو لگانے کی آواز آ رہی تھی۔ غلام احمد نے سوچتے، جھجکتے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟ پاؤں دھو کر کے ونگ سے کوئی عورت جھانکی۔ تلخ کپڑے دوپٹے سے تاک لپیٹ کر ڈھانپ رکھا تھا غالباً جھاڑو دبی دے رہی تھی۔

”غلام..... غلام احمد.....“

”ابا کو ملتا ہے؟ وہ دکان پر ہیں.....“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

غلام احمد کے دل میں خوشی کا نعرہ گونجا۔ ”تو اس کے ابا کا نام غلام احمد ہے کہیں یہ تو گل زعفران نہیں؟“

”پتری..... میں بہت دور سے آیا ہوں، دکان کا مجھے پتا نہیں ہے۔“ پیچھے سے اس کی غالباً ماں کی آواز آئی۔

”ظفر اں کون ہے؟“

”زعفران.....؟“ غلام احمد پورے وجود سے مل

گیا اسے اتنے زور کا چکر آیا کہ وہ دروازہ پکڑتا دہلیز پر بیٹھ رہا۔ وہ اس کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کتنی بد نصیبی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ لڑکی چلی گئی۔

وہ سر ہموار سے سراپا غم بیٹھا تھا۔ اندر سے ایک بچہ آیا۔ یہی کوئی آٹھ نو سال کا ہو گا۔ نگر شرٹ میں تھا اور کافی تیز تھا..... اعتماد سے بولا۔

”چا چا..... وہ سامنے جہاں یہ گلی ختم ہوتی ہے وہاں دودھ، دہی کی دکان ہے، وہ ہماری ہے ابا وہیں ہوں گے۔“

غلام احمد خود کو سنبھال کر اٹھا، کاندھے پر بیگ درست کیا اور مرے، مرے قدموں سے چلنے لگا۔ وہ کس کٹھن راہ پر چل پڑا۔ کیسے کسی کو سمجھائے گا؟ کون اس پر یقین کرے گا؟

دکان کی سائڈ پر ایک بورڈ رکھا ہوا تھا۔ ”گاموں دہی لسی والا۔“ وہ ایک صحت مند سا نوجوان شخص تھا جس نے بنیان اور شلوار پہن رکھی تھی۔ جسے گاموں

رکھنے والے نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا، داڑھی کھجائی۔

”چلو گے؟“ دوبارہ پوچھا۔

”آؤ بیٹھو..... اللہ بلی.....!“ غلام احمد نے بیٹھنے میں دیر نہ لگائی۔

پہلی مسجد منہر کے کنارے تھی اس کا گرد و نواح بیکسر مختلف تھا۔ دوسری مسجد چھوٹی اور زیر تعمیر تھی۔ اس کے گنبد یا مینار ہی نہ تھے..... تیسری مسجد کا تیر گلابی روغن دور سے چمکتا تھا۔ اور غلام احمد کے ذہن میں جسے عکس سے قطعاً مختلف تھا۔ وہاں اتر کر اس نے پانی پیا اور دل ہی دل میں اللہ کے حضور گڑ گڑاتا رہا چونکہ مسجد ایک عام مسجد تھی۔ مینار کہہ نہ سکتے..... یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.....“ کا محراب پر لکھا ہوتا..... مگر اس کے ساتھ کوئی ایسا مکان نہ تھا جس کے اندر سے اونچی کھجور جھانکتی ہو، جس کی چھت کی چار دیواری ہو..... وہ غور سے دیکھتا اور پریشانی بڑھتی۔ ڈرائیور سے نماز پڑھنے کی مہلت مانگی مگر ڈرائیور نے بھی اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ایک مسجد اور قریب ہی ہے اسے بھی دیکھ لیں وہیں نماز پڑھ لیتا..... وہ پوچھتا تھا رشتے داروں کا کوئی فون نمبر نہیں ہے۔ غلام احمد کے پاس کوئی بھی تاویل نہ تھی بس دعا کا دامن تھاما ہوا تھا۔ وہ دونوں پھر رکشا میں آ بیٹھے..... کچھ گلیاں مڑی تھیں کہ ایک مسجد کے مینار دکھائی دینے لگے۔ غلام احمد کا دل زور سے دھڑکا۔

”مینا رتو..... ویسے ہی ہیں.....“ وہ بڑ بڑایا۔

مسجد کے دروازے پر رکشا رکا، غلام احمد لپک کر باہر نکلا..... مسجد کے گرد چکر لگاتے اسے ایک مکان سے کھجور کا درخت دکھائی دے گیا، وہ مکان کی طرف بڑھا چھت کی طرف دیکھا۔

ہاں، چار دیواری تھی..... ہاں، ہاں چار دیواری میں چھ، چھ سوراخوں والے چوکور بنے ہوئے تھے۔ بس مل گیا۔ یہی ہے، اس نے جلدی سے رکشے والے کو لوٹ پکڑائے۔ بیک اٹھایا اور دو قدم چلا تھا کہ رکشے

ہم دو ہی توجی ہیں۔ بوڑھی والدہ اور میں..... میری بیوی مبور بہت خوب صورت تھی۔ اس کے بھورے بال، سبز آنکھیں اور سنہری رنگت تھی۔ سنہری رنگت کیاب ہوتی ہے۔ شادی کے پانچ سال تک ہم اولاد کی خوشخبری کو ترستے رہے۔ دعا، دارو، دم، تعویذ اپنی سی کر کے دیکھ لی۔“ اس نے بولتے ہوئے ہلکی سی کھنکھار سے گلا صاف کیا۔

”اُدھر ہمارے پہاڑی درختوں کا ایک جنگل ہے۔ کبھی یاروں دوستوں کے ساتھ سیر کو چلا جاتا..... ایک دفعہ کیا دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے لوگوں کا ہجوم لگا ہے، معلوم ہوا ہندو دڈیا جانے کب سے آکر بیٹھنے لگا ہے۔ قسمت کا حال بتاتا ہے۔ وہ بولتا غیر واضح تھا۔ فقرے ٹوٹے ہوئے ہوتے۔ سوالوں کا الگ الگ جواب نہیں دیتا تھا۔ تشریح وضاحت نہیں کرتا تھا، جو کہہ دیا وہ سن لو اور سمجھ لو بلکہ گرہ سے باندھ لو کیونکہ وہ ہو کر رہے گا..... میں دیر تک اس کا عمل دیکھتا رہا..... جو کوئی جاتا وہ بائیں طرف پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھ رہتا بلکہ چپ سادھ کے بیٹھ جاتا..... جاپ کرتے، کرتے وہ دائیں ہاتھ سے مٹی کا کوزہ اٹھا کے پہلے سے پڑی گیلی مٹی کو چھینتا دیتا، سر کے اشارے سے پوچھتا ”بول“ بائیں طرف بیٹھا ہوا بندہ اپنا سوال منناتا وہ جاپ کرتے، کرتے چار انگلیوں میں گارالے کے سوال کرنے والے کے ماتھے پر لیپ دیتا، مٹی جب سٹکتی ایک پرانا سا گول عدسہ اس کے ماتھے کے آگے پھراتا اور جو بتانا ہوتا بتا دیتا..... میں بھی قطار میں لگ گیا۔ میرے دل میں ایک ہی سوال تھا میری اولاد ہوگی؟ میری باری آئی یہ سب عمل ہوا جو لفظ اس نے کہے مجھے حرف بہ حرف آج تک یاد ہیں۔

”پُتری بنلی، ہری اکھاں..... گل زعفران..... غلام احمد..... مبوراً مظفر آباد..... جا.....“ جا کا اشارہ پا کر میں اٹھ گیا۔ میں خوش تھا مجھے... سبز آنکھوں اور سنہری رنگت والی پتری کی نوید ملی تھی۔ جس کا باپ میں غلام احمد اور ماں مبور اُھی۔ جس کا نام گل زعفران ہوگا۔

بلایا جاتا تھا۔ بہر حال وہ خوش اخلاق بندہ تھا۔ غلام احمد کو تپاک سے ملا۔ کسی کا بڑا اٹھنڈا گلاس پیش کیا۔

”بے فکر بیٹھو بھرا (بھائی) آرام کرو۔“ وہ دور سے آنے کا سن کر خاص تو قیر کرنے لگا۔ غلام احمد چاہتا تھا کہ اسے دعوت دے کر گھر لے جائے تاکہ فراغت سے بات ہو۔ بالآخر وہ لب کشا ہوا۔

”گاموں صاحب..... میں یہاں کسی کو نہیں جانتا..... آپ مسجد میں میرا قیام کروادیں البتہ..... میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں بلکہ..... اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔“

”خیر ہے بھائی، خیر ہے..... آرام سے بیٹھو دال روٹی حاضر ہے..... ویسے مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”کوئی شک دل میں نہ لانا گاموں بھائی، میں سب کچھ بتا دوں گا..... یہ میرا شناختی کارڈ ہے۔ رکھ لیں جب تک میں یہاں ہوں..... رکھ لو۔“

گاموں نے کارڈ لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر غلام احمد کو دیکھا پھر لوٹا نے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہٹا لیا۔

”چلو میں یہ رکھ لیتا ہوں..... زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔ ناراض نہ ہونا۔ کا کا آتا ہے اسے دکان پر بیٹھا کے گھر چلتے ہیں۔“

کا کا آگیا جو ملازم اور رشتے دار کا مرکب لگتا تھا۔ اس کے آتے ہی گاموں نے ”تشمیر سے آنے والے اجنبی مہمان“ کی خبر سب سے پہلے سنا کی..... کا کا بار، بار غلام احمد کو تاڑتا، بہر حال گاموں اسے دکان پر بیٹھا کر نووارد کو گھر لے آیا۔

بیٹھک کھول کر اسے بیٹھایا اور خود اندر کھانے کا کہنے چلا گیا۔ بیٹھک کی اشیاء متوسط سے کمتر درجے کے معیار زندگی کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ تین کرسیاں ایک میز اور ایک پیٹک رکھا تھا۔ غلام احمد ابھی ہوئی کہانی کی گریں کھولتا رہا..... جائے بسکٹ اور کی گفتگو کے بعد گویا ہوا۔

”آزاد تشمیر کے ضلع باغ میں میری کچھ کاشت کاری اور فروٹ فارم ہے، پھلوں کے کاروبار میں حصہ ہے۔ اللہ کے کرم سے اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔ گھر میں

خواب گزیدہ

تھا..... کوئی پانچ سال پہلے وہاں کچھ لوگ سیر کے لیے آئے ہوئے تھے..... ان سے پتا چلا پنجاب میں بھی کوئی مظفر آباد ہے وہاں سے آئے ہیں..... میں ان سے کیا پوچھتا؟ مسجد؟ مکان؟ پچی؟ کوئی کیا بتلائے؟ خود میری ماں مجھے پاگل گردانتی تھی، اب بھی کہتی ہے تو جھٹا ہے، پگلا ہے..... آپ ہی بتاؤ گاموں صاحب، کوئی خواب بے مقصد اتنی بار کیوں دکھتا ہے؟“

گاموں کا حال اپنی جگہ عجیب تھا۔ اسے بکسر جھٹلانے کی طاقت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ پاگل لگتا تھا نہ جھوٹا..... وہ کرتا بھی تو کیا کرتا..... تسلی کے لیے کوئی لفظ نہیں تھے۔ سچ یہی لگا کہ خوب صورت بیوی اور عرصہ بعد ہونے والی اولاد کی اچانک موت نے نفسیاتی مریض بنادیا۔ دونوں ایک دوسرے کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ گاموں کے چہرے پر حیرت اور ترس ٹھہرا ہوا تھا۔ غلام احمد کی آنکھوں میں یقین کی بھیک تھی۔ گاموں نے رکی ہوئی سانس چھوڑی اور کہا۔

”اچھا بھائی کشمیر والے..... اللہ تم پر رحم کرے..... اب آرام کرو..... ریٹ کرو، عشا کی اذان ہونے والی ہے۔ نماز کے بعد کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کے سو جاؤ۔ پھر رک کر مزید کہا۔“ میں اپنی ماسی جی کو فون کر کے بلواتا ہوں۔ وہ قریب ہی شیر شاہ میں رہتی ہے..... صبح پہنچ جائے گی..... جو کچھ ہمارے پاس سچائی ہے..... وہ آکر بتائے گی..... بس اب آرام کرو.....“

گاموں اندر چلا گیا۔

غلام احمد کا ذہن اور بھی الجھ گیا۔ وہ رات بھر جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ فجر کی اذان سنتے ہی مسجد میں چلا گیا۔ نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہا۔ گاموں کا بیٹا آٹھ بجے ناشتا دے گیا..... ناشتے کے برتن واپس لینے آیا تو اباکا بلاوا دے گیا۔

بیٹھک میں گاموں کے ساتھ سفید چادر والی ایک سن رسیدہ عورت بیٹھی تھی جو یقیناً اس کی ماسی جی تھی۔ غلام احمد نے ادب سے سلام کیا اور بیٹھ رہا۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی۔ گاموں کا بیٹا بھی پُرشوق

مجھے امید ہوگئی کہ اب جلد خوشخبری ملے گی۔ اللہ کی کرنی ہوئی تین ماہ اور پانچ سال کا سکوت ٹوٹا..... میری بیوی نے اماں کو خوشخبری سنائی اماں اس کا بہت خیال رکھنے لگی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ پیٹ میں ہی بچے کا نام گل زعفران رکھ دیا تھا..... چوتھا مہینہ لگا تھا مصورا کی ماں ملنے آئی، کچھ دن کے واسطے بیٹی کو ساتھ لے گئی..... ہمیں کیا خبر تھی کہ اس کا میکے جانا نہیں ہمیشہ کا وہوڑا ہے..... بس جی نہ پوچھو..... ایک قیامت گزر گئی۔ جب یہ خبر ملی کہ مصورا دیہائے نیم میں جاگری۔ ساری عموں کی رتی کلی جھیل کی رہنے والی ان پتھروں رستوں پر چلنے والی..... کیسے گری، کیا ہوا، رب کی رب جانے ہماری تو دنیا اندھیر ہوگئی..... مصورا مر گئی..... گل زعفران مر گئی۔“

وہ سر جھکا کر رو رہا تھا ایک ادیب عمر باریش مرد ہو کر اٹھیاں لے، لے کر رو رہا تھا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ بیٹھک میں اندھیرا تھا۔ کھلی کھڑکی سے ہلکی، ہلکی روشنی اور ہوا آرہی تھی۔ فضا بہت بو جھل تھی..... گاموں بھی چپ تھا۔ غلام احمد نے صاف اتار کر آنکھیں صاف کیں اور اپنا آپ سنبھال کر بولا۔

”اس کے بعد پانچویں رات میں نے خواب دیکھا۔ ایک مکان ہے جو مسجد کے ساتھ ہے مسجد کے بزمینار دیکھتے ہیں..... اس مکان میں کھجور کا درخت ہے۔ اس کی چھت کے چار طرف دیوار ہے جس میں چھ، چھ سوراخوں والے خانے ہیں، دنگا بابا کی..... لہاٹ ہے خواب میں وہی کے وہی لفظ جو اس نے بولے تھے۔ اس مکان میں سنہری رنگت اور بزمز آنکھوں والی میری پتری گل زعفران مجھے بابا، بابا بلاتی ہے..... پہلی بار خواب سے آنکھ کھلی تو..... میں نیم پاگل ہو کے رات کو باہر نکل گیا۔“

”دوسری، تیسری بار یہ خواب دیکھا..... تو غور کیا کہ بابا وہنگا مظفر آباد کیوں کہتا ہے؟ میں تو باغ میں رہتا ہوں۔ میں مظفر آباد نکل گیا۔ وہاں ایک، ایک مسجد ایسی..... مظفر آباد تو ویسے بھی میرا دیکھا بھالا

بچوں تمہیں حج مبارک ہو..... ثریا فرخ

میرے بیٹا، بہو طلحہ اور حسنا اس دن گھر آئے تو کہنے لگے..... امی ہم اس سال حج پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اب آپ بھی ارادہ کر لیں..... ”اللہ تمہارے ارادے کو پائے تکمیل تک پہنچائے۔“ میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔ پچھلے سال رمضان میں طلحہ نے اپنے نانا سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ ”بیٹا تم ارادہ کر لو..... اللہ تعالیٰ خود بلا لے گا انشاء اللہ اور پھر اللہ نے یوں کرم کیا کہ راستے بنتے چلے گئے اور سارے انتظامات اللہ کے فضل و کرم سے ہوتے چلے گئے۔

دونوں بچوں کا جذبہ ایمانی..... ہر اس جذبے پر غالب آ گیا جو دنیاوی محبت کا ہے..... بچوں کی فکر کہ ان کے دو چھوٹے، چھوٹے بچے ہیں، بیٹا طلال ماشاء اللہ آٹھ برس کا ہے۔ اور بیٹی مریم ماشاء اللہ چھ برس کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی کو بلانا ہوتا ہے تو وہ ایسے بلا لیتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بے شک اس کے یہاں اخلاص اور جذبہ ایمانی کی قدر ہے..... اور وہ بڑا قادر دان ہے۔

بچوں کے سارے انتظامات ہو گئے۔ vaccination ہو گئی۔ حاجی کپ میں تربیت بھی ہو گئی..... تو خوش خبری ملی کہ انشاء اللہ 14 اگست کو ان کی روانگی ہے۔ دو پہر کو ڈھائی بجے تک انٹر پورٹ پہنچنا ہے۔

جوانی میں کی گئی عبادت کا اپنا الگ مقام ہے۔ یہ عمر ہر قسم کی دلچسپیوں کی ہے۔ دنیاوی رنگینیاں اپنی طرف بلائی ہیں۔ کبھی کسی کام کی طرف بندہ سوچتا ہے یہ کر لیں تو حج پر جائیں..... وہ کر لیں تو حج پر جائیں..... مگر وقت گزرتا جاتا ہے اور یوں عمر کی نقدی ختم ہونے کو آ جاتی ہے۔ پھر صرف یہ دن رہ جاتا ہے کہ کاش اس بات اور اس کام کی فکر نہ کی ہوتی اور جوانی میں ہی حج کر لیتے۔

”تری طرف کی کہانی تو سیدھی سی ہے..... حادثے سانحے ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی کرنی ہے جو ان مر جاتے ہیں۔“

غلام احمد کی سوالیہ نظریں بات کے مکمل ہونے کی راہ تک رہی تھیں۔

”مگر..... تیرا یہ خواب..... عجیب ہے..... تم کہتے

ہو کہ بار بار دیکھا..... گاموں پتر..... میں حیران ہوں اس نے خواب کے سہارے رستہ ڈھونڈا..... پر کس کا رستہ؟ یہاں تو نہ تری بیوی نہ بچی..... ہمارا کیا لینا دینا بنتا ہے۔“ غلام احمد کا دل بچھ گیا۔ ”ظفراں میری پوتی ہے..... اس کی عمر..... پورے حساب سے تیرہ سال آٹھ ماں بنتی ہے، میں جوانی میں وادیہ کا کام کرنی تھی۔ جسے مڈ وائف کہتے ہیں..... ظفراں کی ماں مصفورا.....“

”صفورا.....“ غلام احمد کے منہ سے ایک دم نکلا۔

گاموں نے سخت نگاہ سے گھورا..... ماسی جی

نظروں سے کسی متوقع خطرے کے انتظار میں سب کو دیکھ رہا تھا۔ گاموں کی اس پر نگاہ پڑی تو ڈپٹ دیا۔

”اوئے تو جا..... دکان پر جا..... کا کا اکیلا ہوگا..... رش کا ٹیم ہے۔“ وہ مادل ناخواستہ چلا گیا..... غلام احمد کو محسوس ہونے لگا کہ اب جلد ہی اسے باعزت رخصت کر دیا جائے گا آغاز گفتگو کی خاطر کھٹکھارا۔

”ماسی جی..... میں آزاد کشمیر سے آیا ہوں۔“

”وہ سب کچھ مجھے گاموں پتر نے بتا دیا ہے..... فجر ویلے کی آئی بیٹھی ہوں، گاموں کی خالہ ہی نہیں ماں بھی ہوں..... اس کی شادی میرے ہاتھوں ہوئی۔ اس کی ماں، جو میری بڑی بہن تھی اتنا سا چھوڑ گئی تھی۔“ وہ ہاتھ سے قد بتا کر چپ ہو رہی..... پھر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹھک کا ماحول بہت بھاری اور ٹھنڈی زدہ تھا۔ غلام احمد نے سوچا جو ہوتا ہے ہو جائے اور وہ کم از کم تازہ ہوا میں جا کر سانس لے۔

”کشمیر والے پتر.....“ شکر ہے بوڑھی خاتون نے خاموشی کی برف توڑی۔

میں ان کے ابو دونوں بیٹے اور حسد (بہو) کے ابو اور بھائی انر پورٹ ان کو چھوڑنے گئے۔ ماشاء اللہ چھوٹے بچوں نے بہت خوشی، خوشی ماں، باپ، گورخصت کیا۔ بس جب حسد اندر جانے لگی تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ جس پر اس نے جلد ہی قابو پا لیا۔ یہ دیکھ کر طلال میاں بھی منہ پھیر کر رونے لگے۔ دعاؤں کے سائے میں ہم ان کو رخصت کر کے واپس ہوئے۔

آج وہ خوش نصیب دن ہے۔ جب میرے بیچ جج کی سعادت حاصل کر چکے..... آج وہ دونوں ایسے ہو گئے جسے ان کی ماؤں نے انہیں آج ہی جنم دیا ہے۔ آج اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کا میل پچھل دور کر دیا..... آج وہ ان مقدس مقامات پر اپنے رب سے قریب ہو گئے۔ جہاں جانے کی ہر مسلمان کو تمنا ہوتی ہے۔ میرا دل ان کے دلوں کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ میری دعائیں ان کی دعاؤں کے ساتھ مل رہی ہیں، میرے بچوں کو اللہ تعالیٰ نے وہ نور عطا کر دیا کہ اس کا جتنا شکر کروں وہ کم ہے۔ اے میرے معبود حقیقی! میرے بچوں کو ہمیشہ ایمان پر رکھنا اور ایمان پر اٹھانا..... اور میرے معبود مجھے بھی موتِ ایمان کی حالت میں دینا۔ (الہی آمین)

اپنے تمام متعلقین سے جج کی مبارک باد وصول کرتے ہوئے میرا دل فخر و خوشی سے لبریز ہے۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے نیک تمنائیں ہیں۔

آخر میں میں اگر اپنے پونی پوتا اور ان کے نانا، نانی کی تعریف نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ ماشاء اللہ بچوں نے بہت اچھی طرح وقت گزارا اور ماشاء اللہ بچوں کے نفسیال والوں نے بھی ان کو بہت اچھی طرح سے رکھا اور اتنا مصروف رکھا کہ انہیں ماں، باپ کی دوری زیادہ محسوس نہ ہوئی۔

اللہ ہم سب کو بھی یہ سعادت نصیب کرے، آمین۔

دیکھ کے بتا دیا تھا کہ بیٹی ہے..... تو لڑکیوں والے نام سوچتی رہتی تھی اس کی ماں..... اتنا مشکل ناں میرے منہ نہ چڑھتا تھا۔

”میں نے مصفورا سے کہا کوئی چھوٹا سا اسلامی نام سوچ لے..... میڈی سونی شہزادی مصفورا ناراض ہو گئی۔ مجھ سے لاڈ کرتی تھی..... میں نے کہا اچھا چل تو راضی رہ..... یہی ناں (نام) رکھ دیں گے۔ اسکول کے رجسٹر میں یہی نام ہے..... پر ہمارے منہ نہ چڑھا..... میں ملواتی ہوں ابھی ظفراں سے کشمیر والے پتر..... ظفراں کی ماں کو بھی اپنی بچی پالنا، سنبھالنا نصیب نہ ہوا..... تین ماہ بعد ہماری کرباں والی چل بسی..... ظفراں کو میں نے پالا..... گاموں کا دو جہا نکاح کیا..... اس کو اللہ نے دو بیٹے دیے پر میری ظفراں تو سروسوں کا پھول ہے..... وہ نہیں ملتی بھائیوں سے..... گاموں پتر..... بلوادیے بیٹی کو۔“

گاموں کا انداز غیر واضح تھا۔

تنہائی نظروں سے دیکھنے لگی وہ ہکلا کر رہ گیا۔
”یہ 2004ء کی بات ہے..... اب مجھے سن یاد آیا ہے..... مصفورا کو حمل ٹھہرا..... پہلے تین ماہ وہ کپڑے دھوئی رہی..... چوتھے ماہ سے آثار ہوئے۔ میں نے خیال کیا کہ دن چڑھے ہیں۔ مگر ڈاکٹر نی کے پاس لے گئے تو ڈاکٹر نی بولی اسے چار ماہ کا پیٹ ہے..... میں تو ہنس پڑی، کہا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ حساب پھر کرو، آپ کو غلطی ہو رہی ہے۔ اسے پچھلے مہینے تو.....“ ڈاکٹر نی نے سمجھایا کہ پریشان نہ ہوں ایسا ہو جاتا ہے..... وہ کیا کہتے ہیں..... کیا ہوتا ہے۔“ ماسی جی ماتھا ٹھوٹک ٹھوٹک کر سوچتی رہی پھر یاد کر کے کہا۔ ”رے ار (rare) کیس..... وہ تھا..... خیر سے احتیاط کی تلقین کی اپنے ٹیم (ٹائم) پہ بچی پیدا ہو گئی..... دو جھمی بات..... مصفورا ایک دن اوپر چھت پر سردی کی دھوپ میں بیٹھی تھی۔ نیچے آئی تو ہاتھ میں رسالہ تھا خوشی سے بتانے لگی۔ ”ماسی جی میں نے اپنی دمی کا نام ڈھونڈ لیا ہے۔ یہ دیکھو، یہ لکھا ہے زعفران گل.....“ ہمیں ڈاکٹر نی نے شیشہ لگا کے

غلام احمد کی آواز اور الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
 دامن دعا تنگ پڑ گیا تھا۔ وہ کبھی ماسی اور کبھی گاموں کو
 صرف ظاہری آنکھ سے دیکھتا نظر آ رہا تھا اس کا وجود، قلب و
 روح کہیں معلق تھے۔ صفورا، صبورا..... زعفران.....
 ظفراں سروسوں کا پھول..... وہ میرے نصیب کی
 ہار شیوں کی اور چھت پر برس گئیں۔
 ماسی جی نے گاموں کو کوئی اشارہ کیا۔ گاموں
 نے سراپکی کا سہارا لیا مبادا غلام احمد سمجھ جائے۔
 ”اساں کیوں دمی نوں ملاؤں۔“ (ہم
 کیوں بیٹی کو ملائیں) ماسی جی بغد رہی، دو تین بار آواز
 دی تو سراپکی میں جواب آیا۔
 ”آئیدی پئی آں ماسی جی۔“

ایک خواب زدہ بوڑھا باپ، بیٹی کے قدموں کی
 چاپ پر آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا۔ بیشک کا گھر کی
 طرف مٹلنے والا دروازہ الہام کی تفسیر سے چمک اٹھا۔
 ایک معصوم صورت جس کی ہری آنکھیں، موتیا رنگت،
 گلاب کی پنکھڑیوں سے لب تھے۔ جس نے دو چوٹیاں
 کس رکھی تھیں اور بڑے، بڑے پرنٹ کا لبا فراک جو
 شلوار کے پانچوں سے کچھ اوپر تک تھا۔ جلدی میں لیا
 گیا کالا دوپٹا فرش پر لٹک رہا تھا۔

سفید داڑھی والا غلام احمد اضطراب سے
 یوں اٹھا کہ کندھے سے صاف نیچے جاگرا۔ بے ساختہ
 دونوں ہانپیں پھیلی۔ ”آ میری گل
 زعفران.....“ دوسرے ہی پل دونوں ہاتھوں سے
 چہرے کو ڈھانپ لیا۔ جسم زلزلے کی زد میں تھا.....
 بے عنوان، بے درد لکھایا تھا کہ ماسی جی آنکھیں پونچھ
 رہی تھی تو گاموں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ظفراں،
 ماسی جی کے پہلو میں دبی آنکھوں میں حیرت بھرے
 تک رہی تھی۔ ماسی جی نے اس کے کان میں کچھ.....
 سرگوشی کی..... وہ معصومیت سے پوچھ پٹھی۔

”کشمیر والے بابا جی..... آپ کی بیٹی زعفران گل مرگی؟“
 زعفران گل تھا۔ آپ کی بیٹی زعفران گل مرگی؟“

”اللہ نہ کرے پتری.....“ غلام احمد زور، زور

سے ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، ادھر ادھر ہاتھ
 مار کر یونہی چند چیزیں اکٹھی کرنے لگا..... مگر ابوصافہ
 اٹھایا..... چپل ڈھونڈی۔

”صبورا کی مٹی کو بتاؤں گا..... جھلی نہ ہو تو تری
 پتری زندہ ہے۔ آ کے دیکھ اماں..... مجھے کہتی تھی پگلا نہ
 ہو تو جھلا نہ ہو تو..... یہ ہے میرا خواب..... یہ پیشگی
 ہے..... گل زعفران.....“ اس نے ان کی طرف سے
 پشت کیے، کیے سامنے کی طرف منہ موڑا تو داڑھی
 آنسوؤں سے بھگ رہی تھی۔

”ماسی جی..... میں جا رہا ہوں..... جیسے تم نے
 آج تک پالی پوی..... ویسے ترے حوالے۔“ گاموں
 نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر دیا، وہ کارڈ لے کر
 اپنی جیب سے بٹا نکال کر اس میں سے کارڈ کی فوٹو
 کا پی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔

”جب میں مٹی ہو جاؤں..... میری مال ملکیت
 میری گل زعفران کا ہے..... لے جانا۔“ کالا سفری
 بیگ، کندھے پر لٹکایا، قمیص کی آستین سے چہرہ
 رکڑا..... دروازے کی طرف بڑھا ذرا سی پشت موڑے
 دایاں ہاتھ اٹھا کر زیر لب رب را کھا کہا۔ پتھر کے بتوں
 میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

اس کا ایک قدم باہر اور دوسرا اٹھایا تھا کہ
 ظفراں نے ماسی جی سے ہاتھ چھڑایا وہ لپکی ہی تھی کہ
 اسی تیزی سے گاموں نے پکڑ کر کھینچ لیا۔

”جھلا بندہ ہے جانے دے۔“

”کشمیر والے..... وہ پکاری مگر پکارا دھوری تھی۔

غلام احمد کے قدم تھے..... جسم سراپا کان ہو گیا۔

”بابا.....“ وہ زور سے چلائی..... روتا نہیں

بابا.....“ غلام احمد نے پلٹ کر دیکھا۔ جھرنے کی طرح

بہتی آنکھیں..... مگر ہونٹ ہنستے تھے..... انگشت

شہادت اوپر اٹھائے..... زور، زور سے ہنسا اور اتنے

ہی زور سے روتا وہ پاگل نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

پگلا جھلا خواب زدہ باپ چلا گیا تھا۔



شیر لویا لکھتا ہوں چپس دیوار سنسٹا ہوں

نصرت یوسف

تھے۔ ان کے قریب بلکہ جڑوں میں پیوستہ کوڑا کرکٹ انسانوں پر نبٹ اور خباثت کے جراثیم اسپرے کر رہے تھے۔ سامنے کا منظر تو کوئی مہبوت کرنے والا نہیں تھا پھر کیوں شاہنواز تھم سا گیا تھا۔ اسے بھی دیکھے جانے کا احساس ہو چکا تھا۔ جیسی اس سرو قد لڑکی نے اپنے عبا یہ کا نقاب خواہ خواہ صحیح کیا اور سڑک کی دوسری جانب ہو گئی۔ ہاتھوں میں کالے دستانے اور کالے ہی بند جوتے اوپر سے نیچے تک کالے سیاہ رنگ میں بس آنکھوں کے گرد سنہری کھال کا چمکا رنگ ہی نمایاں تھا۔ شاہنواز نے لڑکی کو راستہ تبدیل کرتے دیکھا تو

تیز، تیز قدم اٹھاتے، ہاتھ میں کی گئی شاہنگ کے تھیلے اٹھائے وہ سروس روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خلاف توقع زیادہ وقت خریداری میں لگ گیا تھا اور آگے کے تمام کاموں پر جس کا لازمی اثر پڑنا تھا۔ از سر نو ذہن میں بقیہ مصروفیت کو ترتیب دیتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے جیسے تھما سا دیا تھا۔

ڈھلتی شام کی دھیمی، دھیمی روشنی ان خود رو پھولوں اور پودوں پر سنہری افشاں کی طرح چمک رہی تھی جو اس پوری سڑک کی لمبائی میں سانس لے رہے

مکدر سا ہو گیا۔ اس کے سیاہ عبا یا... پر چمکدار رنگوں سے بنے سوالیہ نشان ہی دراصل وہ نقطہ تھا جس نے شاہنواز کو ٹھنکا دیا تھا۔ لڑکی کے قد کی مناسبت سے اس کے عبا یا... کے دونوں اطراف میں بنے فیروززی اور سفید رنگ کے امتزاج کے ساتھ وہ نشانات چمک رہے تھے۔

”بوجھو تو جانیں۔“ شاہنواز کو لگا جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔ ایک بار پھر اس کا سر اپا جانچا جو اب قدرے دور جا چکا تھا۔ وہ عجب سی سنسنی محسوس کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اشارت کردی پھر سامنے نظر آتے بل بورڈ پر نگاہ ڈالی جہاں لکھا تھا "insomnia is in trend alow" (بے خوابی موجودہ دور کا فیشن ہے) انٹرنیٹ کنکشن مہیا کرنے والی کمپنی کی طرف سے تازہ، تازہ پینٹ کیا گیا بورڈ آتے جاتے لوگوں کو شاید ”تعلیم بالغاں“ دینے کے لیے لگایا گیا تھا۔

☆☆☆

”ہائے جگر کہاں تھے تم؟ پچھلے تین دن سے غائب ہی ہو۔ کہاں پائے جاتے ہو آج کل؟ کہیں ملک سے زندہ بھاگنے کی تیاری میں مصروف تو نہیں؟“ ان چاروں نے شاہنواز کو دیکھ کر پوچھنا شروع کر دیا۔

”تین دن؟ ابھی کل تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“ شاہنواز نے حیرت سے کہا۔

”پان کے کھوکھے پر شکل دیکھی تھی بس تمہاری۔“ یاد رہنے جیسے لہجے میں کہا تو شاہنواز ہنس پڑا۔

”ویسے پان کی عادت کم کر دو تو تمہارے ڈسٹنس کا بل بھی کم ہو جائے۔“ شاہنواز نے یاد کو مشورہ دیا تو وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

”بس اس کی طرح سگریٹ، پان استعمال کیا کر، انجانے میں، بیگانے کی طرح.....“ صغدر نے دوستانہ سا طنز کرتے ہوئے شاہنواز کی طرف اشارہ کیا تو اس نے پتا جواب دیے اس کے ہاتھ سے جلتی سگریٹ لے کر ایک ٹمہرا کش لگایا۔ اور بخور ان خالی

کین کو دیکھنے لگا جو ان چاروں کے قریب خالی لڑھک رہے تھے۔ بوٹ بین کے علاقے میں نم اندھیری جگہ پر بیٹھے وہ یقیناً مراقبے میں مصروف نہ تھے۔ خوشحال طبقے سے تعلق کے باعث ان کی زندگی کے مسائل وہ نہ تھے جو اتنی فیصد عوام کے ساتھ جو تک کی طرح چپے تھے۔ ان کے مسائل زندگی میں طاقت اور اختیار حاصل کر لینے کے گرد گھومتے تھے۔ جائیداد کی خرید و فروخت، چھین، ملائشا سے امپورٹ کردہ اسٹم اور ان کی کھپت پر گفتگو ہوتی تھی۔ چھبیس، ستائیس برس کے یہ تمام جوان زندگی کے تلخ ذائقوں سے نا آشنا تھے، انہوں نے آنکھ کھولے ہی سہولتیں اپنے ارد گرد پائی تھیں اور وہ انہی کے عادی تھے سوائے شاہنواز کے جس نے سہولتیں ہونے کے باوجود اپنے باپ عارف بھجتی کی شیر کی نگاہ بھی دیکھی تھی۔ جب تک بچوں پر ان کا کنٹرول رہا وہ خاصی حد تک ارد گرد پھیلے بگاڑ سے بچے رہے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے اپنے، اپنے پر پھیلا کر پرواز شروع کی تو وہ اثرات نمایاں ہونے لگے جو ارد گرد موجود تھے۔ عارف بھجتی کی شیرانہ نگاہ کے اثرات مدھم سے پڑنے لگے تھے۔ اکلونی بیٹی رشا کو انہوں نے مخلوط نظام تعلیم پر پٹی اداروں میں پڑھانا پسند نہ کیا مگر اولیوڑ کے بعد اس نے جس آرٹ کالج میں داخلہ لیا وہیں کے ٹیچر کے ساتھ اس کی پسندیدگی اتنی بڑھی کہ باپ نے کسی غیر مناسب وقت کو دیکھنے سے پہلے ہی اس ٹیچر سے رشا کی خواہش کے مطابق رشتہ کر دیا۔ اس نوجوان ٹیچر میں بظاہر کوئی خامی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ جس پر تعیش زندگی کی رشا عادی تھی، وہ فی الوقت اس کا تحمل نہیں تھا۔ باپ کو بیٹی کی اس بغاوت کا خاصا غم تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ بہت جلد ان دونوں کے درمیان گرم جوش تعلقات کا جھاگ بیٹھ جائے گا۔ وسائل کی قلت رشا کو بے چین کر دے گی لہذا انہوں نے ذاتی کوششوں سے بیٹی داماد کو لندن سیٹل کر دیا۔ دونوں میاں بیوی وہاں جا کر کے کما تے کھاتے تھے۔ دیارِ غیر تک بھجوانے

”کیوں، تمہیں کوئی جاسوسی ناول کا کردار مل گیا تھا؟“
صفر نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک ناول کا حوالہ دیا جو شاہنواز
اور اس کے پسندیدہ مصنف کا متنازعہ ناول تھا۔ امریکا میں
اس ناول پر خاص لے دے اسے خاصا مشہور کر چکی تھی۔

”ناول میں مصنف اگر مقدس ہستیوں پر عام
انسانوں کی طرح بحث نہ کرتا تو یہ ناول میں دوسروں کو
ضرور پڑھاتا۔ لیکن اب یہ شیریں نہیں کیا جاسکتا۔“
شاہنواز نے صفر کو اس کا ناول واپس کرتے ہوئے
نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔ اب صفر نے اسی ناول کا
حوالہ دیا جس میں ”Holy grail“ ایک ایسا راز
تھا جو ایک اجنبی زبان میں تحریر تھا۔

”نہ، نہ، نہ ٹیگر کو خلائی مخلوق سے رابطے کا سفر
بنادیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ایسی باتیں کر رہا ہے۔“
یاور نے اپنی انگلی سے اس کے سر کو چھپتیا تو سب
نے بے اختیار قہقہہ لگادیا۔

”اور اندازے لگاؤ، تم بھی بولو، تم بھی کچھ کہو۔“
شاہنواز نے دونوں بازو باندھتے ہوئے مزے لے کر
بقیہ دونوں دوستوں کو بھی ابھارا۔

”چل یار کسوٹی نہ کھیل!“ علی نے چیونگم کا پیکٹ
اس کے آگے کیا۔

”کوڈز ایک برقع پر لکھے تھے بلکہ بنے تھے۔“
شاہنواز نے ریپر پھاڑ کر چیونگم منہ میں رکھی اور نہایت
ڈرامائی انداز میں بولا۔

”برقع پر.....؟“ صفر نے حیرت سے ڈہرایا۔

”تمہارا مطلب ہے وہ کالے گاؤں جو بیچاری
عورتیں پہنتی ہیں۔“ یاور نے عورتوں پر افسوس کیا۔

”کیا مذاق ہے، صبح سے بتاؤ۔“ علی نے کندھے
پر زور کا ہاتھ مارا۔

”ابے میں بتاتا ہوں لکھا تھا۔“ خاور جو مستقل
خاموش تھا پریقین لہجے میں بولا تو سب کی اس طرف متوجہ
ہو گئے۔ ”برقع پر لکھا تھا۔ touch me not بس
اتنی سی بات ہے جسے بتانے میں اس نے اتنے کھنٹے
لگا دیے ہیں۔“ شاہنواز نے مسکراتے ہوئے سر تلی

میں باپ نے کردار ادا کیا اس کے بعد کی تمام ترقی ان
دونوں نے اپنے بل بوتے پر کی۔ آج کل عارف مجتبیٰ اور
ان کی بیوی اپنے دونوں بیٹوں شاہنواز اور شاہ زیب کو
چھوڑ کر اپنی بیٹی، داماد کے پاس لندن گئے ہوئے تھے۔
انہی، دامادی محبت سے زیادہ ان دونوں اسوں کی چاہت
اکٹس گا ہے بہ گاہے پہنچ لاتی تھی جو تانا، تانی کی آمد پر
بے حد خوش ہوتی تھیں۔ کمانے میں بے حد مصروف
والدین کی عدم موجودگی میں لاڈ اٹھانے والے تانا،
تانی کی آمد انہیں بے حد پسند تھی۔ باپ کے پیچھے
شاہنواز ان کی ٹریولنگ ایجنسی کامیابی سے سنبھالے
ہوئے تھا..... جبکہ چھوٹا شاہ زیب A.C.C.A کی
تاریوں میں مشغول تھا۔ کھانے، پینے، سونے اور گھر
لوسنے کے اوقات می، ڈیڈی کی غیر موجودگی میں
خاصے اترتے۔ جسے شاہنواز نے اڑان کا نام دیا تھا۔
ایجنسی کے تمام معاملات بظاہر ٹھیک ٹھاک ہی
رواں تھے مگر آج کل خلاف توقع کسی پرانی کلائنٹ فرم
سے تعلقات کشیدہ ہو چلے تھے۔ تقریباً چھپیس لاکھ کی رقم
اس فرم پر واجب الادا تھی مگر ادائیگی میں مستقل ٹال
مول سے کام لیا جا رہا تھا۔ فریق اتنا طاقتور تھا کہ اس
پر ہاؤڈالنا کوئی آسان نہیں تھا۔ قوی اندیشہ تھا کہ یہ رقم
اوب جائے گی۔ شاہنواز پچھلے کئی دنوں سے اس
معاملے کے حل کی تیک و دو میں تھا مگر کامیابی کے کوئی
آکار نہیں تھے۔ دو دن پہلے ڈیڈی کے پاکستان واپسی
کے فون نے اسے شکر سا کر دیا تھا۔

”ٹائیگر کچھ پریشان دکھتا ہے۔“ علی حیات نے
شاہنواز کے تاثرات جانتے ہوئے کہا تو سب نے اسے
اپنے دیکھا جیسے اس کے چہرے پر سب کچھ درج ہو۔

”نہیں بھئی..... کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“ شاہنواز
اتھا اٹھا کر شائستگی سے بولا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو غیر
متعلقہ اشخاص سے اپنی پریشانیاں بیان نہیں کرتے۔

”اصل میں مجھے symbolic language
(ملائی زبان) میں ایک پیغام ملا تھا۔ میں اس کو ڈی
کوڈ نہ کر سکا اور وہ ضائع ہو گیا۔“

میں بلایا اور پھر وہ واقعہ سنانا شروع کیا جب عبا پر بنے سوالیہ نشانات سے ابھرتی سرگوشیاں اسے سنائی دیں اور تلامخ خیر خیالات دائرے بنانے لگے۔

”دل تو چاہ رہا تھا کہ میں اس حسینہ سے جا کر کہوں اگر تم سوال ہو تو میں جواب ہوں، ہم معما ہو میں حل ہوں، تم الجھن ہو تو میں سلجھن ہوں۔“

”اور تم حسینہ ہو تو میں پسینہ ہوں۔“ یاور نے طنزیہ انداز میں اس کی بات کاٹی اور چیونگم سائڈ میں تھوک دی۔

”یہ تجا ٹرل کب سے پسند آنے لگی تمہیں؟“ گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چلے؟“ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے شاہنواز بولا۔

”کھلی جگہ ہی میں بیٹھنا ہے تو اسنوکر کلب کے لان میں بیٹھ جایا کرو..... یہاں اب بہت بو آتی ہے۔ کوڑا بھی خاصا ہو گیا ہے.....“ وہ بدستور کھڑا رہا۔

”بات پسند کی نہیں مسٹری کی ہے۔ وہ کوئی مسٹری کوئی راز نگ رہی تھی۔“ شاہنواز نے سر ہلایا اور اپنی بات شروع کر دی۔ کسی مووی کا وہ کردار جو آخر تک نہیں حل ہوتا اور آپ چاہتے ہیں کہ اس کو واضح کر دیں کسی ایک سمت لے جا کر غیر یقینی صورت حال سے نکل آئیں۔“

”نو مور فلسفہ پلیز..... سیدھی بات یہ ہے کہ کھلی ڈلی دوستوں سے تم بور ہو چکے ہو، کچھ نیا چاہتے ہو جس کی شروعات اس تجا ٹرل سے ہو چکی ہے۔ چلو اٹھو کچھ شغل میلا کرتے ہیں۔“ خاور نے کہا تو شاہنواز نے سر ہلایا۔

”سوری، آج میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا..... ہاں کل سنڈے ہے۔ کل کلب میں ملاقات ہوگی۔ بہت دن ہو گئے ہیں جانا نہیں ہوا۔“ شاہنواز نے ان سے معذرت کرتے ہوئے اگلے دن کا پروگرام بتایا تو سب تیار ہو گئے۔

”ماہا کبھی بتا دو کہ وہ اور اس کی فرینڈز ہمیں جو ان کرنا چاہیں تو کل آجائیں۔“ یاور نے شاہنواز سے کہا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”ماہا سے بہتر ہے اربکا گروپ کو لے لو۔ ماہا اہم کلاس میں سیٹ ہونے کی کوشش تو کرتی ہے لیکن بیچاری مس فٹ رہتی ہے پچھلی پارسلو لیس ڈریس میں آئی تھی اور یہ عقل نہیں تھی کہ ایسے آؤٹ فٹس کے لیے کچھ اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے۔“ شاہنواز نے ایسے برے تاثرات سے کہا کہ سب گلا پھاڑ کر ہنس پڑے۔

فضا میں ان کے قہقہے حدود و قیود سے باہر نکلی عورت کو ارزاں اور بے قیمت کر رہے تھے۔ سخی لطف و مزے کے لیے بے حجاب عورت ہو یا حجاب کرنے کے لیے نامناسب انداز اختیار کرنے والی عورت..... دونوں ہی صنف مخالف کے جذبات میں احترام کے بجائے ہیجان برپا کر دیتی ہیں۔ ماہا کو بے مول کیا جا رہا تھا تو عبا پر بنے سوالیہ نشانات نے بھی شاہنواز کو متوجہ کر دیا تھا۔ اس میں ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ وہ بھی موضوع گفتگو بن گئی تھی۔

”تمہارے ساتھ کچھ مسئلہ ہے شاہ، کل تک ماہا کے ساتھ تم انجوائے کرتے تھے، آج تمہیں کو بچپن مارکس والی سیاہ چمگاڈر اپیل کرنے لگی۔“ علی کو ماہا پر تیرے سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاہنواز کی باتوں پر کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی کا رخ گھر کی جانب تھا۔ راستے میں آنے والے ایک سپراسٹور کو دیکھ کر اس نے گاڑی روک لی۔ سی ڈی سیکشن میں مختلف سی ڈیز دیکھتے ہوئے وہ اپنی مطلوبہ سی ڈی کی تلاش میں تھا۔ سی ڈیز کا کوئی خاص انتخاب یہاں پر موجود نہیں تھا۔ ناکامی پر اس نے اسٹور سے باہر جانے کے لیے زینے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ سی ڈی سیکشن دوسری منزل پر واقع تھا۔ کسٹمرز کے لیے لفٹ کی سہولت بھی مہیا تھا لیکن جتنی دم وہ لفٹ کے اوپر آنے کا انتظار کرتا اتنی دیر میں ایک منزل نیچے خود اتر سکتا تھا۔ ابھی شاہنواز نے چند سو سیر حیاں اترتی تھیں کہ اچانک اسے دھکا لگا اور وہ بہ مشکل اپنا توازن گرل پر ہاتھ جما کر برقرار رکھ پایا۔ چار ساڑھے چار سال کے لگ بھگ عمر کا ایک بچہ اس

سے بھی واقف ہیں۔“ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ سے چنے ملتے لگے تو اسے لگا جیسے اس کے خیالات پر درخت نے ردِ عمل دیا ہو، اچانک کوئی کوا پر سمیٹتے ہوئے ایک اونچی شاخ پر آکر ٹک گیا۔

”کالی چگاڈا!“ زریب اس نے کہا اور دھیمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔ وہ پلٹ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا تو میز پر رکھے سیل فون سے ابھرنے والی منترن ٹون سے چونک گیا۔ فون کی اسکرین پر alarming message تھا۔

”اوہ آج اسپینشا کا بدھ ڈے ہے۔“ اسپینشا ایک پارسی لڑکی تھی، بے حد شوخ اور چٹیل۔ بی بی اے کے پورے چار سال اس کی سنگت کے شاہنواز کی خوشنما یادوں میں سے تھے۔ صفدر اور خاور بھی جب ہی شاہنواز کے ساتھ تھے۔ اسپینشا سے تینوں ہی کی دوستی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ایک اکیلی پارسی لڑکی بلا جھجک اسلام پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی تھی مگر کسی کی پیشانی پر طیش بھری شکنیں نہ ابھرتی تھیں۔ اس کے تہرے بالعموم کچھ اس طرح کے ہوتے تھے۔

”مذہب کے نام پر تمہارے ہاں عورتوں کو آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ آخر تم لوگ عورتوں کے خلاف نا انصافی پر آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ تم لوگوں کے لیے عورتوں کی explanation میں کوئی منفی رخ ہی نہیں۔“ ناک سکوڑتے ہوئے وہ یہ سب کہتی تو ایک آواز نہ ہوتی جو اسے روک دیتی۔

”واقعی ہمارے ہاں explanation تو بہت ہے لیکن حق بھی تو دیا ہے رائے کا، مرضی کا اب اگر عورت اسپینڈ نہیں لیتی تو اس کی مرضی.....“ خاور اس کے تمام الزامات کو گویا قبول کرتے ہوئے اس کی بات ہی اونچی کر دیتا۔

”مرضی! کیسی مرضی؟“ وہ طنزیہ انداز میں بولتی۔ ”کیا تم اپنے گھر کی کسی لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے مطابق پارسی خاندان میں کر سکتے ہو؟“ اس پر خاور چپ رہ گیا تھا اور اسپینشا ہنس کر کھڑی ہو گئی تھی۔

سے ٹکرا کر اوپر بھاگ چکا تھا۔ شاہنواز نے مڑ کر دیکھا تو وہ animated movies کے ٹیلیف کے آگے کھڑا اچک، اچک کر سی ڈیز دیکھ رہا تھا۔ بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اس نے بیچے کے والی وارٹوں کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو سامنے لفٹ کے دروازے سے باہر آتی لڑکی پر اس کی نگاہ ٹک گئی۔

”سنی، سوئٹ ہارٹ ویٹ! ویٹ۔“ بیٹے کو بلارتی ہوئی وہ اپنا ہینڈ بیگ سنبھالے تیزی سے آ رہی تھی۔ اخروٹی رنگ کے بالوں کے ساتھ اس کی دراز گردن میں عجیب شان تھی۔

”سوئٹ ہارٹ تم خود ہو، یہ شیطان بچہ نہیں۔“ شاہنواز نے دل میں تہرہ کیا اور مسکراتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

☆☆☆

موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی کا دورانیہ گھٹ رہا تھا۔ شاہنواز رات کتنی ہی دیر تک جاگے لیکن صبح کے نو بجے وہ باقاعدگی سے ابھنسی بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ابھی کے تمام اہم امور کی نگرانی اس نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ”باپ کی پوری، بیٹے کی آدمی اور نوکر کی ملا سے۔“ کاروبار پر توجہ کے درجے ڈیڈی اکثر ڈھیرایا کرتے تھے۔ شاہنواز آدمی کے بجائے پوری توجہ اور فکر کرتا تھا۔ ذرا فرصت ہوئی تو اس نے اپنے آفس کی لڑکی کے بلاسنڈز کھول دیے۔ کھڑکی داخلی راستے کی پردہ میں تھی۔ جہاں سے سڑک اور لوگوں کی آرجار نظر آ جاتی تھی۔ ٹریفک رواں، دواں تھا۔ چھوٹی، بڑی داریاں چھوٹے، بڑے لوگ، اونچے، نیچے قد، رنگ، لگے انسان، سڑک سے اڑتی دھول کہ سرکار نے سڑک بنانے کا احسان کرنے کے بعد استرکاری بھی لہن کی تھی۔ قدیم درختوں کی داڑھیاں جو بارش و رنگ کے مانند درخت کو جہاندیدہ، تجربہ کار ظاہر کرتی تھیں اس سڑک پر نمایاں تھیں۔

یہ درخت کیا، کیا نہ جانتے ہوں گے۔ شاہنواز لے دل میں عجیب سا خیال ابھرا۔ ”انہوں نے دادا ہاں کو بھی دیکھا ہوگا۔ ڈیڈی کو بھی جانتے ہیں اور مجھ

انسوس تو اس بات پر تھا کہ کسی کو بھی یہ نہیں پتا تھا کہ عورتوں کی عزت، حرمت اور قدر و قیمت کا اعلیٰ ترین چارٹر قرآن پاک کے سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے ثبت کر دیا ہے۔ دنیا کا کوئی اصول، کوئی قانون ایک باعصمت عورت پر بدکرداری کے الزام کو اتنی سنجیدگی سے نہیں ڈیل کرتا جتنا اللہ تعالیٰ کا قانون..... ایسے جموئے الزام ہی پر مجرم کے لیے ایسی کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ ایسی کوئی نظیر دنیا کے کسی مذہب و قانون میں نہیں۔ دین کے ایسے حقیقی اور پائدار اصولوں سے لاعلمی کے باعث ہی غیر مسلم گروہ کے الزامات پر عام مسلمان مدافعت بھی نہیں کر پاتے۔

بحیثیت پیدائشی مسلمان شاہنواز کو یہ باتیں چھ ضرور جانی تھیں لیکن اسے بھی یہ اپنے ہی مذہب کی کمزوری لگتی تھی۔

بی بی اے ختم کر کے شاہنواز نے ایم بی اے کرنے کے بجائے اپنے والد کے ساتھ ٹریولنگ ایجنسی میں اپنا بھرپور وقت اور صلاحیت لگا دی۔ اسپینشا مزید اسٹڈیز کے لیے سنگا پور چلی گئی۔ صفدر اور خاور کے ساتھ گاہے بہ گاہے ملاقات رہتی تھی۔ ہاں وہ ہمیشہ کی طرح اسپینشا کو اس کی سالگرہ پروش کرنا نہیں بھولتا تھا۔ چاہے وہ اسی میل ہوتی، کال ہوتی یا مختصر سائیکسٹ میسج۔ شروع، شروع میں جب وہ اسپینشا سے علیحدہ ہوا تھا تو سنگا پور تک کال کر لیتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ نقوش مدہم ہونے لگے۔ ایک اسپینشا چھوڑ گئی اور خوش ادا اور نگاہ خیرہ پیکر زندگی میں آتے گئے۔ بس اب سالگرہ کی حد تک کا تعلق ہی رہ گیا تھا۔ لمحوں میں رنگین سا ایم ایم ایس کر کے اس نے اسپینشا کا نمبر کلک کیا اور ماضی کو چھوڑ کر حال میں واپس لوٹ آیا۔ آج یہ اس کے ایجنسی سے اٹھنے کا وقت تھا۔ سو گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے اس نے باہر کارخ کیا۔

صفدر کو اس کے اسٹوڈیو سے پک کرتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ شاہنگ ایریا کی جانب کیا تو وہ چونک گیا۔ ”یہ کیا! تم مجھے کہاں لے جانے کے لیے آئے تھے؟“

”وہیں لے جا رہا ہوں جہاں کا کہا تھا۔“ شاہنواز نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ صفدر کا تجسس پوری طرح ابھار چکا تھا۔

”تم نے کہا تھا کہ exciting scene ہے۔“ وہ گاڑی شاہنگ مال کی طرف مڑتے دیکھ کر جھنجھلایا۔

”exciting ہی ہے۔ صبر ذرا، میں بھی گھنٹا بھر پہلے ایسے ہی نہیں ایجنسی سے اٹھ آیا۔“ صفدر کو جواب دیتے ہوئے اس نے گاڑی سروس روڈ پر لے جاتے ہوئے دھیمی کر دی تھی۔

”اوہ تو تم اس لیے یہاں آئے تھے بوائے۔“ صفدر نے بے اختیار سامنے سے آتی ایک دروازہ قامت عبا یا میں ملبوس لڑکی کو دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں گول ہو کر سکڑ چکے تھے۔ عبا یا پر بنے چپکتے دکتے سوالیہ نشان اور شاہنواز کی توجہ سے وہ فوراً ہی یہاں آئے کا مقصد جان چکا تھا۔ شاہنواز نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کالی تھی، بتا کسی رنگ کے۔“ صفدر نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں یہ اس کے جسم پر بنے مارکس واقعی exciting ہیں۔“ صفدر نے شاہنواز کے انتہاک کو دیکھتے ہوئے ایک اور تبصرہ کیا تو اس نے گردن موڑ کر صفدر کو ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ exciting ہے۔“ لڑکی کی چال میں قدرتی چلک تھی۔ ایسے میں قد کی لمبائی کے ساتھ اس کا متوجہ کرنا عبا یا شاہنواز کی جذباتی کیمسٹری میں ابال پیدا کر رہا تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر باہر کھڑے ہو چکے تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے کو محسوس کرتے ہی لڑکی کی چال میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ کندھے پر ڈالا شوल्ڈر بیک خواہ خواہ درست کرتی وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی گئی۔ ”لگتا ہے یہ سامنے والے انٹینیٹیوٹ سے آئے۔“ صفدر نے اس کے ہاتھ میں پکڑی کمپیوٹر لپکٹوٹا کی کتاب دیکھ کر کہا۔

”ہاں پہلی مرتبہ جب میں نے دیکھا تھا ا PHP (کمپیوٹر لینگویج) کی کتاب تھی۔“

ذرا سا عمل دیر پاراحت

☆ جہاں معاف کرنے سے خوشنوا ریت ابرا چمائی کا
امکان ہو دہاں بدلہ لینا ظلم ہے۔

☆ اپنے دل کو ہرے بھرے درختوں کے مانند بنا کر رکھو،
سکون امن اور پیار کے پرندے خود ہی اس پر آ بیٹھیں گے۔

☆ آپ کا بہت بڑا سرمایہ وہ لوگ ہیں جو آپ کی
غیر موجودگی میں اپنے رب سے دعاؤں میں آپ کے
لیے خیر و بخشش مانگتے ہیں۔

☆ اچھی سوچ اور نیت والوں کو سکون ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ ان
کے دل ہمیشہ کی گھری ہوئی منی کی طرح ابلے اور پرسکون رہتے ہیں۔

از: رابعہ، جھنگ

پہنچتے پہنچتے شاہنواز نے صفدر کی آفر سے فائدہ اٹھانے
کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”فصل گئے بند دروازے پر کسی روز ہتھوڑا مارنا
ہی پڑے گا ورنہ میں اسی طرح غنی بنارہوں گا۔“ وہ
اندرونی آوازوں کو دبانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔
”تصور سارا اس لڑکی کا ہے کیوں ایسی ڈیزائننگ

کی کہ مجھے متوجہ کر دیا۔ اب تم سوال ہو جانم تو میں
جواب ہوں۔“ وہ خیالوں میں مخاطب ہوا۔ بیڈ پر
جو توں سمیت لیٹتے ہوئے اس نے اپنے اندر سنسنی سی
پھیلی محسوس کی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل
پر رکھا سیل فون اٹھا کر صفدر سے بات کرنا چاہی۔ صفدر
کا نام اسکرین پر چمک کر ڈائلنگ شروع ہوئی تھی کہ

اچانک اس نے سرخ بشن دبا دیا۔ ہمیشہ کی طرح پھر
ایک لہری اٹھی اور اس کا سارا جوش ایسے بہہ گیا جیسے
پانی سے بھرے ٹینک میں لگا stopper ایک جھٹکے
سے نکال دیا جائے تو لچھوں میں بھرا ہوا ٹینک خالی ہو کر
سوکھا سا لگنے لگے۔ شاہنواز نے جھنجھلاہٹ کے عالم
میں سیل فون اچھال دیا۔ ہزاروں کا خریدا گیا سیٹ فضا
میں اچھل کر کہاں غائب ہوا اسے کوئی پروا نہیں تھی۔
بس اسے اپنی کم ہمتی کا شدید ترین قلق تھا۔

من دروازے پر تیز دستک سے اس کی آنکھ کھلی تو

”گنڈ چمکاؤ درماغ بھی رکھتی ہے۔“ صفدر نے
قہقہہ لگایا اور گرد موجود ایک آدھ لوگوں نے ان دونوں
کی نگاہوں کا مرکز بھانپ لیا تھا اور ایسے مسکرا رہے تھے
جیسے کسی اسکرین پر چلتی مودی کے دلچسپ سے سین
سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

”پچھا کریں کہاں جاتی ہے؟“ صفدر کے سوال
پر شاہنواز نے نفی میں سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔
لڑکی دور جا چکی تھی۔ صفدر نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے
دیکھا کہ کچھ ہی فاصلے پر موجود رہائشی علاقے کی طرف
اس کا رخ ہو چکا تھا۔

”مڈل کلاس کی تھی۔ کیا خیال ہے اٹھوا لیں اسے۔“
صفدر نے مزہ لیتے ہوئے کہا تو شاہنواز بس پڑا۔

”صفدر حیات کم از کم میرے جیسے اٹھوا لیے
جاتے ہیں مگر اٹھانے کے ذرائع نہیں رکھتے۔“

”تم تو یونہی بیکار آدی..... تم سے کون کہہ رہا ہے
کہ اٹھاؤ یہ کام تمہارے یار تمہارے لیے کر سکتے ہیں
اگر تم چاہو تو۔“ صفدر نے اگر پر زور دیتے ہوئے
سامنے مل بورڈ پر بنی حسینہ کو دیکھا جس کے بھرے،
بھرے ہونٹوں میں دلی اسٹرا اور عریاں بازو نمایاں
کرتے ہوئے جوس کی مارکیٹنگ کی جارہی تھی۔
”غضب کی عورت ہے یہ، چالیس کے قریب پہنچنے والی
ہوگی لیکن.....“ اس کے بعد صفدر نے حدود قیود سے
آزاد تبصرے جو شروع کیے تو شاہنواز بھی تازہ ترین
دیکھی گئی مودی کی ہیروئن پر رائے دینے لگا۔

صفدر کے ساتھ اسنوکر کلب میں کچھ وقت
گزارنے کے بعد جب اس کو اسٹوڈیو میں اتارا تو ایک
بار پھر اس نے اپنی آفر ڈہرائی۔

”اگر تم چاہو تو تھلی تمہاری مٹھی میں آسکتی ہے
شیزی.....“ یہاں بڑے اور بڑے آدی کے لیے سب
ممکن ہے۔“ شاہنواز نے صفدر کی بات پر قہقہہ لگایا۔
”تو تم بڑے ہو یا برے؟“

”دونوں.....“ صفدر نے فوراً جواب دیا اور
شاہنواز نے مسکراتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھر

وہ بدستور جوتوں سمیت بیڈ پر آڑھ ہاتھ چھالینا تھا۔ وندو اے سی کی کوئنگ سے کمر اٹھنا چاہتا تھا۔ اس موسم میں اے سی محض دو تین گھنٹے چلا کر وہ بند کر دیا کرتا تھا لیکن گزشتہ رات اپنے اوپر غصے نے اسے ٹھنڈک محسوس ہی نہیں ہونے دی۔ سامنے لگے وال کلاک سے اندازہ ہوا کہ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ دروازے پر زور کی دستک سے وہ کچھ گھبرا کر کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے چھوٹا بھائی شاہ زیب تھا۔ بھائی کو فالمر کپڑوں اور جوتوں سمیت نیند بھری آنکھوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اسے کچھ اچھانچا ہوا۔

”کیا رات آپ گھر نہیں آئے تھے شیزی؟“ اس کے لہجے میں کھوج تھی جسے محسوس کر کے شاہنواز الارٹ ہو گیا۔

”تم یہ بتاؤ اتنی صبح تم کیوں اتنے تیار ہو؟“ شاہ زیب کو فریٹس حلے میں دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

”شیزی مئی، ڈیڑی کی فلائٹ ہے آدھے گھنٹے بعد کی۔ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ جودی اور سارہ بھی ساتھ آ رہی ہیں اور انہیں ریسیور کرنے ہم جاتے ہیں ضرور۔“ شاہ زیب نے بھائی کی بھول پر سخت تعجب کرتے ہوئے اپنی بھانجیوں کی آمد بھی یاد دلائی تو شاہنواز کے ذہن سے دھند جیسے جھٹکنے لگی۔ سولہ سالہ بھانجی جودی سے اسے بہت محبت تھی۔ دونوں کا بلڈ +ve تھا۔ جبکہ باقی سب B+ve یا B-ve کے تھے۔ مئی، ڈیڑی، رشا، اس کا شوہر اور شاہ زیب۔

”اوہ، واقعی یار میں بالکل ہی بھول گیا۔ بس ابھی آتا ہوں۔ دس منٹ میں، تم گاڑی نکلواؤ۔ دوسری میں خود ڈرائیور کر لوں گا۔“ شاہ زیب نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر کا رخ کیا۔

واقعی ٹھیک گیارہویں منٹ شاہنواز گرے ٹی شرٹ اور بلو جینز کے ساتھ ویسی خوشبو میں لپٹا grey Hummer کی سیٹ پر آچکا تھا۔۔۔

شاہ زیب نے اپنے اسارٹ بھائی کو رشک سے دیکھا جو زندگی کو انجوائے کرنا جانتا تھا۔

صبح کا دھیمہ، دھیمہ سا اجالا چھیل رہا تھا۔ فضا میں تازگی بھی تھی اور نمی بھی..... ایسا لگ رہا تھا جیسے نو مولود صبح کا نرم ملائم سا احساس تمام جانے والوں کے ساتھ لپٹ رہا ہو۔ محبت میں گندھا، نرمی سے بھرا۔ بس فطرت کی اس بے بہا عنایات کو دونوں نے کچھ منٹ ہی محسوس کیا اور پھر گاڑی کے شیشے بند ہو گئے اور اس کے ساتھ لطیف اور تازگی بھری صبح کا تاثر بھی۔ شاہ زیب نے بٹن دبا کر میوزک آن کر دیا۔ انسانی روح فطرت سے اور دور ہوتی گئی۔

جودی سے ملنے وقت شاہنواز کو وہ کچھ کم مسمی لگی۔ نہ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ شاہنواز کو وہ نہایت ڈسٹرب سی لگی، مئی ڈیڑی بھی گا ہے۔ بگا ہے۔ جودی پر فکر مندی کی نگاہ ڈال رہے تھے۔ شاہ زیب اور سارہ سب سے بے نیاز اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

”زیب ماما یہ سسٹر جودی اتنی سلی ہے کہ اس کا ایک ایر رنگ واش روم میں ڈرین ہو گیا تو اتار روٹی، اتار روٹی کر بس۔“ شاہنواز نے پھر، پھر باتیں کرتی نٹ کھٹ سی سارہ کو دیکھا اور بیک ویو مرر سے بغور نگاہ جودی پر ڈالی۔ اسے سارہ کی بتائی وجہ پر یقین نہیں آیا۔ ایک لمبے فضا کی سفر کے بعد گھر پہنچ کر سامان کی سینک اور تھکان اتارنا مئی، ڈیڑی کی ہمیشہ سے ترجیح تھی۔ مختصر ملاقات کے بعد وہ فریش ہو کر آپس میں تفصیل سے گفتگو کرتے تھے۔ مئی کی ہدایات کے مطابق شاہ زیب ایک دن قبل ہی جودی اور سارہ کے لیے مخصوص کمرے کی سینک کراچکا تھا۔

”شاہ زیب آپ کو میری انٹریڈیز انٹنگ فرم میں آج سے امپلائٹ کر لیا گیا۔“ سارہ نے ڈرامائی آواز میں کہا تو کمرے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی جودی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ زیب نے یہ سب کرایا ہے۔“ شاہنواز تعجب سے بولا۔

وہ ان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے

لگ رہا تھا۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے بیڈ روم میں اسے کاروباری معاملات پر رائے دی ہو یا مانگی ہو..... دوسرا یہ کہ می ایک دوسرے پہلو بدل چکی تھیں جیسے انہیں اس تمام قصے سے کوئی دلچسپی نہیں ہو اور وہ کچھ اور شروع کرنا چاہ رہی ہوں۔

”کوئی ایسی بات جو تمہارے لیے.....“

”pain in neck“ بنی لیکن تم مجھ سے شیر نہیں کر رہے؟“ ڈیڈی نے اچانک سوال کیا تو شاہنواز نے ایک گہری سانس لے کر بچیں لاکھ کی اس ڈوبتی رقم کو سوچا اور تفصیل بتانے لگا۔ می اب بیزار سی نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن محل سے بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔ ساری تفصیل سننے کے بعد ڈیڈی سوچ میں ڈوب سے گئے۔

”شیزی تم کہتے ہو کہ میرے پیچھے ایسا کچھ نہیں ہوا جو ہمیں غائب بنانا ہو، الٹا ہمارے ساتھ ہی..... بے انصافی ہو رہی ہے۔“ ڈیڈی نہ جانے کیا کھوجنا چاہ رہے تھے۔

”پھر گیارہ گھنٹے قبل کیوں ایسا ہوا؟“ وہ پیشانی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑاتے تو می کے چہرے پر سایہ سا آ گیا۔ انہوں نے میاں کے کندھے کو ہلکا سا تھپتھپایا تو وہ کرسی کی پشت سے سر نکاتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ کمرے میں بوجھل پن پھیلتا جا رہا تھا۔

”کچھ گڑبڑ ہے می، سب کچھ نارمل نہیں ہے، آپ، نہ ڈیڈی اور نہ جودی۔“ شیزی ماں، باپ کے تاثرات کو جانچتے ہوئے بولا تو می کے چہرے نے ایک بار پھر رنگ بدلا۔

”ہاں شیزی۔ بہت کچھ غلط ہوا ہے ہمارے ساتھ، ہماری جودی کے ساتھ۔“ می جھکی، جھکی آواز میں بولیں۔ جودی کا نام سننے ہی شیزی کی حیات الٹ ہو گئیں۔

”کیا ہوا جودی کے ساتھ؟ خیر تو ہے می۔“ شیزی کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگے تھے۔

”از پورٹ روانگی سے قبل اس نے ہمیں بتایا تھا

رک گیا تھا۔ جہاں دونوں بھانجیوں کو شاہ زیب کمرے کی نئی ترتیب دکھا کر رائے جاننا چاہ رہا تھا۔ سارہ نے کیا جواب دیا اس نے نہیں سنا کیونکہ ملازم نے آکر اطلاع دی تھی کہ ٹیکم صاحبہ بلا رہی ہیں۔

”حیرت ہے می ابھی کیوں بلا رہی ہیں؟“

شاہنواز اُن کی عادت سے واقفیت کے باعث حیران تھا، کھلے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے.....

بے اختیار نگاہ جودی پر ڈالی جو اسے بدستور اپ سیٹ ہی لگی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنی۔ شاہ زیب تیز، تیز قدم اٹھاتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

”شیزی آپ کے دوست صفدر کا فون تھا مگر میرے ریسیو کرنے سے پہلے ہی کٹ گیا۔ میرے فون پر کیوں کال آئی تھی۔ آپ کا فون کہاں ہے؟“ وہ اپنا میل فون ہاتھ میں لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”صفدر کا فون؟ اس وقت!“ شیزی نے کلائی پر بندھی رسٹ واپس پر نگاہ ڈالی جہاں ساڑھے سات بج رہے تھے۔

”لیکن اس نے میرے نمبر پر کیوں ٹرائی کیا۔“ شاہ زیب کو ابھن سی تھی۔

”کیونکہ میرے فون سے اسے رسپانس نہیں مل رہا ہوگا۔“ بے اختیار اس کے ذہن میں رات کے تمام مناظر اپنے تمام تر محسوسات کے ساتھ زندہ ہونے لگے۔

”ہتا نہیں کتنے ٹکڑوں میں ہو چکا ہوگا میرا E62“ شاہنواز نے می، ڈیڈی کے بیڈ روم پر ناک کرتے ہوئے آخری بات سوچی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔

دونوں کمرے کی دیوار سے چڑے تھری سیٹر پر بیٹھے تھے۔ شاہنواز کو کمرے کے ماحول میں بے آرامی کا سا احساس ہوا۔ ڈیڈی نے اسے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آج بھی ڈیڈی کے سامنے خود بہ خود منڈوب سا ہو جاتا تھا۔ باوجود اتنی خود مختاری اور آزادی کے۔

ڈیڈی نے گفتگو کی ابتدا کاروباری مشکلات پر ہلکے پھلکے سوال جواب سے کی، شاہنواز کو سب عجیب ہی

کہ اس کی فریڈ کا برتھ ڈے ہے جس کا گفت وہ راستے سے گزرتے ہوئے دینا چاہ رہی ہے۔ کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس ہم نے اتر پورٹ کے لیے مقررہ وقت سے گھنٹا بھر قبل نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ ”مئی بہت دھبی آواز میں بول رہی تھیں۔ ”جودی گلابی رنگ کے چمکدار کانڈ میں لیٹا ڈالے کر گاڑی میں بیٹھی تھی جس کے اوپر بڑا ساربن کا بوبندھا ہوا تھا۔ ”شیزی کو یہ سب تفصیلات جز بزر کرنے لگیں۔ وہ کہنا چاہ رہا تھا۔ ”اصل بات پر آئیں مئی.....“ اور شاید مئی کو اصل بات پر آنا آسان نہیں لگ رہا تھا۔

”گاڑی کچھ سفر کے بعد ایک اونچی عمارت کے قریب رک گئی۔ جودی یہ کہہ کر تیزی سے نیچے اتری کہ میں بس ابھی آئی۔ پورے پانچ منٹ میں۔“ وہ ایک گیارہ منزلہ عمارت تھی اور جودی کی دوست چھٹی منزل پر تھی۔ ”دس منٹ سے کم میں یہ نیچے نہیں آئے گی تحفہ دے کر“ میں نے اسے بھاگتے ہوئے عمارت میں جانا دیکھ کر سوچا تھا۔ چھٹی منزل تک جانا اور واپس آنا، چاہے لفٹ سے بھی جودی کرے دس منٹ سے قبل واپس نہیں ہوگی۔ میرا اندازہ دس منٹ کا تھا جب پندرہ منٹ گزر گئے تو رشنا فکر مند ہوئی باہر نکلے تاکہ گراؤنڈ فلور پر لگے انٹرکام سے اس کی فریڈ کے گھر رابطہ کیا جائے۔ حیرت تھی جودی اپنا سیل بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ رشنا ابھی عمارت میں داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک آدمی اس سے ٹکراتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا اور سامنے لفٹ کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے جودی کھڑی تھی۔ خوفزدہ اور کپکپاتی ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ ریسیشن ڈیسک خالی تھا۔ دن کے اس حصے میں لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ”مئی نے پھر خواہ مخواہ کی تفصیل بتائی۔ خمیری کا دل جیسے آنے والے لفظوں کا اندازہ کرنے کی کوشش میں تیز، تیز دھڑکنے لگا۔

”مئی وہ آدمی؟ مئی وہ آدمی؟“ بس وہ یہ کہتی روتی جا رہی تھی۔ رشنا اسے وہیں سنبالنا چاہ رہی تھی۔ گاڑی میں لانے کا مطلب تھا کہ سب ہی شک

میں آجائیں۔ وہ سب کچھ جو اس خبیث آدمی نے میری بچی کے ساتھ دوسری منزل سے لفٹ میں سوار ہونے سے لے کر گراؤنڈ فلور تک کرنا چاہا وہ.....“

”اسٹاپ مئی، آگے نہیں سناؤں۔“ شاہنواز سن ہوتے ہیروں سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ڈیڈی نے کرسی کی پشت سے ٹکائے سر کو سیدھا کیا۔ ان کے ماتھے کی ایک رگ خاصی ابھری ہوئی لگ رہی تھی۔

”بس ایک جواب مجھے اس سوال کا دے دیجیے جو میں اپنے منہ سے پوچھنا نہیں چاہتا۔“ شاہنواز نے اب کہ رخ بھی پھیر لیا تھا۔ کمرے میں لگی اس پینٹنگ کی طرف نظریں جمائے تھا جس میں جلنے والاؤ کے درمیان گل و گلزار پینٹ کیا گیا تھا۔ نہ الاؤ واضح تھا اور نہ غصہ، تجریدی آرٹ کے اس نمونے میں یہ خاصیت تھی کہ کوئی آنکھ صرف تپش کا نظارہ کرتی تو دوسری نظر پھولوں کا مشاہدہ۔ بندے کی جیسی فکر ویسے ہی اس کے محسوسات..... اس وقت شاہنواز کو پوری تصویر میں آگ کے لپکتے شعلے ہی نظر آرہے تھے۔ بے اختیار وہ مئی کی طرف مڑ گیا جب انہوں نے یہ کہا۔

”اللہ نے خیر کر لی۔ رشنا جس وقت اندر داخل ہوئی تھی اسی وقت لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تھی۔ خود کار دروازہ کھلا تو رشنا کی جمل کی آواز سے وہ چوکتا ہو کر جودی کو چھوڑ کر فوراً باہر بھاگ گیا۔ ورنہ اس نے بارہویں منزل چھت کا بٹن دبا ہی دیا تھا۔ خوش قسمتی تھی کہ وہ جانتا نہیں تھا کہ نمبر بے شک بارہ تک ہیں لیکن لفٹ گیارہ سے اوپر نہیں جانی۔ اس لیے وہ حرکت میں نہ آئی اور اللہ نے جودی کو بچالیا۔ شکر ہے وہ کامیاب نہ ہو سکا مگر اس کی مذموم ارادوں کی طرف پیش قدمی نہ جودی کو بلا چکی ہے۔“ مئی کی آواز دکھ سے بوجھل تھی اور شاہنواز کم صم.....

”آج ہی کسی سائیکل ٹرسٹ سے اپنا کنٹ لہو۔ میں پہلی فرصت میں اسے دکھانا چاہتی ہوں تاکہ اس کے اثرات ختم کیے جاسکیں۔“ مئی کی بات پر شاہنواز

نظروں سے ادھر ادھر کھوجا کر آخر سیل گیا کہاں؟ فرش پر رکھے فلور کشنز کو پیر سے ہلاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ٹھک کی آواز سے اس نے آواز کے رخ پر دیکھا تو فلور کشنز کے درمیان موجود سیل فرش پر آ گیا۔ حیران کن طور پر وہ دو کشنز کے درمیان انک گیا تھا۔ بالکل صحیح و سالم اور ڈبے میں رکھی پیننگ کی طرح فکس شاہنواز نے غیر یقینی نظروں سے اسے آگے پیچھے سے چیک کرتے ہوئے دیکھا۔ صفدر کی کتنی ہی مسڈ کالز نظر آرہی تھیں۔ اس نے بدولی سے صفدر کا نمبر ملایا۔

”ہیلو بوائے کدھر ہو۔“ فوراً ہی صفدر کی ہشاش بشاش آواز ابھری۔ ”میرے پاس آئے تو... میں نے سوچا تمہارے کام کی بات بھی کر لی جائے۔ صبح ان کے جانے سے پہلے آخری ٹرائی کے طور پر تمہارے بھائی کے نمبر پر بھی کال کی مگر کچھ نہیں بنا۔“ صفدر کی بات وہ بہ خوبی سمجھ رہا تھا مگر وہ جس ڈپٹی ایجنٹ میں تھا اس میں صفدر کی بات قطعاً متوجہ کن نہیں تھی۔ صفدر نے بھی اس کی بے توجہی نوٹ کر لی تھی اور جلد ہی مزید بات کیے، رسی سے فقرے ادا کر کے فون کال منقطع کردی۔ فون سے فارغ ہو کر اس نے اپنی سائڈ ٹیبل کی دراز کو کھنگالنا شروع کیا۔ کسی چیز کی تلاش میں وہ فائل میں لگے کاغذات کو تیزی سے دیکھ رہا تھا۔

ایک پیپر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے کلپ دبا کر مطلوبہ کاغذ احتیاط سے کاغذات کے درمیان سے نکالا اور فائل میں واپس رکھ دی، یہ پچھلے سال کی جودی ہی کی بھیجی ہوئی ای میل کا برٹ تھا۔ ای میل میں جگہ جگہ خوب صورت رنگ برنگی تتلیاں نمایاں تھیں۔ شاہنواز کے ہونٹوں کو مدہم سی مسکراہٹ نے چھوا اور وہ خط کا متن پڑھنے لگا۔

”ڈیر شیرزی آج بہت عرصے بعد سارہ اور میں نے ممی، ڈیڈی کے ساتھ بھرپور وقت گزارا۔..... میں نے آن لائن آپ کا انتظار بھی کیا تا کہ آپ سے ان خوشگوار لمحوں کی باتیں شیر کر سکوں مگر لگتا ہے آپ

نے گردن ہلا دی۔ الفاظ تو سارے جیسے اس کے پاس سے کہیں گم ہو گئے تھے۔

”اس آدمی سے بچنے کی کوشش میں اس کا ایک اہم رنگ بھی کہیں گر گیا تھا۔ رشنا نے گاڑی میں آ کر صبح کو یہ ہی بتایا کہ جودی اپنا ایر رنگ تلاش کر رہی تھی اور اس کے کھونے پر وہ بہت افسردہ ہے چونکہ جودی اپنی پسندیدہ چیزوں کے لیے بہت حساس ہے سو سارہ تو مطمئن ہو گئی۔ وہ جودی کے برخلاف کسی بھی چیز کے لیے کڑھنے والی نہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے رشنا کی بات سن کر فوراً ہی مجھے دیکھا تھا۔ ان کو اس بات پر بالکل بھی یقین نہیں آیا تھا جس کا اظہار ان کی نگاہوں سے ظاہر تھا۔ پھر رشنا کا بار، بار جودی کو فکر مندی سے دیکھنا مجھے ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔“ جودی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ میں سارے راستے خدشات ہی میں تھی۔ ”شکر ہے کمال (داماد) ساتھ نہیں تھا۔“ میں نے نہ جانے کس سوچ کے تحت کمال کے نہ ہونے پر شکر کیا تھا۔ ”رشنا نے ازپورٹ پہنچ کر ڈیڈی اور سارہ کو سامان میں لگا کر موقع ملے ہی مجھے مختصر یہ بات بتائی۔ میرے بڑے اندازوں کی درستی کے وہ لمحات بہت سخت تھے۔ رشنا اس بات کے حق میں تھی کہ جودی کو میرے ساتھ ہی پاکستان جانا چاہیے۔ کیونکہ نوکری کی بنا پر وہ اس کے جذباتی دھچکے کو کم نہیں کر سکے گی۔ اور پھر جودی بھی میرے ساتھ ہی آنے پر راضی تھی۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو بھی جہاز میں بتایا تھا۔“

”ہم سارہ کو زندگی کی اس تلخ حقیقت سے فی الحال لاعلم رکھنا چاہتے ہیں۔“ ڈیڈی نے طویل خاموشی کے بعد کہا تو دونوں نے اوکے کہنے پر اکتفا کیا اور وہ بوجھل قدموں سے باہر آ گیا۔

”اب سے دس کھنٹے قبل جس وقت جودی وہ سب کچھ فیس کر رہی تھی تو میں صفدر کو فون کر رہا تھا۔“ شاہنواز نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر خیالات کے ہاؤ میں سیل کے ٹکڑوں کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی بھی حصہ کہیں پڑا نظر نہیں آیا۔ اس نے حیران

کہیں اور مصروف تھے۔ خیر دریا کنارے ہماری کپکپاتی خوب صورت تھی کہ بس..... مٹی نے آج بوسناڑ کا وہی میٹکس پہنا تھا جو آپ نے پچھلی بار ناٹو سے ان کے لیے بھجوا دیا تھا۔ ڈیڈی کی آنکھیں آج ہنستی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ورنہ عموماً وہ بہت تھکے ہوئے لگتے ہیں۔ سارہ جعفر باکس نے بہت ہی مزے کا اپیل پائے بنایا تھا جو اس نے اپنی فرینڈ کی مٹی سے سیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی بیکر بنے گی مجھے یقین..... پتا نہیں سورج واقعی زیادہ چمک اٹھا تھا یا مجھے لگ رہا تھا۔ لہر لہر کوڑی، کوڑی فیل ہو رہا تھا۔“ شاہنواز نے جب پہلی بار یہ میل پڑھی تھی تو وہ بھرپور مسکرایا تھا۔

”سلی جودی!“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے آگے پڑھا تھا۔

”میرا خیال ہے شیزی آپ نے کچھ وقت ناٹا، ڈیڈی اور ناٹو ہی کے ساتھ بڑا کوائی والا گزارا ہے۔ جب ہی اس کے اثرات ہم دونوں بہنوں کے پاس آئے ہیں۔“ اس کے بعد جودی نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بنایا تھا۔ ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ کل ہی میں نے butterfly effect کو خاصی تفصیل سے پڑھا تھا جسے ”chaos theory“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے آج کی کپکپ کے بعد مجھے یہ ہی لگا جیسے جو آپ نے کیا ہوا اس کے اثرات مجھ تک آ گئے۔“ ایک اور مسکراتا چہرہ جودی نے بنایا تھا۔ شاہنواز اس کی یہ منطق پڑھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ تین چار دن قبل ہی اس نے دوستوں کے ساتھ بنایا پروگرام چھوڑ کر می کے کہنے پر سنڈے ان کے ساتھ گزارا تھا۔

میل پڑھ کر شاہنواز نے میل کے آخر میں دیا ہائرلنک کلک کر دیا تھا۔ ایک نیا ویب پیج کھل چکا تھا۔

”butterfly effect or chaos theory“ بڑے، بڑے حروف میں لکھا تھا۔ شاہنواز نے میڈیا پلیئر سے ابھرنے والی دھیمی موسیقی کو pause کا بٹن دبا کر خاموش کر دیا تھا۔ وہ بخور یہ سطریں پڑھ رہا تھا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ.....

”ایک چھوٹا اور غیر ضروری عمل وجہ بن سکتا ہے بڑی تباہی کا یا پھر کسی بڑی تباہی سے بچاؤ کا..... آگے کچھ اور پڑھنے کے بعد وہ اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔“ آپ زندگی میں صرف اپنے ہی انجام کے اعمال کے نتائج کے ذمے دار نہیں بلکہ اس کے اثرات اچھے یا برے (آپ سے متعلقہ کسی بھی دوسرے شخص پر پڑ سکتے ہیں) دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پودا دادا لگاتا ہے اور پھل پوتا کھاتا ہے یا براداد کرنا ہے اور بھگتنا کسی لٹوں کو پڑ جاتا ہے۔

”لو جی ہر چیز کے ہم ہی تصور وار.....!“ اس نے جودی کو رپلائی میں بس یہ ایک جملہ لکھ کر ڈھیر سارے مسکراتے چہرے بنا کر سینڈ کا بٹن دبا دیا تھا۔ جیسے ہی میل روانہ ہوئی اچانک کسی خیال کے تحت اس نے جودی کی سیل کے ساتھ تھیوری کی وہ سطریں جنہیں اس نے بھرپور توجہ سے پڑھا تھا pastel کر کے پرنٹ کے آپشن پر کلک کر دیا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو اس وقت شیزی کے ہاتھ میں تھا۔ اندر کہیں لاشعور میں جودی کی سیل کا وہ جملہ جس میں اس نے شیزی اور اپنی ملنے والی خوشیوں کو مربوط کیا تھا۔ پوری طرح زندہ تھا اور اب جودی کے ساتھ بیٹے حادثے سے وہ یک دم ابھر گیا تھا۔ پورے کے پورے سال بھر بعد۔

”تو کیا میری جننش کا اثر میری بھانجی پر پڑا۔“ یہ خیال خاصی چھین لیے تھے اس لیے ہی وہ اس پر یقین بھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، لاکھوں میل دور جودی اور میرے صفدر کو فون کرنے میں کوئی تعلق ہو؟“ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔

”جو بھی ہے ہوا یہی ہے کہ جب میں صفدر کو فون کر رہا تھا تو تقریباً اسی وقت جودی نے یہ سب فیس کیا ہے۔“ وقت کی یکسانیت اسے ششدر بھی کر رہی تھی۔

”تھیوری تو بس تھیوری ہوتی ہے۔“ سوچوں میں گم شاہنواز نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو رول کر کے دوسرے ہاتھ پر ہولے، ہولے مارنا شروع کر دیا۔

دھیان آنا شروع ہوا۔

”جودی کے لیے اس سے بہتر آپشن کیا ہوگا۔“ وہ مطمئن ہو گیا۔ بچ کے اہتمام میں ڈریسنگ کرتے ہوئے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر کسی نغمے کے بول چل اٹھے۔

every thing is gonna se alright

جب تک تو ہے میرے ساتھ

its gonna be alright

اردو انگریزی کے اس ملغوبے سے کمرے

میں تادیدہ دائرے بن رہے تھے جو تیرتے ہوئے باہر لان میں پھولوں کی چمکتی ڈال پر پہنچے تو نازکی سی تیلی نے ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا، پھولوں کا رس چوسنا چھوڑ چھاڑ وہ پر ہلائی دور افق میں گم ہو گئی۔

کچھ ہی دیر میں شاہنواز بھی تیز، تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار پورج تک آچکا تھا۔ گیت سے گاڑی نکالتے ہی اس نے میوزک آن کر دیا۔ ایک بار پھر وہی بول ابھر آئے۔ ”جب تک تو ہے میرے ساتھ its gonna be alright“ نہ جانے وہ یہ کیوں نظر انداز کر چکا تھا کہ ایک عمل کے...

دُعا سے آزاد ہونے نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا تو آنے والی ہرجمنش نے اگر اسے قید کرنا شروع کر دیا تو وہ کیا کرے گا۔ کون سا راستہ ہر پہلو سے آل رائٹ ہے۔ شاہنواز یہ جانتا تھا کہ دور ماضی میں اس کے پردادا کے دعاؤں کے لیے اٹھے دو بوڑھے ہاتھوں میں آنسو رو گرتے، دل سے نکلنے والی دعائیں ہاتھ کی ککیروں پر پھیلتی چلی جاتیں۔ اپنی اور تاقیامت آنے والی نسلوں کے لیے عافیت کی دعائیں، شر سے محفوظ رہنے کی اٹھوائی خسارہ نہ ملنے کی طلب سجدے میں رب سے قریب کرتیں تو اثرات وقت کی گردش کے باوجود رواں دواں رہے۔ وہ تمنائیں جو شاہنواز نے کبھی کی بھی نہ ہوں، ان کے فیض سے بھی وہ محروم نہ رہا کیونکہ دعائیں اس کے ساتھ متحرک تھیں۔ butterfly effect یہاں بھی کام کر رہا تھا چاہے کسی کے علم میں ہو یا نہیں۔

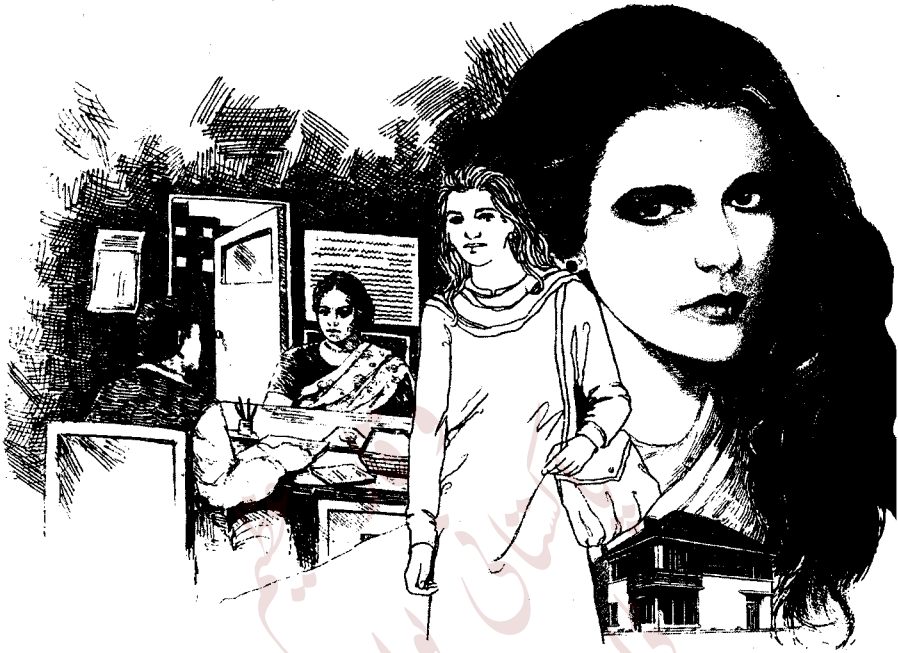
انجینی میں پہنچنے کا وقت بھی گزر چکا تھا مگر وہ خیالات کے تانے بانے ہی بننا رہا۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ شاہنواز نے کام کے وقت کسلمندی محسوس کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو سارے خیالات، فلسفہ، افکار صرف اس وقت تک بلند اور فکر انگیز لگتے ہیں جب تک وہ اپنے آپ کو ان کے درمیان کستا ہوا محسوس نہیں کرتا، جہاں اسے اپنا آپ پھنستا ہوا محسوس ہوتا ہے، وہ انہیں محض ایک خیال، ایک وبال قرار دے کر ٹھٹھا جاتا ہے۔ شاہنواز کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ وہ اپنا دفاع کر رہا تھا۔

”تھوڑی کے لحاظ سے تو وہ وجود قصور وار ہے جس نے یہ ساری سنسنی خیزی پھیلائی۔“ ذہن کے پردے پر عبا پر بنے سوالیہ نشان لہرانے لگے۔ وہ دل و دماغ کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔

”میں نے اس سے پہلے کب اس اتہان تک سوچا تھا۔“ اس نے اپنا سر بیڈ کے کراؤن سے ٹکادیا۔ جودی کے واقعے نے اسے بے حد اپ سیٹ کر دیا تھا۔ شاید جودی سے بھی زیادہ کیونکہ وہ بالواسطہ اپنے آپ کو اس میں جڑا محسوس کر رہا تھا۔

”تمہاری ناکامی نے ہی جودی کو کسی ایسے سے محفوظ رکھا۔“ اندر سے ایک سرگوشی ابھری تو شاہنواز نے بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے برسوں سے جمع شدہ اپنے آپ سے شکوہ چھٹا محسوس کیا۔ ایسے جیسے بند کمرے میں تازہ ہوا کا روزن نمودار ہو جائے۔

”شکر ہے جودی محفوظ رہی۔“ بے آواز شکر کرتے ہوئے اس نے اپنے... آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ موبائل میں لگا الارم منگنا رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ آج سوہا کے ساتھ بچے طے تھا جبکہ وہ ابھی انجینی بھی نہیں پہنچا تھا۔ الارم دو بجے کے بچ کے لیے الارٹ کرنے کے لیے تھا۔ سوہا کے ساتھ کا سوچے ہی شاہنواز کو یاد آیا کہ سوہا کی مٹی شہر کی مانی ہوئی سائیکلائسٹ ہیں۔ ”چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا“ اپنا آپ آزاد محسوس ہوتے ہی اسے دوسرے ضروری کاموں کا



عورت کتنا شگفتہ شاہ

استانیوں کی پریشانی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا۔
”در اصل آباخیر النساء اس شہر کی ایک سینئر ہیڈ ہیں،
وہ بہت سارے اسکولوں کو بہت کامیابی سے چلا چکی
ہیں۔ وہ انتظامی لحاظ سے تو بہت کامیاب خاتون ہیں مگر
مزاجاً اور ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہیں، نہ خود
بھی دیر سے آتی ہیں نہ ہی دوسروں کو دیر سے آنے دیتی
ہیں، پڑھائی کے معاملے میں بھی کڑی نگرانی کرتی ہیں،
شارٹ لیو اور چھٹی دینے کے معاملے میں بھی بہت

جیسے ہی ایک منچر نے اسٹاف روم میں آ کر یہ
اطلاع کیا کہ ہماری ہیڈ مسٹر بیس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور ان
کی جگہ آپا خیر النساء ہیڈ مسٹر بیس بن کر ہمارے اسکول
آ رہی ہیں تو سب کے منہ سے عجیب نکل گئیں اور اسٹاف
روم میں جیسے ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ میں اس وقت
سرکاری نوکری میں بالکل نئی بھرتی ہوئی تھی اس لیے نہ تو
اسکولوں کی ہیڈز اور نہ ہی اس سرکاری اسکول کی منچرز
کے بارے میں پتا تھا، اس لیے ایک سینئر منچر سے ان تمام

با اصول ہیں اس لیے یہاں پر پہلے سے چلنے والے آرام دہ اور سست ماحول کا کیا ہوگا؟“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری کہ میں تو ایک اعلیٰ اسٹینڈرڈ کے پرائیویٹ اسکول سے آئی تھی جہاں ڈسپلن کی پابندی تھی مگر یہاں تو سرکاری اسکول کی استانیوں کے ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ کوئی صبح آدھا گھنٹا لیٹ آرہی ہے تو کوئی گھنٹا لیٹ آرہی ہے۔ پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں..... اسٹاف روم میں کھانا پینا، تنگ کرنا اور کڑھائی وغیرہ کرنا عام بات تھی اور پھر کئی اور بے اصولیاں..... اگر کوئی آکر ماحول کو درست کر دے تو یہ تو اچھی بات ہوگی مگر اصل مسئلہ تو بیویوں اور ماؤں کا تھا جن کے ساتھ گھر کے مسائل تھے۔ صبح وہ شوہر اور بچوں کے لیے ناشتا تیار کریں۔ پھر اگر بچوں کو اسکول تک چھوڑنے کے لیے کوئی گھر میں نہ ہو (یا ذمہ ہی نہ لے) تو وہ خود جا کر ان کو اسکول پہنچاتیں یا پھر دوپہر کے لیے پہلے سے بنزی وغیرہ..... کاٹ کر رکھتیں اور آنا بھی گوندھ کر ریفریجریٹر میں رکھتیں..... تو پھر لیٹ تو ہو جانا ہی تھا سو اب اگر سخت مزاج اور اصولوں کی پابند نہ بنیں اس لیے گی تو یہ سب تو نہیں چلے گا جو کئی سالوں سے ان کا معمول تھا۔

خیر..... نئی ہیڈ مسٹرلیس تو آکر رہیں..... کچھ دن تو خیر سے گزر گئے مگر پھر وہی ہوا..... جس بات کا خدشہ تھا۔ انہوں نے اسٹاف میں ایک میٹنگ کی جس میں ڈسپلن اور وقت کی پابندی کو لازمی بنایا اور صبح دیر سے آنے، چھٹی سے پہلے گھر جانے، چھٹی کرنے، شارٹ لیو لینے وغیرہ کے اصول بتائے اور سب کو ان کی پابندی کا آرڈر دیا۔

خیر..... جناب..... ہماری تو خیر تھی کہ ہم تو ویسے ہی ان تمام اصولوں کے پہلے ہی پابند تھے مگر مسئلہ کچھ استانیوں کا تو تھا..... ہم جیسی غیر شادی شدہ لڑکیوں کا نہیں..... پھر آخر ایک دن ایک نیچر صبح اسٹاف روم میں آتے ہی چیختے ہوئے کہنے لگی۔

”آہ خود تو بیوہ ہیں اور کوئی اولاد بھی نہیں..... گھر میں بھی اکیلی رہتی ہیں اور سرسراں وغیرہ کی کوئی ذمہ

داری بھی نہیں ہے ان پر اسی لیے تو ان کو ہمارے مسائل کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم کس طرح سے ان کو فیس کرتی ہیں۔ شوہر صاحب کو تیار کر کے آفس بھیجیں اور بچوں کو اسکول..... تو ان کاموں میں آنے میں لیٹ تو ہو ہی جاتے ہیں..... پھر آیا کی روز کی صبح، صبح سیں۔ ارے ہم بھی مجبوری میں جاب کرتی ہیں کہ خرچہ پورا نہیں ہوتا مگر کاورنہ ہم بھی آرام سے گھر میں نہ بیٹھ جائیں۔“

اب ایسے ڈائلاگ روز کا معمول بنتے گئے۔ بیویوں اور ماؤں کے یہ ہی بڑے مسائل تھے۔ سو کچھ ماہاتو یوں ہی بیت گئے۔ شکایتیں بھی ہوتی رہیں اور ڈانٹ بھی پڑتی رہی۔ ایک مرتبہ تو میری بھی شامت آئی گئی۔ اسبلی ختم ہوتے ہی میں اسکول پہنچی تھی مگر آیا کا حکم تھا کہ اسبلی سے پہلے پہنچا جائے۔ روز تو ٹائم پر ہی آئی تھی آج ہی اتنی سی دیر ہوئی تھی سو ڈرتے، ڈرتے آفس کے اندر گئی اور جھٹ سے سلام بھڑا اہی تھا کہ وہ بول انھیں۔

”کم از کم آپ جیسی نیچر کو تو دیر سے نہیں آنا چاہیے کہ آپ لوگوں کے پاس شوہر اور بچوں کی ذمہ داری کا بھانا بھی نہیں ہے۔“

”آہ، گھر میں ایک ہی گاڑی ہے، ڈرائیور پہلے بھتیجیوں کو اسکول چھوڑ کر آتا ہے پھر مجھے، آج اشفاق سے تھوڑی دیر ہو گئی اور نہ روز تو میں ٹائم پر آتی ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں سائن کر کے آفس سے نکل آئی مگر مجھے دکھ ہوا کہ ہم جیسی ذمہ دار اور سختی نیچر کو اگر کوئی اعزاز نہیں دیا جاتا تو نہ یہی مگر ایسی کبھی کبھار کی کوتاہیوں کو تو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

پندرہ بیس دن کے بعد پھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ گاڑی ٹریفک جام میں پھنس گئی اور اسکول تھوڑا لیٹ پہنچی..... تو پھر یہی منہ پڑا۔

”آخر آپ کے کیا مسائل ہو سکتے ہیں، آپ تو شادی شدہ بھی نہیں ہیں، آپ کیوں لیٹ ہو جاتی ہیں؟“ ابھی میں جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ ایک اور شامت کی ماری غیر شادی شدہ نیچر بھی پہنچ گئی پھر تو دونوں کو وہ لیکچر ملا جو کہ ہم خاموشی سے گردن جھکا کر آفس سے باہر نکل آئیں۔

بھر..... ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی..... وہ آپا....
خیرالنسا جو اپنی ساری سروس میں شاد و نادر ہی ڈیوٹی پر دیر
سے پہنچی ہوں گی اور اب تو وہ ریٹائرمنٹ کے بھی قریب
تھیں کہ وہ اب اچانک سے ہر روز لیٹ اسکول آنے لگی
تھیں۔ جس کا سبب بھی پتا چل گیا کہ انہوں نے اپنی
جینتی کی نو مولود پتی کو ایڈاپٹ کیا تھا (گود لیا تھا) تب
اس بچی کی ذمہ داری لینے کے بعد انہیں ان مجبور یوں کا
احساس ہو گیا تھا جو مائیں اتنی دفعہ بتا کر بھی انہیں قائل
نہیں کر سکتی تھیں۔

ماں اب جب وہ مائیں دیر سے آتیں تو وہ انہیں
کچھ نہیں کہتیں اور اب تو انہیں بھی پہلے کی طرح شارٹ
لیوٹے لگنے لگی اور دوسری رعایتیں بھی اس لیے اب ان کو بھی
آپا خیرالنسا سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی کیونکہ ماں بننے
کے بعد آپا یکسر بدل کر رہ گئی تھیں گو کہ انہوں نے خود تو
اس بچی کو جنم نہیں دیا تھا، ان کے لہجے کی کڑواہٹ بھی
غائب ہو گئی تھی اور وہ بے حد شفیق اور مہربان ہوتی جا رہی
تھیں۔ اب وہ فون پر آیا کو بچی کے لیے ہدایت دیتی نظر
آتیں اور انٹر وہ ڈیوٹی کے دوران گھر کا پتھر بھی لگا کر
آ جاتیں۔ بچی اگر بیمار ہوتی تو آپا کا سکھ چین چمن جاتا
تھا۔ مطلب کہ اب ان کو ایسی ماؤں کے مسائل سمجھ
میں آ گئے تھے جو درکنگ و دین بھی ہوتی ہیں۔ وہ خاتون
جو اپنے سخت اصولوں اور ڈسپلن کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی
ایک جتنی سی بچی نے اس ڈسپلن کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی
تھیں۔ ماما عورت کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

اب ساری ٹیچر زان سے بہت خوش تھیں کہ ان کا
رویہ اب سب کے لیے شفقت بھر اور برابری والا تھا۔

اچانک ایک خبر پھر کسی دھماکے کی طرح اسٹاف
روم میں پہنچی تھی کہ ان کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ وہ چلی
گئیں..... ان کی شفقت اور مہربانی والا رویہ بھی چلا گیا۔
نئی ہیڈ مسٹر ایس آگئی۔ اب نئے جھگڑے اور مسائل
شروع ہو گئے۔ ”ماؤں“ نے پھر چننا چلا شروع کر دیا تھا
کیونکہ نئی ہیڈ مسٹر ایس بھی بے اولاد تھیں۔

”یہ غیر شادی شدہ ہونا بھی عجیب مصیبت ہے،
اسکول کی ہر اہم ذمہ داری ہمیں ہی ملتی ہے کہ نوجوان
اور غیر شادی شدہ ہیں اس لیے ہم پر گھر کی ذمہ داریاں
نہیں ہیں حالانکہ ہم بھی گھر جا کر گھر کا کام بھی کرتی ہیں۔
ہمارے اد پر بھی گھر کی ذمہ داریاں ہیں۔“ میں نے
اُس سے ٹکٹے، ٹکٹے، اپنی ساتھی ٹیچر سے کہا۔
”اور کیا..... ہم بھی تو جوائنٹ فمیلی میں رہتی ہیں۔
کبھی گاڑی کسی اور کے استعمال میں تو کبھی رکشا ملنے
میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے ناں.....“ وہ بھی دل کے
پھولے پھوڑنے لگی۔

خیر جناب..... ہمارے چھوٹے موٹے مسائل تو
تھے ہی مگر شادی شدہ اؤں کی حالت دیکھ کر تو اکثر بہت رحم
آتا تھا۔ چھوٹے، چھوٹے بچوں کے ساتھ رت چگا
کرتیں، صبح اسکول جانے والے بچوں کو اٹھاتیں، ان کو
ناشہ دے کر اسکول روانہ کرتیں..... کبھی بیمار بچے کو پیچھے
چھوڑ آتیں تو ڈیوٹی پر بھی دھیان دہیں لگا رہتا.....
پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی امتحانوں
کے دنوں میں جلد چمٹی ہو جاتی تو باوا تو بے فکر رہتے مگر وہ
خود جاتیں اور انہیں لے کر اسکول ہی آ جاتیں اور ڈیوٹی
نام ختم ہونے تک ان کو مختلف طریقوں سے بہلاتیں۔
گھر پر خود ان کو امتحان کی تیاری کراتیں..... گھر واپس جا
کر بچ کی تیاری کرتیں..... پھر کسی کے ساتھ جھگڑا لوشکی
مزان شوہر کا مسئلہ تو کسی کے ساتھ ساکس، ہینڈوں کا جھگڑا
کبھی، کبھی تو صبح کے کاموں میں انہیں تنگی کرنے اور
لب اسٹک لگانے کا بھی نام نہیں ملتا تھا تو یہ کام بھی
اسکول پہنچ کر کیا جاتا..... درکنگ و دین کا یہ حشر دیکھ کر رحم
آتا مگر یہ بھی ان کا کارنامہ ہے کہ ہزار پڑیانیوں کے
بعد بھی وہ اپنے آپ کو ٹاپ نام رکھتی ہے، کپڑوں اور
میک اپ کی میچنگ سے خود کو اپ ٹو ڈیٹ رکھتی ہے فیشن
کے مطابق اکثر ٹیچر ایسٹاف روم میں ایک دوسرے
سے اپنے دکھ درد شیئر کرتیں تو کچھ گھر کے مسائل گھر پر
چھوڑ کر وہاں کہیں لگاتیں، قہقہے لگاتیں اور یوں تھوڑی
دیر کے لیے سب بھول بھال کر اچھا وقت گزارتیں۔



ہم کو عبث زندگی کیا

سیار ساردا

آخری حصہ

ایک نئی زندگی ملی ہے اور یہ بڑی خوب صورت زندگی ہے..... اب آپ کو بس آگے دیکھنا ہے پیچھے مڑ کر ہرگز نہیں دیکھنا۔ ہماری محنت ان سی ڈیز میں ہے..... جس میں پل، پل آپ کو لاشعور سے شعور میں ڈھالا ہے..... آپ کو ایک نئی زندگی ملی ہے شمع! زندگی ہے تو اللہ تعالیٰ کی امانت..... مگر جس نے آپ کو بچانے کے لیے اپنا وقت، نیند، سکون، خوشی آپ کے لیے وقف کر دیا ہو..... تو اس نا خدا کی بھی قدر کرنی چاہیے..... شاید میرے اس قدر کہنے سے بھی آپ کو اندازہ نہ ہو مگر یہ سی ڈیز آپ کو حیران کر دیں گی..... وہ اپنی چمکی آنکھیں حیرت کے ساتھ جھپکاتی ہوئی ان سی ڈیز کو دیکھنے لگی۔ اب ڈاکٹر راجیل نے تایاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اعزاز کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اس کے بھائی کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ اگر یہاں ہوتا تو قسیرہ بی بی کو ہر بات کا پہلو سمجھ میں آ جاتا۔“

”ڈاکٹر اعزاز.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔
 ”اوہ..... نو.....؟“ وہ مسکرا دیے۔ ”وہ ڈاکٹر نہیں ہیں، تمہارے میچا ہیں..... وہ بہت جلد تم سے ملیں گے۔“ ڈاکٹر راجیل بولے۔

”ارے بیٹا..... وہ بہت پیارا آدمی ہے۔ اس نے

پتھنی لہجہ ہے آہستہ غزل پڑھتا
 پتھنی کی کہانی ہے پھولوں کی زبانی ہے
 صبح کا پُر کیف منظر اس کے سامنے تھا.....
 اس کا مخصوص کمر..... کمرے سے باہر خوشنما پودے،
 بادل کے ساتھ جموٹی ہوا..... دھواں، دھواں سا موسم
 صبح نے اس سے مکالمہ کرتے ہوئے کہا.....
 اٹھو..... دیکھو

باہر کیا خوب صورت نظارہ ہے۔“
 اس کے شکر فی لبوں پہ مسکراہٹ ابھری۔
 ”ٹھہرو..... پہلے اپنے رب کا شکر ادا کرنے دو.....
 مجھے ایک اور نئی زندگی عطا کرنے پر.....“ وہ مسکراتے ہوئے آگئی۔

وضو کے پانی سے خود کو اللہ کے حضور عاجز ہوتے دیکھا..... اور نماز میں سپردگی کے احساس نے اسے سکون عطا کیا..... سلام پھیر کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اس کی نظر ساتھ رکھے ایک شاہر پر پڑی اور کچھ دن پہلے کا منظر اس کے سامنے آ گیا۔

ڈاکٹر راجیل کے روم میں وہ تایاجی کے ساتھ بیٹھی تھی..... ڈاکٹر راجیل بتا رہے تھے۔
 ”آپ کو بہت مبارک ہو شمع! شمع..... آپ کو

کیم مٹی..... پہلی سی ڈی اس نے اٹھائی..... نور
سے نکالی، تاریخ دیکھی اور سی ڈی پلیئر میں ڈال دی۔
سامنے اندھیری اسکرین پر روشنی ابھر آئی اور دھڑکتے
دل کے ساتھ ایک منظر سامنے تھا۔

☆.....☆.....☆.....

ہر نیا دن..... نیا سورج ایک نئی داستان کے ساتھ
طلوع ہوتا ہے، اعزاز شاہ، قشمرہ کو ایک نئی زندگی دینے پر
بہت خوش تھے۔ اس سے روبرو ملنا چاہتے تھے مگر انہیں کیا
خبر تھی کہ وہ کس صورت حال میں پھنس جائیں گے۔
اعزاز شاہ حیران پریشان سے فیضان کے بیڈ کے
قریب کھڑے اس کی کیفیت نوٹ کر رہے تھے..... جو
روزی، روزی کی تکرار کر رہا تھا..... روزی اس کی زندگی
میں کب آگئی.....؟

”فیضان..... فیضان کیا ہوا.....؟“ اعزاز نے
اسے زور سے پکارا..... ان کے بازو بار کہنے پر فیضان نے
بہ مشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی..... پھر غنودگی میں
چلا گیا۔

تمہارے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ تم اس سے ملو گی
تو جان جاؤ گی کہ وہ کتنا ہیرا خنص ہے..... باادب.....
بانیب بچہ ہے.....“
”اور مس قشمرہ، اعزاز جاتے ہوئے یہ ”بکے“
آپ کے لیے دے گئے تھے۔“

اس نے گلاب کے پھولوں کا اتنا فریش بکے کبھی نہ
دیکھا تھا۔ حیرت سے فوراً اٹھام لیا۔
”بے فکر رہیے۔ یہ کبھی نہیں مرجھائیں گے۔“ وہ
مسکراتے ہوئے بولے..... ”یہی ان پھولوں کا حسن
ہے۔ اور اب آپ بالکل پیچھے مڑ کر نہ دیکھیے گا۔ میں بھی
کہہ رہا ہوں..... اور اعزاز نے بھی کہا ہے کہ قشمرہ سے
کہنا ہماری محنت پہ پانی نہ پھیرے..... اوکے.....
گڈ لک..... اللہ حافظ!“

اب بیڈ کی سائڈ دراز کے اوپر سبز ڈائری اور تازہ
گلاب بند کھے ہوئے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا بھی نہیں
چاہتی تھی مگر شوق و تجسس تھا کہ وہ سی ڈی کو دیکھے..... ان
میں ہے کیا آخر۔



”معاہدہ کچھ سنگین ہے.....“ وہ حقیقت پریشان ہو گئے۔
اس کے خون کے ٹیسٹ کے مطابق اس کے جسم
میں ڈرگز کے آثار ملے تھے..... اور یقیناً اسی کیفیت میں
اس نے ڈرائیونگ بھی کی۔ ایک پولیس آفیسر اس کے
قریب آن کھڑا ہوا تھا۔
”سر.....!“ اس نے اپنی کیپ اتارتے ہوئے
اعزاز کو مخاطب کیا۔
”جی!“

”آپ کو رپورٹ دے رہا ہوں..... گاڑی
درخت سے ٹکرا گئی تھی..... ڈرائیونگ سیٹ کا ڈور بھی کھینچ
سے لاک نہ تھا..... ان کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔
دروازے پہ زور پڑا تو یہ سیٹ سے گر کر لڑھکتے ہوئے
آگے جا کر بے سدھ پڑ گئے..... جگہ پتھر ملی ہونے کی
وجہ سے جسم کے مختلف حصوں میں چوٹیں تھیں..... سر کا
پچھلا حصہ زخمی تھا..... خون بہت زیادہ بہہ گیا، اس لیے
انہیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا.....“
”ان کے ٹریینٹ میں کسی بھی قسم کی کمی نہیں آئی
چاہے.....“ زور شاہ، ڈاکٹر سے کہہ رہے تھے۔ وہ بالکل ٹوٹ
کر رہ گئے تھے..... وہ بابا کو لے کر راہداری میں چلے گئے۔
”میں نے تمہیں کہا تھا..... اسے روزی سے دور
رکھو۔ وہ کسی اور مقصد کے لیے اس سے دوستی کر رہی
ہے۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی.....“ وہ بہت غصے
سے کہہ رہے تھے۔

”اس پر نظر رکھو..... ایف آئی اے میں دو اس کا
نام..... اس کا چاندنی سے تعلق ضرور ہے..... اٹھارہ
سال پہلے کا قرض چکانے آئی ہے یہ.....“ محبت اللہ کے
الفاظ بھجری ٹوک کی طرح چبہ رہے تھے۔

”مگر افسوس تم نے میری ایک بات نہ مانی.....“ وہ
تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے..... اعزاز شاہ نے
زور شاہ کو دیکھا جو شکست خوردگی سے محبت اللہ کی بات پر
سر ہلانے لگے۔

”تم نے اپنی ذاتی زندگی میں بھی روزی کو شامل
کر لیا تھا..... وانیہ کے معاملے میں بھی تم نے روزی کو

رازدار بنالیا اور پھر جو ہوا سب نے دیکھا.....“

”میں اتنا بے خبر تھا گھر کے ماحول سے.....؟“
اعزاز نے سوچا۔ تب ہی تیز، تیز قدموں سے اس کے
آفس کار رائیڈر بوائے ہاتھ میں موبائل کا پیکٹ تھامے
قریب آ گیا۔ اعزاز نے فیضان کا موبائل رجسٹرنگ کے
لیے دیا تھا..... جو ایکسیڈنٹ کے وقت اس کے ہاتھ سے
نیچے جا گرا تھا۔ اسکرین پہ بے تحاشا لکیریں تھیں۔
رجسٹرنگ شاپ والا وہی موبائل لے کر یہیں آ گیا تھا۔
”جناب میں نے موبائل کی رجسٹرنگ کرا دی
ہے۔ موبائل کے ٹکڑے جوڑ دیے ہیں..... مگر ایک عجیب
بات ہے.....“
”کیا.....؟“

”جب میں نے کیڈنگ اتار کر موبائل کی بیٹری
تکالی تو حیران رہ گیا.....“
”کیا مطلب.....؟“ اعزاز نے الجھن سے اسے دیکھا۔
”کیا ہوا اب.....؟“ محبت اللہ نے پوچھا۔
”اس فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ آپ کہیں تو
لگا رہے دوں.....“
”ٹریسر..... فیضان کے فون میں.....؟“ اعزاز
کی سانس رکنے لگی۔

زور شاہ جیسے سکتے میں آ گئے۔
”اوہ مائی گاڈ! جس نے بھی یہ ٹریسر ڈالا ہے وہ
ہمہ وقت لو کیڈن ٹریس کر سکتا ہے۔“

”اور ٹریس کر تا رہا ہے.....“ محبت اللہ نے کہا۔
اعزاز بنالپک جھپکے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر
ٹریسر کو دیکھنے لگے۔

”جناب یہ بہت ایڈوانسڈ ہے..... کوئی بھی جب
چاہے اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی
سن سکتا ہے۔“ وہ لڑکا ٹریسر کے بارے میں معلومات
دے رہا تھا۔

”اوکے..... یہ ٹریسر مجھے دے دو، بہت
شکریہ.....“ اعزاز نے ہاتھ بڑھا کر ٹریسر اور موبائل لے
لیا۔ لڑکا راہداری سے چلا گیا تھا۔ ایک لمحے کو سناٹا

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آئیں آپ لوگ۔۔۔۔۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے، کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اب خطرات بڑھ گئے ہیں۔ بابا وہ اسپتال۔۔۔۔۔ یہاں سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پہ ہے۔۔۔۔۔“ اعز انے اسپتال کی لوکیشن چیک کر کے navigation آن کر دی۔

وہ تینوں اسپتال کی پارکنگ سے گاڑی میں آ بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اعز انے سنبھال لی۔۔۔۔۔ تینوں کے درمیان خاموشی تھی۔ خاموشی کے بیچ اس سفر میں محبت اللہ کبھی اعز ان کی طرف اور کبھی کن اگھیوں سے زوار کی طرف دیکھتے ہوئے بہت کچھ سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔ انہیں یہ ضرور احساس تھا کہ ماضی پلٹ کر واپس آتا ہے اور حساب کے گوشوارے بھی چکانے پڑتے ہیں۔ ان کی نظروں میں چاندنی کا چہرہ آگیا۔

☆ ☆ ☆

”کیا اس کے ساتھ انہوں نے نا انصافی کی تھی؟“ وہ مارکیٹنگ کنسلٹنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ آفس

”سنو زوار، حالات ہمارے موافق نہیں ہیں۔“ محبت اللہ نے کہا۔ ”فیضان کے ذریعے ساری معلومات، سارا احوال، ہمارے ڈاکومنٹس، فائلیں سارے راز جانے کہاں تک پہنچ گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ اور مجھے پکا یقین ہے کہ روزی ان سارے حالات کی ذمے دار ہے۔۔۔۔۔ اسے فوراً فراموش کرو، کہیں وہ فرار نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ جانے نہ پائے۔۔۔۔۔“ انہوں نے بہت تیزی سے موبائل سے پولیس کے ہائی آفیشلو سے رابطہ کیا۔۔۔۔۔ صورت حال بتائی اور پھر زوار سے کہنے لگے۔

”جس اسپتال میں یہ لوگ (فیضان کی طرف اشارہ کر کے) گئے تھے۔۔۔۔۔ وہاں کسی خاتون کو ایڈمٹ کروایا تھا۔ ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔۔۔۔۔ روزی وہیں ہوگی۔۔۔۔۔“

”ردا کو فون کر دو کہ وہ فیضان کے پاس ٹھہرے۔۔۔۔۔ اعز ان تم یہاں رکو گے یا چل رہے ہو؟“ زوار اشارہ نے اعز ان سے پوچھا۔

نومبر 2017ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ

سپر سٹار



مزید

خطیبہ الہامیہ محفل، محفل شعر و سخن اور

مرزا امجد بیگ کی کھوج کا نتیجہ

شکست کی فتح

گھٹن زدہ حالات سے ایک حسینہ کی بغاوت۔۔۔۔۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کے قلم سے ایک ایسی دلگداز داستان جو سوچنے پر مجبور کر دے

دربان

پرتھوی راج کے عہد کے تاج و شیریں واقعات۔۔۔۔۔ ایک بیٹی کا باپ کے خلاف اٹھایا جانے والا قدم اسے عشق کی انہما پر لے گیا۔۔۔۔۔ ابتدائی صفحات پر علی اختر کی سوغات

رنگ آسمان

ماضی کی دلفریب یادیں اور ایک فرنگی حسینہ کی دلداریاں۔۔۔۔۔ ایے، آر، راجپوت کے قلم سے خوب صورت سلسلہ

وقت

وقت کی چالوں اور انسان کی مکاریوں کے درمیان معرکہ آرائی۔۔۔۔۔ حسام بٹ کے خیالات کی روانی

منظرِ امام: تنویر دھواض شمر عباس سلیم انور اور محمد باسر اعوان کی خوب صورت تحریریں

اس کی عداوت

بھی تمہارے لوگ تمہیں مار دیں گے.....“ چاندنی نے خود کو مافیا گروپ سے لاتعلقی ظاہر کیا۔ وہ رورہی تھی..... وضاحتیں کر رہی تھی مگر سب بیکار تھا۔

”تم نے جتنی فون کالز یہاں سے کیں..... ڈرگز سپلائی کرنے کا اڈا اس جگہ کو بنایا..... سب ثبوت ہیں ہمارے پاس..... اب کچھ نہیں ہو سکتا اور تمہارا اصل نام چندا ہے..... تمہاری ایک بہن اور ماں بھی اس میں شامل ہیں۔ تم کال گرل، برائڈ لیمپسڈ ربن کر بہت کچھ سپلائی کرتی ہو اور کچھ بتاؤں.....؟ لہذا اب پورے گروپ کا نام بتا دو؟“ آفیسر کی آواز پھر بن کر اس کے سر پہ پڑ رہی تھی..... محبت اللہ، زوار شاہ دونوں دم بخود تھے۔

محبت، عزت سب داؤ پہ لگ گیا تھا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ ہوا کا جھونکا کھڑکی سے اندر آیا تو جیسے اسے نجات کا راستہ ملا۔ اس نے ایک نظریہ محبت اللہ کو دیکھا اور برق رفتاری سے کھڑکی سے کود گئی۔ یہ سب کچھ اتنا آفاقی ہوا کہ کوئی کچھ نہ کر سکا۔ کوئی اسے روک نہ سکا..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے ہارٹ ایٹک بھی ہوا تھا۔ اس کی موت معما بن گئی تھی۔ خودکشی کا یہ عمل اس کے خلاف بہت سارے ثبوت کھول گیا تھا۔ زوار کے ادارے کی سادہ خطرے میں پڑ گئی تھی۔

اخبارات نے اس اسکینڈل کو بہت اچھا۔ بالآخر وقت کے ساتھ ساتھ باتیں دب گئی تھیں، سرگوشیوں میں کمی آگئی اور اخبارات بھی خاموش ہو گئے..... زوار شاہ نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ وہ مہر و کی بے وفائی سے بہت دلبرداشتہ ہو کر کچھ عرصے کے لیے گاؤں آ گئے۔ جہاں ان کی شادی زبردستی روائیتم سے کروادی گئی..... جو ان کی کزن تھی۔ یہ سمجھو تے کی شادی تھی، ادھر محبت اللہ نے بھی خود کو جرمی میں سیٹھ کر لیا..... اور ہیبرمرگ آ گیا..... ان کے بہت سے مشترکہ بزنس تھے۔ چاندنی کی یادوں کو بھلانے کا واحد ذریعہ یہی تھا۔

اور اب اٹھارہ سال بعد واپسی ہوئی تو پھر وہی در کھل گیا۔ اب بارش کے قطرہ کی ماہیت مختلف تھی..... سانپ نے بارش کے قطرہ کو زہر بنالیا تھا.....

کے ہر فرد کے ساتھ اچھی بننے کی کوشش کرتی تھی۔ اور جب محبت اللہ نے اسے سمجھایا کہ اپنی حد میں رہو تو وہ آہستہ آہستہ محبت اللہ میں دلچسپی لینے لگی۔ ان کے دفتر میں گھنٹوں بیٹھ کر محبت اللہ کے ٹیکچر سنتی۔ اور ان کی اس نشست میں زوار شاہ بھی آ گئے۔

ان دنوں زوار شاہ بہت الجھے، الجھے رہتے تھے..... مہر و کے ساتھ ان کی رفاقت ختم ہونے جا رہی تھی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر چاندنی اور محبت اللہ کے ساتھ باتوں میں وقت گزار لیتے تھے۔

محبت اللہ کے دل میں چاندنی کے لیے نرم گوشہ ابھر رہا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس لڑکی کے لیے بہت کچھ سوچے کہ ایف آئی اے کے مختلف چھاپوں نے ان کے ادارے کو ہلا کر رکھ دیا تھا..... بہت ساری فون کالز کا ریکارڈ ایف آئی اے کے پاس تھا..... بہت سی سیاسی شخصیات اور بااثر لوگوں کو دھمکیاں دی گئی تھیں..... زوار کے ادارے کی سادہ خطرے میں آگئی تھی۔ یہاں سے کال ریکارڈنگ کا ثبوت ایف آئی اے برانچ میں تھا۔

چاندنی وہ نہیں تھی جو نظر آتی تھی۔ مجرم کہیں نہ کہیں اپنے ہی دام میں پھنس جاتا ہے۔ کئی بار کرائم برانچ نے ان کے دفتر کے چکر بھی لگائے اور پھر چاندنی کے آنے جانے کے اوقات..... اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی.....

”سر میں کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر جانا چاہتی ہوں..... میری بہن کا ایڈمشن بہت ضروری ہے..... میں واحد لفیل ہوں..... اس لیے مجھے جانا ہوگا.....“

زوار نے اس کی چھٹی کی گرانٹ منظور کر لی تھی مگر دو گھنٹے بعد ہی ایف آئی اے کے بندے سادہ لباس میں آدھکے اور زوار کے آفس میں انہوں نے چاندنی کو ہلا کر پوچھتا چہ شروع کر دی تھی۔

”تم مان لو بی بی.....“ آفیسر نے کہا۔ ”اور خود بتا دو..... ورنہ بہت برا حشر ہوگا تمہارا تم کس مقصد کے لیے یہاں ہو اور کس مافیا میٹ ورک کے لیے کام کر رہی ہو۔ تمہاری بچت ہو سکتی ہے..... ورنہ تم گھنٹیں کام سے..... تم یہاں سے بچ نہیں سکتیں اور اگر بچ بھی گئیں تو

”کیا سوچ رہی ہیں آپ میرے بارے میں؟“ روزی شاطرانہ انداز میں مسکرائی۔ ”میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں کو پکڑنا ہے۔۔۔۔۔ صرف بچ بتاؤ بچ۔۔۔۔۔ وہ تم تک کیسے پہنچی اور ان دونوں میں سے قاتل کون ہے؟“ دو تصویریں Zoom کر کے ان کے سامنے آگئیں۔۔۔۔۔ زوارشاہ کے ساتھ مسکراتے ہوئے گلے میں ہاتھ ڈالے محبت اللہ تھے۔ ”قاتل۔۔۔۔۔؟ نہیں یہ لوگ قاتل نہیں ہو سکتے۔“ وہ الجھن کا شکار تھیں۔

”مجھے نہیں پتا۔۔۔۔۔ لیکن وہ اسے کیوں مارتے؟ محبت اللہ تو اسے پسند کرتا تھا۔۔۔۔۔“ زیب التنا کے لہجے میں کمزوری اور پکپکاہٹ تھی۔

”اور زوارشاہ۔۔۔۔۔؟“ وہ غرائی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ بھی ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“

”کیوں نہیں کر سکتا؟“ روزی غرا کر بولی۔

”جب وہ وانیہ شاہ کے لیے قتل کا حکم نامہ دے سکتا ہے تو وہ میری بہن کو بھی مردا سکتا ہے۔“

”اس نے خودکشی کی تھی۔۔۔۔۔“

”یہی راز مجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کرے گی وہ ایسا؟ وہ نہیں کر سکتی ایسا ہاں کبھی نہیں۔“ روزی سختی سے بولی۔

جان لیوا دکھ انسان کو بے حس کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی بہن کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔

”تم۔۔۔۔۔ وہاں سے بتاؤ پوری بات جب تمہاری چاندنی سے دوستی تھی اور میری بہن کا ان لوگوں سے کس حد تک رابطہ تھا۔ میں اپنی بہن کے قاتلوں کے ہر راز سے واقف ہونا چاہتی ہوں۔ اپنی یادوں کو آواز دو۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔“ وہ ان کے قریب آ کر بولی۔

”وقت تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔“ زیب التنا نے دھیرے سے کہا اور پرانے زخموں کو آواز دیے لگیں۔

اور کہانی کرداروں کی صورت۔۔۔۔۔ ان کے سامنے آگئی اور وہ ایک، ایک یاد پر ہرائی چلی گئیں۔۔۔۔۔ اور روزی ایک، ایک لفظ پر غور کر رہی تھی۔

اور کہیں دور نیلی روشنی کی جلتی بجھتی پولیس کی ہارن

روزی کے ذہن میں جو کچھ تھا اس کی سوچ اور عمل سے بہت شدید نقصان ہو سکتا تھا۔ فیضان کا شکار وہ کر چکی تھی۔۔۔۔۔ آگے کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔

پولیس اور ایف آئی اے پھر حرکت میں آچکی تھی۔

گاڑی اسپتال کے دروازے پر رک چکی تھی۔۔۔۔۔

☆ ☆ ☆

”مجھے صرف بچ سننا ہے۔۔۔۔۔ تم کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتیں۔۔۔۔۔“

خالہ نینب کے پرائیویٹ روم میں روزی تن کر کھڑی تھی۔۔۔۔۔ کمر اندر سے مقفل تھا۔

”دیکھو مجھے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔۔۔۔۔ زندگی مجھے کتنی مہلت دیتی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اس ایک سیڈنٹ سے میرا کندھا اور گھٹنا بالکل فریز ہو چکا ہے۔ میں اب اور کتنا بھاگوں اور کس کے لیے بھاگوں۔۔۔۔۔؟“ وہ نینب سے مخاطب ہو کر بولی۔

”میرے پاس مزید وقت نہیں ہے۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے موبائل کی اسکرین ایک لمحے کو دیکھی۔۔۔۔۔ کسی شناسا نمبر سے کال آ رہی تھی۔

”ہاں خان۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ سارے کام ہو گئے؟“

”میڈم اس کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔۔۔۔۔“

”اس کا موبائل؟“

”ہاں مجھے پتا ہے۔۔۔۔۔ آگے بتاؤ۔۔۔۔۔“ وہ خشک لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

دوسری جانب سے جواب سن کر وہ چونک گئی۔

پھر خالہ نینب نے اسے سرد لہجے میں کہتے سنا۔۔۔۔۔

”اگر موقع ملے تو اسے کسی نہ کسی طرح مار دینا اور موبائل کو سرچ کر دکھاؤ۔۔۔۔۔ پل، پل کی خبر چاہیے تھے، بالکل کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ اوکے!“ لہجہ سرد تھا اور پھر اس نے کال منقطع کر دی اور سامنے چلتے ہوئے کھوس گئی۔

”یہ اپنی بہن چاندنی سے کتنی مختلف ہے۔۔۔۔۔ وہ ہمدرد تھی۔۔۔۔۔ خود غرض نہیں تھی۔۔۔۔۔ اور یہ تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

بجائی گاڑیاں زوار ہاؤس کی طرف رواں تھیں۔

☆.....☆.....☆.....

رات بھر سینے میں اک بے نام سی الجھن رہی
رات بھر کرتی رہیں آنکھیں ستاروں کو شمار

۳۰ اکتوبر.....

جب کچھ غیر معمولی ہونا ہوتا ہے تو اس کی اطلاع
انسانوں سے پہلے پرندوں، جانوروں، درختوں اور
ہواؤں کو ہو جاتی ہے..... بارش کے احساس کے ساتھ
مورنا جنے لگتا ہے..... گھر میں کسی خوشی کی آمد ہوتی ہے تو
منڈیر پر گولے کاٹیں، کانیں کرنے لگتے ہیں..... مگر وہ
ایک بچھا ہوا تھا دن تھا..... راستوں میں نہ پہلے جیسی
آہٹیں تھیں..... نہ چروں پر صبح کی جگہ گائیں تھیں.....
ہوائیں درختوں میں دبکی ہوئی تھیں.....

آسمان دور، دور تک پرندوں کی اڑان سے خالی
تھا..... ہر گھر کی کھڑکی سے سنائے جمائے رہے
تھے..... عموماً صبح پانچ بجے تک لوگ خواب خرگوش کے
مرے لے رہے ہوتے ہیں.....

فیضان کی وجہ سے رات ویسے ہی بے قرار گزری
تھی۔ موبائل کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ زوار شاہ کا نام
اسکرین پر چمک رہا تھا..... کانوں سے لگاتے ہی اور ان
کے ہیلو کہنے پر وہ انہیں اسپتال آنے کا کہہ رہے تھے۔
”میں نے ڈرائیور کو بھی بتا دیا ہے۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر انہوں نے لان کی طرف
دیکھا..... ڈھلتی ہوئی سیاہی مائل رات کا رنگ کم ہو گیا تھا
مگر سیاہی مائل رات کافسوں ہر طرف تھا.....
اس دن گلیوں میں موت چھپی تھی اور نشانے پہ

زوار ہاؤس تھا۔

ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی..... اور
چوکیدار مین گیٹ بند کر رہا تھا..... گلی اچانک دھماکے
سے گونج اٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

اپنے حصے کی چال تم چل بیٹھے
ہمارے منتظر رہنا کہانی ختم کرنی ہے

زندگی آسان نہیں ہوتی اور زندگی آسان ہے بھی
نہیں..... جب اس نے آنکھ کھولی تو دنیا اپنی بہن کی
نظروں سے دیکھی جو چندا سے چاندنی بن گئی تھی۔

اس کی ماں اس خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو ان
چھ کروڑ لوگوں میں سے تھے جو دوسری جنگ عظیم کی
بربریت کی بھیٹ چڑھ گئے..... وہ وہاں سے کسی طرح
سنگاپور پہنچی..... یہ کہانی ادھوری سی ہے..... وہ، اس کی
ماں اور بڑی بہن جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں،
انہیں پیسے کی تنگی تھی۔ ماں کی بیماری کے بعد زندگی بسر
کرنے اور خاندان کی کفالت کے لیے وہ دو تین جگہ کام
کرتی تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ سنگاپور کے ایک چھوٹے
سے بازار میں پر فیمو بیچا کرتی تھی..... وہیں اس کا کھراؤ
سیٹھ داؤد سے ہوا..... بہت بڑے مافیا گینگ کا ایجنٹ تھا۔

زندگی میں کامیابی کا جو طریقہ کار کچھ لوگ اپناتے
ہیں وہی فارمولہ ان جیسے بعض اور لوگ بھی اپناتے ہیں جو
یا تو کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں مگر راہ کیروں کی ٹھوکروں
سے ہی صحیح راستہ مل جاتا ہے۔

غربت میں حسن کی قیمت کے دام منہ مانگے مل
جاتے ہیں اور چندا کو جو راہ ملی اسے اس نے بخوشی قبول
کیا..... معمولی تعلیم جو نہ ہونے کے برابر تھی مگر وہ حسن
کے زیور سے مالا مال تھی..... بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن
روزینہ کے لیے اس نے اپنی خوب صورتی کے دام
لگا دیے..... جائز اور ناجائز کا فرق مٹ گیا..... ماں نے
مرنے سے پانچ سال پہلے تک قیمتی دواؤں کے سہارے
ایک اینٹیڈیل زندگی بسر کی۔

وہ ناٹلجیا کے مرض میں مبتلا ہو کر بیٹیوں کی ذمے
داریوں سے آزاد تھی مگر چندا نے اپنی ماں اور بہن کے
لیے خود کو قربان رکھ دیا تھا۔

”جانی تم کیا کام کرتی ہو.....؟“ جب وہ چندہ
دن کے بعد گھر آئی تو وہ اپنی بہن کے معصوم سوالوں سے
خوفزدہ اور پریشان ہونے لگی۔

”میں برائنڈ ایسڈز رہوں.....“

”یہ کیا ہوتی ہے؟“ روزینہ سوال پہ سوال کرتی۔

کھلونے جمع کر کے ایک طرف رکھنے لگی۔

وہ اپنی فیملی کو اس آگ سے دور رکھنا چاہتی تھی۔
جس میں وہ جل رہی تھی۔ ڈاڈو مافیا نے اس کی
grooming (ترہیت) پہ بے حد پیسہ خرچ کیا
تھا۔۔۔۔۔ وہ بیک وقت کئی کام سرانجام دے سکتی تھی۔

ریڈی ٹو ویئر ملبوسات کی نمائش میں حصہ لینے کا
بنیادی مقصد ملائیشیا کی طرف سے نمائندگی تھی۔۔۔۔۔ آج
کل وہ پاکستان میں تھی۔۔۔۔۔ وہ تمام کام اس کے سپرد تھے
جو ایک خوب صورت عورت بہ آسانی انجام دے سکتی تھی۔
وہ ذہین تھی، ہوشیار تھی اور بلا کی پرکشش اور
جاذب نظر تھی۔۔۔۔۔ اس کے ایک اشارے پہ تمام فائلیں
تہہ خانوں سے نکل کر اس کی دسترس میں آ جاتیں۔۔۔۔۔

وہ ایک عام سادہ تھا۔۔۔۔۔ جب وہ شام کے وقت
گروپ آفیسر کے ساتھ دامن کوہ آگئی۔۔۔۔۔ دامن کوہ میں
اس کی ملاقات ایک لڑتے بھڑکتے جوڑے سے ہوئی۔
وہ دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ جو بار،
بار کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ”میں نہیں چھوڑوں گی اسے۔۔۔۔۔ وہ مجھ
سے کیسے آگے جاسکتی ہے۔ اس کو اتنا امیر آدمی کیسے مل
گیا۔۔۔۔۔ اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔۔۔۔۔“

وہ غصے میں انٹ خدش بول رہی تھی اور اس پاس
سے بالکل بے نیاز تھی۔۔۔۔۔ اسے نہ اپنی عزت کی پر دافنی
نہ اس آدمی کی۔۔۔۔۔

”دیکھو۔۔۔۔۔ اب تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔۔۔۔۔ اس
کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ ایک با اثر آدمی کی بیوی ہے۔“
”نہیں۔۔۔۔۔ میں اس کی شادی ختم کروا دوں
گی۔۔۔۔۔ وہ خوش کیسے رہ سکتی ہے۔۔۔۔۔ میں اسے۔۔۔۔۔ میں
اسے۔۔۔۔۔ میں اسے۔۔۔۔۔ شدت جذبات سے اس کے
منہ سے الفاظ صحیح ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

”کیا کرنا چاہتی ہو تم؟“ اس آدمی نے کہا۔
”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے، مجھے ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا
۔۔۔۔۔ مگر طفیل تم میرا ساتھ دو گے ناں؟“
”ہاں بابا۔۔۔۔۔ زندگی بھر ساتھ دوں گا۔۔۔۔۔!“ وہ
اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ لمبی،

”دیکھ جہاں میں کام کرتی ہوں اس کمپنی کی
پراڈکٹ یا برانڈ کو متعارف کرواتی ہوں۔۔۔۔۔ یہ دیکھو۔“
اس نے اپنی ایک تصویر دکھائی جس میں وہ کبھی پرنسوم
کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔
”تم کتنی پیاری لگ رہی ہو چانی۔۔۔۔۔“ وہ اسے
پیار کرتے ہوئے بولی۔۔۔۔۔ ”میں بھی تمہارے جیسی ہی
ہوں گی۔۔۔۔۔ ہیں ناں۔۔۔۔۔!“

”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔“ چندا نے اس کے منہ پہ ہاتھ
رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔
”کیوں۔۔۔۔۔؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“
نوسالہ روزینہ نے اس سے لپٹ کر کیا۔

”میں چاہتی ہو۔۔۔۔۔ میری گڑیا بہت پڑھے۔۔۔۔۔
میرے خوابوں کو پورا کرے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ بہت
آگے جائے۔۔۔۔۔“ چندا نے اسے پیار کرتے ہوئے اس
کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا۔
”نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہاری طرح ہی ہوں گی۔۔۔۔۔“ وہ
خند کرنے لگی تو چندا نے اسے بے بسی سے دیکھا جو
آنکھوں میں آنسو بھر، بھر کر اسے منارہی تھی۔

”ارے بیٹا۔۔۔۔۔ مان جا اس کی بات۔۔۔۔۔ بچی ہے
ہاں کر دے ابھی اس کا دل رکھ لے، کہہ کر ابھی جان
چھڑا۔۔۔۔۔“ ماں نے روزینہ کی ضدی طبیعت سے زچ ہو
کر کہا۔

وہ کیسے بتاتی کہ یہ دل اور دلدل کا سفر ہے۔۔۔۔۔ وہ
نیم رضامندی سے گردن ہلا کر رہ گئی۔۔۔۔۔ تو چانی، چانی
کہہ کر وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے پیار کرنے لگی۔
کانٹوں کی جس دلدل میں وہ تھی۔ اس سے وہ اپنی
بہن کو بچانا چاہتی تھی۔ ماں کو اس نے دہمی نظروں سے
دیکھا جو اپنی چھیز کو خود ہی چلاتی دوسرے کمرے
میں جا رہی تھی۔

”مگر تم میری ایک بات یاد رکھو۔۔۔۔۔ اگر تم اپنی چانی
سے پیار کر رہی ہو تو بہت محنت سے پڑھو گی اور مجھے بھی
مافیوس نہیں کرو گی۔۔۔۔۔“
”ٹھیک۔۔۔۔۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور اپنے

لمبی سانسیں لے رہی تھی..... اور آنکھوں میں بے حد غصہ تھا..... وہ اسے یقین دلارہا تھا کہ میری وفا میں تمہارے ساتھ ہیں.....

”یقیناً اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے.....“ چاندنی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جاگ گیا..... وہ اس کے حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگی۔

”میں اسے اعتماد میں لے کر اس سے دوستی کروں گی۔“ اسے کافی عرصہ پاکستان میں رہنا تھا..... کچھ دنوں یہ مشغل ہی سہی.....

شام کے سائے آہستہ، آہستہ گہرے ہونے لگے تو لوگوں کا جیم غنیر چھٹنے لگا..... واپسی کے راستوں پہ ان کے قدم بھی ہم سفر ہو گئے تھے..... چاندنی کی نظروں کے حصار میں وہ جوڑا تھا جو آہستہ، آہستہ جچی بنی ہوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا..... گاڑی کی پارکنگ کافی دور تھی۔

”سنو میں کچھ دیر اکیلے گھومنا چاہتی ہوں، میرا مطلب ہے کہ مجھے واک کرنا ہے..... میں تمہیں پارکنگ ایریا میں ملوں گی.....“ اس نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے آفس سے کہا.....

وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا..... چاندنی نے ایک گہری سانس لی اور اپنے آگے چلتے ہوئے دوسراؤں کے درمیان آگئی.....

”ہیلو..... میں چاندنی ہوں..... آج کل آپ کے شہر میں ہوں.....“ اس نے خوش دلی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”مگر میں تمہیں نہیں جانتی.....“ زینب نے اس کا سراپا بغور دیکھا اور روکھے لہجے میں کہا۔

”جان جاؤ گی..... اگر دوستی کرو گی..... مجھے تم اچھی لگی ہو.....“ چاندنی نے کہا۔

”اچھا.....“ زینب نے مسکراتے ہوئے پیشانی کے بل درست کیے اور اس کا بڑھا ہوا خوب صورت ہاتھ تمام لیا۔

”یہ تمہارا.....؟“ چاندنی نے اس کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھا جو بظاہر لاتعلیق سا نظر آ رہا تھا مگر

دھیان ان کی گفتگو کی طرف ہی تھا.....
”یہ میرے شوہر ہیں طفیل.....“
”ہیلو.....“ اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ جھجک گیا۔

”کیوں.....“ زینب نے اسے ٹھوکا دیا تو اس کے گھورنے پر اس نے چاندنی سے ہاتھ ملالیا..... اس ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے شوہر پہ حاوی ہے..... آئس کریم ہار کے قریب آ کر چاندنی نے فوراً آرڈر کر دیا..... سنگ مرمر کی بنی بیچ، درمیان میں رکھی خوب صورت ٹیبل بھی سنگ مرمر کا شاہکار تھی..... آرڈر بہت جلدی سرو کیا گیا..... تین مختلف فلیور کے آئس کریم کپ کھاتے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے چاندنی کو احساس ہوا کہ زینب احساس برتری اور احساس کمتری کا کچر ہے..... اس کا شوہر آئس کریم خاموشی سے کھاتا رہا اور اس کے حکم کا منتظر رہا کہ کب وہ چلنے کا کہتی ہے۔

یہ ان دونوں کی آخری ملاقات نہیں تھی، ملاقات دوستی میں بدلتی گئی۔ چاندنی نے اپنی حیثیت یہاں مارکیٹنگ منیجر کے طور پر بنالی تھی۔ اسے یہاں بارہ مہینے ہر صورت میں گزارنے تھے..... کچھ انفارمیشن، سلائی باکس کے کارشن، سی ڈیز کو شاپ کرنا..... یہ وہ اہم کام تھے جس کے لیے یہاں اسے نوکری کرنا تھی..... اور ہر فرد کے ساتھ مراسم رکھنا اس کے لیے حکم تھا..... اس حکم میں کبھی، کبھی شناخت بھی چھپادی جاتی.....

زوار کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا..... محبت اللہ اسد نے پہلے ہی انٹرویو میں اسے سلیکٹ کر لیا تھا..... وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ بلاکی اسارٹ تھی..... اس کے لیے برنس لانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس پیشے میں اس نے ہر ایک سے دوستی کر لی تھی..... محبت اللہ نے اس کی خوبصورتی اور اخلاق کو الگ زاویے سے دیکھا..... خوب صورتی کا فائدہ ضرور اٹھایا..... مگر اخلاق کے راستے میں ہر ایک نہیں..... اور چاندنی نے اس کے سمجھانے پر اپنی ساری توجہ اس کی جانب مبذول کر لی..... اس کی اپنائیت، نرم لہجہ یہ سب اس کے لیے بے حد اچھا تھا۔ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا مگر وہ

ہو جائے گا..... مگر ایک بار سوچ لو.....“ چاندنی نے اس سے کہا..... ”میں صرف یہ سوچتی ہوں جو کچھ اسے ملا ہے..... اسے نہیں ملنا چاہیے..... اسے ہر چیز مل جاتی ہے..... مجھے کیوں نہیں ملتی..... یہ اس کا حق نہیں ہے..... میں اسے تباہ کرنا چاہتی ہوں.....“ اس نے سفاکی سے کہا۔ ”ایک میری گڑیا ہے روزی جس کے منہ سے نکلنے والی ہر خواہش کا احترام میں کرتی ہوں..... وہ میری محبت ہے..... اور محبت مہربان ہوتی ہے..... حسد نہیں کرتی۔“ مگر زبالتسا کی دوستی کے لیے وہ سب چاندنی نے کیا جو اس نے چاہا..... کسی نہ کسی مقام پر تو آدمی گرتا ہے..... اور میں نے بھی انسانیت کی سطح سے گر کر اس کی مدد کی۔

کسی کی تصویر کو کسی کے ساتھ جوڑنا، آواز کا جادوئی کمال، فالنگک میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال..... یہ سب اس کی تربیت کا حصہ تھا۔

چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی..... اس کی زندگی میں دیرانے تھے..... اب صرف ماں اور بہن کے لیے اسے جینا تھا۔ وہ اپنی اور محبت کی دوستی کو دراز کرتی چلی گئی..... زوار بھی اس دوستی کا حصہ بنا مگر وہ زبالتسا سے بھی ملتی رہی..... اس کے بہت سے مسائل اس نے حل کیے..... کئی جگہ زبالتسا کو ماڈلنگ کے لیے راستہ دکھایا اور اس نے بھی جم کر اپنی خوب صورتی کو کیش کروایا..... اس کا شوہر طفیل بھی مطمئن ہو کر دینی چلا گیا..... اور وہ خطرناک کام بھی زبالتسا نے چاندنی کے ذریعے کیا..... جس نے اس کی بہن کی زندگی تباہ کر دی اور یوں مہر کے ساتھ اس نے بہت برا کیا..... اس کی ہنستی ہنستی زندگی اجڑا دی..... اس کے کردار کو اس کے شوہر کی نظروں میں داغ دار کر دیا کہ وہ اس کی شکل دیکھنے تک کاروا دار نہ رہا۔

”میں دوستی جھانے میں ماہر ہوں..... تمہارا کام

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جازب نظر آئیں



بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائٹنگ کریم (ہر بل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
گڑبٹ 30 سال سے آزمودہ



چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی

اپنی PIC روانہ کریں
watsapp: 0311-5800057
Email: bhdhdeva@yahoo.com
skype: devapak
کراچی ہواڈیویری 0322-2916250
پٹنڈی ڈیویری 0300-2500028

- | | |
|---|---|
| ☐ غلیظہ طور پر لیس ڈاکٹر صدر کراچی | ☐ خاندانہ خاندانہ صرف بازار احمد آباد |
| ☐ صدر پرنٹنگ سٹور لکھنؤ ڈاکٹر صدر کراچی | ☐ خلیجہ میں سونے کی جڑ بازار احمد آباد |
| ☐ سلم سہارا سٹور لکھنؤ ڈاکٹر صدر کراچی | ☐ عوامی دکان خاندانہ میں بازار احمد آباد |
| ☐ ایس ایم ان لکھنؤ ڈاکٹر صدر کراچی | ☐ عوامی دکان خاندانہ میں بازار احمد آباد |
| ☐ فاسٹ پرنٹنگ سٹور لاہور آصف سکون 22 کراچی | ☐ القادریہ سونے کی جڑ بازار احمد آباد |
| ☐ قریبی سٹور سٹور لاہور آصف سکون 22 کراچی | ☐ ملت دکان خاندانہ میں بازار احمد آباد |
| ☐ قریبی سٹور سٹور لاہور آصف سکون 22 کراچی | ☐ ملت دکان خاندانہ میں بازار احمد آباد |
| ☐ قریبی سٹور سٹور لاہور آصف سکون 22 کراچی | ☐ ملت دکان خاندانہ میں بازار احمد آباد |

پادشاہ وی ہٹی میٹر بازار احمد آباد پٹنڈی 051-5502903-5533528 SMS کر کے لکھنؤ سٹور سٹور کراچی

الجب پٹنڈی سٹور سٹور لاہور آصف سکون 22 کراچی 021-32720328 ریاض محمد 69 خاندانہ خاندانہ میں بازار احمد آباد

پورے پاکستان میں مگر نہ سٹور کے لیے اور بریسٹ میں کی یا خاندانہ کے بارے میں سٹور میں سٹور کے لیے سٹور صاحب سے تمام سٹور کی سٹور بریسٹ ڈولپنگ آکر کے بارے میں سٹور میں اس نمبر پر حاصل کریں۔ Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbat.com

مافیا گینگ کے سہارے Spy اور نمائندے اس میں ماہر تھے.....
ایک بار اس نے زیب التسا اور مہرو کی گفتگو سنی تھی..... اس طرح اسے مہرو کی آواز کا کلیڈ (Clue) مل گیا تھا..... سو چاندنی نے کئی جعلی تصاویر اور فون کا لنک کی رپورٹ تیار کر کے جب زیب التسا کو دکھائی تو اس کی زبان منگ ہو گئی۔

”یہ..... یہ تم نے کیا ہے.....؟“ زیب التسا کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

مہر التسا کے ساتھ جس آدمی کی تصویر تھی..... وہ بہت ہینڈم تھا..... چاندنی نے بڑی ٹیکنیک سے اس میں مختلف locations یہ کام کر کے دونوں کی مختلف زاویوں سے ہنسی، مسکراتی تصاویر، پارک، ہوٹلز اور ریسٹورنٹ کے مقامات پر سیٹ کی تھیں۔

”یہ آدمی کون ہے.....؟“ زیب التسا نے تجسس سے کہا۔

”یہ..... یہ..... اب سونگی تو حیران رہ جاؤ گی، دل تھام کے سنو..... یہ مارا جا چکا ہے..... نیل نام تھا..... بے قصور تھا بچہ..... اس کی تصویریں تھیں میرے پاس اور اس کی آواز بھی محفوظ ہے میرے پاس..... اپنی مقیتر سے بہت لمبی، لمبی روٹھک باتیں کرتا تھا..... بس تمہاری بہن کی آواز کا انداز ٹھہراؤ میں ڈراقت پیش آئی..... سب

ہو گیا۔ یہ سنو.....“ اس نے کیسٹ پلیئر میں پلے کا بن دیا۔
مرد کی آواز ابھری..... خوب صورت گیمبر لہجہ تھا۔

”ہیلو..... میں نیل بات کر رہا ہوں.....“

”ہیلو..... ہاں..... جی..... وہ ابھی اماں سو رہی ہیں.....“ مہرو کی آواز ابھری۔

”یہ تو مہرو ہے.....“ وہ چلائی۔

”سنو تو.....“ چاندنی نے کہا۔

”جی.....“ مہرو کی آواز۔

”میری دل رہا..... میں تمہارا دلبر بن کر ساری زندگی تمہارا ساتھ بھاؤں گا..... تم ہاں کہہ دو..... میں فون رکھ

دوں گا..... تم ہاں کہہ دو.....“ گیمبر لمبے میں التجا تھی۔
”اچھا بابا..... ہاں..... میں رخصتی ہوں فون.....“
زیب آ رہی ہے.....“ بالکل مہرو کی آواز لگ رہی تھی۔
کیسٹ پلیئر کا مین اسٹاپ کر کے چاندنی نے داد طلب نظروں سے زیب التسا کو دیکھا جس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔
”کیسے؟ یہ سب کیسے کیا تم نے.....“ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا.....

”بس تمہاری دوستی کی لاج رکھی ہے..... تمہیں اپنی بہن سے سب کچھ چھین کر سکون مل جائے گا.....“
اس نے اس کے الفاظ واپس کیے تو زیب التسا فتح مندی سے مسکرا دی.....
”اور مجھے اپنی بہن کو سب کچھ دے کر سکون ملے گا.....“ چاندنی نے دل میں کہا..... ”مجھ میں اور اس میں کتنا فرق ہے.....“

اور پھر وہی ہوا جس کے لیے زیب نے منصوبہ بندی کی تھی..... حالانکہ چاندنی زیب التسا کے حوالے سے زوار کے آفس میں کام کر رہی تھی مگر اپنا اور زیب التسا کا تعلق ظاہر نہیں کیا تھا.....

زیب التسا نے ظلم کی حد کو دی مظلوم بہن کو بالآخر اس جگہ پہنچا دیا..... جس کا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔
”بیچاری مہر التسا..... ہونہ..... بہت عیش کرنے چلی تھی.....“ وہ دل ہی دل میں اپنی فتح مندی پر خوش ہوئی۔

پھر ایک روز اسے وہ خبر مل ہی گئی جسے سننے کے لیے اس کی سماعتیں بے چین و بے قرار تھیں..... اماں کی حالت بگڑ گئی تھی..... اور مہرو بے حد کم صمی ایک ہی جگہ بیٹھی تھی..... اس نے مہرو کی طرف دیکھا جو بالکل چپ سکتے کی کیفیت میں تھی۔

”یہ تو ہونا تھا اماں..... تم مہرو کو سمجھاؤ..... اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ رشتہ کرے گی تو دھوکا تو کھائے گی ناں..... دفع کرو آگے کی سوچو.....“ اس نے بظاہر ہمدردی اور بے رحمی سے کہا۔

”دھوکا تو اس نے کھایا ہے..... میری بیٹی فرشتوں کی

امید نظر آئی مگر بے سود.....

دوسرے فلور پہ زوار شاہ کے نام کی تختی سنہرے حروف میں لگی تھی..... وہ ہلکی سی دستک کے ساتھ اندر آگئی..... زوار شاہ کا یہ انداز اس کے لیے بالکل نیا تھا..... مہر و کے رشتے کے حوالے سے وہ بہت عزت دیتا تھا..... آج اس کا چہرہ مکمل اجنبی تھا۔

چاندنی بھی اسی فلور پہ تھی..... زوار شاہ کے ساتھ محبت اللہ اسد بھی تھے..... جو ان کے پارٹنر تھے..... یہ سب اسے چاندنی بتا چکی تھی۔

”آپ سے مجھے بہت ضروری کام تھا..... اس لیے آپ کو یہاں زحمت دی ہے..... میں آپ کا زائدہ وقت نہیں لوں گا.....“ زوار شاہ کی سنجیدہ آواز کمرے میں گونجی..... ”یہ ایک لفافہ ہے.....“ وہ خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے..... ”اس میں آپ کی بہن کے کاغذات ہیں اور ایک عدد چیک..... یہ آپ ان کے حوالے کر دیجیے گا.....“ اس نے وہ خاکی لفافہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”آپ جا چن تو یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتی ہیں..... کافی یا ٹھنڈا پانی کر جائیے گا..... مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے.....“ وہ تیزی سے اٹھے اور کمرے سے باہر چلے گئے..... زینب ہکا بکا سی انہیں دیکھتی رہی۔ اس ساری صورت حال میں وہ اس اجنبی کو دیکھنے لگی جو اس منظر نامے سے ناخوش دکھائی دے رہا تھا..... اسی لمحے چاندنی کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی نظریں زیب التسا کے کمرے میں..... جو جانے کی منتظر تھی۔

”آپ.....؟“ وہ اجنبی بن کر اس سے مخاطب ہوئی۔

”یہ زوار کی مہمان ہیں.....“ محبت اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”اوہ..... کم آن آپ کہاں جا رہے ہیں..... کچھ دیر تو بیٹھیں..... زیب التسا کے پاس.....“ چاندنی نے کہا۔

”میں ضرور بیٹھتا.....“ پھر وہ چونک کر کہنے لگے..... ”تم انہیں جانتی ہو..... تمہیں ان کا نام کیسے پتا.....؟“ محبت اللہ نے پوچھا۔

طرح معصوم ہے..... میں نے اسے پیدا کیا ہے..... جس نے بھی میری بیٹی کے ساتھ ایسا کیا ہے..... اللہ اسے معاف نہ کرے گا..... اسے دنیا میں دکھائے گا..... میری بیٹی کے ممبر کا حساب دینا پڑے گا اسے..... میری بچی معمولی نہیں ہے..... کردار کی پختہ ہے.....“ اماں یک دم شیرنی کی طرح گرجیں..... پھر ہنچکیوں سے رونے لگیں۔

”اگر تیرے بارے میں کوئی اس طرح کہتا زیب التسا تو میں شاید اعتبار کر لیتی مگر مہر و کے لیے نہیں۔ اس کے ساتھ جس نے کیا ہے وہ قرار کو تر سے گا..... بہت جلد اس کے آگے آئے گا..... میری بچی پریشان نہ ہو..... وہ تجھے نہیں چھوڑے گا تو اسے فون پر خوشخبری سنا کہ اللہ نے تجھے امید سے نوازا ہے..... ہمت کر بیٹی..... ہمت کر.....“ اماں مہر و کو دلا سا دیتی رہیں۔

مہر و خاموشی کی تصویر بنی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی..... شاید وقت بھی ظالم تھا..... اور لوگ بھی ظالم تھے..... اس کے کانوں میں سیسہ پکھلائے ہوئے الفاظ کو بجھ گئے۔

اس نے زوار شاہ کو خوشخبری سنانے کے لیے فون کیا تو زوار شاہ نے کہا۔

”خوشخبری تمہیں میری طرف سے ملے گی..... اسے تم زندگی بھر یاد رکھنا۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں..... میں ایسی گری ہوئی عورت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جس کا کردار مشکوک ہو..... میں تم جیسی چالاک عورت کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میری غیرت کا مذاق اڑانے والی تم وہ گھٹیا عورت ہو..... اگر میرے سامنے آئیں تو میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا..... سمجھیں.....“ اور فون بیچ دیا گیا تھا۔

زینب کو ساری باتیں معلوم ہو گئی تھیں..... وہ بہت خوش تھی..... اس نے مہر و کے پرکاٹ دیے تھے..... زوار نے زینب کو ایک روز فون کر کے آفس بلایا تھا..... وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

شانداز مہر شکوہ عمارت میں ہر چیز چمکتی ہوئی نظر آئی..... اس کا احساس کتری پھر جاگ اٹھا..... ایک

”جہیں.....“ وہ حقیقتاً گھبرا گئی تھی..... ”رہنمائی“
 روزی نے ان کا نام لکھا تھا..... آپ کی کھوجی طبیعت تو
 مجھے مروا دے گی.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو محبت اللہ
 نے اسے بغور دیکھا اور نارمل ہو کر کہنے لگے۔

”جہیں مجھے بھی کام ہے..... اوکے میں چلتا
 ہوں.....“ وہ چلے گئے تو چاندنی مسکراتے ہوئے اس کی
 طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر وہ خاکی لٹافہ اس کے ہاتھ میں
 دیکھ کر چاندنی نے مجھے اسے وکٹری کا نشان دکھایا۔

”میرا کوئی پراجیکٹ آج تک ناکام نہیں ہوا..... میں
 ہمیشہ کامیاب رہی ہوں.....“ چاندنی نے دُعا سے کہا۔
 ”اور دیکھو زوار شاہ کو یقین آ گیا کہ سب کچھ
 اصلی ہے؟“

”وہ بھی ایک ہی بار میں.....“ زینب انسانے بھی
 اس کا ساتھ دیا تو دونوں ہنسنے لگیں..... اچانک دروازہ
 کھلا..... محبت اللہ اندر داخل ہوئے۔

”سواری میں قفل ہوا..... میری گاڑی کی چابی نہیں رہ گئی
 تھی.....“ انہوں نے یک دم چابی اٹھائی اور لٹکتے لگے۔
 دونوں لمحہ بھر خاموش ہوئیں تو محبت اللہ ایک لمحے
 کورے، دونوں کو دیکھا پھر نکل گئے۔
 ”اوہ گاڈ.....“ وہ تھوڑا محتاط ہو گئی۔

”یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے..... اس خوشی
 کو بعد میں سلی بریٹ کرتے ہیں.....“
 ”تم یہاں کیا کرتی ہو.....؟“

”میں مارکیٹنگ منیجر ہوں..... بہت لوگوں کے
 ساتھ تعلقات ہیں..... پھر آرام سے بات کریں گے چلو
 تم جاؤ.....“ چاندنی نے کہا۔

اور پھر وہ کاغذات اور چیک لے کر آگئی.....
 چیک اوپن اور ایک بڑی رقم کا تھا..... وہ کاغذات اس
 نے کھول کر نہیں دیکھے..... اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی.....

اس کے خیال میں طلاق نامہ ہی ہوگا..... اس نے اس
 ملاقات کا ذکر اماں اور مہرود سے بھی نہیں کیا۔ زینب نے
 اس چیک کو کیش کر دیا اور زندگی کے مزے لوٹنے لگی.....
 خاکی لٹافہ الماری کی چکی دراز میں محفوظ رہا۔

کچھ دنوں بعد چاندنی سے ملاقات ہوئی تو وہ
 گھبرائی ہوئی تھی..... پوچھنے پر بتایا کہ کچھ لوگ اس کے
 پیچھے پڑے ہوئے ہیں..... اس نے زینب کو بھی ملنے سے
 منع کر دیا تھا۔ فون پر رابطہ تھا..... نہ اس سے ملاقات
 ہو رہی تھی..... ماڈلنگ کا دھندا بھی مائع پڑ گیا تھا.....

ایک روز ہمت کر کے وہ زوار شاہ کے آفس گئی تو وہ
 بھیا یک خبر سی کہ چاندنی نے کھڑکی سے کود کر دوسری
 منزل سے خودکشی کر لی..... اور اس کی موت چند لمحوں میں
 ہو گئی تھی..... وہ دہل کر رہ گئی تھی..... کئی سوالات اس کے
 اندر تھے مگر جواب نہیں مل رہے تھے اور آج تک نہیں
 ملے.....؟ کیوں کیا اس نے ایسا.....؟ وہ تو اپنی بہن

روزی کو بہت آگے دیکھتا چاہتا تھا..... اور پھر وہ
 دلبرداشتہ ہو کر اپنے دونوں بچوں کو لے کر پنڈی کے ایک
 چھوٹے سے علاقے میں آگئی..... یہاں زندگی اس کے
 لیے آسان نہیں بلکہ دشوار ترین تھی..... حسد کی آگ نے
 اسے جلا ڈالا تھا۔ بچے ساتھ چھوڑ گئے..... مگر نہیں
 رہا..... اور شوہر پتا نہیں کہاں تھا.....؟ حقدار کا مال

کھانے والے عاصموں کا انجام تو ایسا ہی ہوا کرتا
 تھا۔ خالد زینب نے روزی کو شروع سے آخر تک سب کچھ
 بتا دیا تھا۔

”پھر چاندنی کو کس نے قتل کیا ہے؟“ روزی
 نے اپنے انتقام کی آگ میں سوچا..... ان کے قصے میں
 کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی شک یا شبہ زوار یا محبت اللہ
 پر جاتے..... ”پھر قاتل کون ہے؟“ روزی کے
 دماغ کی الجھن سمجھ نہ پا رہی تھی۔

موہاں فون پر اسی وقت مختلف سی ٹون بجی.....
 ”سر.....!“ وہ الارٹ ہو گئی..... چار منٹ صرف
 خاموشی سے وہ کان لگائے حکم سنتی رہی اور پھر اوکے کہہ کر
 فون رکھ دیا۔

اسے فوراً اس شہر سے کوچ کرنے کا حکم مل گیا تھا۔
 ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ اسپتال سے باہر تھی۔
 اس کا سامان اسے راستے میں مل گیا تھا اور اب وہ اتر
 پورٹ پر تھی..... اپنی فلائٹ کی منتظر..... فلائٹ شیڈول

میں 2017ء

166

ماہنامہ ہفت روزہ

”میں زور شاہ کا دوست ہوں اور اس نے ان کے بیٹے کو مروانے کی کوشش کی ہے.....“

”زوارشاہ..... وہ کہاں ہیں؟.....“ چیتابی سے یہ سن کر نربالہا کا وجود جیسے تروتازہ ہو گیا..... ”وہ کہاں ہیں؟ خدا کے لیے آپ ان سے میری ملاقات کروا دیں..... میں ان کی سابقہ بیوی مہرالہا کی بڑی بہن زیب الہا ہوں.....“

”کیا.....؟“ اعزاز کو ان کی دماغی حالت پر شک ہوا۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں.....؟“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... زوار کو بلاؤ.....“ محبت اللہ نے کہا..... وہ زیب التسا کو پہچان گئے تھے..... ”اور فوراً بلاؤ..... ہمارے پاس وقت نہیں ہے.....“ اعزاز کمرے سے نکل کر تیز قدموں سے زوار کی طرف بڑھے جو کسی شیخ پر اجماع تھے۔

”پاپا.....“ اعزاز نے آواز دی تو زوارشاہ نے ان کی طرف فوراً مڑ کر دیکھا..... اعزاز کی حالت عجیب دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی آنکھیں حیران، چہرہ پریشان اور ماتحتا سلوٹوں سے آباد ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“ اعزاز نے کچھ کہے پتا کرے
کی طرف اشارہ کیا..... زوار نے ایک نظر اٹھیں دیکھا۔
اور جلدی سے اندر آ گئے اور سوالیہ نظروں سے محبت اللہ
کو دیکھا۔

”یہ خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں.....“ محبت اللہ نے انہیں آگے آنے کا اشارہ دیا.....

”مجھ سے.....“ وہ حیرت سے بڑبڑائے اور ان کے قریب چلے گئے۔

انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک نئے دھماکے کے شہر
تھے..... ان کا دماغ ماف ہو رہا تھا۔ وہ اس ماحول کی
یکسانیت سے بچ کر کچھ دنوں کے لیے خوب صورت
زندگی کی طرف چلے گئے تھے۔ شہرہ کو ایک نئی دنیا سے
متعارف کروانا کیا خوب صورت عمل تھا۔ اور جب وہ
مکمل طور پر ہوش میں آ گئی اور زندگی اسے مل گئی تو میرے
ساتھ کیا ہوا.....؟ انہوں نے ڈریشن پھر حملہ آور ہونے

بورڈ پر اس کی نگاہ پڑی تو ایک اور منظر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

.....★.....★.....★.....

روزی کے جانے کے بعد بھی اسپتال کے اس کمرے کا منظر کچھ زیادہ تبدیل نہ ہوا تھا..... سوائے اس کے کہ ان کی سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں..... ”یا اللہ میں تیرے پاس کس منہ سے آؤں گی۔ میں تو بہت کم ظرف ہوں۔ میں نے تو کبھی برداشت نہیں کیا کہ لوگ تو خوش رہیں اور میں غمزدہ رہوں..... میری خوشی تو دوسروں کو برباد کرنے میں تھی..... خود کو آباد کرنے میں سبھی کچھ برباد ہو گیا..... کس کے صبر سے کتنا کھیلا میں نے..... اور کیا صلہ ملے کہ آج کوئی میرے پاس نہیں۔

کاش ایک بار میرا لہنا مجھے مل جائے..... میرے سامنے آجائے۔ میں اس کے قدموں میں خاک ہو جاؤں گی..... معافی مانگ لوں گی..... وہ معاف کر دے گی اس کا دل بہت کشادہ ہے۔ وہ کر دے گی مجھے تنہا کر کو معاف۔“ وہ بے آواز روتی رہیں، تڑپتی رہیں، سلگتی رہیں پھر منظر بدل گیا..... خاموش کمرے میں اچانک جوتوں کی آواز ابھری..... باہر کا شور کمرے میں آنے لگا۔ انہوں نے اپنے سامنے کھڑے افراد کو دیکھا۔

بجھی، بجھی آنکھوں میں آشنائی کے رنگ گہرے
 ہونے لگے..... اعزاز اور محبت اللہ ان کے بیڑ کے
 نزدیک کھڑے تھے..... زوار شاہ باہر بیچ پر بیٹھے تھے۔

”آپ کو زخمی حالت میں جس لڑکتی نے یہاں ایڈمٹ کیا تھا..... کیا ان کے ہمارے میں آپ کچھ بتا سکتی ہیں.....؟“ اعزاز نے ان کے قریب آتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا۔

”وہ ابھی پندرہ منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہے۔“
 ”ابھی.....“

”راستے میں تو نہیں ملی.....“ محبت اللہ نے کہا۔
 ”کوئی فون آیا تھا..... میں نے یہ سنا تھا کہ انہیں
 یہاں سے فوراً جانا ہے..... کہاں گئی ہیں یہ مجھے نہیں
 پتا۔ آپ ان کو کون ہیں.....“ حنیف التسانہ نے کہا۔

گئی۔ میرے دل نے پہلی بار مجھے احساس دلایا..... محبت کیا ہوتی ہے.....؟ کیسے ہوتی ہے.....؟“

میں کس بازار میں جاؤں محبت ڈھونڈ کر لاؤں؟ وہ محبت کی ادھوری نظم کو خلاؤں میں گھورتے ہوئے مکمل کر رہے تھے۔ کہ زور شاہ کے دہانے کی آواز سنائی دی..... وہ جیسے چونک کر حال میں واپس آئے..... وہی کمراتھا مگر منظر بدلا ہوا تھا..... وہ مریض خاتون رو، رو کر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ”مجھے معاف کر دیں..... میں نے آپ کا گھر تباہ کیا ہے..... آپ کی بیوی فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ اس کے کردار کو داغدار بنانے میں صرف میرا ہاتھ ہے..... میں نے اسے آپ کی نظروں سے گرایا تھا..... وہ تصویریں، آواز کی ریکارڈنگ سب جھوٹی تھیں، سب جھوٹی تھیں.....“ وہ بلک، بلک کر رو رہی تھیں۔

تڑاخ..... ایک دھچکا لگا..... بہت دور تک کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی..... گرد و پیش کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں..... وقت ختم گیا..... سناٹا چھا گیا تھا..... کیا کہہ رہی تھی یہ.....

"I don't believe that"..... "اعزاز نے محبت اللہ کے منہ سے یہ جملے سنے....." مگر کیسے یہ سب؟“ زور شاہ سن کھڑے تھے۔

”چاندنی ان تمام کاموں میں طاق تھی..... اس نے میری مدد کی تو کام آسان ہو گیا..... سب کچھ ٹھیک تھا..... آپ نے بھی یقین کر لیا..... آپ کا اعتبار مہر پر سے اٹھ گیا..... مجھے اور کیا چاہیے تھا مگر بالآخر مجھے اس کا صبر کھا گیا..... مہر و مہر وفا کا پیکر تھی..... سب کچھ سہہ گئی..... تمام تکالیف کا بس کر مقابلہ کیا..... میں نے اس کے کردار کو داغدار کیا مگر وہ آج بھی باکر دار ہے۔ اس کا کردار اس کا بیٹا ریبال ہے اور میں نے سب کچھ گنوا دیا..... چاندنی کے سہارے کامیابی حاصل کرنا چاہتی تھی..... وہ سہارا بھی سب سے پہلے چھن گیا..... اولاد آوارہ اور نکلی نکلی..... بیٹا جیل میں ہے..... بیٹی اپنی مرضی سے چلی گئی..... شوہر کا پتا نہیں..... معافی

حالات خراب ہو گئے۔ سب ختم ہو گیا اور اب بیماری نے میرا کام تمام کر دیا ہے..... میں نے وہ لغافہ اسے آج تک نہیں دیا..... مگر اس نے کبھی دوسری شادی کا نہ سوچا..... وہ آج بھی آپ کے نام پر بیٹھی ہے..... آپ اسے منالینجیے..... وہ وفا کا پیکر ہے..... ورنہ میرا خدا مجھے معاف نہیں کرے گا..... مگر آپ ضرور معاف کر دیں..... مہر و سہ بھی کہیے گا مجھے معاف کر دے..... مجھے بہت سزا مل چکی ہے..... میں نے اسے بہت تکلیف دی ہے..... بہت تکلیف دی ہے.....“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بکیتی ہوئی معافی مانگتی ہوئی جیسے بے ہوش ہو گئی تھیں.....

”اف میرے اللہ..... خون کا رشتہ اور اتنا ظلم..... سنگین ظلم.....“ محبت اللہ کا وجود مل رہا تھا..... ”مہر و بھابی تو ویسے بھی مظلوم ہی تھی..... یہ سب سن کر تو ان کی عزت تو قیور اور بڑھ گئی.....“

زور کے قدم بھاری ہو گئے تھے..... وہ اپنے وجود کو سنبھالے ایک نظر بے ہوش پڑی زینب التسا کو دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے..... دل کو کسی بل قرار نہ تھا..... اس انکشاف نے ان کی دنیا ہلا کر رکھ دی تھی.....

”وہ میرا دل و نظر تھی..... کیسے دل سے نکل گئی..... اور میری نظر سے گر گئی میں نے ایک بل کو بھی نہیں سوچا کہ وہ ایسی کیسے ہو سکتی ہے؟“ پچھتاؤں کے سمندر میں وہ ڈوب ڈوب ابھر رہے تھے۔

”کیا تم نے واقعی مہر و کو طلاق دے دی تھی.....؟“

محبت اللہ نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”نہیں.....“ وہ سپاٹ لہجے میں بولے..... انہیں اپنی آواز دور سے آتی سنا دی.....

”تا عمر شکل نہ دیکھنے کی سزا دی تھی.....“

”اور وہ مہر کا چپک بھی تو تھا.....“

”وہ زندگی گزارنے کے لیے دیا تھا.....“ زور شاہ نے دور کہیں سامنے دیکھتے ہوئے کہا..... ”معاہدہ کیا تھا اس کے ساتھ میں نے ان کاغذات کے ذریعے..... اور اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی.....

”تم نے میرا نام کہیں اور کسی کے سامنے لیا تو میں

حق میں بند کر دیے تھے۔

☆.....☆.....☆.....

جنگجوڑے کھلی بگیا سب میں اس کے روپ

اس کی ہر کھاس کی چھاؤں اس کی ہر چادھوپ

پوجا اس کی جانچو جس کو انسانوں سے پیار

درد نہ ہو تو لاکھ برس کی پوجا ہے بیکار

سادھو بھائی اس دنیا میں سب سے ملنے جا

جانے کون سے بھیس ماں لپکتاں کو ملے خدا

زیب التسمائی کا رزق بن چکی تھی..... مہر التسمائی کو

اطلاع دینا ہے سود تھا..... وہ سمندر پار تھی۔ اپنے بیٹے کی

کامیابی کے جشن میں مگن..... اس کا ہونا ریبال کے لیے

بہت اہم تھا۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار نہیں کیا رہا تھا..... صرف

بیس دنوں کے لیے مہر التسمائی کو اجازت ملی تھی اور یہ بیس

دن ریبال کی زندگی کے کامیاب اہم ترین دن تھے.....

اس کی خوشی کا ہر لمحہ جانتے گزر رہا تھا..... ماں بھی کتنی

بڑی، حسین اور انمول نعمت ہے..... وہ اس تصور سے ہی

خود کو بہلا رہا تھا کہ جب کانوینکشن میں اپنی ماں کے

سامنے ڈاکٹر بیٹ کی ڈگری کے لگاتو ماں کو کتنا فخر ہوگا.....

اس پر وہ اکثر بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگتا۔

اور جہاں نور اس کی ایک، ایک حرکت کو نوٹ

کرتی..... اور جھپٹتے ہوئے کہتی۔

”میرا خیال ہے اسی تمہارے منہ میں نوالہ ڈال

رہی ہیں..... اس لیے تم مسکرارہے ہو، ہے ناں

ریبال.....؟“ اور وہ جھینپ جاتا..... یوں ہی انتظار کی

کیفیت سے گزرتے ہوئے وہ دن آ پہنچا..... جب وہ

ہیلمبرگ کے Helmut Schmidt

Flughafer ائر پورٹ پہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا ان کا

بے چینی سے انتظار کر رہا تھا..... جہاں نور کافی شاپ

سے کافی لینے چلی گئی تھی۔

جرمن قوم بھی اپنی ثقافت اور تہذیب کی عکاس

ہوتی ہے..... ائر پورٹ کی مینجر لابی بھی ائر پورٹ کی

طرح چمکتی ہوئی تھی..... چھوٹے، چھوٹے کیمبن، کافی

شاپ، ریسٹورنٹ، کبے شاپ سب ہی کچھ سلیقے سے

تمہارا بہت برا حشر کروں گا..... تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی.....“ انہیں اپنے الفاظ کی بازگشت سنا کی دے رہی تھی..... لہجہ سخت اور سرد تھا۔

اس کی سسکیاں ان کے کانوں میں آج بھی گونجتی

تھیں..... کئی بار ان کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے

آنسو اپنی ہتھیلی میں جذب کر لیں..... مگر انہوں نے اپنے

اس جذبے کو دبا کر..... بے حس بن کر ردائیکم کو اپنا

لیا..... وہ سوچ میں گم آگے بڑھ رہے تھے..... اعزاز

سے بھی بے نیاز کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

تب ہی ان کے پیچھے سے دوڑتے قدموں کی

ٹھک ٹھک سنا کی دی..... ایک سلیو زی..... وہ..... وہ.....

خاتون..... وہ خاتون مرگئی ہیں..... کیا آپ ان کے کسی

وارث کو جانتے ہیں..... ہم ڈیڈ باڈی ایسے ہی کسی کے

حوالے نہیں کر سکتے.....“

وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے چلی گئی..... دکھ

میں سب گرفتار ہو گئے۔

”اوکے، یہ ذمے داری میں لیتا ہوں، آپ

چلیں.....“ زوار اس کے ساتھ استقبالیہ کی جانب بڑھ

گئے تھے..... زیب التسمائی کے سفر کا آخری مرحلہ تھا..... جو

ان کے حصے میں آیا۔

”یہ ہے انسان..... اپنے مفاد کی خاطر دوسرے کو تباہ

کر دیا..... کیا ملا.....؟ آج مٹی کے اوپر اوکل مٹی کے

نیچے.....“

”اور میں ہار گیا مہر..... جدائی کے طویل راستے

اور محبت کی شدت..... کیا میں ان زیادتیوں کی تلافی کبھی

کر سکوں گا..... جو میں نے اپنے اور تمہارے درمیان روا

رکھی.....“ سوچوں ہی سوچوں میں مہر التسمائی سے باتیں

کرتے ہوئے انہوں نے زیب التسمائی کے سارے

واجبات ادا کر دیے۔

روزی کی تلاش میں زیب التسمائی کی موت آڑے

آگئی..... اور تلاش لا حاصل رہی..... پولیس اور ایف

آئی اے کے اہلکار الرٹ تھے..... مگر وہ کہاں تھی.....

زمین کھا گئی یا آسمان.....؟ سارے راستے اس نے اپنے

”سیدنا کی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ویسے آئی کے لیے میں نے بھی بہت کچھ سوچا۔ ہے۔“

”کیا.....؟“

”میں انہیں یہاں کے sea points دکھاؤں گی۔ جو تم نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔“

”یہاں سمندر ہے.....؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”تم تو اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو کر دیا میں نے تمہیں پانی، پانی یا تمہاری میموری کہیں چلی گئی ہے خیر جانے دو۔“ وہ ادائے بے نازی سے بولی۔ ”میں انہیں ریسٹورنٹ لے کر جاؤں گی اور مرے کے کھانے کھلاؤں گی۔“

”معاف کر دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”حلال ریسٹورنٹ تلاش کرنا پڑے گا۔“

”مجھ سے زیادہ جانتے ہو اس جگہ کے بارے میں۔“ وہ اس کا سنسراڑا تے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں رہتی ہوں یا تم.....“ وہ چڑ کر بولی، لہجے میں خفگی تھی۔ ”سوری میڈم۔“ وہ معصومیت سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

جہاں نور کی ساری خفگی ختم ہو گئی، وہ ایسا پہلے کب تھا یہ انداز، یہ شوخی اس کے لیے بالکل جداسی..... وہ اس کی طرف بے ارادہ دیکھے گئی۔ ”ہیلو..... کیا ہوا.....؟“ اس نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر بولی۔

”امی کو..... میرا مطلب ہے آئی کو یہاں حلال ترکش ریسٹورنٹ لے جائیں گے اور پاکستانی ریسٹورنٹ Baloch اور Balochistan کی بھی دو برانچز ہیں وہاں ہر کھانا کھلایا جاسکتا ہے۔“

”اوکے..... اوکے۔“ ریبال نے اس کو روکا اور اسکرین کی طرف دیکھا۔ جہا لینڈ ہو رہا تھا، ان کے باہر ٹکڑے میں کم از کم آدھ یون گھنٹا ضرور تھا۔

”میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔“ وہ اچھی خاصی اردو بولنے لگی تھی۔ ریبال نے دلچسپی سے سنا دیکھا۔

”ہاں پلیز.....!“

آراستہ تھا..... جرمن محنتی ہونے کے ساتھ، ساتھ بہت بااخلاق بھی ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں ریبال نے محسوس کیا تھا کہ ان کا مطالعے کا رجحان بہت وسیع ہوتا ہے..... دنیا بھر کی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ اور تحقیقی مقالات بھی شائع ہوتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی نمائش یہاں جرمنی میں ہوتی ہے۔ جب ہی تو ہائیزل برگ سٹی میں ایک گلی علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے۔

میں امی کو ہائیزل برگ ضرور لے کر جاؤں گا جو Hilly area ہے۔ امی بہت خوش ہوں گی وہاں جاکر انہیں علامہ اقبال سے ویسے بھی بہت عقیدت ہے۔ کتنے اشعار تو ان کو زبانِ یاد تھے۔ وہ سوچوں میں کم اپنی والدہ کے لیے جانے کون کون سے پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جہاں نور اس سے تین فٹ کے فاصلے پر کافی شاپ سے کافی لینے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس نے پلٹ کر یونہی ریبال کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے آپ میں کم دکھائی دیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ ”ماں کا انتظار ہے۔“ اور پھر اس کی طرف بڑھ گئی کافی کے گک کے لیے۔

بھاپ اڑاتی Choco Coffee کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ اپنے خیالات کی دنیا سے واپس آ گیا۔ ریشمی عبا یا بنے وہ ہاتھوں میں کافی کے گک لیے کھڑی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی گک اس کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ.....“ وہ کافی کا لطف لینے لگا۔

جہاں نور نے اس کی طرف دیکھا، وہ بہت خوش اور آسودہ دکھائی دے رہا تھا۔

”بہت خوش ہو..... ہے ناں.....!“

”ہاں..... بہت.....“ وہ بہت جوش و خروش سے بولا۔ ”مجھے پتا ہے، تم اپنی امی کے لیے پلاننگ کر رہے تھے کہ میں انہیں یہاں لے کر جاؤں گا وہاں گھماؤں گا، ہے ناں؟“

”ریٹیل مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟“ وہ حیرت میں پڑ گیا۔

طرح انہیں دیکھے جا رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔ انہوں نے ریبال کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور آنکھوں سے آنسو گرتے رہے پھر مسکراتے ہوئے اسے اطراف کے ماحول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے لے آئیں۔ اتنا جینس مین مگر ماں کے آگے ایک معصوم بچہ لگ رہا تھا۔ جیسے میلے میں ان سے کھو گیا تھا اور اب ان کا ہاتھ پکڑے انہیں کندھے سے لگائے وہ لوگوں کے ہجوم سے ذرا آگے آ گیا۔ وہ اپنی دھن میں ماں سے باتیں کرتا ایک لمحے کو رکا، مڑا اور پھر کہا۔

”اوہ امی، ٹھہریں۔“ جہاں نور کو تلاشنے لگا۔
”یہیں تو تھی، کہاں ہے؟“

وہ اس کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ امی بھی اس کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔

”کون بیٹا، کس کو دیکھ رہے ہو؟“

”السلام علیکم۔۔۔۔۔! میں یہاں ہوں۔“ وہ مہر النساء بیگم کے سامنے آتی ہوئی بولی تو مہر النساء نے دراز قد، رشمی عبا میں ملبوس خوب صورت و دشنہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”میں نے آپ کے بیٹے کے کردار کو دیکھ کر اسلام

قبول کیا ہے۔ اور میرا نام جہاں نور ہے۔“ وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی تو مہر النساء بیگم نے اسے گلے لگا لیا۔ انہیں جہاں نور بہت اچھی لگی تھی۔

”تو آپ میرے ساتھ رہیں گی۔“ وہ بہت دھن سے بولی اور ان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگی۔ مکمل استحقاق کے ساتھ۔

☆.....☆.....☆.....

"when you focus on problems

you will have more problems

but

when you focus on possibilities

you will have more"

وہ اس مقولے پر پورا اتر رہی تھی۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی حلال ریہ ٹورنٹ کے علاوہ ہم انہیں Internationally Famous ایک ہوٹل ہے، لٹلانک وہاں بھی لے جاسکتے ہیں اور Alster بھی جائیں گے جو پانی پر بیٹا ہوا ہے۔ کچھ یاد آیا تمہیں؟“ جہاں نور نے اسے یاد دلایا جب وہ جینی تھی۔ ریبال کی آنکھوں میں وہ یاد لہرائی۔ ”اس کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں، پاکستان میں جس طرح منگی فوڈ اسٹریٹس ہیں۔ یہاں بھی ہیں اسی علاقے میں جہاں تم رہتے ہو۔ یہاں پر بھی بہت اچھی فوڈ اسٹریٹ موجود ہے۔“ ”آف، تم کتنا بولتی ہو۔ میری امی اتنا کچھ نہیں کھا سکتیں۔ وہ بہت سادہ مزاج ہیں۔ سادہ کھانا کھاتی ہیں۔ سمجھیں جہاں نور بیگم اور پلیز مجھ میں ہمت نہیں ہے اتنے ریٹورنس کے بارے میں سننے کی، ہم بہت فقیر لوگ ہیں جہاں نور بیگم ہمیں اپنی چادر میں رہنے دو۔“ وہ بے رخی سے بولا۔

”ہیں۔۔۔۔۔“ وہ ہکا بکا ہو گئی۔ ”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“
”اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھانا میری امی کو وہ پسند آئے گا! اوکے۔“

”اوکے“ وہ خوشی اور تانجی میں گردن ہلا کر رہ گئی۔
”چلو اس طرف چلتے ہیں۔ فلائٹ آگئی ہے، مسافر آرہے ہیں۔“ وہ تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ وہ بھی ریبال کے ساتھ ہر خاتون میں ریبال کی امی کو ڈھونڈتی رہی۔

”امی، امی، وہ رہیں امی۔۔۔۔۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے تعاقب میں جہاں نور نے اس سمت کو دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں ملبوس سر پہ اسی رنگ کا جارجٹ کا دوپٹا لیے اور کاندھوں پر میرون اور آف وہائٹ کبی ٹیشن کی شال لیے، وہ مہر النساء بیگم میں۔ ریبال کی والدہ، باوقار اور سادہ خاتون۔ وہ ریبال کو دیکھ کر آگے بڑھیں اور اس کے گلے لگ گئیں۔ ان پورٹ پہ یوں تو ملنے والے تڑپ کر رہی ملے ہیں اور اشکبار آنکھوں سے استقبال بھی کرتے ہیں اور خدا حافظ بھی کہتے ہیں مگر ریبال کے لیے دنیا میں صرف ایک ہی ہستی ایسی تھی اور وہ تھی اس کی ماں۔۔۔۔۔ اس کی کل کائنات۔ وہ دوپٹوں کی

آج اس کا شہر میں آخری دن تھا..... جہاز پرواز کے لیے تیار تھا..... اس کا کام ہو چکا تھا..... ہر جگہ پراس نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے..... وہ چاندنی نہیں تھی جو دل کو تھیل کا چھالانا چلتی.....

اس نے ہمیشہ مسائل اور مشکلات کو نفرت سے دیکھا..... اور اپنے پُر اعتماد انداز کے ساتھ ہر جگہ اپنی

بہیمان بنائی منفی اعزاز کے باوجود "be positive" بن کر کامیابی حاصل کی.....

لوگوں کی نفسیات سے کھیلتا، مہرہ بنا کر بساط پلٹ دینا اس کے لیے بالکل مشکل نہ تھا.....

ان احکامات یہ کام کیا جہاں کامیابی اس کے قدم چومتی مگر افسوس کا لٹھ پیدا ہو ہی جاتا ہے..... چاندنی کے قاتلوں کا پتا چل ہی نہ سکا..... یہ پہلی شکست اسے کھائے جا رہی تھی..... اس کی جان سے عزیز بہن آج زندہ ہوئی تو حالات ہی کچھ اور ہوتے..... جب اسے چاندنی کی موت کی خبر دی گئی تو وہ کہتے میں آگئی تھی..... وہ کیسے زندگی کی طرف واپس آئی اسے کچھ احساس نہ تھا..... اس وقت وہ سولہ سال کی ہو چکی تھی..... جب اس نے اے لیول کر لیا تھا اور چاندنی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مزید تعلیم کے لیے اسے بیرون ملک بھیجے گی..... مگر سارے خواب بکھر گئے تھے..... اس کی موت نے مفلسی کی چادر دراز کر دی تھی..... تب ایک دن چاندنی کے پاس آئے اور اسے پُرکشش معاوضے کی پیشکش کی اور یہ بھی کہا کہ اگر چاندنی کی موت کا انتقام لینا ہے تو ہمارے گروپ کا حصہ بننا ہوگا اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر انہیں جوائن کر لیا..... غلط کام، غلط لوگ..... اس نے کچھ نہیں دیکھا..... اپنی بہن کی موت کے غم میں وہ انتقام کی آگ میں جھلتی رہی..... اور وقت نے اسے روزینہ سے روزی بنا دیا۔

پاکستان آنے کے بعد حالات کچھ موافق ہوئے اور اس نے زوار گروپ کو جوائن کیا..... نشیات کی سپلائی یونیورسٹی اور کالجز میں بہت منظم طریقے سے اس کے

زیر نگرانی ہوتی رہی..... بگ باس نے جو تصویریں اسے میل کی تھیں۔ وہ زوار شاہ اور محبت اللہ کی تھیں..... اصل قاتل کون ہے یہ پتا لگانا مشکل نہ تھا..... فیضان شاہ کو ٹریپ کرنا۔ اس کے بائیس ہاتھ کا کھیل تھا..... جی پی ایس ٹریسر کے ذریعے لمحہ، لمحہ کی خبر ملتی رہی..... "زوار کی بیوی کو مروا دیا، فیضان کو نٹے کا عادی بنا دیا۔" تمام داؤد بچ آزما کے راز کھلنے والا تھا کہ واپسی کا حکم نامہ مل گیا..... اور وہ واپس سنگاپور آگئی تھی..... جب ایک روز ہم کی طرح چاندنی کی موت کا راز کھل گیا..... بگ باس نے سر دھری سے کہا..... "نو پرابلم روزی..... تم اس لیے کامیاب ہو کہ تم دل کی جگہ دماغ رکھتی ہو..... اور تمہاری بہن دل کے چکر میں آکر کمزور پڑ گئی تھی..... اگر وہ خودکشی نہ کرتی تو اوپر والے مار دیتے..... وہ بیوقوف تھی۔"

"چاندنی نے خودکشی کی تھی؟.....؟" حیرتوں کے جھٹکے اس کے وجود کو ہلا گئے..... مگر یہ سب کچھ ہی دیر کے لیے تھا..... اس نے خود کو نابل کیا..... اسے سارا گیم کچھ آگیا تھا..... وہ ایک سفر کے لیے چھپی بن کر روانہ ہو گئی..... سبز اور جیل اس کے لیے نہ تھے..... اور قصاص کے معنوں سے وہ کوسوں دور تھی.....

☆.....☆.....☆.....

بدلتے موسم کی رُت ہے
میدانوں میں اندھیرا ہے
وہ سامنے اونچی کرسی کے مکانوں کی نیم روشنی میں
دروازوں کے باہر کھڑے
لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں
گزرے ہوئے دنوں کی
آنے والے ماہ و سال کی
کچھ پتا نہیں چلتا
بس دور سے ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے ہیں
دور دیس سے منظر بدل جاتا ہے

"فیضان شاہ ہنوز اسی صورت میں ہے....." زوار شاہ، محبت اللہ اور اعزاز شاہ اسپتال کی لابی میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔

سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے کہ اپنے، اپنے غم کو پھر سے اپنے اندر سیٹھ لیں۔

”میں نے ان کے اندر متا دیکھی تھی..... میرا دل چاہتا تھا مہر التا آئی میری ماں ہوتیں تو میں کتنا خوش نصیب ہوتا۔“ اعزاز شاہ، مہر التا بیگم کے بارے میں سوچنے لگے۔ ”مجھے ریال پہ کتنا رشک آتا تھا..... ایک ایسی محبت اور پیار مجھے ان سے ملا جو میری سمجھ سے باہر تھا..... بابا نے اتنی نیک خاتون کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟..... مجھ میں اور بابا میں یہی تو فرق ہے کہ میں واپس چھٹی عورت کو برداشت کر گیا..... اور بابا کمزور لحوں کا شکار

ہو گئے، کاش یہ افراتفری جلدی ختم ہو جائے سارے حالات جلد سے جلد بہتر ہو جائیں.....“ اعزاز نے شدت سے دعا کی۔

”فیضان صحت یاب ہو جائے..... تو پھر میں خود مہر التا امی کو مناؤں گا..... وہ بابا کو معاف کر دیں گی.....“ پھر اس کا ذہن تشریم کی طرف چلا گیا۔

”نہ جانے تشریم کیسی ہے؟..... وہ مجھے بھولے گی تو نہیں.....“ ان کے اندر وہم نہ سراٹھایا۔

”نہیں.....“ ایک صدمانے احساس دلایا۔

”ریال میرا بھائی ہے؟.....؟“ وہ مان سے سوچ گئے..... ایک سرخوشی کا احساس سر اٹھانے لگا..... ”انشا اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس کچہری کے چکر بھی ختم ہو جائیں گے۔“ اور اسی لمحے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی..... تینوں اپنی سوچوں سے باہر نکلے..... سامنے دو پولیس آفیسر کھڑے تھے۔

”جی آفیسر..... روزی کی کوئی خبر ملی؟.....؟“ زوار شاہ نے پوچھا۔

”زوار صاحب..... روزی کی تلاش جاری ہے مگر آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔“

”کیا.....؟ سب کچھ تو داؤ پر لگ گیا اب اس سے

بری خبر کیا ہو سکتی ہے؟.....“ محبت اللہ نے سوچا۔

”مجھے افسوس ہے سر..... آپ کی مرسدیز گھر

سب کے ذہنوں میں الگ، الگ کہانیاں گردش کر رہی تھیں۔

محبت اللہ، روزی کے چھلاوا ہونے سے بے حد پریشان تھے..... مسلسل آٹھ گھنٹے کی پولیس کی بھرپور کوششوں کے باوجود وہ کہیں سے دستیاب نہ ہوئی..... اللہ اس کے خلاف بہت سے ثبوت سامنے آ گئے تھے..... وہ منشیات فروخت کرنے والے بڑے گینگ سے وابستہ تھی۔

تمام تعلیمی اداروں میں یہ سہلائی بے آسانی ہو رہی تھی..... اور براٹر لیمپسڈر کا ٹیک لگا کر مختلف ممالک میں کیش رقم بہت سلیقے سے سہلائی ہو رہی تھی۔ ایجنسیاں پیسے بے بس تھیں..... اعزاز شاہ نے روزی کے فوٹو گراف اور تفصیلات ایجنسیوں کو میل کر دیے تھے۔

اس افراتفری میں ابھی تک روا بیگم کی طرف کسی کا ہیمان نہیں کیا تھا..... بے درپے انکشافات اور صدموں نے سب کے ذہن ماؤف کر دیے تھے..... کوئی کسی سے نظریں ملا کر بات نہیں کر رہا تھا سب کم تھے یا کسی خبر کے منتظر تھے۔

محبت اللہ نے چاندنی کو چاہا تھا..... اسے پانے کے لیے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی تھی..... وہ دل سے گھر بسانا چاہتی تھی مگر جن راہوں پر وہ تھی..... وہ کانٹے اسے بھی خود سے جدا نہ کرتے..... محبت اللہ دل لگتے ہو کر یہاں سے چلے گئے تھے باہر اور زندگی بھر ملائی نہیں کی۔ زوار کے کاروبار کو سنبھالتے رہے اور اب ایک عرصے بعد واپس ہوئی تو لگا کہ وقت پر لگا کر پیچھے کی طرف چلا گیا ہے..... سب بے سود ہوا۔

روزی نے ان کا بہت نقصان کیا تھا..... کاروبار، مراسم اور اولاد سب کو اپنے حساب سے چلا رہی تھی..... اعزاز پہ ہاتھ شاید اس لیے نہیں ڈال سکی کہ اس کی ماں کی ماں کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں..... مگر واپس کو اس نے بری طرح ٹریپ کر کے بالآخر غلطیہ کر دیا تھا..... گھر ٹوڑنے میں تو کامیاب ہو گئی تھی۔

”آف.....“ زوار شاہ نے کراہ کر سوچا۔

اسکرین پر ایک پُرکشش شخصیت کا چہرہ نمایاں تھا..... کھنی موٹھیں، مسکراتے لب، ذہن اور چمکدار آنکھیں لیے تھمرہ سے ہم کلام تھا۔

وہ پیار اور محبت سے اس کو مٹا رہا تھا..... اس کی وہ ساری باتیں اسے یاد دل رہی تھیں..... جو اس کی ڈائری میں قید تھیں۔

”اسے میری ڈائری کی باتیں کیسے معلوم.....؟“

یہ اتنا مجھے کیسے جانتا ہے.....؟“

وہ حیرتوں کے سمندر میں غرق ہوتی تو کم نہ تھا.....

اس نے جلدی سے ایک اور سی ڈی لگا لی۔

”اف اعزاز شاہ کیا کمال کا جادوگر ہے..... اس کے

سامنے تو پتھر بھی بول پڑے کتنی خوب صورت باتیں کرنا

ہے.....“ وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے اسے

دیکھتی رہی.....

”میرے لیے اس کے لہجے میں اتنا پیار کیوں

ہے؟ اور یہ کیا مجھ سے بات کر رہا ہے.....“ وہ اعزاز

شاہ کی ایک، ایک حرکت کو دیکھ رہی تھی..... ایک، ایک

لفظ سن رہی تھی۔

اور اس وقت اس کی پلکیں جھپکنا بھول

گئیں..... جب اعزاز شاہ نے اس کے ہاتھوں کی

vibratin کو محسوس کیا تو اس کے چہرے پہ خوشی کے

آثار نمایاں تھے..... جیسے کسی جیت کا احساس ہو.....

کیمرہ اعزاز شاہ کے فیس ایکسپریشن دکھا رہا تھا..... جہ

اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا..... تھمرہ نے لاشعوری طور

پر بھی..... ایک انجینی مرد کے لمس کو محسوس کیا اور یہ اس کی

قوت مدافعت اور اعزاز شاہ کی پہلی کامیابی تھی..... اس

نے مڑ کر کسی کو دیکھا تھا..... شاید یہ ڈاکٹر راجیل

ہوں..... پھر کیمرہ اینڈ پریشی ہوئی تھمرہ کو دکھانے لگا.....

جو بالکل بے سدھ لٹی تھی۔ بے حس و بے حرکت۔

”میں ایسی ہو گئی تھی..... کیوں.....؟“ اسے بہت

عجیب لگا۔

”نو..... ان باتوں کو نہیں سوچنا ہے..... بس آگے

دیکھنا ہے.....“

سے جب نکلی جس میں آپ کی بیگم بیٹھی تھیں..... حملہ آوروں نے انہیں آپ کی کھلی ہی میں شدید فائرنگ کر کے مار دیا ہے..... آپ کا چوکیدار آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا تھا..... اسے بھی گولیاں لگی ہیں وہ شدید زخمی ہے..... اس کے بیان پر ہی آپ کو اطلاع دی ہے..... میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں سر..... ان حملہ آوروں کی تلاش جاری ہے۔“

وہ سر جھکا کر سب بتا رہا تھا..... اور خاموشی کے

کتنے لمحے گزر گئے.....

”یا خدا.....! ہر پر رحم کر۔“

زوار شاہ کا دل چاہا وہ پھوٹ، پھوٹ کر

روئیں..... آگ لگا دیں ہر طرف..... اعزاز تیزی سے

لاٹی سے نکل کر بھاگے..... محبت اللہ نے انہیں جلدی سے

پکڑ کر قابو کیا۔

”ہوش میں آؤ اعزاز..... ممبر کر د میرے بچے.....

یہ خون اتنا اڑاں نہیں ہے..... خدا کی لگی بے آواز

ہے..... بہت جلد حساب ہوگا.....“ وہ کسی نہ کسی طرح

اعزاز کو روکنے میں کامیاب ہو گئے..... ورنہ وہ نہ جانے

کیا کر بیٹھتے۔

وہ اعزاز کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہوئے..... اعزاز

شاہ کی آنکھوں میں وحشت اتری ہوئی تھی..... وہ حال

سے بے حال ہوئے جارہے تھے..... ”یا اللہ..... یہ سب

کیا ہو رہا ہے..... رحم فرما..... رحم.....! وہ گڑ گڑا کر اللہ

کے حضور دعا کر رہے تھے۔

”میرے مالک کس گناہ کی سزا ہے..... میں زندہ

ہوں..... اور میرے پیارے یہ سب بھگت رہے

ہیں.....“ زوار شاہ جیسا مضبوط آدمی حالات کے اس

رنج پر کھرجا رہا تھا..... کیا یہ سب سہنا مقدّر تھا.....؟

☆.....☆.....☆.....

ایک صورت دل میں ساکی ہے

ایک شکل ہمیں پھر بھائی ہے

ہم آج بہت سرشار تھی

پراگلا موڑ جدائی ہے

”اچھا جی۔“ اور چینی کے ذکر پر وہ ہنس دی۔
 ”یہنا۔ تم بھی ناں۔۔۔۔۔۔ اب کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟“
 ”کچھ نہیں جی۔۔۔۔۔۔“ وہ تائی کا نام لینا نہیں چاہتی
 تھی۔۔۔۔۔۔ اس لیے ہنسنے ہوئے چلی گئی۔
 ”بی بی کو ایسی باتیں یاد مت دلانا۔۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر
 راجیل کی ہدایات یاد آئیں۔

”اس کو کیا ہوا۔۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت سے
 بڑبڑائی۔۔۔۔۔۔ پھر سر جھٹک کر آخری سی ڈی کو لگانے
 لگی۔۔۔۔۔۔ ”تو اعزاز صاحب نے خاصا ہوم ورک کیا ہے
 میرے اوپر۔۔۔۔۔۔ اتنا ریسرچ ورک تو میں نے اپنے
 ماسٹرز کے پراجیکٹ پہ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ میری مہرنگ کی
 ڈائری بھی استعمال ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔“ یہ آخری سی ڈی
 تھی۔۔۔۔۔۔ علاج کا آخری ہتھیار۔

سائیکو لایسٹ کا کامیاب وار اس نے کیا تھا۔۔۔۔۔۔
 تمام محرومیاں سامنے لا کر اسے ایک اور زندگی کا انعام پھر
 دیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ ریال کا نام بھی اعزاز شاہ نے لیا تھا۔۔۔۔۔۔
 اور وہ جو کمزور سے اعصاب کی مالک تھی۔۔۔۔۔۔ اس وقت
 خاصی مضبوط اعصاب کی مالک دکھائی دے رہی تھی۔

اس کے بچپن کی محرومیوں کی داستان اور پھر تشہیر
 کو اس کا احساس دلا کر شعور میں لانا۔۔۔۔۔۔ فاطمہ کی موت
 کے صدمے سے زندگی کی طرف بڑھانا۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس کا
 جج مارکر۔۔۔۔۔۔ احتجاج کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنا کہ وہ
 ایسی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ وہ بے قصور ہے۔۔۔۔۔۔ نہیں ہے وہ
 ایسی۔۔۔۔۔۔ اور بالآخر علاج کا رگڑ ثابت ہو گیا۔

اس نے ریویوٹ سے اسٹاپ کا بٹن دہانے کے
 بجائے۔۔۔۔۔۔ اعزاز کی ویڈیو ایک لمحہ کو Still کر دی۔
 اس نے اعزاز شاہ کو احسان مندی کے احساس سے دیکھا۔
 ”کیسا اس شخص کا احسان میں ساری زندگی اتار
 پاؤں گی۔۔۔۔۔۔؟ کاش میں اس کے کسی کام آسکوں۔۔۔۔۔۔؟“
 وہ گھٹنوں میں سر جھکا کے سوچنے لگی۔۔۔۔۔۔ ”انسان
 اللہ کی کن کن نعمتوں کی شکر گزاری کرے۔۔۔۔۔۔ ہر انسان
 فاطمہ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ امتحان سے گزارتے ہیں۔۔۔۔۔۔
 میں تو ایک طویل مسافت طے کر کے آئی۔۔۔۔۔۔ یا اللہ تیرا

”او کے۔۔۔۔۔۔!“ وہ مسکرائی۔۔۔۔۔۔ اور اسی پل۔۔۔۔۔۔
 ”تشہیرہ باجی اکیلے، اکیلے یوں کیوں آپ ہنس
 رہی ہو۔۔۔۔۔۔ مجھ کو بھی شامل کرلو۔۔۔۔۔۔“ یہنا۔۔۔۔۔۔ دھب،
 دھب کرتی چال کے ساتھ اندر آگئی۔۔۔۔۔۔ اور تشہیرہ کے
 ساتھ اسکرین کو دیکھ کے خود بھی ہنسنے لگی۔
 ”باجی آپ تو بالکل مست ہو گئی ہیں۔۔۔۔۔۔
 دیکھیں۔۔۔۔۔۔ وہ جو صاحب ہیں ناں۔۔۔۔۔۔ جن کا نام بڑا
 معزز سا ہے۔۔۔۔۔۔“ وہ انک کر بولی۔۔۔۔۔۔ ”یعنی اعزاز۔۔۔۔۔۔“
 وہ نام کو پہنچ کر بولی۔۔۔۔۔۔ انہوں نے جی۔۔۔۔۔۔ ”وہ ہاتھ کے
 اشارے سے وہ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔
 ”بہت پیارے صاحب ہیں یہ۔۔۔۔۔۔ انہوں نے
 ڈاکٹروں سے بڑھ کر آپ کی خدمت کی ہے۔۔۔۔۔۔ آپ
 کے بارے میں مجھ سے ایک، ایک بات پوچھ رہے
 تھے۔۔۔۔۔۔ آپ کو کیا پسند ہے کیا، نہیں۔۔۔۔۔۔ پھول، پودے
 آپ کے سارے گلے، ان کے نام، آپ کی کتابیں۔۔۔۔۔۔
 اور جی باجی جی۔۔۔۔۔۔ آپ کی یہ ڈائری بھی میں نے دی
 تھی۔۔۔۔۔۔ دیکھیں جی آج آپ ہمارے پاس ہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ
 خوش ہو کر تشہیرہ کے ہاتھوں کو چھونے لگی۔۔۔۔۔۔ اس کی محبت
 بھری باتوں پہ تشہیرہ کا دل خوش ہونے لگا۔
 ”تم خود بہت اچھی ہو یہنا۔۔۔۔۔۔ اسی لیے میں تمہیں
 اچھی لگتی ہوں۔۔۔۔۔۔“

”تشہیرہ باجی جی۔۔۔۔۔۔ آپ کے تایا کی تو یہ اتنی
 عزت کرتے ہیں جیسے ان ہی کے بیٹے ہوں۔۔۔۔۔۔ فرشتہ
 ہیں جی فرشتہ اعزاز صاحب۔۔۔۔۔۔ تایا جی کے مددگار تھے
 یہ۔۔۔۔۔۔“ پھر افسردہ لہجے میں بولی۔۔۔۔۔۔ ”پیارے کسی مشکل
 میں پڑ گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے
 ناں۔۔۔۔۔۔! ورنہ تو وہ آپ کے ساتھ ہر پل تھے۔۔۔۔۔۔ تایا
 جی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے دفتر بھی نہیں جاتے تھے۔۔۔۔۔۔
 آپ کی فائل پر کام کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔“ یہنا ڈاکٹر کی
 رپورٹ کے متعلق بات کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اب اس کا رکنا
 بہت مشکل تھا۔۔۔۔۔۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”اچھا بابا۔۔۔۔۔۔ اعزاز نامہ بند کرو اور میرے لیے
 اچھی سی چائے بنا لاؤ۔۔۔۔۔۔ چینی کم ڈالنا۔۔۔۔۔۔“

شکر ہے.....“ کاش میں اس کے کچھ کام آسکوں۔

وہ احساس تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر نہ جانے کتنی دیر اسی عالم میں رہی..... اسکرین یہ اعزاز شاہ کی تصویر پینگ ہو گئی تھی..... مینا نے اس کو یوں تم صم بیٹھے دیکھا تو گھبرا کر تایاجی کو بلا لائی..... وہ گھبرائے ہوئے دوڑے چلے آئے..... ان کی سانس پھولنے لگی تھی.....

”تشمیرہ بیٹی کیا ہوا.....؟“ اس طرح کیوں بیٹھی ہو.....؟“ وہ واقعی پریشان ہونے لگے تھے..... تایاجی کی آواز سن کر تشمیرہ نے سر اٹھایا تو ان کی جان میں جان آئی..... وہ سمجھ گئی مینا کی حرکت ہے یہ.....

”میں بالکل ٹھیک ہوں تایاجی.....“ وہ انگبار آنکھوں سے تایاجی کے شانے سے ٹکے ہوئے کہنے لگی۔

”میں آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں تایاجی.....“

پھر وہ اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی.....

”کیسے اترے گا یہ احسان..... کیا کروں میں.....؟“

”ارے میری بیٹی..... یہ سب محبتوں کے گلاب ہیں..... اور اعزاز بڑا پیارا بچہ ہے..... اسے اللہ نے ہماری مدد کے لیے ہی بھیجا تھا خیرا کر میں اس کی تعریف کرنے لگ گیا تو ڈائری کی ضرورت پڑے گی..... بس اب تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو..... تاکہ اس منصوبے پہ کام کیا جائے.....“

”میں بتاؤں گی.....“ مینا نے اتنا ہاتھ اٹھایا۔

”تمہیں..... کیسے بتاؤں کہ تمہاری تشمیرہ بی بی کیا کرنا چاہتی ہیں.....“ وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر شفقت سے پوچھ رہے تھے..... مینا کی گول، گول آنکھیں چمکنے لگیں۔

”تشمیرہ باجی کو تو پڑھنے کا بہت شوق ہے جی..... اور نوکری کرنے کا بھی بہت شوق ہے..... آپ ان کو اجازت دے دیں جی.....“ وہ اپنی دانست میں بہت ہوشیاری کی بات کر گئی۔

”واہ بھئی..... مینا کو تو سب پتا ہے.....“ پھر وہ تشمیرہ کی طرف مڑے..... ”اپنا ادھورا ماسٹرز مکمل کرو..... اور پھر جو چاہے کرو..... کوئی رکاوٹ نہیں..... میں اپنی بیٹی کو بس خوش دیکھنا چاہتا ہوں.....“ وہ اس کے

سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”میں بھی آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں تایاجی..... مجھے معلوم ہے آپ تائی جی کا ذکر میرے سامنے نہیں کرتے مگر میں ایک روز ان کو واپس اس گھر میں ضرور لاؤں گی.....“ فیصلہ کن لہجے میں سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

تایاجی جا چکے تھے..... مینا اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گرا صاف کرنے لگی اور اس کی نگاہ اعزاز کے دیے ہوئے گلدستے پر ٹھہر گئی اور وہ گل دتے میں جیسے قید ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

محبت دل کی مٹی میں اگا سر سبز برگد ہے

محبت اسم اعظم ہے محبت ظرف انسانی

محبت لہجہ ربی، محبت عہد آسمانی

محبت لفظ ”کن“ کا کارنامہ ہے

اوائل نومبر کا دودھیا پن ٹیمبرگ میں چھایا ہوا تھا..... گزشتہ رات ہونے والی بارش سے سڑکیں مزید نکھر گئی تھیں..... ٹیمبرگ میں درختوں کے درمیان گھیرے ایک چھوٹے سے صاف تھڑے علاقے میں یہ سات منزلہ عمارت تھی..... کب پارٹنگ ایریا میں رکی تو جہاں نور نے کار کا دروازہ کھول کر مہرلتسا کو احترام سے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے ساتھ ہی سہارا دیا.....

فرسٹ فلور پہ جہاں نور کا اپارٹمنٹ تھا..... ریبال سوٹ کیس تھا مے پیچھے آ رہا تھا۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا تو بائیں جانب ہی چھت پہ نصب ایک ہک سے لٹکا ہوا بہت دیدہ خوب صورت سا ڈنٹا ٹائم کا استقبالیہ منظر اچھا لگا..... جو پانچ فٹ سے زیادہ لمبا تھا..... گولڈن گرے پلیٹ تھی..... اور لڑکیاں لٹک رہی تھیں..... یوں محسوس ہوا تھا..... جیسے کوئی جادوئی کھلونا لٹکا ہو۔

جہاں نور نے ہولے سے لڑی کو چھوا تو لڑیوں کے بیچ اسٹک سے ٹکرانی اور ایک محسوس دھن بج اٹھی۔

خوب صورت الفاظ گولڈن پلیٹ پہ انگریزی میں کندا تھے..... (جس کا اردو ترجمہ یہ ہے)

لگا..... اتار کا شربت بہت عمدہ تھا..... روح سیراب ہوگئی..... دسترخوان پہ پلاؤ، شامی کباب کے ساتھ، ہی کا رائیہ بھی تھا..... اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا..... انہوں نے تعریف کی تو اس نے بے اختیار کہا۔

”یہ ریبال نہ کھایا ہے مجھے آپ بھی تو اس طرح بتاتی ہیں ناں..... آپ کی ریشمی ہے پوری.....“ جہاں نور کے اعتراف یہ انہوں نے کھیر کھاتے ریبال کو دیکھا..... اس نے بھی نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا..... مہرالتسا بیگم مسکرا دیں..... جہاں نور نے برتن سینے اور کمرے سے چلی گئی۔

”امی میں کل بیج چھ بجے آپ کو لینے آؤں گا.....“ صبح فوجی تقریب ہے..... میں اب چلتا ہوں آپ آرام کریں.....“ وہ ان کی پیشانی پہ پیار کرتا ہوا باہر نکل گیا..... اور جب جہاں نور قہوہ لے کر آئی تو اسے گئے دس منٹ ہو چکے تھے..... امی کو قہوہ دینے کے بعد اس نے ریبال کو ڈھونڈا۔

”ریبال.....؟“

”وہ چلا گیا ہے صبح آئے گا.....؟ تم بی لوقہوہ.....“

مہرالتسا کے چہرے پہ ایک رنگ آکر گزر گیا..... انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا..... ریبال کے جانے کا ملال اس کے چہرے پہ رقم تھا۔

”وہ صبح جلدی آئے گا..... ہم ساتھ چلیں گے.....“ یہ لڑکی موج نسیم کی طرح ہے..... اس کا دل بہت حساس ہے..... کسی ان دیکھے جذبے کی دھک انہیں دکھائی دے رہی تھی..... اس نے بے دلی سے قہوے کی تیسری پیالی اٹھالی تھی۔

اور جہاں نور کی میزبانی میں پہلا دن بہت اچھا گزر گیا تھا..... بیسیرگ کا سورج اگلے دن بہت جلدی روشن ہو گیا تھا..... ایسا انہیں محسوس ہوا۔

یہ کامیابیاں، یہ عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے
تمہارے دم سے ہیں میرے لبوں میں کھلتے گلاب
میرے وجود کا سارا نظام تم سے ہے

انسان جب اچھا سوچتا ہے تو اللہ خود ہی راستہ بنا دیتا ہے اور
مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں.....

انہوں نے مسکراتے ہوئے سوتی چہرے والی لڑکی کی طرف دیکھا..... جس کے مسکراتے چہرے پر نور کا ہالہ تھا..... وہ قدم قدم رکھتی..... اس کے ہمراہ اندر چلی آئیں..... ایک چھوٹے سے صاف سقرے کمرے میں اس نے انہیں ایک سنگل بیڈ پہ بٹھا دیا..... صاف سقری خوب صورت چادر اس پہ پھیٹی تھی..... سامنے دیوار کے ماتھ گلی کارزنٹیل سے پہلے ایک چھوٹا سا یک سیلف تھا..... جس پر مختلف کتابوں کی جلدیں رکھی تھیں..... قرآن پاک کے ساتھ ساتھ انجیل، توریت کے صحیفے بھی تھے..... کارزنٹیل پہ ایک فریم میں سورہ اخلاص کے عربی الفاظ جگمگا رہے تھے..... انہوں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں نور کی سادگی اور سلیقے کو سراہا..... ”والدین کے بغیر یہ کیسے رہتی ہوگی.....“ تب ہی تازہ اتار کے شروب کے دو گلاس وہ لے آئی۔

”بہت باہمت ہو تم بیٹی.....“

”جی.....“ اس نے کہا۔

”زندگی اگرچہ مشکل ہے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل مال ہو تو کوئی مشکل نہیں رہتی.....“ اس کی بات پر وہ مسکرائیں۔

”میں نے جینے کا سراغ پایا ہے آنٹی..... اس لیے کوئی خوف نہیں ہے بس آپ یہ جوس نہیں..... پھر میں آپ کے لیے پلاؤ بناتی ہوں..... شامی کباب کے ماتھ کھیر بھی ہے..... آپ کو پسند آئے گی.....“ وہ بہت پیار سے کہہ رہی تھی۔

مہرالتسا کو وہ بہت اچھی لگی۔

”ریبال کہاں ہے.....؟ وہ اندر نہیں آیا.....“

”وہ باہر ڈیننگ روم میں بیٹھے ہیں..... وہ اندر نہیں آئے..... آپ کی وجہ سے آج یہاں تک آگئے.....“ وہ مادگی سے کہہ رہی تھی..... انہیں اپنے بیٹے کے کردار پر یقین تھا..... اور آج ایک غیر لڑکی کے منہ سے سن کر اچھا

کہاں بساط جہاں اور میں کسں ونداں

یہ میری حیات کا سبب اہتمام تم سے ہے
صبح ہونے کا دل میں یقین رکھتے ہوئے فجر کی
اذان کی آواز کانوں میں ضرور سنائی دی..... جہاں نور
کے موبائل کے ذریعے انہوں نے time set کر کے
الارم لگا دیا تھا..... ایک خوب صورت اور پر نور صبح کا آغاز
تھا..... جہاں نور نے نماز کا اہتمام کیا اور مہرالنسا کے
ساتھ مل کر نماز پڑھی..... ان کے کپڑے پر لیں کر کے
نور ا دیے..... ہلکے پھلکے ناشتے میں صرف ٹوسٹ اور
چائے شامل تھی۔

انگوری رنگ کے سادہ سے شلوار سوٹ میں اور
بڑی چادر سر پہ لیے وہ بہت باوقار لگ رہی تھیں.....
جہاں نور کی عبا میں ملبوس تھی..... اس کا چہرہ میک
اپ سے بے نیاز تھا اور چمک رہا تھا..... ریبال مقررہ
وقت پہ آ گیا تھا..... آف وائٹ ڈریس پنٹ کے ساتھ
چاکلیٹی رنگ کا لشرٹ میں وہ بے حد اسٹارٹ لگ رہا
تھا..... آج کا دن اس کے لیے بہت خاص دن تھا.....
بہت بڑی کامیابی اس کی منتظر تھی۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کی ایک دوسری شاخ
جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں اسلامک اسکولز کے تحت عمل
میں آئی تھی..... ریبال نے PHD اسکالرشپ کے
ذریعے اس موقع کو avail کیا..... یونیورسٹی کے
آڈیٹوریم میں 400 سے زیادہ افراد کی محفائش تھی.....
ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا..... خوب صورت، تختی چہرے،
ذہانت کی چمک لیے ہوتے افراد..... وہ اپنی ماں کے
ساتھ آگے کی مخصوص نشستوں پر براجمان تھا..... جہاں
نور، مہرالنسا کے ساتھ بیٹھی تھی۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والے دو اور طالب علم تھے۔
چیف منسٹر ہیمبرگ مہمان خصوصی تھے اور پھر وہ لمحہ
قریب آ گیا جس کے لیے ایک ماں نے بیٹی کی شخصیت و
کردار سازی کی تھی۔

اپنے اوپر لگے الزام کو غلط ثابت کرنے کی کئی
صورتحس ہوتی ہے..... مظلوم شخص ظالم ہوتا ہے..... جو
گھٹ گھٹ کر مر جاتا ہے۔

ممبر کے گھونٹ پی کر اللہ پہ بھروسہ کرنا اور یہ یقین
رکھنا کہ وقت سب سے بڑا منصف ہے..... اور اکیلا
منصف نے آج فیصلہ سنایا تھا.....

سامنے ایک بڑی سی اسکرین تھی..... ریبال احمد کا
نام چمک رہا تھا اور پھر وہی نام ڈاکٹر ریبال احمد کے
ساتھ سے جگمگا اٹھا..... ساتھ ہی اس کا سنجیکٹ

"Comparative Studies of
Communication media in
networking"

بے تماشائیوں کی گونج میں ریبال اپنی ماں کے
ساتھ اسٹیج پہ چڑھ رہا تھا۔

مہرالنسا کی آنکھوں سے شکرانے کے آنسو رواں
تھے..... ذرا شاہ آج ہر قدم پہ آنکھیں یاد آرہے تھے۔
”کاش تم دیکھ سکو کہ ریبال آج عظمت کی کس

سیر می پہ ہے..... میرے اللہ نے مجھے سرخرو کر دیا.....
اور..... آج میں اپنے بیٹے کو ضرور بتاؤں گی کہ اس کے
باپ کا نام کیا ہے.....“

وہ اسٹیج پر ریبال کے ساتھ فخر سے کھڑی تھیں.....
چیف منسٹر ریبال سے ہاتھ ملا کر اسے ڈاکٹریٹ کی سند
دے رہے تھے..... اعزازی طور پر اسے کیش ایوارڈ،
شیلڈ دی جا رہی تھیں..... بین الاقوامی میڈیا چینلوں ایسے
موقعوں پر کوثریج کے لیے موجود ہوتے ہیں..... تعلیم ایک
ایسا شعبہ ہے جو ملکی ترقی کی راہ کو ہموار کرتا ہے اور اسی
ملک کے تعلیمی پس منظر کو بھی واضح کرتا ہے۔
”ڈاکٹر ریبال احمد فرام پاکستان.....“

بار بار اناؤنس ہو رہا تھا..... اور ریبال کے دھما
میں وطن کی محبت کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ مہرالنسا کو سب
مبارک بادے رہے تھے۔

ریبال کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو اس نے
صرف دو جملے کہے۔

”میری کامیابی صرف میری ماں کے دم سے
ہے..... اگر اللہ میری زندگی میں ماں جیسی نعمت نہ دیتا
میں آج یہاں نہ ہوتا.....“

تالیوں کی گونج میں وہ مبارک باد وصول کرتا نیچے

”بہت اچھی ہے.....“ انہوں نے زور دے کر کہا۔
 ”جی.....!“ ریبال نے سعادت مندی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اور پھر دن اتنی تیزی سے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا..... ایک روز وہ مہرالتسا کو لے کر اپنے اسکول بھی گئی جہاں وہ بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتی تھی..... انہوں نے اس کا ہر روپ دیکھا..... اسلام لانے سے پہلے وہ کیا تھی انہیں اس سے مطلب نہیں تھا لیکن اب وہ کیا ہے.....؟ یہ ان کے لیے اہم تھا..... اس کی آنکھوں میں حیا تھی..... اور یہ حیا بہت کم لڑکیوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔

انہوں نے ریبال کی کلاس فیلو تحمیرہ میں بھی مشرقیت کے بہت رنگ دیکھے تھے۔ ریبال کے دل میں تحمیرہ کے لیے نرم گوشہ تھا..... وہ اس سے بھی واقف تھیں..... انہیں وہ اچھی بھی لگی تھی..... مگر وہ کہاں تھی.....؟ کچھ اتنا پتا نہ تھا..... اعزاز سے ریبال نے کہا تھا مگر پھر اعزاز سے ان کی بات نہ ہو سکی..... وہ ان کا ٹکٹ کروا کر یقیناً مصروف ہو گیا ہوگا..... ورنہ وہ ضرور فون کرتا۔

”مجھے پاکستان دیکھنے کا شوق ہے.....“ جہاں نور نے اپنی خواہش کا اظہار کیا..... وہ دونوں واک کرتی ہوئی اسکول سے واپس گھر آرہی تھیں..... ”میں نے ریبال سے بھی کہا تھا..... کیا میں جاسکتی ہوں وہاں.....؟“ وہ مہرالتسا سے کہہ رہی تھی۔
 ”دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے.....“ مہرالتسا نے کہا..... ”اگر نیت اچھی ہو تو اللہ ضرور راستے ہموار کرتا ہے..... تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔“ ان کی بات پر وہ خوش ہو گئی تھی۔

”انشاء اللہ.....!“ آپ کو پتا ہے ریبال سے ملنے کے بعد میری زندگی بالکل بدل گئی ہے.....“
 ”اور ریبال کے جانے کے بعد.....؟“ مہرالتسا کے کہنے پر وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔

”میرا دل بند ہو جائے گا..... شاید میں اس کے پتا نہیں رہ سکتی.....“ وہ بہت سادگی سے اپنی محبت کا اظہار کر گئی۔

ا..... جہاں نور بہت خوشی سے آگے بڑھی مبارکبادی اور سرخ اور سفید گلابوں کا تختہ آگے بڑھا دیا۔
 ”بہت شکریہ جہاں نور.....!“ اس نے پھول تمام لیے۔
 ”بس شکریہ.....“ اس نے چھیڑا..... ”آپ کے اس ڈاکٹر بٹ کی ڈگری ہے ڈاکٹر ریبال احمد۔ آج میں آپ پورا ہیبر برگ گھمائیں..... آپ کے پاس کیش لم بھی خاصی ہے.....“
 ”بالکل ٹھیک ہے بیٹا..... آج جو جہاں نور کہے گی..... وہ ہی ہوگا۔“ مہرالتسا نے اس کی خوشی کا ساتھ دیا..... ”تو ریبال نے خندہ پیشانی سے سر جھکا لیا۔
 ”اوکے..... چلیے.....“

وہ بڑا یادگار دن تھا..... وہ ساری جگہیں اور طامات جو انہوں نے سوچ رکھی تھیں..... چھ گھنٹے میں اہم خاصا گھوم لیے تھے۔ وہ رات انہوں نے زوار سے گلوہ کرتے ہوئے گزاری۔

”محبت اللہ کو تو معلوم تھا کہ میں نے کس طرح ریبال کی پرورش کی..... مگر اے میرے اللہ تو اب بھی ارادہ شاہ کے دل میں رحم ڈال دے..... میرے لیے گواہی پیدا کر دے..... میں ان تمام لوگوں کو معاف کر لی ہوں جو میری تکلیف کا سبب بنے..... میں اپنی ان کو بھی معاف کرتی ہوں۔ اس کے مزاج میں سدا خود راضی تھی۔ میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں۔ میرے مالک نے مجھے سرخ رو کیا۔ یا اللہ تیری رحمتوں کے صدقے اسی سے زوار کو نرم دلی عطا فرما دے..... تاکہ میرے بچے کی یہ محرومی دور ہو جائے.....“ وہ روتے، روتے سولی تھیں..... اور اطمینان کی ایک لہر نے ان کو اندر سے مرشار کر دیا تھا۔

”جب تم پاکستان آؤ گے تو تمہیں تمہارے والد سے ضرور ملو آؤں گی..... یہ میرا وعدہ ہے.....“
 ”مجھے جہاں نور بہت اچھی لگی ہے.....“ پانی پہ بڑے اس حلال فوڈ ریستورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے ہوں نے ریبال سے کہا..... انہوں نے عقب میں دیکھا، ہاں نور سلاؤ کے باؤل میں سلاؤ کا انتخاب کر رہی تھی۔
 ”ہاں اچھی ہے.....“ ریبال نے سادہ لہجہ میں کہا۔

”تمہیں پتا ہے وہ.....“ مہرالتسا نے کچھ کہا ہی تھا کہ وہ بول اٹھی..... ”جی وہ اپنی دوست تشمیرہ کو پسند کرتا ہے.....“

”کیسے.....؟“ انہیں حیرت ہوئی۔

”میں نے اس کی پریشانی دیکھی تھی..... جب وہ اپنے دوست اعزاز شاہ کو اس کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں بھی آپ..... کو ایک بات بتاؤں.....“ وہ مہرالتسا سے بولی..... ”میں نے ایک بات ریبال سے چھپائی تھی..... اعزاز کا فون میں نے ریسیو کیا تھا..... وہ ریبال کو تشمیرہ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا کہ اس کا پتا چل گیا ہے..... وہ کوئے میں ہے..... عین شادی کے دن اس کے شوہر کا مر ڈر ہو گیا تھا.....“

”تمہیں پتا تھی یہ بات.....“ انہیں حیرت کا جھٹکا لگا..... ”اتنی بڑی بات ریبال کو معلوم ہونی چاہیے تھی۔“

”ہاں..... مگر میں نے ریبال کو نہیں بتایا..... وہ ڈسٹرب ہو جاتا کیونکہ اس کو یہاں سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا..... میں اس کو اس ڈنٹی پریشانی سے اکیلی کیسے بچا سکتی تھی..... میں نے بس اتنا کہا کہ اعزاز شاہ نے تشمیرہ کے کیس کو سنبھال لیا ہے.....“

”اعزاز میں یہ خصوصیت تو بہت زیادہ ہے..... وہ انسان دوست اور ہمدرد بچہ ہے.....“ انہیں اعزاز کی یاد آنے لگی۔

”کیا ہوا ہے تشمیرہ کے ساتھ.....؟“ یہ آواز ریبال کی تھی جو جہاں نور اور ماں کی گفتگو کا آخری حصہ سن چکا تھا..... اس کے لہجے میں بے حد تنجیدگی تھی۔

جہاں نور کو ڈر لگا..... اولین دنوں کا سا لہجہ جب وہ جرنی آیا تھا.....

”تم نے کیوں چھپائی یہ بات.....؟“ وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

”میں اس کے لیے پریشان تھا اور یہ بات تم جانتی تھیں.....“ وہ بے حد غصے میں تھا..... ”تم اعزاز سے کاٹلیٹ میں رہیں، کیوں کہ کسی حیثیت سے ہمیں سب سمجھتا ہوں تم یہ ہتھکنڈے میرے اوپر نہ آزماد..... یہ مجھ پر نہیں چلیں گے.....“

”ریبال زبان سنبھال کر بات کرو.....“ لہجے میں تم بات کر رہے ہو..... ہوش میں تو ہوں..... نے صرف آخری بات سن کر فیصلہ کر لیا..... یہ ترہ ہے میری.....؟ معافی مانگو اس سے.....“ انہیں مل برالگا تھا۔

”ای پلیز.....!“

”مجھے کچھ نہیں سننا..... میرا بیٹا ایسا کچھ ہو سکتا ہے.....؟ سواری کہو جہاں نور سے.....“ ریبال نے سر جھکا لیا۔

”جہاں نور.....“ مہرالتسا نے پکارا..... اس کا خاموشی کو محسوس کر کے انہوں نے اس کی طرف دیکھا..... وہ زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔

”جہاں نور.....“ ریبال نے پکارا..... مسلسل خاموشی.....

اس نے فوراً ایسولینس کال کی..... سائرن بھلا ایسولینس جلد آگئی..... پندرہ منٹ میں وہ مقامی اسپتال میں تھے..... ایمر جنسی میں اس کو رکھا گیا تھا..... ریبال بے حد پریشانی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا..... مہرالتسا الگ فکرہ تھیں..... آدھے پون گھنٹے بعد ڈاکٹر ایمر جنسی وارڈ سے آگئے تو ریبال کو بلایا..... مہرالتسا بھی ساتھ تھیں.....

”بلڈ پریشر خطرناک حد تک لوٹھا..... خروں برک ڈاؤن کے قریب تھیں..... بچت ہوگئی ہے.....“

رہیں انہیں..... ابھی بہت young ہیں وہ..... ڈوٹل وری انہیں ریلیکس کرنے کے لیے انجیکشن دے دے..... ایک گھنٹا انہیں آرام کرنے دیں..... اوکے.....“

اور جب وہ ریبال اور مہرالتسا کے سہارے گواہیں آئی تو بہت خاموش تھی..... ریبال بہت شرمندہ تھا.....

”سواری مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا..... تمہیں تکلیف پہنچی..... تمہارا دل دکھایا..... معاف کرو دو پلیز.....“

”میں نے معاف کیا.....“ جہاں نور نے کہا۔

”دیکھیں ریبال..... جب میں دائرہ اسلام ٹم داخل ہوگئی ہوں تو ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں جو میرے کردار کو چوٹ پہنچائے..... مجھے اللہ یہ یقین ہے کہ جو مجھ تک پہنچی ہوگی وہ خود پہنچ جائے گی..... اسے چھل سے کیا حاصل.....“

ریبال اس کی بات پر اسے گہری نظر سے کیا حاصل.....

”حکم دے کر گئی ہیں کہ گھر چھوڑ کر آتا.....
سجھیں..... چلو اب“

اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی.....
چند دنوں بعد رپال کی بھی واپسی تھی مگر تیسری انگلی میں
پہنی مہر النسا کی نشانی ایک عہد نامہ تھا..... جو اس کو سرور
دیتا تھا۔

.....☆.....☆.....☆.....

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیا ب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL مامو مائل نمبر -

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیۃ الیکسینشن و فیفس باؤسٹک اشعار کی پہلی کوئی روایت

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

نہ دیکھ کر رہ گیا۔

”میں نے اعزاز سے کہا تھا جب حالات بہتر ہوں گے تو آپ ریال سے بات کر لیں..... کیونکہ تسمیرہ کی سبکدوشی تقریبی میں اعزاز کو باقاعدہ ہائر کیا گیا تھا۔ ان لوگوں آپ ذہنی دباؤ کا شکار تھے..... اسی کے آنے کا مسئلہ اور دیگر مسئلوں کی وجہ سے میں نے چھپایا..... ورنہ آج اسی درجہ درمیان نہ ہوتی.....“ اس نے مہرالنسا کی طرف دیکھا..... انہوں نے پیار سے دونوں کی طرف دیکھا۔

”بیٹا پرسوں مجھے چلے جانا ہے..... لہذا تم دونوں کو بھی کرلو..... ان بیس دنوں میں ایک لڑائی نہیں دیکھی تھی۔“ وہ بھی دیکھ لی..... شکر ہے آپ دونوں کا.....“ ان کی بات پر وہ دونوں دلی کھول کر ہنس دیے..... جس رات ہوائی فلاح کی فلائٹ تھی..... اس روز سہ پہر میں پکنگ کرتے ہوئے ریہال اور جہاں نور ان کا ساتھ دے رہے تھے..... جیسی ایک سفید لفافہ انہوں نے ریہال کو دیا۔ ”میرے جانے کے بعد کھانا.....“

انہوں نے بہت پیار سے جہاں نور کو اپنے پاس لایا اور کہا۔ ”بٹی تمہاری خدمتوں کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں۔۔۔۔۔۔ مگر ایک چیز ہے میرے پاس تمہارے لیے۔۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی سے ایک سونے کا چھلا اتارا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جہاد دیا۔

”اب تم تنہا نہیں ہو.....“ اور جہاں نور رنگ سی
منے کے چلے کو دیکھے جارہی تھی..... میٹر ہونے کا
حساس اسے سرشار کر گیا اور پھر جدائی کا لمحہ آن پہنچا.....
لوٹ پوٹ پر بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تو
ہاں نور کو لگا آج وہ تنہا ہو گئی ہے..... وہ اپنی رو میں چلتی
گے بڑھنے لگی تو ریبال نے اسے روک لیا۔
”ٹھہرو تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں.....“

”نہیں، میں چلی جاؤں گی.....“ جہاں نور آگے
 تلی رہی۔

”او کے..... امی کو پھر خود جواب دینا.....“ اس نے پیچھے سے کہا.....
 ”وہ تو چلی گئیں.....“ وہ پیچھے مڑ کر بولی۔

کوئی خاموش زخم لگتی ہے
زندگی ایک نظم لگتی ہے
بزم یاراں میں رہتا ہوں تنہا
اور تنہائی بزم لگتی ہے
اپنے سائے پہ پاؤں رکھتا ہوں
چھاؤں چھاؤں گونم لگتی ہے
چاند کی ہنسی دیکھنا اٹھ کر
رات کی سانس گرم لگتی ہے

زندگی کے بہت سے قیمتی لمحے سرک گئے تھے اور
کچھ قیمتی لمحے باقی تھے۔ ان ہی یادوں میں ایک قیمتی یاد
مہر مٹھی.....

آج وہ اس کے دروازے پہ چلے آئے تھے.....
ردائیکم کی موت، فیضان کا ایکسیڈنٹ، کاروباری ساکھ
ایک بار پھر داؤ پر لگ گئی تھی..... سب کچھ گنوانے کے بعد
اعزاز شاہ اور محبت اللہ نے طے کیا تھا کہ جیسے ہی مہر انسا
جرمنی سے واپس آئیں گی..... وہ ان کو لے آئیں گے۔
فیضان اب بہتر تھا اور روزی کے ٹرانس سے باہر آ گیا
تھا۔ اس کی بیٹائی بھی واپس آ گئی۔

دروازہ ہلکی سی دستک پہ فوراً کھل گیا..... مہر انسا
بیگم آسمانی رنگ کے جارجٹ کے دوپٹے کو سر پہ سنبھالتی
ہوئی سامنے آئیں۔

”عزرا از بیٹا تم.....؟ کہاں تھے تم..... کتنا یاد کر رہی
تھی میں تمہیں..... اور اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو تم کیا
ہوا ہے.....؟“ اور اعزاز ان کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر
رودیے..... کئی دنوں کا دل کا غبار ان کے سامنے اشکوں
کے ساتھ بہہ گیا۔

”کیا ہوا تمہیں.....؟“ وہ روتے ہوئے اعزاز کو
سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں اور خود بھی ان کی آنکھیں
بھٹکنے لگیں..... اشکوں کی پاڑ سے انہوں نے دیکھا.....
زوار شاہ یک دم سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے..... دکھ
کی چادر بنایہ شخص ان کا اپنا تھا.....

محبت جگر کا سونا
محبت وصل کی چاندی
اور محبت کھائی جاتی ہے

مہر انسا کا دل زوار شاہ کے لیے آج بھی دھڑکتا تھا.....
اور اب اس کے بعد کوئی پڑاؤ نہیں تھا..... سب
انٹے تقسیم ہو گئے۔ سب گلے شکوے، بنا کچھ کہے ہی دھڑ
گئے تھے۔ مہر انسا کا تو دل صاف ہی تھا زوار شاہ کی
آنکھوں سے بھی غلط فہمیوں کی دھند چھٹ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

ہمیشہ کے لیے چہرے نقابوں میں نہیں رہتے
سبھی کر دار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر
وہ email چیک کرنے بیٹھا تھا۔

”تم آ جاؤ تمہارے لیے سر پرانز ہے.....“ اعزاز
کی ای میل آئی تھی۔
دوسری میل شمیمہ کی تھی.....

“Congratulations! Dr.
Reebal Ahmed, You have
Completed your
thesis.succcess fully”

ای کی آواز کانوں میں گونجنے لگی.....

”بیٹا تم نے جو سنا نچا تیار کیا ہے..... اس کا تمہیں
ادراک ہونا چاہیے..... اگر وہ ٹوٹ گیا تو تم ٹوٹ
جاؤ گے..... بیٹا..... محبت پر انسان کا اختیار نہیں.....
کہیں بے بسی ہے اور کہیں اختیار..... تو تمہارے پاس
قوت ہے اس کا استعمال کرو اللہ کے لیے.....“ وہ جانا
تھا ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

15 نومبر کو اس کی واپسی تھی..... انٹرنیشنل یونیورسٹی
آف ایڈمنسٹر اے سے پڑھانے کی آفر تھی..... فی الوقت
وہ اپنے وطن کے لیے رخصت سفر باندھ رہا تھا..... جہاں
اس کے لیے بہت ساری خوشیاں منتظر تھیں۔

☆.....☆.....☆.....

وہ اعزاز شاہ کے آفس میں بیٹھی اس سے اہل
تعارف کروا رہی تھی اور اس کے مقابل بیٹھا اعزاز اہل
مونیچوں تلے مسکرایا تھا..... ”میں شمیمہ احسن ہوں.....
محسن صاحب سے آپ مل چکے ہیں..... جو میرے تایا کی
ہیں..... آپ مجھے پہچان گئے ناں آپ نے ہی میرا اعلان
کیا تھا اور میں ابلاغ عامہ میں ماسٹرز ہوں.....“

کرا آگے بڑھنے لگی۔۔۔۔۔

”سوری۔۔۔“ وہ اس کے سامنے آگئے۔ ”کیا ایک مسیحا کا اتنا بھی حق نہیں۔۔۔“ وہ انہیں گھورنے لگی۔
”دیکھو اپنی بڑی، بڑی آنکھوں سے ناحق نہ گھورو۔۔۔۔۔“

”جائیں معاف کیا۔۔۔“ اور اس کی ریشمی زلفیں لہرا گئیں اور وہ چلی گئی، خوشبو کا احساس دلا کر۔۔۔۔۔

بہت دنوں کے بعد محبت بارش اور محسوس کن جلتے رنگ جیسے جذبوں کو اس نے محسوس کیا تھا اور اپنی خوشی کا اظہار اس نے مہرالنسا بیگم سے کر دیا۔ وہ فیضان کے پاس بیٹھی اس کا سردباری تھیں۔ اس کی بات سن کر ہنسنے لگیں۔

”مجھے معلوم تھا۔۔۔۔۔ مسیحا کی کام ضرور دکھائے گی۔ تم نے بھی جو سانچا تراشا ہے۔ اس کی قدر تم سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔۔۔۔۔“
”میری پیاری امی۔۔۔۔۔!“ کہہ کر وہ ان کے گلے لگ گیا۔۔۔۔۔ فیضان بھی ہنسنے لگی۔

☆ ☆ ☆

گھڑی کی سوئیاں تب 9 بج کر 05 منٹ کا اعلان کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ جرمنی سے آنے والی فلائٹ صرف 10 منٹ کی دوری پر تھی۔

اسلام آباد انٹرپورٹ پر جہاز نے جیسے ہی زمین کی سطح کو چھوا۔۔۔۔۔ مہربان سایہ دار بادل نے بارش کی بوندوں کو برساتنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر ریہال احمد، فخر پاکستان اپنے تھیسس پہ کامیابی کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آچکے تھے۔۔۔۔۔ اس شعبہ میں یہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں ڈاکٹریٹ کی سند سے نوازا گیا تھا۔

زوارشاہ، مہرالنسا، اعجاز شاہ اور فیضان شاہ سب اس کے منتظر تھے۔۔۔۔۔ جیسے ہی وہ باہر آیا۔۔۔۔۔ کمرے حرکت میں آگئے۔۔۔۔۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بے قرار رہے۔۔۔۔۔ پھولوں کے ہار اس کو ڈالے گئے۔۔۔۔۔ پھولوں کی چیتاں نچھاور کی گئیں۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے اسے راستہ ملا۔ وہ اپنی ماں مہرالنسا کے گلے لگ

مسلل ایک گھٹنے سے وضاحت کر رہی تھی۔۔۔۔۔
”الیکٹرانک میڈیا میں میرا ایم فل مکمل ہو چکا ہے۔۔۔۔۔
مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“
”پھر یہ کہ مجھے آپ سے کام ہے۔۔۔۔۔“
”کیا کام۔۔۔۔۔؟“

”مجھ سے دوستی کریں گی۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے پلٹ کر سوال کر ڈالا۔

”آپ میری بات سن ہی نہیں رہے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ رنج ہو گئی۔

”آپ ہی کو تو سن رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اپنی مسکراہٹ کو چمپاتے ہوئے بنیاد لہجے میں بولے۔

”بھڑا میں جائے شوق۔۔۔۔۔ خواہ خواہ تایاجی کے کہنے پر آ کر آپ کے پاس آئی۔۔۔۔۔“ اس نے جھٹکے سے کرسی ہٹائی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ جواتنی دیر سے اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ گھبرا کے اسے روکنے لگے اور اسی وقت تایاجی کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کا لال بھجھو کا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہو گئے۔

”کیا ہوا بیٹا۔۔۔۔۔؟ سب ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔؟“
”کچھ ٹھیک نہیں ہے آپ چلیں یہاں سے۔۔۔۔۔“
وہ برا مانتے ہوئے ان کا بازو پکڑنے لگی۔

”تایاجی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے انکل میں ذرا ان کو چپک کر رہا تھا کہ سب ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔ بس یہ غصے میں آ گئیں۔۔۔۔۔“ اعجاز شاہ نے تایاجی کو اشارہ کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں۔۔۔۔۔

”تو سب ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔!“ تایاجی نے بھی اس کی تائید کی۔۔۔۔۔

”انکل یہ وہ تھمرہ ہی نہیں ہے جو ڈری سہی رہتی تھی۔۔۔۔۔
یو تھیرنی بن گئی ہے مقابل کے دوانت تو ڈر سکتی ہے۔۔۔۔۔“

”مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔۔۔۔۔ میری بیٹی ایک پبلشنگ ادارے کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے اور تمہیں اس کا ساتھ دینا ہوگا۔۔۔۔۔“

”جی بالکل بالکل! میری خدمات حاضر ہیں۔۔۔۔۔“
وہ شرافت کا نمونہ بنا ہوا تھا وہ ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈال

love my country and very
"proud to be Pakistani

.....☆.....☆.....☆.....

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگو تے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں
زوار ہاؤس میں خوشیوں کی رونق تھی اور خاندان
کی مرکزی حیثیت زوار شاہ اور مہرالنسا کو حاصل تھی.....
مہرالنسا نے بچوں کو سمیٹ لیا تھا..... محبتیں گھر میں لوٹ
آئی تھیں.....

دل کے ویرانے میں بہار آگئی تھی..... فیضان
صحت یابی کی طرف مائل تھا.....
کھانے کی میز پر مہرالنسا نے ایک قول سنا کر بچوں
سے ایک فیصلہ مانگ لیا کہ

”کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پر بھی ہو اگر ایسا
ہے۔ تو پھر وفاداری اور قدردانی کا کیا.....“

اور ان کی سمجھداری سے اعزاز اور تشیمیرہ زندگی کے
خوب صورت بندھن میں بندھ گئے..... ریہال نے بھی
ماں کی خوشی کا احترام کیا اور جہاں نور کو اپنا لیا۔

☆☆☆

مقامی ہوٹل میں تشیمیرہ اعزاز کے پبلشنگ ادارے
کے اجراء کی تقریب ہوئی۔

تشیمیرہ کا ناول ”ہم کو عبث بدنام کیا“ اس کے
پبلشنگ ادارے کی پہلی کاوش تھا۔

محبتوں کے اس سفر میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور
پھول بھی جو کانٹوں سے دامن بچا لیتا ہے پھول اس کی
جھولی میں آجاتے ہیں۔

ہم کو عبث بدنام کیا کی تشیمیرہ دکھ کی چادر اوڑھنے
کے باوجود آج کامیاب ہے..... محبت، انتظار اور صبر کے
جذبات سے گندھی عورت تہمت اور بدنامی کے وار سہہ کر
بھی ثابت قدم رہتی ہے اور بالآخر اس کا اپنا کردار اس کی
پاکیزگی کی گواہی دے دیتا ہے۔

جس محبت کے سانچے میں اس کا وجود ڈھلا ہے وہ
ہی محبت کے امر ہونے کا اولین نسخہ ہے۔

(ختم شد)

گیا..... زوار شاہ اپنے خوب صورت قد آور بیٹے کو دیکھ
رہے تھے جو ان جیسا قد و قامت رکھتا تھا..... مگر مزاج
میں ماں کا عکس تھا۔

مہرالنسا کی آنکھیں کھلی ہوئی لگیں..... زوار شاہ
نے آگے بڑھ کر ریہال کو گلے سے لگایا اور وہ آبدیدہ
ہو گئے تھے۔ سب ہی اس محبت پر انگبار تھے۔ موبائل
کمرے کی آنکھ نے یہ لمحے محفوظ کر لیے تھے۔

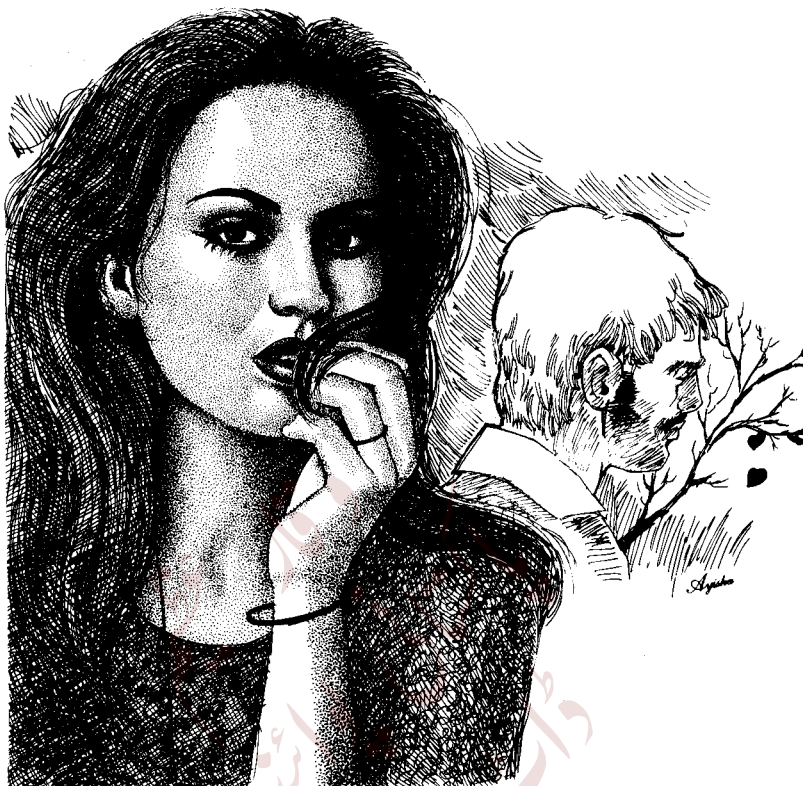
آج کل فحشی چینلوں سب سے پہلے نمبر پر آنے کے
لیے ایسی منفرد خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ گلے ہی
دونوں میں ریہال مختلف ٹی وی چینلوں پر نوز شو میں آ رہا تھا
کہ جس میں اس کی تعلیم اور اسلام سے وابستگی کی بنا
پر جرمنی میں قیام اور ایک غیر مسلم لڑکی جینی کا قبول اسلام
جیسے واقعات کے متعلق انٹرویوز ہو رہے تھے۔ جرمنی کے
اخبارات نے بھی اس کے انٹرویوز شائع کیے تھے اور اب
یہاں پاکستان کی یوتھ کے لیے اس کی جدوجہد کی مثالیں
دہرائی جا رہی تھیں۔ ایک چینل والوں نے تو گھر آ کر اس
کا فیملی انٹرویو کیا تھا۔ بے سکر نے ناظرین کو ریہال کا مکمل
تعارف اور اس کی کامیابیوں کی تفصیل بتانے کے بعد
تھا اس سے کچھ یوں سوال کیا۔

”ڈاکٹر ریہال احمد آپ اپنی کامیابی کا کریڈٹ
کس کو دیتے ہیں.....؟“

”میری ماں مہرالنسا نے بے تحاشا محنت، صبر و حسن
اخلاق سے میری پرورش کی مگر انہوں نے ایک بات
ہمیشہ مجھ سے چھپائی اور کہا جب تم بہت اعلیٰ مقام پہ
پہنچو گے اس وقت تمہاری اس بات کا جواب دوں
گی..... ابھی کچھ دنوں پہلے جرمنی سے واپسی پر میری امی
ایک لفافہ میرے لیے چھوڑ گئی تھیں جس میں وہ نام تحریر
تھا..... جس کو جاننے کے لیے اور خود کو پانے کے لیے
میں نے یہ لباس سفر کامیابی سے طے کیا.....

”بلاشبہ یہ کریڈٹ میری ماں مہرالنسا کو جاتا ہے۔
میرے خوابوں کو پورا کرنے میں جو راستہ مجھے ملا وہ
میرے والد محترم زوار شاہ کا ہے..... میرے والدین
میرے لیے اثاثہ ہیں.....

I Love my family and I also



سقوطِ آنا

سارہ احمد

نکاح نے حلال کیا تھا، کمال نہیں کہ ایک بستر پر
 سونے سے وہ ہم مزاج بھی ہو جاتے۔ انہیں تو مزاج
 آشنا ہونا تھا۔ اور یہ ایک رات نہیں ایک سال نہیں اور
 شاید یہ ایک زندگی بھی نہ بننا پاتی اگر ضد ایک دوسرے
 پر حکومت کرنے کی ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے کے
 سامنے آئے اور پھر ہمیشہ ساتھ رہنے کی تمنا کر بیٹھے۔
 محبتوں کی اولین داستان ایک نئی دنیا کے دروا کرتی چلی
 گئی۔ مان کی گھڑی جب ان چھوئے جذبوں کو گدگدا

کر لکھوں سے نکلی تو ان پر زندگی عیاں ہونے لگی۔
کاشف نے اپنا گھر اور دل دونوں تسمیہ کے اختیار میں
دے دیے۔

”ہمیں سنوارو یا بگاڑو۔“ کاشف نے تسمیہ کی
پیاری سی ناک چھو کر کہا۔

”ہمیں لکھو اور ہر بار مٹا دو۔“ تسمیہ نے بھی اس
کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے سارے پال
خراب کر دیے اور اک ادا سے کہتے ہوئے دروازے
کی طرف بھاگ گئی۔ کاشف اس سے پہلے دروازے
پر پہنچ کر اپنی پھیلانے اس کا راستہ روک کر کھڑا
ہو گیا۔

”بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔“ تسمیہ اس کے وجود
میں قید ہو گئی اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

رات کے کھانے کے بعد کاشف کا معمول تھا کہ
کچھ دیر باہر اپنے دوستوں میں وقت گزارتا تھا۔ شروع
میں تسمیہ کو تنہا یہ شام سے رات کا وقت گزارنا بہت مہر
آزما لگا لیکن اس ایک بات کے علاوہ کاشف میں ایسی
کوئی دوسری عادت نہیں تھی جو اسے پریشان کرتی۔
اس کے آنے تک وہ کسی نہ کسی طرح وقت کو تھکیت کر
خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی..... کیلی کبھی ڈر بھی
جاتی اور وہ ہوتا کہ شاید کوئی گھر کے اندر دیوار پھانڈ کر
آ گیا ہے۔ ہوا سے پردہ ہلتا تو چونک جاتی کہ ابھی اس
پردے کے نیچے سے کسی کے جوتے نظر آئیں گے اور
اُٹھ کر اسے محسوس ہوتا کہ کوئی سایہ ہے جو اس کے ساتھ
ساتھ چلتا ہے۔ کاشف کے آنے پر وہ یہ سب اس
سے کہنا چاہتی لیکن اس کی محبت کے والہانہ انداز اسے
شکوہ کرنے سے روک دیتے۔

محبت کی مٹی سے جو کوئلیں پھوٹی ہیں وہ رشتوں
کی بیلوں کو مزید پروان چڑھا دیتی ہیں۔ جب سے وہ
ایک نئے رشتے کے احساس سے سرشار ہوئی تھی، اس کا
دل اور بھی گداز ہو گیا تھا اور کاشف کا روز، روز دیر تک
رات گئے غیر حاضر رہنا اس کے دل کو مسلنے لگا۔ سکوت
شب سب، سبج، سبج، قطرہ، قطرہ، پلکوں کو دشمنی کر رہی تھی۔ وہ

سو ناچا رہی تھی لیکن کاشف کے بغیر اسے نیند نہیں آ رہی
تھی۔ دل چاہا اسے فون کرے مگر ارادے ٹوٹ، ٹوٹ
کر اس کے تکیے پر بکھرتے رہے۔ آنکھیں بند ہوئیں تو
لحہ بھر کو وہ ماحول سے غافل ہو کر نیند سے مغلوب ہو
گئی۔ ایک ریشمی سی حرارت اس کی سانسوں سے ٹکرائی
تو چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کاشف کی محبت
بھری نگاہ اس کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“
”نئے مہمان نے تمہیں اور بھی حسین بنا دیا
ہے۔“ کاشف نے اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھ
دیے۔ زمین دل پر بارش اتری تو تنہائی شکوہ کناں
ہونے کو بے قرار ہوئی۔

”آپ جلدی گھر آ جایا کریں اب۔“
”شش..... بس چپ سو جاؤ ابھی..... کل ڈاکٹر
کے پاس تمہیں چیک اپ کے لیے لے کر جانا
ہے..... میرے آنے تک تیار رہنا۔“ وہ ان سنی کر کے
اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

آنے والے دنوں نے تسمیہ کو خود سے بھی چیز
کر دیا، نہ ٹھیک سے کچھ کھایا پیا جاتا اور نہ گھر کے کسی
کام میں دل لگتا، کاشف اگر کوئی بات کرتا تو بس ہوں،
ہاں پر ہی اکتفا کرتی، اگر کہیں باہر لے جانے کا
پروگرام بناتا تو وہ بھی رد کر دیتی۔

”ایسا کرو کچھ دن امی کے ہاں رہ آؤ۔“ کاشف
نے اسے پیار سے کہا۔ مبادا کوئی الٹا مطلب ہی نکال
لے اور وہی ہوا۔

”تاکہ آپ جو رات کو دیر سے آتے ہیں وہ بھی
نہیں آئیں۔“

”کیا مطلب؟.....؟“
”مطلب صاف ہے جہاں دل لگتا ہے وہیں رہ
جائیں اور کیا۔“ تسمیہ سے چپ نہیں رہا گیا۔

کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا اور آفس جانے کی
تیاری کرتے ہوئے سوچتا رہا کہ تسمیہ کا ایسی حالت میں
بے دخل فطری تھا۔ کچھ مہینوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

تمام پاکیزہ بیٹوں کے نام

نورِ نظر لکھوں یا کہ جان جگر لکھوں
حیران ہوں تجھے کیا میرے پر لکھوں
تیرے ہی دم سے روشن میری محسوس و شامیں
تجھ سے ہی سارے کام ہیں تجھے سر بسر لکھوں
جیتی ہوں تیری خاطر تجھ پر ہی جان دوں گی
تجھ کو میں کہکشاں کی اک راہ گزر لکھوں
تیرے لیے ہی کرتی ہوں ہر پل دعائے خیر
جانِ حیات تجھ کو فلاح کا اکبر لکھوں
میرے لعل تیری زندگی جنتِ نظیر ہو
ہو جائے زیست تیری مانند خضر لکھوں
رب کی رضا کا جام ملے یوں سرخرو تو ہو
آپ کوثر کے لائق رشکِ قمر لکھوں
دعا گو: کوثر خالد، جزائوالہ

معاشرے کے لیے فعال ثابت ہوں نہ کہ نفسیاتی اور
جذباتی کشش کا شکار ہو کر اپنی ہی نسل کو باغی کر دیں۔
وہ گھر آیا تو تسمیہ فون پر اپنی آپنی سے بات کر رہی
تھی، اس نے ہاتھ منہ دھو کر خود ہی کھانا نکال لیا، تسمیہ
اٹھنے لگی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع
کر دیا۔ تسمیہ کا موڈ بھی اچھا تھا حالانکہ صبح جس طرح
اس نے رُوٹل کیا تھا ایک بے نام سی اداسی سارا دن
اس کے ساتھ رہی تھی۔

”یوں چپ سے کیوں لیٹ گئے؟“ تسمیہ پاس
آ کر محبت سے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کھنکھی
کرنے لگی۔ ایک بیٹھے سے سرور نے اس کے اعصاب
کو سکون بخشا اور سارے بدن سے تھکاوٹ نکل گئی۔ وہ
یونہی چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔
”اچھا سوری..... کچھ بولیں بھی تو۔“ تسمیہ نے
کاشف کے کان پکڑ کر سوری کہا تو وہ اس کی اس ادا پر

تسمیہ کے یوں بیٹا رہنے پر اس کے اندر ایک بے چینی
سی کنڈلی مار کے بیٹھ گئی اور اسے اماں کی یاد شدت سے
ستانے لگی۔ ہفتے میں ایک دن ضرور وہ ان سے باتیں
کرنے جاتا تھا اور اب نئی زندگی اسے اس آنے لگی تو
امول صورتیں اور قیمتی یادیں کیوں فراموش ہونے لگیں۔
قبرستان کی خاموشی میں اس کی پرسوز تلاوت ایک
احساسِ زیاں کو پکار کر ہر چیز کے فانی ہونے کا اقرار کر
رہی تھی۔ سرخ گلابوں سے معطر اماں، ابا کی قبروں کی مٹی
میں اس کے آنسو مل رہے تھے۔

”لڑکے نہیں روتے۔“ اماں نے اس کے گال
صاف کر کے چومے۔

”مگر اماں جب تم روتی ہو تو ایک لڑکا نہیں بیٹا
رہتا ہے۔“ وہ لڑکا نہیں بیٹا ہونے پر فخر کرتا مگر اس کی
ابکھن نہ سمجھ سکی کبھی.....

”اماں تمہیں کہیں چوٹ بھی نہیں لگتی اور تم پھر بھی
روتی ہو۔“ اور اماں اسے اپنے سینے سے لگا لیتیں،
مائیں اپنے بچوں سے کتنا کچھ چھپاتی ہیں، خاص کر
اپنے دکھ اماں کے روپ میں اس نے عورت کی وہ
معراج دیکھی تھی کہ دنیا کی ہر عورت اس کی نظر
میں ہمیشہ قابلِ احترام ہی رہی۔ ابا کا رعب اور ڈر اس
کے قد کے ساتھ اونچا ہوتا گیا، اسے ان دونوں کے
رشتے کی سمجھ ان کے دنیا سے چلے جانے تک بھی نہیں
آئی..... ان کے درمیان تعلق کی ٹھنڈک جب بڑھ کر
جذبوں کو سرد کر دیتی تو دونوں دو مختلف دنیاؤں کے
لوگ لگتے لیکن جدا بھی نہ ہوتے..... اسے ایک ایسا مرد
نہیں بننا تھا جس کے ساتھ رہتے ہوئے عورت کو چوٹ
تو نہیں آئے لیکن آنسوؤں کی سیج بطور گواہ اسے طزم
کے کٹہرے میں کھڑا کر دے۔

تسمیہ کی نظروں کو تو وہ روز بڑھتا تھا اور نظر انداز
کر دیتا تھا لیکن اب اس کی شکایت لفظوں میں اتر آئی
تھی۔ تسمیہ کا شکوہ بجا بھی لیکن کیا شادی کے بعد اس کا
اپنی ذات پر اختیار نہیں بچا تھا؟ کاشف پیار میں
شناخت نہیں مدغم کرنا چاہتا تھا۔ دو وجود یک جان ہو کر

”کیا ضرورت تھی ایسے لڑکے سے شادی کرنے کی، جس کا کوئی آگے پیچھے ہی نہیں ہو۔“ تسمیہ کے ابو کو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”یہ ہمارے ساتھ چلے..... بعد میں دیکھ لیں گے کہ کیا کرتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، چھوڑیں ساری باتیں۔“ تسمیہ کی امی کی تجویز اس کے ابو کو مقبول لگی۔ ”ہاں ٹھیک ہے، نہ ہم رک سکتے ہیں نہ اسے یوں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔“ اپنے ابو کے غصے کے آگے وہ خاموشی ہو گئی اور وسوسے اور واہے اپنے دل میں لیے ان کے ساتھ چلی آئی۔

رات روشنیوں اور تلیوں کے جہان کی طرف سمٹ رہی تھی..... رات جو مخلوق خدا کے آرام کرنے کا وقت..... رات جو کسی کے لیے سرور تو کسی کے لیے تکلیف..... پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ بار، بار کاشف کا نمبر ملا رہی تھی اور وہ اسی طرح بند جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ضبط ہار جاتا اسے کاشف کی کال آگئی اور اس نے نہیں اٹھائی صرف اس کا نمبر اسکرین پر دیکھتی رہی۔ پھر اس کا میج آیا۔

”میں جانتا ہوں تم جاگ رہی ہو اور تمہیں میرے بغیر نیند نہیں آئے گی۔ میں جب عملی زندگی میں آیا تو میں نے عہد کیا کہ میں اپنی فیملی کے لیے تو ساری زندگی کام کرتا رہوں گا کیوں نہ اپنی ذات کے خلا کو بھی بھرنے کے لیے زندگی میں کچھ کروں..... میں نے ڈھابوں پر کام کرنے والے غریب الوطن لڑکوں کو پڑھانے کا ذمہ لیا۔ کیا تم چاہتی ہو میں ادھورا رہ جاؤں اور انا جیت جائے؟“

تسمیہ کو زندگی سمجھا رہی تھی کہ زہر کا ایک قطرہ فنا کرنے کے لیے کافی ہے لیکن امرت کے ہر گھونٹ کے ساتھ پیاس اور طلب بڑھتی جاتی ہے۔ اسے کاشف کو کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی وہ گھر کے باہر اس کا منتظر ہے اور اسے اگلا اقدام کیا کرتا ہے۔

بل بھر میں نہال ہو گیا۔ قریبوں میں بس اتنا فاصلہ ہوتا چاہیے کہ دونوں طرف سے ہونے والی پہل مسافت کو دراز نہ کر دے۔ اسے اپنی سوچوں میں بھی کاشف پورے کا پورا چاہیے تھا۔

تسمیہ کے خوشگوار موڈ کے پیش نظر کاشف نے آج روز کی طرح باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ موبائل پر ایک دو بار کال آئی مگر اس نے نظر انداز کر دی اور موبائل و اجبریشن پر لگا دیا۔

”آپ کے دوستوں کو آپ کی یاد ستا رہی ہے۔“ طنز نمایاں تھا۔

”ہم ابھی اگر اس بات کو نہ چھیڑیں تو مناسب رہے گا۔“ کاشف کی آواز جھمی تھی۔

”خاموشی کا مطلب اسنے حق دوسروں کو سونپ دینا نہیں۔“ تسمیہ کے لہجے میں جھنجکی تھی اور وہ ماں بننے کے احساس کے ساتھ شاید اس پر غالب آنا چاہتی تھی۔

”اچھا..... صرف ایک بات کو میرے تمام فرائض پر دھبنا کر لگا دیا..... بہت خوب بھی۔“

”آپ کو کیا ایسی مجبوری ہے جو روز رات آپ باہر جائے بغیر رہ نہیں سکتے؟“

ازدواجی تعلق میں کبھی اعتماد بننا وضاحت کیے کیوں نہیں پنپ سکتا؟ کاشف خاموشی سے موبائل بند کر کے کروت بدل کر لیٹ گیا۔ تسمیہ نے بھی تکیہ درمیان میں لگا کر بیڈ کا بؤارہ کر دیا۔ صبح کاشف نے خود ہی اپنا ناشتا تیار کیا اور اسے بے خبر سوتا دیکھ کر جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تکیہ درمیان میں اسی طرح پڑا تھا اور دونوں ہی رات بڑی احتیاط سے کروت بدلتے رہے کہ سقوطِ انا کا خطرہ تھا۔ تسمیہ سارا دن منتظر رہی کہ کاشف رابطہ کر کے اس کی طبیعت کا پوچھے گا اور اسے منالے گا مگر شام ڈھل گئی اور اسے ہی فون کرنا پڑا لیکن کاشف کا موبائل بند جا رہا تھا۔ اس کے کسی دوست کا نمبر بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ تسمیہ کی پریشانی بڑھ گئی۔

”بیٹا اس سے رابطہ کا کوئی تو ذریعہ ہوگا۔“

تسمیہ کے والدین کافی دیر سے آئے ہوئے تھے۔

اکوکی شادی

شیم فضل حائق

جب سے میرا رشتہ شہزادی انجم سے طے پایا تھا
گھر کے لوگ جیسے میرے دشمن بن گئے تھے۔ مجھ
بچارے اکلوتے فرزند سے وہ، وہ کام لیے جاتے کہ
جسے سن کر پسینے آجائیں لیکن میں وہ سب کام کرنے پر
مجبور ہوتا۔ اماں تو جب بھی بات کرتیں دانت کچکا کر
بات کرتیں، بڑی باجی تو اچھے بھلے نام اکبر کو بگاڑ کر اکو
کہہ کر بلایا کرتیں۔ چھوٹی باجی اگرچہ بیٹھے لہجے میں
بات کرتیں لیکن ان کے بھی کچھ کم کام نہ ہوتے غرض میں



دل میں مجھے غصہ بھی آیا جانے یہ لڑکی کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے..... وہ شاید میرے اندر کی سوچ کو سمجھ گئی اس لیے جلدی سے بولی۔

”جی..... وہ..... میرا نام شہزادی انجم ہے۔ ہم وہ دوسروں والے تیسرے مکان میں رہتے ہیں..... آپ وہ نیلے مکان والوں کے بیٹے ہیں ناں.....“ اس نے تصدیق چاہی تو میری گردن خود بخود اثبات میں ہل گئی۔

”دراصل مجھے اماں کی دوائی لینی ہے لیکن میرے پاس پیسے کم ہیں۔ ابھی تنخواہ میں چار دن رہتے ہیں..... چیسے ہی تنخواہ ملے گی میں آپ کی رقم واپس کر دوں گی۔“

”کتنے پیسے چاہئیں؟“ میں کچھ دیر سوچ کر بولا۔

”بس پانچ سو تک سے کام چل جائے گا..... تین سو میرے پاس ہیں۔“ وہ جلدی سے بولی تو میں نے جب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ویسے تو اس کا نقد و قامت اچھا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بھینکا پن تھا۔

”خیر..... مجھے کیا؟“ میں نے سوچا اور پانچ سو کے نوٹ پر فاتحہ پڑھی اور تیز، تیز قدم اٹھا کر آفس کی سمت روانہ ہو گیا۔ میں فطرتاً ایک رحم دل بندہ تھا۔ جتنا میرا بس ہوتا میں دوسروں کی مدد ضرور کرتا تھا۔ اس لڑکی کی مدد اس لیے کی کہ وہ ضرورت مند تھی لیکن جب چار دن بعد اس نے پھر مجھے آواز دی اور شکریے کے ساتھ مجھے پانچ سو کا نوٹ دیا تو میں سچ سچ حیران رہ گیا..... کیونکہ مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ میرا پانچ سو کا نوٹ دوبارہ میری جیب میں آجائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی اماں کی بیماری وغیرہ سب ڈھکوسلا لگ رہی تھی لیکن اس وقت وہ مفکرانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”آپ نے بروقت میری مدد کی ورنہ جانے اماں کا بغیر دوائی کے کیا حال ہوتا.....“

”رہنے دیں..... پھر کبھی سہولت سے دے دیجیے گا۔“ میں نے اپنے پہلے والے خیالات پر شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں..... قرضہ مجھ پر ایک بھاری بوجھ کے مانند ہوتا ہے اور میں آسانی سے کسی سے کوئی قرضہ نہیں

سب کے سچ کھن چکر بنا چکراتا پھرتا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی گھر والوں نے بڑی بنا کی ہوئی تھی۔ محلے میں ہمارا گھر دوسرے گھروں سے نسبتاً بڑا تھا..... ابا کے ریٹائر ہونے کے بعد میں ان کی جگہ پر بھرتی ہو گیا۔ چھوٹی سی سرکاری نوکری تھی، میں نالائق بھی بہت تھا سر مرا کر ایف اے کر لیا تھا بس قسمت اچھی تھی جو سرکاری نوکری مل گئی۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا سو لاڈ لا بھی بہت تھا، نوکری نے جیسے میرے سر پر تاج رکھ دیا تھا۔ بڑے چاچو نیلے ہوتے کے میں اگلوں سے بڑا تھا اور کماؤ بھی..... میں اکثر کر بیٹھا رہتا اور سب کی محبتیں سیتا..... لیکن اچانک ان محبتوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی وجہ تھی شہزادی انجم.....

شہزادی انجم ہمارے محلے کے گڑ پر رہتی تھی ان کا دوسرے پر بنا چھوٹا مکان تھا۔ جس میں کوشٹری نما کمرے بنے تھے۔ ایک کمرے میں اس کا بھائی اور بھائی رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے درمیان کوئی شناسائی نہ تھی۔ اماں اور بہنیں تو ان دو، دو مردوں میں رہنے والوں کے سخت خلاف تھیں۔ وہ تو قربانی کا گوشت تک ان کے گھر بھیجنے کی روادار نہیں تھیں، میں جب آفس کے لیے نکلتا تو شہزادی انجم بھی اس وقت اسکول جانے کے لیے نکلتی، وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں چندہ سو یا دو ہزار مشاہرے پر پڑھاتی تھی..... ہم دونوں ایک راستے کے مسافر ضرور تھے لیکن ہمارے درمیان کوئی شناسائی نہیں تھی۔ چند ماہ ہی ہوئے جب میں اور وہ حسب معمول راستے میں اکٹھے ہوئے تو ایک ہلکی سی کمزور آواز میں کہا گیا۔

”سنیے.....“ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ کسی اور کو بلا رہی ہے لیکن ادھر ادھر دیکھا تو ہمارے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ میں سٹپٹا کر پلاٹا اور کہا۔

”جی فرمائیے۔“

”آپ..... آپ مجھے کچھ رقم ادھار دے دیں گے؟“

”جی.....؟“ مجھے جھٹکا سا لگا یہ تو جان نہ پہچان..... میں تیرا مہمان والی بات ہو گئی..... دل ہی

کرتے تھے۔ ظاہر ہے ماں، بہن کو دھکے دے کر تو گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ بھائی اس کا سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا اور اس کے تین بچے تھے اگرچہ شہزادی انجم، بھائی اور بھائی سے خوش نہیں تھی لیکن اسے اپنے بھائی سے ہمدردی ضرور تھی۔ وہ اس کا دفاع بھی کرتی تھی کہ ”بھائی بہت محنت کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا اپنا کنبہ بڑا ہے۔۔۔۔۔ پانچ بندے ہیں، ان کا خود کا پورا نہیں پڑتا تو ہمیں کہاں سے کھلائیں۔“ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت سنجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھینگا پن تھا بس اس کے سوا اس میں کوئی خامی نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گولڑی تھی۔۔۔۔۔ ایک سختی اور ایماندار لڑکی تھی۔۔۔۔۔ اس کی سوچ بہت مثبت تھی۔ ان تمام ملاقاتوں کا انچڑیہ نکلا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ پہلے تو میں خود کو یہ یقین دلاتا رہا کہ مجھے سچ سچ شہزادی انجم سے محبت ہو بھی سکتی ہے یا صرف وقتی پسندیدگی ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کا رزلٹ بہت جلد سامنے آگیا۔۔۔۔۔ اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اور وہ گھر تک محدود ہو گئی۔۔۔۔۔ نہ پوچھیے کہ اس دوران میں نے اسے کتنا س کیا۔۔۔۔۔ میرا نہ گھر میں دل لگانا نہ آفس میں۔۔۔۔۔ عجیب بے چینی تھی۔ رات ساری کروٹیں لے کر گزر جاتی، صبح آفس جاتا تو اس کے گھر کو نظروں کے حصار میں لیے رہتا کہ شاید اس دشمن جاں کا دیدار ہو جائے لیکن وہ نظر نہ آتی خیر۔۔۔۔۔ اُن دنوں مجھے جس بات کی الجھن تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا، میں یقیناً شہزادی انجم کے عشق میں گڑھے، گڑھے دھنس گیا تھا اب بس اس کی رائے لینا تھی کہ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔۔۔۔۔ میں دبلا پتلا اور قدرے چھوٹے قد کا مالک تھا، نقوش بھی عام سے تھے۔ رنگ سانولا تھا لیکن آپ اسے گہرا سانولا کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر میں گھر کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو یقیناً میری پرستش ایسی تھی کہ کوئی دوسری نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرتا۔۔۔۔۔ لیکن جو اعتماد مجھے ملا تھا وہ اس لیے کہ گھر میں سب مجھے اہمیت دیتے تھے۔ میرے کھانے، ناشتے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔۔۔۔۔ اور جب سے میں کمانے کے قابل ہو گیا تھا تو اس اہمیت

لیتی۔۔۔۔۔ جب تک انتہائی ضرورت نہ ہو۔“ میں نے متاثر ہوتے ہوئے اپنا نوٹ جیب میں ڈال لیا۔۔۔۔۔ ہم ساتھ، ساتھ چلتے گئے میں نے بات برائے بات کرنے کو کہہ دیا۔

”آپ یہ ساتھ والے نیلے گیٹ والے اسکول میں پڑھاتی ہیں۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”یہ پرائیویٹ اسکول والے کام تو زیادہ لیتے ہیں لیکن سیکری بہت کم دیتے ہیں۔“ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”جی۔۔۔۔۔ پندرہ سو دے رہے ہیں۔“ میں سچ سچ حیران ہوا۔

”اتنے کم پیسوں میں تمہارا گزارہ کیسے ہو جاتا ہے۔“ ”ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایک میں اور میری اماں ہی تو ہیں۔“ وہ بولی۔

”لیکن۔۔۔۔۔ مہنگائی کے اس دور میں دو بندوں کے لیے پندرہ سو روپے بہت کم ہیں۔“

”جی۔۔۔۔۔ پر ہم بھائی کے ساتھ رہتے ہیں ناں۔۔۔۔۔ بچکی وغیرہ کے بلز بھائی ہی پے کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میرے ذمے بس اپنا اور اماں کا کھانا، پینا اور اماں کی دوائیاں وغیرہ ہیں۔“

”لیکن دوائیاں بہت مہنگی ہیں۔۔۔۔۔ پھر کچن کا خرچہ۔۔۔۔۔ سب کیسے پورا ہوتا ہے۔“ مجھے سچ فکر ہوئی۔

”ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ہم کفایت شعار لوگ ہیں۔۔۔۔۔ پھر بھی دیکھ لیں۔ فرض کی نوبت آئی جاتی ہے۔“ اس نے جیسے آنسوؤں کا گولا حلق میں اتارا۔۔۔۔۔ اسکول کا بورڈ سامنے نظر آ رہا تھا وہ خدا حافظ کہہ کر بجلی میں اسکول کے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ میں کچھ خالی ذہن کے ساتھ کچھ دیروہیں کھڑا رہا۔۔۔۔۔ پھر اپنے راستے ہولیا۔

ہمارے سچ جیسے شاسانی کا ایک در کھل گیا۔۔۔۔۔ اب راہ چلتے ہماری بات چیت ہو جاتی۔۔۔۔۔ بے تکلفی ہوئی گئی۔۔۔۔۔ اب وہ مجھ سے اپنے گھر بلو پر ابھر بھی شیراز کرنے لگی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کے بھائی اور بھائی ان ماں، بیٹی کا وجود اس گھر میں بہ مشکل گوارا

”گو یا..... تمہیں میرا ساتھ منظور ہے..... میری

محبت منظور ہے؟“ میں مسرت سے بے قابو ہوتا ہو
لرزتی آواز میں بولا۔

”ہاں..... کون بد بخت ہوگا جو گھر آئی خوشیوں کو
لوٹا دے گا لیکن مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ اگر آپ
کے گھر والے نہ مانے تو آپ ان کی بات مان لیں
گے..... مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔“ میں نے
اثبات میں سر ہلا کر عقیدت سے اسے دیکھا وہ یقیناً
ایک اچھی لڑکی تھی، گھری اور بچی..... اور مجھے ایسی ہی
شریک سفر کی تلاش تھی۔

دوسرے مرحلے طے ہو گئے تھے اب آخری اور سب
سے مشکل مرحلہ درپیش تھا..... میں روزانہ اماں، ابا
سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کرتا لیکن ہمت نہیں
پڑتی۔ میں جانتا تھا اماں تو ان گھروں میں قربانی کا
گوشت تک بھیجنے کی روادار نہیں تھیں تو ایسے گھر کی بہو
کیسے لاتیں..... لیکن بات تو کرنی تھی، بہادر تو بننا تھا۔
سو اس دن جب میں اماں کے ساتھ صحن میں چائے پی رہا
تھا، اماں بھی ساتھ بیٹھی تھیں تو میں نے بات چھیڑی۔
میں جانتا تھا میری بات سب کے لیے کسی شاک سے کم
نہیں ہوگی لیکن اس درجہ سب کو شاک لگے گا اس کا
انداز نہیں تھا۔ بات کر کے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے صحن
میں کوئی طاقتور بم پھینک دیا ہو۔ ابا کے ہاتھ سے
چائے کی پیالی پھوٹ گئی اور اماں نے اتنی کر بناک چیخ
ماری کہ میرا دل دہل کر رہ گیا..... کمرے سے بہنیں بھی
اماں کی چیخ سن کر دوڑی، دوڑی آئیں..... اور جب
اماں نے تسکیوں اور پتلیوں کے بیچ انک، انک کر ان
کو ساری بات بتائی تو دونوں باجیوں کو جیسے سکتہ سا
ہو گیا..... وہ دونوں اپنی پوری آنکھیں کھولے، منہ
پھاڑے میری طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے میں ان کا
بھائی اکبر نہیں..... نہ جانے کون ہوں۔ ابا تو ابھی تک
ٹوٹی پیالی پر نظریں جمائے ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن کا
سب کچھ لٹ چکا ہو۔

”مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ ہمارا معصوم بھائی.....
اتنا بے غیرت بھی ہو سکتا ہے..... ہم نے اپنے اس

میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پہلا مرحلہ طے ہو گیا یعنی خود اپنی محبت کا مجھے
یقین ہو گیا جو مجھے شہزادی انجم سے ہو گئی تھی اور میرے
ہال میں یہ محبت اتنی شدید تھی کہ اب میں شہزادی انجم
الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... دوسرا
مرحلہ شہزادی انجم کو راضی کرانے کا تھا..... اور یہ مرحلہ
ہی خاصا مشکل تھا..... خیر ہمت کر کے میں نے اپنی
ہمت کا اظہار اس سے کر دیا..... میری بات سن کر وہ کم
سم ہو گئی۔ کافی دیر تو اس سے کچھ بولا نہ گیا..... میں
نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔ اس کے
ہمے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ پتا نہیں چل رہا
تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے یا کسی اور
طرف..... مجھے اس کے جواب کا بے چینی سے انتظار
تھا..... آخر کار وہ بولی۔

”آپ کا بہت شکریہ اکبر کہ آپ نے مجھے اس
افزائی کے قابل سمجھا..... لیکن اکبر
اب..... میری اور آپ کی کلاس میں بہت فرق
..... میں چھوٹے طبقے کی عام سی، بد صورت سی لڑکی
ہوں..... آپ اکلوتے بیٹے ہیں اپنے گھر
کے..... اکلوتے بھائی ہیں اپنی بہنوں کے..... آپ کے
توسط سے انہوں نے بہت سے خواب بٹے ہوں گے۔
میں..... بھلا.....“ اس کی آواز رندھ گئی..... میرے
دل میں جیسے ایک نوکیلا تیر پیوست ہو گیا۔ کیا چیز ہے یہ
محبت بھی..... جس میں محبوب کی آنکھ میں ایک آنسو بھی
برداشت نہیں ہوتا۔

”دیکھو شہزادی.....“ میں تڑپ کر بولا۔ ”منزل
پانے کے لیے راستے کی کھٹانیاں تو برداشت کرنی
پڑتی ہیں..... تم ہاں کر دو..... باقی ساری مشکلات
میرے لیے رہنے دو۔ ہاں تم، ایک وعدہ کرو گی مجھ
سے کہ مشکلات تو ضرور پیدا ہوں گی لیکن ہم دونوں
اسے حوصلے اور صبر سے برداشت کریں گے اور ہمت
نہیں ہاریں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی.....“ وہ نظریں جھکا کر
شرعیلے انداز میں بولی۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ نومبر 2017ء
کی جھلکیاں

سخن ساز

ساجد امجد کے قلم سے ایک
بڑے شاعر کی روداد حیات

انوکھی شادیاں

وسیم بن اشرف نے دنیا بھر
سے دلچسپ رسوم جمع کی ہیں

بھیڑے

کاشف زبیر کی ایک دلچسپ تحریر،
بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کا تذکرہ

روایت شکن

زیو یا اعجاز کی زبانی، ایک ماہست لڑکی کی کہانی

لڑکے لڑائیں

ندیم اقبال کی دلچسپ سفر کہانی
”ہمشال سے نورنو“، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی
”ہناسور“، سلمیٰ اعوان کی ”کالی گوری“ کے
ساتھ ساتھ بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں سچے
قصے، تاریخی واقعات

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ
سچے قصے اور تاریخی واقعات

بھائی کے کتنے لاڈ اٹھائے ہیں۔“ آخر کار بڑی باجی
رندگی آواز میں بولیں۔

”ارے..... میرے دل سے پوچھو..... میرے
دل سے۔“ اماں سینے پر دو، تھڑ مار کر بولیں۔“ میرا دل
جل کر کوئلہ ہو رہا ہے..... ارے کسی کا اکلوتا بیٹا ایسی
نا فرمائی دکھائے گا..... اور وہ ماں زندہ رہے گی؟ تف
ہے مجھ پر اور میری زندگی پر.....“ وہ بلند آواز سے
رونے لگیں..... ابا کو فکر ہوئی کہ ساتھ والے گھروں
کے لوگ پرسا دینے نہ آجائیں کہ شاید میں مر گیا ہوں۔
”زیتون..... اس طرح رو، رو کر بد شکونی مت
پھیلا.....“ اماں کو چپ کراتے ہوئے وہ بولے۔

”محلے والے تو کسی ایسے واقعے کی بوس گھٹتے پھرتے ہیں
بچے نے بات ہی تو کی ہے..... وہ سچ سچ اسے پیہا کر تو
نہیں لایا ناں! ہم اسے سمجھائیں گے تو یہ سمجھ جائے گا۔“
”جانتے ہو، وہ لڑکی بھٹی ہے۔“ اماں اور زیادہ
شدت سے روتے ہوئے بولیں۔ ”اس کم بخت کو کوئی
اور اچھی لڑکی نہیں ملی تھی..... یہ ہی لڑکی ملی تھی۔“ اب وہ
سسکیاں لے رہی تھیں۔

”میں نے کہا ناں، ہم اسے سمجھالیں گے..... یہ
اس سے شادی کا خیال چھوڑ دے گا۔“ ابا دوبارہ اماں
کو سمجھانے لگے۔

”ہم کیسے کسی کو اس لڑکی سے متعارف
کرائیں گے..... اکو تو نے یہ بات کرتے ہوئے کچھ نہ
سوچا۔“ چھوٹی باجی ناک سرک کر کہنے لگیں۔

میں نے اس منظر نامے سے ہٹنے کو ہی نجات کا
ذریعہ سمجھا اور سیدھا کمرے میں جا کر اپنی چارپائی پر
بٹو گیا..... میں کسی رعشے کے مریض کی طرح تھر، تھر
کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں نے ایسی جرات کا
مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے..... میرے
ساتھ ایسا برتاؤ شروع ہو گیا تھا جیسے میں ایبا قیدی ہوں
جس نے کوئی سخت جرم کیا ہو اور وہ کال کوٹھڑی میں بند
ہو..... مجھے اکبر جان..... اکبر جان کہنا تو بالکل موقوف
ہو گیا تھا اب میرا پیر والا نام ”اکو“ نظر والا نام بن گیا

نیم جاں نظر آنے لگا تو اماں کو بچ بچ فکر لاحق ہوئی وہ اتوار کا دن تھا..... اماں اور ابا صبح ناشتا کر رہے تھے۔ پرائیویٹ کی سوئچ سوئچ میرے تھنوں میں کھسکی جا رہی تھی اور میرا دل اٹھل پھل ہو رہا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ فوراً بستر سے نکلوں اور پرائیویٹ پر ہلا بول دوں لیکن نہیں..... یہ میرے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ باہر سے اماں کی فکر مندی آواز آرہی تھی۔

”اکبر بہت کمزور ہو گیا ہے..... سارا دن بھوکا رہتا ہے، اکبر کے ابا..... ایسا کب تک چلے گا۔“ پہلے ابا کے چائے پینے کی خرپ، خرپ کی آواز آئی پھر دو بولے۔

”جب تک تم لوگ اس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی پر راضی نہیں ہوتے۔“

”کیا کہہ رہے ہو اکبر کے ابا.....؟“ اماں کی حیران آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ایک ریڑھی چلانے والے کی بہن جو.....“ ابھی اماں اس کے آنکھوں کے عیب کا کہنے ہی والی تھیں کہ ابا نے انہیں ٹوکا۔

”بس کرو..... یہ اللہ کے کام ہیں کسی کے جسمانی عیب کو اس کے لیے برائی مت بناؤ۔ شادی کرو یا نہ کرو کم از کم کسی لڑکی کے بارے میں ایسا تو مت کہو۔“ ”تو کیا میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کرادوں اس سے؟“

”تو کیا ہوا؟“ ابا بولے..... ”بڑے، بڑے نوابوں، رئیسوں نے طوائفوں سے شادیاں رچا رکھی ہیں، غیر مذہب والیوں سے شادیاں رچا رکھی ہیں..... تیرا بیٹا ایک چھٹی آنکھوں والی غریب لڑکی سے شادی رچالے گا تو کون سی قیمت آجائے گی نیک بخت۔“

”لیکن..... ہمارے سب ارمان، ہماری خواہشات..... ان کا کیا ہوگا۔“ اماں رو کر بولیں۔

”کچھ نہیں ہوگا۔“ ابا رمان سے بولے۔ ”عشق کا یہ بخار جس تیزی سے چڑھا ہے اسی تیزی سے اتر بھی جائے گا..... تم دیکھ لینا۔ اکبر پھر اس لڑکی سے جان چھڑانے کا سوچے گا۔ بس..... تم اس کی دوسری شادی کرالینا اپنی پسند سے، اپنی مرضی سے..... میری

تھا۔“ ”ارے او اکو..... اے اکو سن۔ اوے اکو.....“ کہہ کر پکارا جاتا..... گھر کے سارے گندے سندے کام مجھ سے کرائے جاتے۔ جیسے میں اس کا گھر کا اکلوتا بیٹا نہیں..... کام والا چھو کر ہوں..... ابا سارا دن مجھے نصیحتیں کرتے رہتے اماں اور باجیاں، شہزادی انجم کے گھر جا کر ایک بہت بڑے جھگڑے کے موڈ میں تھیں لیکن ابا نے انہیں قطعی منع کر دیا تھا۔

”کیوں محلے میں شور شرابا کر کے تماشا بنانا چاہتی ہو ابھی تو بات گھر میں ہے کل کلاں کو سارے محلے میں پھیل جائے گی۔ اکو ہماری بات مان جائے گا..... تم لوگ تھوڑا صبر تو کرو.....“ ابا کے سمجھانے بھجانے سے بات اماں اور باجیوں کی سمجھ میں آگئی..... اس سلسلے میں شہزادی انجم کا کردار زبردست تھا، اس نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں نے گھر میں بات کی ہے کہ نہیں، ہم روز ملتے اور عام سی باتیں کرتے..... وہ اپنی ماں کی صحت کے بارے میں متروعدھی..... میں نے گھر میں کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا..... آفس میں ایک پلیٹ چھو لے کھا لیتا۔ چائے کی تین چار پیالیاں پنی لیتا، شروع میں تو گھر میں کسی نے نوٹس نہیں لیا لیکن جب بغیر ناشتا کیے آفس جاتا اور دوپہر اور رات کا کھانا کھائے بغیر کام واپس کرتا تو اماں اور باجیاں چونک اٹھیں..... اس صبح ابا ڈپٹ کر بولے۔

”اونے اکو..... کیوں بھوک پڑتا کر رکھی ہے۔“ ”جل آ..... ناشتا کر میرے ساتھ.....“

”نہیں ابا.....“ میں آواز کو پتلا اور کمزور کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ناشتا نہیں کرنا..... آفس کو دیر ہو رہی ہے۔“ ”یہ بتا.....“ اماں کو لہجوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے دہاڑ کر بولیں۔

”سوگ منارہا ہے اپنی اس شہزادی کا..... بول..... بتانا.....“ میں خاموش رہا دراصل آج کل میں ایک چپ سوکھ والے مقولے پر عمل درآمد کر رہا تھا سوہرے کی اچھی بری بات پر چپ ہی رہتا اس وقت بھی میں خاموشی سے آفس چل دیا تاں تو پھر ماں ہوتی ہے جب میری بھوک پڑتا لہجی ہونے لگی اور میں کمزور اور

”ہزار نہیں صرف ایک بات۔“ وہ ہنس کر بولی۔
 ”ہاں..... ہاں کہو.....“

مجھے تو اس کی بات سن کر جیسے چکر سا آگیا۔۔۔۔۔ یہاں تو اپنے لیے جگہ نہیں تھی۔۔۔۔۔ اور یہ خدا کی بندی اپنی ماں کو بیچ میں لے آئی میں اسے فوری جواب نہیں دے سکا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
”کیا ہوا اکبر؟“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”کیا تمہیں

کریں گے۔“ میں نے اس وقت تو اسے ٹال دیا لیکن بعد میں ساری صورت حال اس پر واضح کر دی۔ وہ گھبرا گئی۔ دہل کر بولی۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہوگا.....“ میں نے اسے تو تسلی دی لیکن میرا دل جیسے پا تال میں ابھر اور ڈوب رہا تھا۔
لاکھ سوچنے کے باوجود بھی اس مسئلے کا سلوشن سمجھ

”ہاں، تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ جلد ہی اکبر اپنے اس فیصلے پر پچھتائے گا اور.....“

”کیسے ہو سکتا ہے اکبر کا نکاح.....؟“ اماں پریشانی سے بولیں۔

”مسئلہ تو یہی ہے کہ لڑکی کو بیاہ کر کہاں لے کر آئیں گے۔“ اماں بولیں۔ ”کمرہ کہاں ہے؟ لڑکی کس کمرے میں رہن بن کر آئے گی۔“ اماں کی بات سن کر میں اور ابا دونوں سوچ میں پڑ گئے ہمارے گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک کمرے پر بڑی باجی قابض تھیں دوسرے نسبتاً چھوٹے کمرے میں چھوٹی باجی اور تیسرے کمرے میں اماں، ابا کے ساتھ ایک کونے میں میری چار پائی ہوتی تھی..... سردی کم ہونے لگتی تو

میں نہیں آ رہا تھا۔ گھر کے سارے لوگ تو خاموشی سے بیٹھ گئے تھے کہ ان سب کے لیے تو یہ خوشی کا مقام تھا کہ ایک ناپسندیدہ شخصیت کے لیے ان کے گھر میں جگہ نہیں بن رہی تھی لیکن میرا دماغ تو مسلسل اسی ادھیڑ بن میں رہتا۔۔۔۔۔ میں سوچ، سوچ کر پاگل ہونے لگا تھا اور جب میں مکمل طور پر مایوس ہونے لگا تو اچانک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی۔۔۔۔۔ میں جتنا، جتنا اس پر سوچتا گیا تو یہی تجویز مجھے گویا اپنے اس موجودہ مسئلے کا موزوں حل نظر آیا۔۔۔۔۔ اس دن میں نے ناشتا کرتے ہوئے ابا سے کہا۔

”ابا۔۔۔۔۔ کیا بڑی باجی اور چھوٹی باجی میرے ساتھ جگہ تبدیل نہیں کر سکتیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“ ابا کے بجائے اماں نے جواب دیا۔

”مطلب یہ کہ وہ اپنا کمرہ ہمیں دے دیں اور وہ میرے بیڈ پر آپ کے ساتھ سویا کریں۔“

”کک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔؟“ بڑی باجی اور چھوٹی باجی اتنے زور سے بیک وقت چلائیں کہ میرے کان بج اٹھے۔ دونوں باجیاں خونخوار انداز میں میری طرف جھپٹیں۔

”تم ہماری مرضی کے خلاف ایک تو ہمارے سر پر اسے مسلط کر رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ تو چلو ہم نے سہہ لیا۔۔۔۔۔ اب ہمارے کمرے بھی ہم سے چھین رہے ہو۔۔۔۔۔ ہمیں سڑک پر کیوں نہیں ڈھکیل دیتے۔“ چھوٹی باجی روتے ہوئے بولیں، بڑی باجی، بھی اپنی ناک سڑک رہی تھیں۔۔۔۔۔ اماں تو سینے پر دو ہتھ پٹھار کر بولیں۔

”ارے۔۔۔۔۔ اگر تم دونوں کی قسمت اچھی ہوئیں تو کب کی تمہاری شادیاں ہو چکی ہوتیں۔۔۔۔۔ لیکن بد نصیبی۔۔۔۔۔ اس لڑکی کی قسمت تم سے اچھی نکلی۔

اب بھائی کمرے لے رہا ہے۔۔۔۔۔ ہماری موت کے بعد تو تم دونوں سچ سچ سڑک پر پھینک دے گا۔“

اب تو اماں اور باجیاں بلند آواز سے رونے لگیں۔

”چلو اکو۔۔۔۔۔ معافی مانگ بہنوں سے۔“ ابا گھبرا کر بولے۔

”جب تک ہم زندہ ہیں ان کے کمرے ان ہی کے رہیں گے۔۔۔۔۔ اب تم اپنے لیے کیا سوچتے

ہو۔۔۔۔۔ کیا کرتے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری مرضی۔“

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بات ناممکنات سے ہے کہ باجیاں میرے لیے اپنے کمرے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ لیکن یہ صرف میری تجویز کی تمہید تھی۔ سو میں نے فوراً دونوں باجیوں سے معافی مانگ لی اور نیچے دل سے کہنے لگا۔

”ابا۔۔۔۔۔ پھر تو اس مسئلے کا ایک ہی حل رہ جاتا ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔۔۔ اماں کی سسکیوں اور باجیوں کی ہچکیوں کو بھی بریک مل گیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ یہ کہ نکاح کے بعد میں شہزادی انجم کے گھر رہوں عارضی طور پر۔۔۔۔۔“ میں نے وہ دھماکا کر ہی دیا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ تم اس کے گھر رہو گے؟“

اماں بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ باجیاں بھی منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”تو پھر کیا کروں اماں۔۔۔۔۔؟ میں بے بسی سے بولا۔

”مجبوری ہے۔ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے اس مسئلے کا۔۔۔۔۔“ ابا جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے، بڑی دیر بعد سر اٹھا کر بولے۔

”میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک عارضی حل ہے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کوئی اچھا سا مستقل حل ڈھونڈ سکیں ہم۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ اماں بدک اٹھیں۔ ”اکو اکلوتا بیٹا ہے میرا۔۔۔۔۔ کیسے اس کے ہاتھ سوئپ دوں۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ جیسے تڑپ اٹھیں۔

”ارے بیگم۔۔۔۔۔ اکو کہیں بھی رہے، رہے گا تو ہمارا بیٹا ہی ناں۔۔۔۔۔ اس کی تنخواہ ہماری ہوگی۔۔۔۔۔ وہ دن بھر یہیں رہے گا۔ رات کو وہاں جائے گا۔۔۔۔۔ کیوں اکو۔۔۔۔۔!“ وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے تو میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میں نے سنا، ابا اماں سے کہہ رہے تھے۔

”دیکھ زیتون۔۔۔۔۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔۔۔۔۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ نامہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

یہ دونوں ملک سے قارئین صرف و بلیٹرن یونین یا مین گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری پیک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرجیاس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز آباد سسٹیم ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کو رنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

تمہیں اور بچیوں کو اس لڑکی کو ہر وقت دیکھ کر ٹینشن نہیں
ہوگی۔ وہ تم سب کی نظروں سے دور ہوگی..... اور تمہارا
بیٹا تمہارا ہی رہے گا۔“

”لیکن اس مسئلے کا یہ تو کوئی حل نہیں ہے..... تو کیا وہ
ساری عمر اسی کے گھر رہے گا۔“ اماں اداسی سے بولیں۔

”ارے نہیں..... حل تو ہے..... جلد ہی اکو کا دل

اس سے بھر جائے گا۔ لکھوا لو مجھ سے..... بس وہ

اسے طلاق دے کر چھوڑ دے گا اور اپنے گھر آ جائے

گا تب تک شاید ایک بیٹی کا رشتہ طے پا جائے گا اور کمرہ

خالی ہو جائے گا۔ اکو کئی دہین کے لیے۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اماں کی آواز میں امید

کے ساتھ لرز رہے تھے۔

”بالکل ہو سکتا ہے..... بس اب تم دل بڑا کر کے

اکو کو اس کی سرال رہنے کی اجازت دے دو۔“

گھر سے اجازت ملی تو اب ایک بڑا مرحلہ

شہزادی انجم سے بات کرنے کا تھا..... اور جب ہمت

کر کے میں نے بات کی تو شہزادی انجم حیران رہ گئی۔

”کک..... کیا..... کیا کہہ رہے ہیں آپ

اکبر..... ہمارے گھر میں کوئی قانون کمر نہیں ہے۔ آپ کو

پتا تو ہے۔“

”ہاں پتا ہے۔“ میں رसान سے کہنے لگی لیکن ہم

اسی کمرے میں رہ لیں گے جس میں تم اور اماں رہتی ہو۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔

”آپ سمجھ بھی رہے ہیں کد آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”اماں بالکل معذور ہیں..... وہ نہ سن سکتی ہیں نہ

دیکھ سکتی ہیں۔ ان کا بے ضرور وجود..... ہمیں کیا ڈر سرب

کرے گا۔“

”لیکن اکبر..... وہ جیتا جاگتا انسان تو نہیں ہے

ناں.....؟“ میری بات پر وہ آہستگی سے بولی۔

”ہاں تو کمرہ تو خاصا کھلا ہے..... تم رنج میں ایک

پردہ لٹکا لیتا۔“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”یہ ایک عارضی حل ہے شہزادی.....“ میں اسے

سمجھاتے ہوئے بولا۔

”ورنہ ہمارا نکاح کھٹائی میں پڑ جائے گا..... اور

کیا خبر کل کو میرے گھر والے اس رشتے سے ہی منکر ہو جائیں..... تم جانتی ہو کہ کن حالات میں ہمارا رشتہ طے ہوا ہے..... بس اب جلد سے جلد میں تم سے نکاح کر کے اس رشتے کو پکا کرنا چاہتا ہوں..... بعد میں ہم دونوں مل کر اس مسئلہ کا حل ڈھونڈیں گے۔“

”لیکن اکبر..... اماں تو راضی ہو جائیں گی لیکن بھیا اور بھابی کیسے راضی ہوں گے؟ وہ تو خوش تھے کہ میرے ساتھ، ساتھ ان کو اماں کے وجود سے بھی چھٹکارا مل جائے گا..... لیکن اب۔“ وہ تنویش بھرے لہجے میں بولیں۔

”تم ان کو سمجھا لو کہ یہ سب عارضی ہے..... میں خود بھی یہاں رہنا پسند نہیں کروں گا..... اور ان سے یہ بھی کہہ دو کہ اماں بھی ہمارے ساتھ جائیں گی، جہاں ہم جائیں گے..... اور ان کو ساری پچویشن بھی سمجھا دو.....“ میں اسے دھیمے لہجے میں ساری بات سمجھاتا رہا..... وہ غور سے سنتی رہی..... اور اگرچہ اس کے کہنے کے مطابق بھائی بھابی کا ماننا بہت مشکل تھا..... لیکن اس نے سارے جتن کیے پھر بھی ان کی ایک نہ ٹھہری جو کسی طرح ہاں میں نہیں بدل رہی تھی۔ آخر کار جب تھک ہار کر شہزادی انجم نے انہیں یہ لالچ دی کہ اکبر ہر ماہ اپنے یہاں رہنے کی فیس ادا کیا کرے گا تو وہ اس شرط پر راضی ہو گئے کہ یہ دورانہ زیادہ لمبا نہ ہو..... خیر جو بھی ہوا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا..... اور تب چند لوگوں کی موجودگی میں بڑی سادگی سے ہمارا ہو گیا..... نکاح والے دن اماں اور بہنیں صبح سے رو کر دو کر پاگل ہو رہی تھیں گھر میں ایسی سوگواریت تھی جیسے ابھی، ابھی گھر سے کوئی میت نکلی ہو..... ابا ایک ٹوٹی چار پائی پر اٹوانی کھٹوانی لیے لیٹے تھے اور بار، بار ہائے اودی کر رہے تھے..... ایسے جیسے ان کا جوڑ جوڑ ڈھک رہا ہو..... میں...

کہاں لکھیوں سے اپنے اس نئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا جو میں نے اپنے نکاح کے لیے دو تین ماہ پہلے بنایا تھا..... اسے استری کر تو رکھا تھا لیکن پہننے کی ہمت نہیں تھی۔ مقررہ وقت پر مارے خوف کے میں ان ہی تلکے کپڑوں میں ابا کے ساتھ چل پڑا..... دو تین ابا کے قریبی دوست بھی تھے، کسی رشتے دار کو بلا دیا تھا نہ

محلے والوں کو۔ شہزادی انجم نے اپنی تنخواہ سے چائے اور مٹھائی کا اہتمام کیا تھا..... میں نے شہزادی کو کچھ رقم دے دی تھی کہ وہ اس سے نکاح کا جوڑا سلوا لے..... اس کا بھائی قاضی کو لے کر آیا تھا۔ ہمارا نکاح پڑھادیا گیا اور شاید دنیا میں ایسا نکاح کسی کا نہ ہوا ہوگا..... مبارک سلامت تک کسی نے نہیں کہا..... چائے اور مٹھائی کسی زہر کی طرح سب نے حلق سے اتاری اور چلتے بنے۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس شہزادی انجم کو اس کی بھابی اندر لے گئی اور میں ابا کے ساتھ گھر آ گیا۔ اماں اور باجیاں مجھے دیکھ کر چیخ، چیخ کر رونے لگیں..... مجھے بھی رونا آ گیا لیکن میرا رونا اس بات پر تھا کہ کسی کی شادی ایسی بھی ہوئی ہوگی جیسے میری ہوئی تھی۔ بہر حال رونا دھونا ختم ہوا..... میں ابا کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ رات کا کھانا بھی ابا کے ساتھ کھایا جب میں شہزادی انجم کے گھر جانے لگا تو اماں نے ایک دردناک چیخ مارتے ہوئے کہا۔

”اکو..... میں تیری خالی چار پائی کو کیسے دیکھوں گی، اے اللہ..... مجھے صبر دے۔“ باجیوں کی چیخوں کی آواز بھی اماں کی چیخوں میں شامل ہو گئی..... میں بولھلا کر بجلت میں باہر نکل آیا..... چوروں جیسی چال سے شہزادی کے گھر میں داخل ہو گیا..... گھپ اندھیرا تھا داخلی دروازہ شاید میرے لیے ہی کھلا چھوڑا تھا۔ میں نے اندر اگر کنڈی چڑھا دی اور سیدھا شہزادی کے کمرے میں آ گیا..... راستے میرے دیکھے بھالے تھے کہ بات پکی ہونے کے بعد ایک دو بار آچکا تھا۔ اماں کے خرانے باہر تک آرہے تھے کمرے کو پردے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ شہزادی سرخ کپڑوں میں دلہن بنی بیٹھی تھی..... میں اپنا اشتیاق چھپاتے ہوئے چار پائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا..... اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا..... اور ہمیں سارے روماس کا خاتمہ ہو گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی اور طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ میری پسند تھی سہاگ رات جیسے تیسے گزرتی..... صبح منہ اندھیرے کسی نے دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا..... شہزادی کمرے میں موجود نہیں

ارمان

محبت زندگی بن کر
کرے جب خواہشیں اکثر
بہت بے چین کرتی ہے
کبھی تو بین کرتی ہے
چھڑ جائے کوئی بل کر
بکھر جائے کوئی محل کر
کسی کی دل لگی ٹھہرے
کسی کی آنکھ میں آنسو
کہیں ہیں اجنبی چہرے
مگر بس ایک ہی حل ہے
ہمارے پاس جو مل ہے
اسے وقفہ وفا کر دیں
حسیں لمحے دعا کر دیں
محبت زندگی بن کر
فقط ارمان ہوتی ہے
جہاں اس کی تنہا ہو
وہیں مہمان ہوتی ہے

کلام: بیٹھی احمد

تھی۔ میں نے بوکھلا کر دروازہ کھولا تو شہزادی کی بھابی
کھڑی طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔
”آپ کے ابا آپ کو بلانے آئے تھے۔۔۔۔۔
ناشتے کے لیے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ میں غلت میں نیند سے بھری
آنکھیں ملتا گھر سے باہر چلا گیا۔۔۔۔۔ ناشتے پر سب میرا
انتظار کر رہے تھے۔ میں باتھ روم میں کھس کر فریش ہوا
اور سب کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ پھر یہ
روٹین بن گئی۔۔۔۔۔ سارا دن میں اپنے گھر پر ہوتا کھانا،
ناشتا سب گھر والوں کے ساتھ کرتا، رات گئے شہزادی
انجم کے گھر آتا۔ بس وہی وقت ہوتا جب ہم ایک
دوسرے سے بات چیت کر لیتے۔۔۔۔۔ وہ عادتوں کے
لحاظ سے زبردست تھی اس نے بھی اعتراض نہیں کیا کہ
تم سارا دن اپنے گھر کیوں گزارتے ہو۔۔۔۔۔ میرے
ساتھ ناشتا، کھانا کیوں نہیں کھاتے۔۔۔۔۔ کبھی مجھے
احساس ہوتا تو میں آفس سے کچھ وقت کی چھٹی
کر لیتا۔۔۔۔۔ وہ بھی اسکول سے ایک دو پیریڈ کی چھٹی
کر لیتی، ہم پارک میں بیٹھ کر دبی بھلے کھاتے، محبت
بھری باتیں کرتے۔۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔۔ اتنی ہی عیاشی
ہمارے بس میں تھی۔

وقت جیسے، جیسے گزرتا گیا۔۔۔۔۔ شہزادی کے بھیا
اور بھابی، شہزادی کو تنگ کرنے لگے کہ وہ یہ گھر چھوڑ
دے۔۔۔۔۔ شہزادی مجھ پر زور دینے لگی کہ ہمیں جلد سے
جلد اپنا بندوبست کر لینا چاہیے۔۔۔۔۔ اس کا کہنا تھا کہ
”ہم کسی معمولی علاقے میں کسی ایک کمرے کا تو
بندوبست کر ہی سکتے ہیں ناں۔۔۔۔۔ اور پورا گھر نہ
ہو۔۔۔۔۔ بھلے سے کمرہ ہو۔۔۔۔۔ ہم گزارہ کر لیں گے
لیکن۔۔۔۔۔ آزادی کا سانس تو لے سکیں گے۔“
”تمہاری بات ٹھیک ہے شہزادی۔۔۔۔۔ لیکن سوچو
تو۔۔۔۔۔ اماں ہم دونوں کے نوکری پر جانے کے بعد اکیلی
کیسے رہیں گی جبکہ ابھی تو گھر میں بھابی اور بچے بھی
ہیں۔۔۔۔۔ وہ ان کی دیکھ کر کچھ کر لیتے ہیں۔“

”ہاں یہ مسئلہ تو ہوگا۔“ وہ سوچ میں ڈوبے لہجے
میں بولی۔ اگرچہ میں نے شہزادی انجم کے ذہن میں یہ

بات ڈالی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر چھوٹی باجی کی
شادی ہوگئی اور اس کا کمر خالی ہو گیا (بڑی باجی کی
شادی کی عمر میرے خیال میں گزر گئی تھی) تو میں شہزادی
انجم کو اپنے گھر لے جاؤں گا اور یقیناً وہ اماں اور باپ کی
اتنی خدمت کرے گی کہ وہ اسے اپنی انہی آنکھوں
سمیت دل سے بہو مان لیں گے کیونکہ اتنے عرصے
میں، میں اس کے دل کی خوب صورتی جان گیا تھا آپ
کیا کہتے ہیں قارئین کہ مجھے کوئی سستا سا الگ گھر
ڈھونڈ لینا چاہیے یا چھوٹی باجی کی شادی کا انتظار کرنا
چاہیے یا بھابی کو اپنے رہنے کا ڈبل معاوضہ دے کر۔۔۔
فی الحال اسی گھر میں رہنا چاہیے۔۔۔۔۔ پلیز کوئی حل
بتائیے۔“ آخر میں آپ سب کا بھی تو اکو ہوں۔

بسن اتنی سی بات ک

ناہید چوہدری

ٹریفک سگنل پر گاڑی رکتے ہی پھولوں اور کجروں والوں نے یلغار کر دی۔

”صاحب جی..... تازہ سمجھ رہے ہیں جی، بیگم صاحبہ کے لیے لے جائیں۔“ عدنان کی گاڑی رکتے ہی تیرہ، چودہ سالہ لڑکا بسی سی ڈنڈی پر ڈھیر سارے مہکتے سمجھ رہے لیے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی میں گھسا..... خوشامد اندہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

کچھ اتفاق ہی ہو رہا تھا کہ کافی دنوں سے عدنان اس سے سمجھ رہے لے رہا تھا۔ شادی کے بعد سے شاید ہی ناغہ ہوا ہو۔

روزانہ بھی سبائی حنا چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجائے اس کی نظر ہوتی۔ اور اسے دیکھتے ہی عدنان سارے دن کی کوفت اور تھکاوٹ بھول جاتا۔

”لاؤ بھئی آج ذرا آپیشل والے دو..... ہاں یہ موٹے والے.....“ عدنان نے پوری دلچسپی اور توجہ سے دو عدد سمجھ رہے ہاتھ میں لے کر سوچتے۔

”واہ..... کیا دل فریب خوشبو ہے، یہ لو پیسے۔“ اس نے سوکا نوٹ لڑکے کی طرف بڑھایا..... گاڑیوں کی لمبی قطار دھیرے، دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔

”صاحب..... صاحب جی.....“ عدنان کی گاڑی ذرا آگے بڑھی..... لڑکے نے پھر تان لگائی۔

”آج..... آج..... آپ یہ چھوٹا پھولوں کا گلدستہ بھی لے لو صاحب جی.....“ لڑکے نے رنگ برنگے گلابوں کا گلدستہ کھڑکی میں گھسایا۔

عدنان کی گاڑی مہک اٹھی۔
”نہیں بھئی، اس کی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ سگنل نہ جانے کب کھلے گا۔“ عدنان کو بیزار ہونے لگی۔

”اپنی امی جان کی خوشی کے لیے صاحب جی۔“ لڑکے نے گویا منت کی۔

”امی جان.....“ عدنان نے نا سنجی سے اسے گھورا۔
”آج مدرز ڈے ہے ناں جی..... ماں کے لیے لے جائیں خوش ہو جائیں گی.....“ لڑکا گلدستہ پیچھے کا ہر حربہ استعمال کر رہا تھا۔

”مدرز ڈے.....“ عدنان بڑبڑایا۔ اس نے تو دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ہارن پر ہارن بجتے لگے۔

”رہنے دو..... وہ مجھے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتی ہیں۔“ عدنان نے گاڑی گیر میں ڈالتے ہوئے غلٹ میں کہا۔

”تو پھر اپنی بیگم صاحبہ کے لیے کیوں لیے.....“ گاڑی آگے بڑھتے، بڑھتے بھی لڑکے کا جملہ اس کے کانوں میں پڑ گیا۔ گاڑی تو آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن عدنان کا ذہن اسی ایک جملے میں انک گیا۔

”اونہ..... یہ اپنی چیزیں پیچھے کے لیے کیا، کیا ڈائلاگز بولتے ہیں..... بھلا ماں کو یاد کرنے کے لیے کسی خاص دن کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”اچھا تو بھلا تم بتاؤ..... آخری بار ماں سے کب ملے تھے؟“ دماغ نے جھٹ سوال داغا۔

”اوں..... شادی کے ہنگامی دنوں میں تو آس پاس ہی ہوتی تھیں ناں.....“ آف یہ اکلوتا پن بھی کتنی بری

گلابوں کی مہک ایک بار پھر ناک سے ٹکرائی۔ سٹنل
شاید کھل چکا تھا۔

اس کی گاڑی کے پیچھے لائن لگ چکی تھی۔
عدنان نے میکا کی انداز میں گلدستہ پکڑا اور جتنے
پیسے ہاتھ میں آئے کھڑکی سے باہر اچھال دیے۔
”ای! عدنان کو پھولوں کے بیجاں کا چہرہ نظر آنے
لگا۔۔۔۔۔ اب وہ ماضی کا چھوٹا سا بچہ بن چکا تھا۔۔۔۔۔ جب ابو کی
حادثاتی موت پر انی نے اسے اپنے شفیق بازوؤں میں بھر
کے اپنے سینے میں چھپالیا تھا۔ اس کے کانوں میں رشتے
داروں کے طرح، طرح کے جملے گونجنے لگے۔

”بچاری صفہ۔۔۔۔۔ پہاڑی جوانی کیسے گزارے گی۔۔۔۔۔“
”میرے خیال میں تو اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔“
ایسے ہی بے شمار جملوں کے بعد اسے انی کی
پتھروں جیسی مضبوط آواز سنائی دی تھی۔

”میرا۔۔۔۔۔ ہاں میرا عدنان، میری کل کائنات
ہے میرا مضبوط سہارا۔۔۔۔۔ اسی کے سہارے ساری
زندگی گزاروں گی۔۔۔۔۔“ باتیں بنانے والے اپنا منہ

چیز ہے۔ کاش میرے بھی دو چار بہن، بھائی ہوتے۔“
دل میں حسرت نے سرا بھارا۔

”وہیے ایمان کی بات ہے۔۔۔۔۔ کافی دنوں سے انی نظر
ہی نہیں آئیں۔۔۔۔۔ یادہ مصروف ہو گئی تھیں یا۔۔۔۔۔“

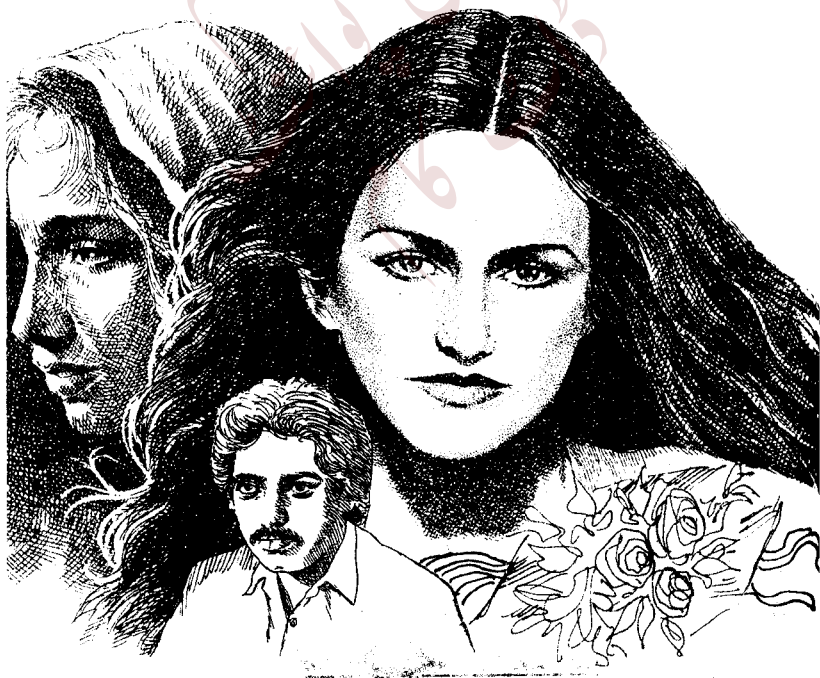
”ایڈیٹ۔۔۔۔۔ تم بڑی ہو گئے ہوا پنی زندگی
میں۔۔۔۔۔ اپنی نئی فوہلی دہن میں۔۔۔۔۔ وہ تو اپنی جگہ پر ہی
ہیں۔“ صبح تیار ہو کے نکلنے لگتا تو کاریڈور سے گزرتے
ہوئے یہی خیال ذہن میں آتا کہ امی سورہی ہوں گی۔
رات دیر سے آتا تو پھر یہی خیال کہ امی سورہی
ہوں گی۔

”کبھی یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ کہیں وہ بیمار نہ
ہوں؟“ دماغ نے جھڑک کر پوچھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ مین شاہراہ پہنچتی لال ہوئی تو اس
نے یہ مشکل بریک لگائے۔

”نہیں، یہ خیال تو کبھی نہیں آیا۔۔۔۔۔“ بحرمانہ
احساس نے گھیر لیا۔

”صاحب جی۔۔۔۔۔ بڑا پیارا گلدستہ ہے۔“



بچوں کو رشتے تو یاد آ جاتے ہیں۔ بہت اچھا رواج نکالا ہے۔“ بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے صفیہ کمزور آواز میں کہہ رہی تھیں اور عدنان شرمندگی کے احساس میں ڈوبا جا رہا تھا۔

اب وہ کس زبان سے پوچھتا کہ امی آپ کب سے بیمار ہیں؟ وہ حنا کو کس منہ سے تصور وار ٹھہراتا..... جبکہ وہ خود ہی خیال سے غافل رہا تھا۔

”امی..... آپ نے بتایا..... کیوں نہیں کہ.....“ ان کے گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے ندامت سے پوچھا۔ زبان رک، رک گئی۔

”حنا آئی تو غصی..... پر اس وقت طبیعت اتنی خراب نہیں تھی۔“ صفیہ نے نرمی سے کہا۔

دروازے کے باہر کھڑی ٹوہ لیتی ہوئی حنا گڑبڑا گئی۔ اس نے تو شروع کے دنوں میں ہی چالپوسی کی تھی، اس کے بعد ملازمہ بی ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی..... وہ تو سارا، سارا دن ٹی وی پر ڈرامے دیکھتی رہتی یا اپنی ای سے گپ شپ لگا لیتی۔

ای کا خیال ذہن میں آتے ہی حنا کو یاد آ گیا کہ اس نے اپنی امی کو دھکے تو کیا ہی نہیں۔

”ابھی کرتی ہوں.....“ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نمبر ملانے لگی تھی کہ بے خیالی میں دروازے کو ہاتھ لگا لیا تو وہ مزید کھل گیا۔ عدنان اور صفیہ کی نظریں دروازے کی سمت اٹھ گئیں۔

”وہ..... میں..... امی کو دھکے کرنے آئی تھی۔ پپی دروازے امی.....“ حنا نے آگے بڑھ کر سر ساس کے آگے جھکا دیا۔

”جیتتی رہو..... میری چندا..... میرے گھر کی رونق سدا سہاگن رہو..... دو دو نہاؤ، پوتوں بچلو.....“

صفیہ دعاؤں کی لڑی پروتے لگیں۔ بس اتنی سی بات تھی..... حنا اور عدنان نے احساس ندامت میں ڈوبی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا..... اور اپنے قیمتی رشتے کو دل کی گہرائیوں میں بند کر لیا۔ اور حنا کا دامن اصول دعاؤں کے خزانے سے بھر گیا۔

لے کر غائب ہو گئے۔ زمانے کے سرد و گرم سے بچانے والی ماں کو آج دروازے نے یاد کروایا وہ بھی ایک پھول بیچنے والے کی وجہ سے..... دو تین مہینوں سے تو وہ ساری دنیا بھلائے بیٹھا تھا..... امی کی یاد ہمک، ہمک کر آنے لگی..... اور گاڑی کی اسپید بڑھتی گئی، گیٹ کے سامنے بریک زور سے چڑھ گئے۔

لان میں ہلٹی حنا گھبرا کر گیٹ کی طرف آئی۔

”واؤ..... آج تو اتنا حسین جگے بھی آیا ہے.....“ حنا نے بے مبری سے ہاتھ آگے بڑھائے۔

”امی، امی کہاں ہیں حنا؟“ عدنان نے پھولوں والا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں.....“ حنا نے اس کے انداز پر حیرت زدہ ہو کر کہا..... عدنان نے آج نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا امی کی یاد کا انجیکشن نہ جانے کہاں سے لگو آ کر آیا تھا۔ ناگواری سے سوچا۔

”یہ بکھرے لو اور اپنے کمرے میں جاؤ..... میں ابھی آتا ہوں۔“

”میں..... بھی آؤں۔“ حنا نے رک، رک کر پوچھا۔

”کیا صبح سے تم امی کے کمرے میں گئی تھیں۔“ عدنان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں..... تو.....“ حنا گڑبڑا گئی۔

”تو پھر اب بھی مت آؤ.....“ عدنان فیصلہ کن انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ امی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا..... عدنان گلدستہ ہاتھ میں پکڑے شرمندہ، شرمندہ سا آگے بڑھا۔

اندھ گھستے ہی دوائیوں کی ناگوار بدبو ناک سے ٹکرائی۔ صفیہ دروازے کی طرف رخ کیے گویا منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”امی..... میری پیاری امی..... پپی دروازے.....“ عدنان نے گلدستہ ان کی گود میں رکھ کر بازو ماں کے گلے میں ڈال کر سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔

”جیتے رہو میرے چاند..... آج نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تمہیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ٹی وی میں آرہا تھا کہ آج ماؤں کا دن ہے چلو اسی بہانے

سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ دوپہر کی ہانڈی کے لیے فریج سے گوشت نکال رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ بہت حسین لگ رہی ہے میری بیٹی.....“ انہوں نے بے ساختہ ساتھ لگا کر اس کے بالوں پہ لب رکھ دیے..... کھلے دروازے سے شعیب احمد اندر آچکے تھے۔

”شاہینہ، یہ دروازہ کیوں کھلا رکھا ہے؟“ انہوں نے آتے ہی بیوی سے باز پرس کی۔

کائنات نے نیچرل پنک کلر کے لب گلوں سے ہونٹوں کو رنگا۔ پھیلے ہوئے کاجل کوٹھو سے صاف کیا اور تنقیدی نگاہ سے ایک بار پھر اپنا جائزہ لینے لگی۔
نوجوانی کی چمک لیے اس کی گلابی رنگت تیار رہی تھی..... لائسنز اور کاجل سے بھی آنکھیں قدرتی خم دار پلکوں سے حسین تر لگ رہی تھیں، بال سامنے کر کے فریج چوٹی بنائی تھی۔

”ای کیسی لگ رہی ہوں؟“ کائنات ماں کے

نکلے جو قدم

ریحانہ آفتاب



”میں نے تو بند کیا تھا خود، آپ کے جانے کے بعد.....“ شاہینہ جلدی سے بولیں۔

”پھر کھلا کیسے.....؟“ شعیب احمد کی گھورتی نظروں سے خائف شاہینہ لب چبانے لگیں۔

”وہ، ابو میں نے کھولا تھا۔ ساتھ والی حصہ کو آواز دینے کے لیے..... بند کرنا بھول گئی۔“ کائنات نے سچائی بیان کی۔

”آئندہ دروازے پہ آکر کسی کو آواز دینے کی ضرورت نہیں، مجھے سخت ناپسند ہیں وہ عورتیں جو دروازے پر ٹنگی رہتی ہیں۔“ شعیب احمد کی آواز کی گونج سے دونوں چپ ہو گئیں۔

”اور تم، اتنا میک اپ کر کے کہاں جا رہی ہو؟“ یونیفارم میں ملیں چودہ سالہ کائنات، شعیب کی نظروں کی گرفت میں تھی۔

”اسکول میں فیئر ویل پارٹی ہے، اسی میں جا رہی ہے۔“ شاہینہ نے کائنات کی مشکل آسان کی۔

”اتنا جھج کے؟“ وہ کھا جانے والی نظروں سے بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

”صرف کا بجل اور گلوڑ ہی تو لگایا ہے۔“ شاہینہ منمنائی۔

”منہ بند رکھو اپنا..... اور تم؟“ شعیب نے دھاڑ کر شاہینہ کو چپ کرایا۔

”نور آمنہ دھو کر بال کھولو اور سادی چٹیا بناؤ۔“ باپ کے حکم پر وہ واش روم کی طرف بڑھی۔

”اگر میں ابھی چابی لینے واپس نہ آتا تو تم اسی حلیے میں بھیج دیتیں بنی کو باہر..... اور یہ دیر سے کیوں جا رہی ہے اسکول؟ خضر اور میر کہاں ہیں؟“ شعیب احمد نے آنے کی وجہ بتانے کے ساتھ نفیثش شروع کی۔

”وہ تو اپنے ٹائم پر اسکول چلے گئے۔ کائنات نہم میں ہے تو دسویں کی فیئر ویل ہے اس لیے ان کی تقریب دیر سے شروع ہوگی..... ساتھ والی حصہ کے ساتھ جائے گی۔“ شاہینہ نے معلومات بہم پہنچائیں۔

”تم احق عورت.....! میری باتوں کا اثر نہیں ہوتا تم پر..... سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہنسی ٹھنول کرتی جائے گی وہ اسکول..... تم سے کہا ہے ناں خضر اور میر کے بغیر اسے اکیلے نہیں ٹکٹے دینا۔ تربیت کرنا کب آئے گی تمہیں..... تمہیں کیا بولے بندہ..... جسے خود تربیت کی ضرورت ہے۔“ شعیب احمد کی زبان کے نشتر شاہینہ کے وجود میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔

”آئندہ اگر میں نے کوئی کوتاہی دیکھی کائنات کی طرف سے تو وہ تمہارا آخری دن ہوگا اس گھر میں سمجھیں!“ شاہینہ کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ آگئی۔

کائنات ان کی ساری گفتگو سن رہی تھی، اچھی طرح رگڑ، رگڑ کر منہ دھو کر باہر دو ٹکل آئی۔

”بال کھولو..... جلدی۔“ ہدایت دے کر شعیب احمد اندر کمرے میں چلے گئے تھے۔

کائنات چپ چاپ آئینے کے آگے کھڑی ہو کر بال کھولنے لگی۔ شاہینہ نے لب چباتے تم سن کائنات کی خاموشی کو محسوس کیا۔ آنکھوں میں گلابی پن... اس نے نظریں جھکا رکھی تھیں۔

”امی ہم ساری سہیلیوں نے ایک جیسا میئر اسٹائل، کا بجل، لائٹس کے ساتھ میچنگ لپ گلوڑ پلان کیا ہے، فیئر ویل کے لیے۔“ کتنے دنوں سے وہ اس تیاری کے لیے ایکساٹڈ تھی۔

صبح سے ہی وہ تیاری میں جت گئی تھی مگر اب..... یقیناً معصوم سی خواہش کو پانی میں بہتا دیکھ کر وہ خوب روئی تھی۔ شاہینہ کے دل میں کوئی نیزہ چبھا تھا۔

شعیب احمد کمرے سے چابی لے کر واپس آئے۔

”کائنات! جلدی آؤ۔“ باپ کی آواز پہ اس کے ہاتھ اور تیزی سے الٹی سیدھی چٹیا بنانے لگے۔

”آئی ابو!“ اس نے آواز لگائی۔ باپ کے رعب و دبدبے سے تینوں بچے کانپتے تھے۔ شاہینہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔

”کائنات کو میں چھوڑنے جا رہا ہوں، خضر اور میر آجائیں اور اس کی پارٹی ختم نہ ہو تو تم خود جا کر لے

نکلے جو قدم

لگی تھیں۔ اماں دودن سے چھوٹی بیٹی کے گھر گئی ہوئی تھیں، اس کے گھر خوشخبری آنے والی تھی۔

دونوں بھائیوں کے بچے اولیول اسکول میں تھے۔ مگر شعیب احمد مخلوط اسکول کے سخت مخالف تھے۔ بھائیوں نے سمجھایا بھی مگر وہ اپنی ہٹ کے کپے تھے۔

”یہ بچوں کے ساتھ زیادتی ہے۔“ اسد نے انہیں سمجھانا چاہا۔

”رہنے دو، تم کیوں اپنی جان ہلان کر رہے ہو، ماں کا کیا اولاد کو جھگڑتا پڑتا ہے۔“ برتن سینیٹی شاہینہ کو لینے تو زنگیوں سے گھورتی صفیہ بیگم (ساس) نے چھوٹے بیٹے کو حمایت سے روکا۔

کائنات کی چوکیداری کے لیے خضر اور میر کو بھی قربانی دینا پڑی۔ وہ ساتھ والے اسکول میں پڑھتے تھے جو لڑکوں کا تھا۔ شعیب احمد کے بچوں میں اعتماد کی کمی تھی۔ وجہ اسکول نہیں بلکہ باپ کا غضب ناک رویہ تھا۔ جیٹھانی کے بچے جب اپنے اسکول کی بڑکیں مارتے تو ان کے رنگ پھیکے پڑ جاتے تھے۔

☆☆☆

”السلام علیکم امی!.....“ کائنات بھائیوں کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔

”تم آگئیں..... پارٹی جلدی ختم ہوگئی؟“ شاہینہ نے چند گھنٹے بوجھل دل کے ساتھ گزارے تھے۔ صفائی سے فارغ ہو کر جلدی، جلدی کھانا بنایا تھا۔

شعیب احمد دوپہر کو گھر سے کھانا منگواتے تھے اور ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ وقت سے پہلے سب تیار رکھیں۔ کائنات کو دیکھ کر انہوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”نہیں پارٹی تو چل رہی تھی یہ دونوں لینے آ گئے تو میں چلی آئی۔“ کائنات نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تم رک جاتیں ناں، میں خود لینے آ رہی تھی تمہیں۔“ شاہینہ کو حد درجہ ملال ہوا اس کے پڑمردہ چہرے کو دیکھ کر۔

”ناخن اتنی دھوپ میں آپ کو زحمت ہوتی اس

آنا..... کسی دوست کے آسرے پر مت بیٹھی رہنا۔“ وہ بیوی کو حکم نہیں دے رہے تھے بلکہ شاہینہ سے بات کرنے کا اُن کا انداز ہی ایسا تھا۔ کائنات دو چوٹی بنائے دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ دوپٹا سر پر لیے کھڑی تھی۔

”کوشش کرنا، بھائیوں کے ساتھ گھر لوٹ آؤ اور آئندہ سے کسی تقریب میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکول پڑھنے بھیجتا ہوں ان چوٹکوں کے لیے نہیں، چلو میرے ساتھ۔“ کائنات کو ہدایت دے کر آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

”اللہ حافظ امی!“ سر جھکا کر ان کے آگے سے گزرتی کائنات نے ہولے سے رندھی ہوئی آواز میں ماں سے کہا اور باپ کے پیچھے چل دی۔ اس کی دلی کیفیت یہ وہ افسردہ تھیں، سہیلیوں کو گلابی آنکھیں اور تیاری نہ ہونے پر جانے کائنات..... کیا کیا تاویلیں دیتی۔ گیٹ کی زوردار آواز آئی وہ بھاگیں دروازہ بند نہ کرنے پر شعیب نے گیٹ پر غصہ اتارا تھا۔

☆☆☆

شعیب احمد تین بھائی اور دو بہنیں تھیں، ان کے والد کے دو بڑے جزل اسٹور تھے۔ جوتیوں بیٹے ہلاتے تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے ایک جزل اسٹور مزید کھول لیا تھا تاکہ تینوں بیٹوں کا ذاتی کاروبار ہو سکے۔ دونوں میاں، بیوی تینوں بیٹوں کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے اس لیے تین منزلہ گھر بنوایا تھا۔ شعیب احمد نے پہلی منزل میں رہنا پسند کیا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں انہی کے پورشن میں رہاں پڑ گئیں۔ ان کے لیے بیڑھیاں طے کرنا دشوار عمل تھا۔

دوسرے فلور پر شعیب سے چھوٹا اسد اور تیسرے سب سے بڑے بھائی آصف تھے۔ دونوں بہنوں کی فادی ہو چکی تھی وہ اپنے گھر کی تھیں۔ سر تو شاہینہ کی خدمت گزار طبیعت پر اسے بہت سراہتے تھے۔ تینوں بھوکوں میں انہیں شاہینہ سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کی بات کے بعد شاہینہ حقیقتاً خود کو بہت تنہا محسوس کرنے

☆☆☆

”زور سے دبا لڑکی... کیا ہاتھوں میں جان نہیں ہے۔“ صفیہ بیگم شام کو لوٹ آئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے شاہینہ اور کائنات کو لگا رکھا تھا۔ کبھی ان کی ٹانگوں میں درد ہوتا، کبھی سر میں ہونے لگتا۔ اب بھی شاہینہ کو سالے والی چائے پینے بھیج کر وہ کائنات سے سر دیواری تھیں۔ ہدایت پر وہ اور زور سے دبا رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیاں دھکنے لگی تھیں۔ کلائی میں درد ہونے لگا تھا۔

”شاہینہ، بالکل ہی پھو ہڑ ہے تمہاری بیٹی، ذرا جو تم نے کچھ سکھایا ہوا ہے۔“ وہ چائے لے کر آئیں تو صفیہ بیگم نے لب کھولنا ضروری خیال کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شاہینہ اور ان کے بچوں میں بھی کوئی خوبی انہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

وہ کچھ کہہ کر عتاب کا نشانہ نہیں بن سکتی تھیں۔ شروع، شروع میں کئی بار انہوں نے اس نا انصافی پر آواز بلند کی تھی اور وہ صفیہ بیگم کو اتنی گراں گزری کہ جب تک شعیب نے شاہینہ کی ہڈی پولی ایک نہ کر دی، انہوں نے حلق سے پانی اور کھانا نہیں اتارا۔۔۔۔۔۔ سب ہی اس ذلت سے آگاہ ہوئے، تب سے شاہینہ نے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے، وہ جیٹھانی اور۔۔۔ دیورانی کو تفریق لینے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔

صفیہ بیگم کی شاہینہ کی نسبت دونوں بہوؤں سے زیادہ ہنسی تھی۔ جیٹھانی ہڈی تو صفیہ بیگم کی سکی بھانجی تھیں، دیورانی نگہت کو وہ خود بڑے چاؤ سے بیاہ کر لاتی تھیں۔

”لائیں میں دبا دیتی ہوں۔“ شاہینہ نے چال کے ساتھ اپنی خدمات پیش کیں۔

”تم جا کر پڑھو، پیپر ز کی ڈیٹ آنے والی ہے۔“ شاہینہ نے بیٹی کو جانے کا اشارہ کیا۔

”یہ کیا پڑھے گی، بھی پڑھنے میں تو میری نواسیاں ہیں۔“ یسری کی رائیگ دھیمی سے تم نے، کیا موتیوں سی ہے۔“ صفیہ بیگم بڑی نواسی کے کٹ گالے

لیے چلی آئی۔ ابو کو بھی میرا زیادہ دیر باہر ہٹا پسند نہیں ہے ناں۔“ اپنی دانست میں اس نے سمجھداری دکھائی تھی مگر اتنی کم سن میں یہ سمجھداری شاہینہ کو مزید طول کر گئی۔

”بہت بھوک لگی ہے، کیا پکایا ہے آپ نے؟“ خضر نے ان کی گفت و شنید کو بریک لگائے۔

”چکن کڑا ہی۔“ شاہینہ کی نظر بیٹی کے چہرے پر تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”دادی تو نہیں آئیں ناں؟“ میر نے دبی آواز میں پوچھا۔ شاہینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ خضر نے بے ساختہ کہا۔

”اللہ کرے مزید کئی دن نہ آئیں۔“ میر نے بھی دلی خواہش بتائی۔

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم لوگ۔۔۔۔۔۔ دادی ہیں وہ تمہاری۔۔۔۔۔۔“ شاہینہ نے غصہ دکھایا۔

”صرف ہماری ہی دادی ہیں ناں۔۔۔۔۔۔ آپ دیکھتی نہیں ہیں بڑے اور چھوٹے ابو کے بچوں کے ساتھ ان کا رویہ کتنا اچھا ہوتا ہے، ہم سے تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں۔ ہر وقت ڈانٹ پھٹکار۔“ خضر کے منہ بگاڑ کر بولنے پر شاہینہ سر پکڑ کر رہ گئیں۔ یہ کس ڈگر پر جا رہے تھے ان کے بچے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میر نے دروازہ کھولا۔ شاہینہ بھی دروازے تک آئیں۔ اسٹور پر کام کرنے والا لڑکا تھا جو کھانا لینے آیا تھا۔

”شعیب بھائی نے کہا ہے پوچھ کر آؤں کہ کائنات گھر آگئی؟“ وہ کھانا لے کر جاتے ہوئے استفسار کر رہا تھا۔ شاہینہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”کہہ دینا بھائیوں کے ساتھ ہی آگئی۔“ بادل ناخواستہ جواب دے کر شاہینہ نے دروازہ بند کیا۔ چنچ کر کے آئی کائنات نے بھی یہ سوال سن لیا تھا۔ شاہینہ کی نظر اس پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے دونوں اک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ کائنات نے نظر پھیر کر فرنج کھول کر سر اس میں ڈال دیا۔ خضر اور میر کھانا جلدی لگانے کے لیے شور کر رہے تھے۔ شاہینہ کچن میں چلی آئیں۔

میں گن تھے۔ جب شاہینہ نے سوال کیا.....
 ”مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔ بھابی اور بچوں سے
 پوچھو۔“ شعیب نے بھانج کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”تم بھی آجایا کرو کسی اوپر.....“ ہڈی کو بھی اس
 کا خیال آ گیا۔

”بھابی فرصت نہیں ملتی۔“ شاہینہ نے آہستہ سے کہا۔
 ”ہاں اس کے گھر کے کام ہی نہیں نمٹتے۔ سستی
 کی ماری ہے۔“ صفیہ بیگم زہر خند ہوئیں۔
 ”شعیب تمہیں سمجھا بھی تھا۔ انہوں میں رشتہ
 کرو، میری بہن کشف تو پاگل بھی تم سے شادی کے
 لیے..... لیکن تم نے کہیں اور ٹانگا جوڑ رکھا تھا۔ اگر میری
 بات مان لی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔“ ہڈی کے ہاتھ لہرا
 کر بولنے پر شاہینہ کا خون کھول اٹھا۔
 ”بس بھابی غلطی ہو گئی اب تک پچھتا رہا ہوں۔“
 شعیب نے عجب انداز سے کہا۔ ہڈی کے قہقہے پر شاہینہ
 سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔
 ”بھابی آپ کیا کھانا پسند کریں گی؟“ شاہینہ نے
 لہجہ کو شیریں بنا کر پوچھا۔

”میرے لیے تو بریانی اور نہاری بنالو، باقی
 بچوں سے پوچھ لو۔“ ہڈی نے اپنی فرمائش بتائی۔
 ”میں ٹکس اور ڈرم اسٹک کھاؤں گی۔“ ہڈی کی
 بڑی بیٹی حرائے اپنی فرمائش بتائی۔
 ”میں پڑا اور زنگر برگر کھاؤں گی۔“ چھوٹی نے
 بھی حسرت پوری کی۔

”مجھے تو شاشک ودرائس چاہیے۔“ بیٹا کیوں
 پیچھے رہتا۔

”کاشان کے لیے کسٹرڈ اور تھوڑا پنجنی پلاؤ بنالو،
 وہ اوپر پڑھ رہا ہے کہہ رہا تھا کھانے پر بلا لیجے گا۔“ ہڈی
 نے مزید فرمائش چٹ پڑائی۔ شاہینہ بیچارگی سے
 شعیب احمد کو دیکھ رہی تھیں۔

”اتنا سارا کچھ..... اتنی جلدی بنانا اور پھر کچھ
 سامان گھر میں ہے بھی نہیں“ شاہینہ نے مجبوری بتائی۔
 ہڈی اور باقی سب سن کر بھی لا تعلق بن گئے۔

گلیں۔ کائنات چاچکی تھی۔ شاہینہ کے پاس ٹھنڈی
 مانس بھر کر ان کی گوبر افشانی سننے کے علاوہ کوئی چارہ
 نہیں تھا۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ شعیب احمد گھر پر ہی تھے۔ جس
 دن وہ گھر پر ہوتے وہ ان چاروں کے لیے عذاب کا دن
 ہوتا..... شعیب کی صبح دیر سے ہوتی تھی۔ صفیہ بیگم کو آٹھ
 بجے ناشتا چاہیے ہوتا تھا۔ سو شاہینہ کے لیے کوئی دن
 سکون کا نہیں تھا۔ ساس کے ناشتے کے بعد بچوں کا ناشتا
 ہوتا۔ پھر شعیب کے اٹھنے کے بعد انہیں ناشتا کرایا۔
 درمیان میں وقفے، وقفے سے ساس صاحبہ کی
 لڑائیں بھی چلتی رہتیں، کبھی چائے کبھی ”اک تو س
 لکھی بھی سینک کر دو۔ انڈا بھی فراہم کر دینا، صبح ٹھیک
 طرح سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا۔“ وغیرہ، وغیرہ.....
 شاہینہ ناشتے کی ٹرے لے کر آئیں تو سیز جیوں
 سے جیٹھانی ہڈی مع اپنے تینوں بچوں کے پیچھے تشریف
 لے رہی تھیں۔

”آصف دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے ہیں،
 اہل ہم نے سوچا کیوں ناں آج بچ تمہاری طرف
 کریں..... تم لوگ تو اوپر آتے نہیں ہو سو ہم ہی چلے
 آئے۔“ جیٹھانی مکمل میک اپ کیے تیار کھڑی
 تھیں جیسے نیچے نہیں کہیں پارٹی میں جاری ہوں، نیچے
 لگا لک سک سے تیار تھے۔

”اچھا کیا بھابی، جو چلی آئیں۔“ شعیب بچھ بچھ
 دوسروں کے سامنے وہ جتنے مسکراتے تھے۔
 اسی کڑواہٹ تو بیوی، بچوں کے لیے ہوتی تھی۔
 اٹھنے نہ ٹرے صفیہ بیگم کے سامنے رکھی۔

”خالہ اتنی دیر سے ناشتا کر رہی ہیں۔“ ہڈی، صفیہ
 کی طرف متوجہ تھیں، شعیب کے ہاتھ سے ریوٹ
 مار کر ہڈی کے بیٹے نے میوزک پھیل لگالیا تھا۔

کسی گانے پر تینوں بچے جھوم رہے تھے۔ شاہینہ
 رگڑ رہی تھیں۔

”بچے میں کیا بناؤں؟“ شعیب، ہڈی سے باتوں

بڑا۔ وہ جلدی، جلدی ہاتھ چلانے لگیں۔ بیچ میں ان کے تواضع کے لیے شربت کا دور بھی چلا تھا۔

کھانا تیار ہو چکا تھا۔ ”برائی، نہاری، بخنی، پلاؤ، رائے، سلاد، پودینے کی چٹنی، شاشلک، بوائل رائس سب تیار ہے۔ کسٹر فرنیچ میں ہے۔ کچھ رہ تو نہیں گیا؟“ وہ فکر مندی سے تمام ڈشز کو کھول کر چیک کر رہی تھی۔

”خضر اور میر روٹیاں اور کولڈ ڈرنکس لینے گئے ہیں باقی سب تیار ہے، باقی کھانے جو ہوم ڈیوری پر آئے ہیں، انہیں چیک کر لیں۔“ کائنات نے پورا ساتھ دیا تھا تیاری میں۔ اب بھی وہ برتن صاف کر رہی تھی۔ بیچ میں جا کر ان سب کے حضور سلام بھی کر آئی تھی۔ ورنہ بدتمیزی پہ لکچر سننے کو ملتا۔

حرا اور فزانے اس کے پرنٹڈ سوٹ کو تسخیرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”کتنا تھرا ڈکلاس، لاسٹ اسٹیر کا سوٹ پہنا ہوا ہے اس نے۔“ فزا، حرا کے کان میں ہنسی کہہ رہی تھی۔ جسے شعیب نے بھی سن لیا تھا۔ دونوں کی ہنسی پہ اس نے ایک نظر فزا اور حرا کی جدید فراس پر ڈالی اور دوسری نظر کائنات پر جو اس کی نظروں کی حدت سے جلدی مچن میں روپوش ہو گئی۔ دونوں ماں، بیٹی کھانا لگا رہی تھیں۔

”بھابی کا شان کو بھی بلا لیں۔“ شعیب نے ہدلی سے کہا۔

”جاؤ کوئی بھائی کو بلاؤ۔“ ہدلی نے تینوں بچوں سے کہا۔

”ہم نہیں جا رہے ہمارا فیورٹ پروگرام آرہا ہے۔“ تینوں چپکے بیٹھے رہے۔

”خضر یا میر میں سے کسی کو بھیج دو۔“ شعیب کی طرف سے اگلا حکم آیا۔

”وہ روٹیاں لینے گئے ہیں۔“ شاہینہ نے آگاہ کیا اور ان کی ناخلف اولاد پہ ایک نظر ڈالی جو بڑے چھوٹوں کا لحاظ کیے بغیر فضول چیلن لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی اپنی اولاد تو باپ کو دیکھتے ہی ٹی وی کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی کبا کے ساتھ بیٹھ کر وہی تباہی دیکھتے۔

”جو گھر میں بن سکتا ہے بناو، باقی میں آرڈر کر دیتا ہوں، ہوم ڈیوری ہو جائے گی۔ کھانا بن جائے تو خضر اور میر کو روٹیاں لینے بھیج دینا۔ بھابی کو نہاری کے ساتھ نان اچھے لگتے ہیں۔“ شعیب نے جیسے اس پر احسان کیا۔

”بھئی کولڈ ڈرنک ضرور ہونی چاہیے۔ گلے میں پھنستا ہے میرے اور میرے بچوں کا کھانا..... شاہینہ رائے سلاد تو تم بناؤ گی ہی پودینے کی چٹنی بھی ہو جائے املی کے ساتھ تو مزہ آجائے۔“ ہدلی مسلسل ہدایت دے رہی تھیں۔

”جی ضرور.....“ شاہینہ نے شکل گم کرنے میں عافیت جانی، ورنہ اس کی شکل دیکھ کر انہیں اور کوئی فرمائش یاد آجانی۔

”کیا یہ لوگ مہینوں کا فائدہ کر کے آئے ہیں، ہمارا راشن ختم کرنے۔“ بچن میں موجود تینوں بچے سب سن رہے تھے۔ ماں کی شکل دیکھتے ہی خضر نے لب کھولے۔

”چپ کرو، سن لیں گی۔“ شاہینہ نے پیشانی دباتے ہوئے کہا..... انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کام کہاں سے شروع کریں۔

”میں نے چکن فرنچ سے نکال کر پانی میں رکھ دیا ہے۔ بونگ کا گوشت بھی نکال دیا ہے پہلے پیاز فرانی کر لیتے ہیں دونوں کے لیے..... برائی اور نہاری کے بعد بخنی بنا لیں گے۔ پلاؤ کے لیے.....“ پیاز چھیلی کائنات نے اس کی مشکل آسان کی۔

”کتنے بھلکے ہیں یہ لوگ..... کیسے بے شرموں کی طرح منہ بھر، بھر کر فرمائش کی ہے۔ یاد ہے پچھلی بار ہم گئے تھے تو گھنٹوں بیٹھنے کے بعد حرا کو دس بار بڑی امی نے چائے بنانے کا کہا تھا۔ تب وہ بد مزہ سا محلول چائے کے کپ میں ہمارے سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں پڑھنے کے بہانے گم ہو گئی تھی۔“ میرا نہیں پچھلا واقعہ یاد دلار تھا۔

”چپ کر جاؤ تم دونوں، پٹو گے اپنے باپ سے اگر سن لیا کسی نے۔“ شاہینہ کو شعیب احمد کا حوالہ دینا

کھول کر پرفیوم اسپرے کیا۔ کائنات کو سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔

”میں چلتی ہوں، آپ آجائیے گا۔“ کائنات جلدی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”ارے ایسی بھی کیا جلدی ہے، چلتے ہیں۔“ کاشان نے اسے سیڑھیوں پر جالیا۔ کاشان کے بڑھتے ہاتھ کو دیکھتے کائنات نے تقریباً بھاگتے ہوئے دو تین سیڑھیاں عبور کیں۔ نتیجے میں کائنات کا دوپٹا کاشان کے ہاتھ لگ گیا۔

”اوپر آکر لے لو۔۔۔۔۔“ کاشان دوپٹا لہراتے آفر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی خباثت سے کانپتی کائنات نے باقی کی سیڑھیاں بھی تقریباً بھاگتے ہوئے طے کی تھیں۔

سب دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ شاہینہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی اوپر ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جب بھاگتی ہوئی کائنات آکر ان سے لپٹ گئی۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔ دوپٹا کہاں ہے تمہارا؟“ شاہینہ اس کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر چیخنے لگیں۔ کاشان کی حرکات و سکنات انہیں پہلے ہی اچھی نہیں لگی تھیں۔ اس لیے وہ کائنات کو بھیجنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

کاشان دوپٹا ہاتھ میں لیے نیچے آ رہا تھا۔

”چاچی سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ یہ رہا دوپٹا۔۔۔۔۔“ باقی سب کی نظریں بھی اسی طرف تھیں۔

”کیا دیوانی ہو گئی تھی جو سیڑھیوں پر ریس لگا رہی تھی۔۔۔۔۔ یہ دوڑنے، بھاگنے کی عمر ہے اس کی۔“ صفیہ بیگم نے کائنات کی پشت کو گھورتے ہوئے لب کھولے۔

”امی! کاشان بھائی نے بدتمیزی کی کوشش کی۔“ کائنات کے جملے پہ جہاں شاہینہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہیں ہدی کسٹرو کا باؤل فرش پر مار کے چٹکھاڑتی کھڑی ہو گئیں۔

”بد ذات، تیری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے پر الزام لگانے کی۔“ ہدی آگے بڑھیں تاکہ کائنات کو شاہینہ سے الگ کر کے اس کی پٹائی کر سکیں جو ماں سے

”جاؤ کائنات۔۔۔۔۔! تم بلا لاؤ بھائی کو۔“ ہدی اٹھم ویا تو وہ شاہینہ کو دیکھنے لگی۔

”خضر یا میر آجاتے ہیں تو چلے جائیں گے۔“ شاہینہ نے ٹالا۔

”کون سا سرخ پر بھیج رہی ہوں تمہاری بیٹی کو جو صبر کر رہی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اس کا بچنی والا شخص زندہ ہو جائے۔۔۔۔۔ شاید ہم نے آکر غلطی کی۔“ اہلی برامان گئیں۔ شاہینہ ڈر گئیں۔

”بھابی ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود بلالاتی ہوں کاشان بیٹے کو۔“ شاہینہ نے شعیب کی گھورتی لہروں سے خائف ہو کر کہا۔

”آپ رہنے دیں، میں بلالاتی ہوں۔“ ماں کے لیے ہر گھڑی تیار رہنے والی کائنات جلدی سے درعاس طے کرنے لگی۔

”ارے بھابی، موڈ ٹھیک کریں۔“ شعیب کی ادا اوپر تک آ رہی تھی۔

”کاشان بھائی!“ وہ آواز دیتی ہر کمرے میں بھانک رہی تھی۔ وہ اوپر بہت کم آتی تھی۔ اسے اٹھان کا کمر اچھا نہیں تھا۔ ایک کمرے میں کاشان کی اسی تصویر دیکھ کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرہ خالی تھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

”ادلیز پرک گئی۔ کاشان اندر سے برآمد ہوا۔“ السلام علیکم!“ اس نے سلیقے سے سلام کیا۔ اٹھان آواز سن چکا تھا۔ کائنات کو سر سے پاؤں تک لہک کر مسکرایا۔

”و علیکم السلام۔۔۔۔۔! اندر آؤ، کھڑی کیوں ہو؟“ ”میں آپ کو بلانے آئی تھی۔ سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آپ آجائیں جلدی۔“ اس لہروں سے خائف ہو کر کائنات غیر ارادی طور پر اٹھانوں پر برابر کرنے لگی۔

”ارے، روکو، ساتھ چلتے ہیں۔“ اس کے مڑتے ہوئے کورکنے کا اشارہ ہوا۔ کائنات انگلیاں مروڑتی لمبی ٹھیل میں کھڑی رہی۔ بال بنا کر کاشان نے دل

چٹی کھڑی تھی۔

”مام! میں تو اس کی عزت رکھنے کے لیے بہانہ کر رہا تھا لیکن جب یہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے تو میں بھی بچتا دوں کہ یہ میرے کمرے میں خود دوپٹا اتار کر بیٹھی تھی۔ شعیب چاچو کے روئے کا گلہ کرتے مجھ سے محبت کا اظہار کر رہی تھی..... میں نے سمجھایا کہ ابھی بہت چھوٹی ہو تو برامان کے چلی آئی۔“

کاشان کے سفید جھوٹ پر شاہینہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، کائنات کے وجود کی کپکپاہٹ مزید بڑھ گئی۔

”بے غیرت ماں کا خون جو ہے اس کی رگوں میں، یہ تو کرے گی ہی ایسی حرکتیں، میرے پوتے پر الزام تراشی کرتے تجھے موت نہ آئی۔“ صفیہ بیگم نے کائنات کو شاہینہ کی پناہ سے کھینچا..... وہ جھول کر نیچے آ رہی تھی۔ شاہینہ نے بازو پھیلا کر اسے گرنے سے بچالیا۔

ہڈی اور صفیہ بیگم دونوں ماں، بیٹی کے کردار کی دھجیاں اڑا رہی تھیں۔ خضر اور میراچکے تھے، وہ بھی نا بھجی سے سارا معاملہ دیکھ رہے تھے۔ شاہینہ بیٹی کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہی تھیں۔ لمبا چوڑا دسترخوان یونہی سجا ہوا تھا۔ شاہینہ نے اسے کمرے میں لٹا دیا۔ خضر اور میر زمین سے کسٹرڈ صاف کر رہے تھے۔ اس سارے قصے میں شعیب احمد کی خاموشی شاہینہ کو بہت چھبی تھی۔

☆☆☆

شاہینہ چار بھائیوں کے بعد دنیا میں آئی تھی۔ سو سب کی آنکھ کا تارہ تھی۔ شاہینہ کے والد فیروز صاحب کی الیکٹرکس آسٹم کی شاپ تھی جو بہت اچھی چلتی تھی۔ شاہینہ کے بعد دو اور بہنوں کا اضافہ ہوا۔ مگر جتنے ناز خڑے اس کے اٹھائے جاتے تھے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ گھر میں ہر چیز کی فراوانی تھی۔ تین سو گزر پر مشتمل گھر میں محبت کا سکہ چلتا تھا۔ شاہینہ بہت شوخ و شرارتی تھی۔ اس کی بہت ساری

دوستیں تھیں۔ جن کے جھرمٹ میں وہ اسکول جاتی اور واپس آتی تھی۔ راہ چلتا کوئی من چلا ان کے ہاتھ بانگ تھپتھپے پر کوئی فقرہ چست کرتا تو وہ جواب دینا فرض سمجھتی۔ نئی ایک کو گریبان سے پکڑ کر تھپڑ بھی جڑا کرتی تھی۔ اور جو کوئی بدتمیزی کی کوشش کرتا تو اس کے چاروں بھائی شکایت پہ اس کی ہڈی پھلی ایک گروپ کہ وہ بیچارہ پھر کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ کی بھی ہمت نہیں کر پاتا۔

ان دنوں وہ میٹرک میں تھی۔ جب ایک سال مسلسل ان کے گروپ کے انتظار میں کھڑا نظر آتا، تمام سہیلیاں ایک دوسرے کو اشارہ کرتی رہتیں کہ چال چلے اس کا منظور نظر کون ہے..... سب کا خیال تھا کہ شاہینہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ سب میں ممتاز آتی تھی۔ یہ ابہام بھی جلد دور ہو گیا۔ جب شاہینہ دو دن اسکول نہ جانے پر تیسرے دن وہ ان سب سے استفسار کرنے لگا۔

”آپ کے گروپ میں جو شاہینہ ہیں، وہ..... سے نظر نہیں آ رہی ہیں؟“

”کیوں، تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ لبتی نے اچکا کر پوچھا۔

”وہ مجھے اچھی لگتی ہیں، محبت کرتا ہوں۔“ اس کے دو ٹوک لفظوں پر سب آنکھیں پچا۔ اسے گھورنے لگیں۔

”وہ اپنی کزن کی شادی میں گئی ہوئی ہے۔“ آئے گی اسکول۔“ افشاں نے اطلاع دی۔

”بہت شکریہ.....!“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اگلے دن اسکول میں ان کا گروپ سارا دن لڑکے کے متعلق چرچا کرتا رہا۔

”تم لوگوں نے آرام سے سن لی اس کی بکواس نہیں۔“ شاہینہ قصہ جاننے کے بعد نفیث کر رہی تھی۔

”ہم سب تو اس کی بہادری پہ دنگ رہ گئے۔“

ہیر کی طرح بھرم تھا، کچھ سوچا ہی نہیں۔ ”گروپ سے کسی نے کہا..... واپسی میں وہ پھر اپنے مخصوص

آئی تو اس کی مٹھی میں ایک تہ کیا ہوا پرچہ دبا گئی۔
”تمہارا مجنوں ملا تھا۔ بہت اصرار کر کے اس
نے کہا ہے تمہیں دینے کو۔“ شاہینہ نے پرچہ پڑھا۔
محبت و جنون کی داستان لکھی ہوئی تھی۔ اس کی صورت
نظر نہ آنے پر بے قراری رقم تھی۔ شاہینہ کے دل کی
دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس طرح مہکتے لفظوں میں پہلی بار
کسی نے اظہار کیا تھا۔ خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور
دیوانگی درج تھی۔

”یہ تو بڑی طرح مر مٹا ہے تجھ پر..... جواب دے
گی؟“ یمنی نے بھی خط پڑھا تھا اور استفسار کرنے لگی۔
”میں ان خرافات میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ کاغذ
کو مٹھی میں دبا کر توڑ مروڑ کر اس نے کمرے کے کونے
میں پھینک کر کہا۔

”تجھے اس سے محبت نہیں ہے؟“ یمنی کے
استفسار پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔
”ٹھیک ہے پھر میں تمہارا پیغام دے دوں گی اے۔“
یمنی کے جانے کے بعد اس نے ڈھونڈ کر مڑا ترا
کاغذ نکالا اور اس کی شکنیں دور کر کے پھر سے پڑھنے
لگی۔ نیچے کے نیچے رکھے اس پرچے نے اسے رات بھر
سونے نہیں دیا۔

شعب احمد کا نام ساری رات دماغ میں گھومتا
رہا۔ اس سے پہلے وہ اس کے نام سے واقف نہیں تھی۔
اگلی بار یمنی پھر ایک پرچہ لے آئی۔ اس نے غالباً پہلے
خط کے ساتھ کیا گیا سلوک سنا دیا تھا۔ تب ہی خط میں
افسردگی تھی، مر جانے کی دھمکی تھی۔ اک بار ملنے کی
درخواست تھی۔

”اے کہہ دو پاگل نہ بنے..... ابو اور بھائیوں
کو خبر ہو گئی تو جان سے جائے گا.....“ اس نے یمنی کو
تلقین کی۔

”میرے سمجھانے سے نہیں سمجھنے والا ایسا کر تو
اسے خط لکھ دے، میں دے دوں گی شاید وہ تیری بات
مان لے۔“ یمنی کے سمجھانے پر شاہینہ نے اسے خط لکھ
کر سمجھانے کی سہی کی پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ یمنی ڈاک

پھر آیا تو سب نے ایک دوسرے کو ٹھوکا دیا۔
”آگیا تیرا مجنوں، دیکھتے ہیں کیا کرتی ہے تو۔“
مکی نے شاہینہ کو اکسایا۔ اپنے لفظوں کا بھرم اور
مکیوں کے اکسانے پر شاہینہ اس کے سامنے جا
کھڑی ہوئی۔

”کل کیا بکواس کی تم نے میری سہیلیوں سے؟“
دلپ کی تمازت سے گلانی چہرہ لیے سر پر فائل سے
ہلکے ہٹائے وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔
”سچ کہا تھا۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

”میں نے اپنے بھائیوں سے شکایت لگائی تو
ان مار پڑے گی کہ ساری ہیرو پٹی نکل جائے گی۔“
شاہینہ نے ڈرانا چاہا۔

”اگر مجھے پتہ آ کر آپ کو خوشی ملے گی تو یہ شوق بھی
کھال کر لیں۔ لیکن اسپتال ملنے ضرور آئیے گا۔
انہیں انتظار کروں گا آپ کا۔“ وہ پُرشوق نگاہوں سے
مکی کی چھوٹی، چھوٹی بکھری ہوئی ٹٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

”کل سے نظر مت آنا، ورنہ پنپنے کی حسرت
پھیل جائے گی۔“ اپنے تئیں اس نے دھماکا کیا۔ وہ
دلپ کی تھی۔

اگلے روز وہ حسب معمول اپنی ڈیوٹی انجام دے
آئی۔

”رہنے دو کھڑا، تمہیں کچھ کہتا تو نہیں ہے
..... سڑک کسی کے باب کی تھوڑی ہے۔ جو کھڑا
لے پر جمانہ لگا دیں۔“ کسی دوست نے کہا تھا۔
دوست تھی۔ وہ کوئی بدتمیزی نہیں کرتا تھا، نہ فقرے
تھا، بس خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہتا تھا۔

شاہینہ ارادی اور غیر ارادی طور پر اس کی
مدد کی عادی ہو گئی تھی۔ کبھی وہ جگہ بدل کر کھڑا ہوتا
اسے میں دیر ہو جاتی تو اس کی نظریں بے اختیار
اس کے اطراف اسے ڈھونڈنے لگیں۔

بالآخر بورڈ کے امتحان شروع ہوئے اور ہو کر ختم
ہو گئے۔ اسکول جانا بند ہو گیا اور اس لڑکے سے
اسلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یمنی ایک دن اس کے گھر

خانے کے فرائض انجام دینے لگی۔ کالج میں ایڈمیشن اوپن ہو گئے۔

میزک میں اس کے اچھے نمبر آئے تھے۔ کالج میں آسانی سے داخلہ مل گیا تھا۔ کورس مشکل تھا جس کے باعث اس کے گروپ نے نزدیکی کو چنگ سینئر میں شام کی کلاسز لے لیں۔

شاہینہ کی حیرت اس وقت سوا ہو گئی جب اس نے شعیب احمد کو بھی اسی کو چنگ سینئر میں دیکھا۔ یہ سینئر اس کے علاقے سے بہت دور تھا۔ بعد میں شعیب نے بتایا کہ ایسا اس نے صرف شاہینہ کے لیے کیا تھا۔

دونوں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں کو چنگ کی کلاسز بنک کر کے اکثر وہ اور شعیب ڈیٹ پر چلے جاتے تھے۔ وہ اسی رنگ کے کپڑے پہنتی جو شعیب اسے کہتا۔ ایسے ہی بال بنائی جیسے اسے پسند تھے۔ ان دنوں اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ شعیب کے لفظوں سے تراشی گئی دنیا کا حصہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

حسب معمول اس روز بھی وہ کلاسز بنک کیے آئیں کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ جب اپنے دوستوں کے ساتھ شاہینہ کا بڑا بھائی بھی داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ شاہینہ خود کو چھپانی وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ شعیب نے اس کی اڑتی رنگت پر استفسار کیا۔

”بھائی اور اس کے دوستوں نے دیکھ لیا ہے ہمیں۔“ شاہینہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

بے شک وہ گھر بھر کی لاڈلی مٹی مگر اسے خبر تھی، اس کے والد اور بھائی ان معاملات میں کتنے سخت تھے۔

”اوہ..... پھر.....؟“ شعیب بھی کسی قدر پریشان ہو گیا۔

”میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئیں کریم تو کھالو، میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔“

”نہیں پھر کسی نے دیکھ لیا تو مزید شام آجائے گی، مجھے آٹو کروادو۔“ شاہینہ کتابیں اٹھا کر باہر نکل آئی۔

گھر پہنچی تو خلاف توقع فیروز صاحب گھر تھے۔ حالانکہ اس وقت وہ شاپ پر ہوتے تھے۔ ہال نے دیر کیے بغیر بات ان کے کانوں میں ڈال دی تھی بھائی اور باب کی عدالت میں اس کی پیشی ہوئی۔ ملہ فیصلوں کی دھمکی کے بعد اسے ایک موقع دیا گیا کہ غلطی کو سدھارنے کا۔

دوسری طرف شعیب مسلسل رابطے میں تھا۔ بل کے ذریعے اس نے گھر کا فون نمبر بھی لے لیا تھا۔ سب کے سوجانے کے بعد وہ شعیب سے بات کرتی تھی۔ پابندی اور مسلسل نگرانی کے باوجود وہ شعیب کے خیال کو دل سے نہیں نکال پارہی تھی۔

کو چنگ جانا بند ہو گیا تھا سو شعیب سے ملاقات کی سبیل نہیں بن رہی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس سے ملنے نہ آئی تو، زہر پی لے گا۔ ساری رات بے آرامی میں کئی۔

ایک بار پھر یمنی نے اس کی مدد کی اور اپنی جھولی سا لگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے شاہینہ کے اسے اجازت لینے چلی آئی تھی۔

وہ دونوں یمنی کے گھر کے نزدیک آئیں کریم پارلر میں ملے تھے۔ جہاں شعیب بے چین و بے قرار اس کا منتظر تھا۔ اس کے بغیر مرجانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ کورٹ میرج کی پیشکش کر رہا تھا۔ شاہینہ بھی اب اس دوری سے تنگ آ گئی تھی۔ اس نے سوچنے کا ٹائم لے لیا۔ شعیب کی جنوں خیز محبت جس شدت سے شاہینہ کے دل میں جڑ چڑ گئی تھی، وہ ایک کڑا فیصلہ کرنے پر راضی ہو گئی۔

ایک صبح وہ کالج کے لیے تو نکل مگر کالج کے بجائے یمنی کے گھر پہنچ کر اس نے یونیفارم پہنچ کیا اور ضروری سامان جو وہ پہلے ہی یمنی کے ہاتھوں اس کے حوالے کر چکی تھی لے کر شعیب کے ساتھ بانیگ پہ بیٹھ کر گئی۔

جیشانی کی دل جلانے والی باتیں جب وہ شعیب سے کرتی تو وہ الٹا برہم ہونے لگتا۔ شعیب میں بھی بہت تبدیلی آنے لگی تھی۔

”پاگل ہو گیا تھا میں..... جب عشق، محبت، چاہت کا خمار چڑھتا ہے تو ساری سمجھ بوجھ چور دروازے سے بھاگ جاتی ہے۔ بہت بڑی غلطی کر دی میں نے..... اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی، پڑھنے لکھنے کی عمر میں تم سے دل لگا بیٹھا۔ انٹرمیڈیٹ کر پاؤں گا یا نہیں..... اٹھارہ سال کی عمر میں باپ بننے کی خوشخبری دے رہی ہو مجھے.....“ شاہینہ کے خوشخبری سنانے اور اس کے رویے پر گلہ کرنے پر شعیب پھٹ پڑا تھا۔

بہت جلد اس نے محبت کا چولا اتار پھینکا تھا۔ شاہینہ اپنی محبت کے لمبے تلے ساکت نظر دوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی عمر کون سی زیادہ تھی۔ پندرہ یا سولہ سال..... لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ کتنے سالوں کا بھگتان بھگتنا ہے۔

رفتہ رفتہ شعیب کا نرم گرم رویہ سخت تر ہوتا گیا۔ جن ہونٹوں سے فقط اس کے لیے پھول جھڑتے تھے ان سے نشتر نکلنے لگے جو شاہینہ کے دل میں پیوست ہو جاتے تھے۔

دیور کی شادی پر شاہینہ کو کتنی دل خراش باتیں سننے کو ملی تھیں یہ وہ ہی جانی تھی سارا خاندان جمع تھا جب جیشانی کی بہن نے شاہینہ کو رگیدا۔

”ارے، تم بھی تو اپنی شادی کی ویڈیو لاؤ، دیکھتے ہیں دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھیں۔“

”گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی شادی کی ویڈیو کون بناتا ہے بھلا..... بات تو سوچ سمجھ کر کرو۔“ ہڈی نے بہن کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”دلہن بنتی ہیں ہائے نصیبوں والیاں.....“ کسی نے تان لگائی تھی۔

کمرے کی حدت سب کی دہلی ہنسی سے بڑھ گئی تھی۔ شاہینہ کے قدم من، من بھر کے ہو گئے۔ ٹی وی پر چلتی شادی کی ویڈیو کو اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے

دیکھا کہ سفر پر نکل گئی۔ پیچھے رہ جانے والوں کے۔ لڑکیاں کا احساس کیے بغیر۔

کورٹ میرج کے بعد شعیب اسے اپنے ایک دوست کے گھر لے آیا تھا۔ جہاں وہ دو دن رہے۔

”دوست اور اس کی گھر سے بھاگی معشوقہ کو تو ہماں، بیوی کہہ کر دو دن ہمارے گھر رکھتا رہا۔ آنے اسے تیرے باپ کو..... کرتی ہوں تیرا حساب کتاب.....“ دوست کی ماں نے جب دوست کو رگیدا تو ناچار انہیں اگلی منزل کی طرف چلنا پڑا۔ تمام دوستوں نے ساتھ دینے سے معذرت کر لی تھی۔ غیب کی جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ کوئی کرایہ کا گھر فورڈ کر سکتا۔ وہ ایک ہفتے کی پکنک ٹرپ کے بہانے گھر سے دور تھا۔ بیچ سڑک پہ کھڑے رہنے سے بہتر اسے گھر جانا لگا۔

شاہینہ کو متعارف کرانے پہ صفیہ بیگم نے جتنی گالیاں دی تھیں یہ الگ قصہ تھا۔ جیشانی ہڈی کی طنز لہری باتیں شاہینہ کو بار بار کر رہی تھیں کہ سفر دشوار ہے۔ غیب کے والد انیس صاحب نے معاملے کو سمجھانے کے لیے شاہینہ کے والد سے رابطہ کیا تھا تاکہ دونوں گھرانوں کی عزت بچی رہے

”ہماری بیٹی، ہمارے لیے اسی وقت مرگئی جب اس نے آپ کے بیٹے کے ساتھ بھاگنے کے لیے گھر کی دہلیز عبور کی۔ ہماری دو بیٹیاں اور ہیں اور ہم کو کش کریں گے جو غلطی ہم نے آپ کی بھوک پرورش میں کی وہ نہ دہرائیں۔ اسے بیٹا، بہو سے کہہ دیجیے گا کہ غلطی سے بھی ہمارے گھر کی طرف نہ آئیں ورنہ آپ کو ان کی لاشیں وصول کرنے کے لیے آنا پڑے گا۔ اپنے بیٹوں کو بہت مشکل سے روکا ہے، آپ کی طرف سے اسی غلطی سے خون کی نہریں بہہ جائیں گی۔“ فیروز صاحب کے بے لچک رویے پہ انیس صاحب کی آس م توڑ گئی۔ شاہینہ نے بھی ساری گفتگو سن لی تھی۔ شاہینہ نے محبت کی باتیں پکڑ کر جس راہ پہ قدم رکھا تھا اس سے اس کے پیر لہو لہان ہونے لگے تھے۔ صفیہ بیگم اور

دیکھا تھا۔ کچھ بل کچھ لمحے کتنے اہم ہوتے ہیں اور جب وہ ریت کی طرح ہاتھ سے پھسل جائیں تو ان کی محرومی پر آنکھیں سدا برستی رہتی تھیں مگر ان لحوں کی کسک کبھی دل سے ختم نہیں ہوتی۔

ان باتوں کا اور اک کئی بار کئی بھگوتے شاہینہ نے کہا تھا مگر وقت بیت چکا تھا، اس نے اپنے لیے وقت کے کشکول سے فقط نکل کر چنے تھے اور ان نکلروں کی جھین شاہینہ کو تاحلیت برداشت کرنی تھی۔

کائنات کی پیدائش کے بعد شعیب مزید پاگل ہو گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب شعیب نے سیلوئس اور ماڈرن کپڑے پہنانے پہ پابندی لگا دی۔ اسے لڑکیوں کے اسکول میں ڈالا۔ دو بیٹوں کے بعد بھی اس کا مزاج نہ بدلا..... کائنات کو دوست بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ اکیلے آنے جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس درجہ پابندی پہ شاہینہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”جس طرح میں اپنی بیٹی کو پال رہا ہوں اگر تمہارے باپ نے اسی طرح تم پر نظر رکھی ہوتی تو تم میرے ساتھ بایک پر سیر پانے نہ کر رہی ہوتیں..... وہ تو میں تھا جس نے شادی بھی کی اور تم جیسی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رکھا ہے۔ کوئی اور ہوتا ناں تو عیش کر کے پھینک چکا ہوتا اور تم کسی بدنام زمانہ جگہ کا حصہ ہوتیں۔ میں تمہارے باپ جیسی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔“ شعیب کے لفظوں کے شعلوں میں گھری شاہینہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

صفیہ بیگم الگ اس کی جان کی دشمن تھیں۔ وہ اکثر کونوں میں بیٹھی روتی رہتی تھی۔ کائنات کے ساتھ ہونے والی حق تلفی کی ذمے دار خود کو گردانتی تھی۔ کائنات اب چودہ سال کی تھی۔ وہ کہیں سے تین بچوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ شعیب نے اسے سسرال میں مقام دلانے کے لیے کچھ نہ کیا تھا۔ بلکہ تفحیک اڑانے میں وہ پیش، پیش ہوتا تھا۔ بیوی اور بچوں کا اس نے کسی محاذ پر ساتھ نہیں دیا تھا اور آج تو حد ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کائنات ہوش میں آچکی تھی لیکن اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو سوتا غاہر کیا۔ شاہینہ اس کے سر ہانے لہ بیٹھی تھیں۔ خضر اور میر بھی سپہ ہوئے اپنے کمروں میں تھے۔ صفیہ بیگم کو اس عالم میں بھی اپنی ضرورتوں کی بڑی تھی۔ وہ بیٹے سے بہو کی شکایت لگا رہی تھیں... شاہینہ ان سنی کیے بیٹھی رہیں۔

جی حضوری کی زندگی جی کر شاہینہ نے دیکھ لیا تھا۔ فقط ذلت ہی مقدر ہوئی تھی۔ ماں کی شکایت پہ شعیب نے آواز بھی دی پر وہ ان کے بلاوے کو بھی نظر انداز کر کے بیٹھی رہیں۔

ساری رات اپنا احتساب اور خود کو لعنت ملامت کرتے گزر گئی۔ صبح، رات کی طرح بوجھل تھی۔ صفیہ بیگم ناشا وقت پر نہ ملنے پر آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ ”آپ جائیں میں ٹھیک ہوں، تھوڑی دیر میں آشتی ہوں۔“ کائنات کے سمجھانے پر شاہینہ کچن میں آ گئی تھیں۔

”کون مر گیا، کس کا سوگ منا رہی ہو تم ماں، بیٹی۔“ ناشا ان کے سامنے رکھا تو وہ حسب عادت زہر خند ہو گئیں۔

شاہینہ نے باقی سب کا ناشا بتایا۔ بیٹے اسکول جا چکے تھے۔ شعیب احمد ابھی تک سو رہے تھے۔ غافل دکان جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ شاہینہ اپنا اور بیٹی کا ناشا لے آئیں۔ بعد اصرار اسے تھوڑا سا کھلایا۔ اسکول کا ٹائم نکل گیا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو مد نظر رکھ کر شاہینہ نے کچھ بھی کرنا مناسب سمجھا تھا۔

”کل تو مجھ کو حد ہی ہو گئی۔ ان بد بخت ماں، بیٹی نے میرے کا شان پہ بد کرداری کا بہتان لگایا۔ باقی کی تفصیل میں تمہیں آنے کے بعد سناؤں گی۔ بس تم چلی آؤ۔ بہت کڑا وقت گزرا کل مجھ پہ، بے وقوف ہوں جو گناہ کو پالنی آرہی ہوں۔ اسی وقت طلاق دلاؤ کے گھر سے باہر نکال پھینکتی تو آج ہمیں یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔“ صفیہ بیگم بیٹی کو فون پر سن رہی تھیں۔

شاہینہ نے گزرتے ہوئے ان کے کلمات سننے

غزل

محبت کا شکت پن نظر کیا آئے باہر سے
یہ دیکھ تو بدن کو چاٹتی رہتی ہے اندر سے
میری ترتیب میں صحرا مزاحی کارفرما ہے
بجھے کی پیاس کیا میری بھلا اٹھوں کے ساگر سے
تمہارے ہجر کا یہ درد سر تو مستقل ٹھہرا
مجھے لگا ہے جاں لے کے یہ اترے گامے سر سے
تیری دلہیز پر میں منتظر اپنی رہ جاؤں
یہی سب سوچتی ہوں لوٹ آئی ہوں تیرے در سے
شمینہ مسئلہ یہ ہے میری قامت سے کتر ہے
ہمیشہ پیاس پی کر لوٹ آئی ہوں سمندر سے
کلام: شمینہ سید، لاہور

کے جسموں میں اٹھیل کر سب باقی کا وقت اوپر گزار کر
اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

رات نے تاروں بھرا آجکل اوڑھ لیا تھا۔ سب
سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ شعیب ٹی وی پر نیوز دیکھ
رہے تھے۔ چائے کا گناہ ان کے سامنے رہتی شاینہ
کمرے کی ٹھکری چیزوں کو حبس پر رکھ رہی تھیں۔
دروازے پر دستک دے کر کائنات اندر آ چکی تھی۔
”کچھ چاہیے بیٹا.....؟“ شاینہ اسے دیکھ کر
چوٹیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ، بیٹی دونوں کا
سامنا ہو۔ مگر اب کائنات خود چلی آئی تھی۔
”میں ابو سے کچھ کہنے آئی تھی۔ آپ مصروف
تو نہیں ہیں، بات کروں؟“ شاینہ کو جواب دے کر وہ
باپ کی طرف آگئی۔ شعیب گہری نظروں سے کائنات
کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ آج اس کے انداز میں جو خود
اعتمادی نظر آئی وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی انہوں نے۔
”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بعد میں بات
کر لینا“ شاینہ نہیں چاہتی تھیں کہ شعیب کے تلخ لفظوں
سے مزید اس کی روح چھلنی ہو۔ شعیب نے ہاتھ اٹھا
کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کائنات سے کہا۔

کے لیے قدم روک لیے تھے۔ عین اسی وقت شعیب بھی
فریش ہو کر اسی طرف آئے تھے۔ انہوں نے بھی ساری
باتیں سن لی تھیں۔ شاینہ نے ایک رخ نگاہ شعیب پر
ڈالی۔ پھر اپنے معمول میں لگ گئیں۔

دن چڑھنے کی دیر تھی۔ شاینہ کی دونوں مندریں
آگئی تھیں۔ آصف بھی شکار سے لوٹ آئے تھے اور
انہوں نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شعیب سے جلد بات
کریں گے۔ دوپہرانی کے کانوں تک بات پہنچی تو وہ بھی
میکے سے لوٹ آئی۔ صفیہ سے کل کا احوال جاننے کے
لیے چلی آئی۔

”خدا جانے کیا نصیب ہے میرے بھائی کا،
جب سے یہ منحوس اس کی زندگی میں آئی ہے کھاگئی
میرے بھائی کی خوشیوں کو..... جب لڑکے کرکٹ،
فٹ بال کھیلتے ہیں تب اس پر باپ بننے کی ذمہ داری
آزادی..... تعلیم ادھوری چھوڑ کر کاروبار میں لگ گیا۔
اکیس سال کی عمر میں چودہ سال کی بیٹی ہوگئی۔ اور اب
بیٹی کے کروتوت دیکھو.....“ بڑی تند بھائی کو پاس
بٹھائے غالباً اس کی نادیدہ خوشیوں کا ماتم کرنے آئی
تھیں۔ جو بیان کر کر کے ماتھا پیٹ رہی تھی۔

”گھر میں تو اب تمہاری بیٹی کبھی گی نہیں..... اتنا
کچھ ہونے کے بعد آصف بھائی اور بھابی تمہاری بیٹی کو
پوچھیں گے بھی نہیں..... تم کسی راہ چلتے سے بیٹی کے دو
بول پڑھا کر رخصت کرو، ورنہ ماں کی طرح کوئی چاند
چڑھا کر زندہ درگور کر جائے گی تمہیں، بھائیوں کے بیچ
تویوں بھی پھوٹ ڈلوادی۔“ چھوٹی بہن، شعیب احمد کو
صلاح دے رہی تھی۔

”کسی کی بچی کے بارے میں ذکر کرتے اپنی
اولاد کو نہ بھولو، کائنات بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے
کاشان پر بالکل اعتماد نہیں۔“ اسد نے ناگواری سے
ٹوکا تو آخری جملے پہ سب اس کے سر ہو گئیں۔ مگر میں
ان سب کے لیے کھانے کا اہتمام کرنی شاینہ اور بیڑھی
پہ سرجکا کے بیٹھی کائنات ساری گفتگو سن رہی تھی۔
دعوتی کھانا کھا کر اپنی، اپنی زبانوں سے زہران

”بولو.....!“

”میں نے جب سے ہوش سنبھالا خود کو اور دونوں بھائیوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے دیکھا۔ ہر ظلم، ہر زیادتی پہ ہمارے لیے کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ آپ آقا بن کر ہمارے نصیبوں کا فیصلہ کرتے رہے اور میں سر جھکا کر مانتی رہی کہ آپ میرے والد ہیں۔ آپ کی ڈانٹ پھٹکا سستی رہی کہ یقین جو تھا آپ میرے لیے شجرِ سایہ دار ہیں۔ زمانے کی ہر سرد گرم سے مجھے بچا میں گئے لیکن کل میرا یقین پاش، پاش ہو گیا ابو..... آپ نے اعتبار کی چادر مہرے پر نہیں ڈالی.....“ کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔ صرف کائنات کی بے تاثر آواز تھی۔ چٹ اس کے ننھے دل پر لگی تھی۔ جس کی صدا کمرے میں گونج رہی تھی۔

”جب پیدا کرنے والے کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں باہر والوں سے کیسے عزت طلب کروں..... سب آئے میرے کردار پہ انگلی اٹھانے اور سب نے مجھے بہت اچھے القابات سے نوازا..... اپنے بہن، بھائیوں کے آگے آپ نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لفظ بھی نہیں نکالا..... کیونکہ آپ کو کبھی مجھ پر اعتبار نہیں..... میں اگر سولی بھی چڑھ جاؤں گی تو بھی آپ کو اپنے حق میں بولنے پر راغب نہیں کر سکوں گی..... وجہ آپ اور امی کا ماضی ہے..... جہاں آپ نے ایک لڑکی کو محبت کے سپنے دکھا کر، ورغلا کر اسے گھر بدر کر دیا اور پھر سب کے ساتھ خود پتھر مارنے لگے۔“

شاہینہ کے لب سل گئے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر ٹک گئیں۔ کائنات کے اندر کون سا آتش فشاں پھٹ چکا تھا وہ لاعلم تھیں شعیب بھی دم سادھے بیٹھے تھے۔

”جو گناہ، جو جرم آپ دونوں نے کیا تھا اس کی سزا اس عورت نے بھگتی۔ گالیاں، کوسنے، ذلت سب اس عورت کا مقدر بن گئے، اور واقعی یہ اس کی حق دار بھی ہیں..... یہ بے وقوف، عاقبت نا اندیش تھیں۔ جنہوں نے ایک مرد کی باتوں میں آ کر نہ صرف اپنی

بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ نہ پیچھے رہ جانے والوں کے درد، تکلیف کا سوچا، نہ ان کی محبت کا صلہ دیا۔ خود غرضی سے صرف اپنے لیے سوچا..... آپ دونوں نے کبھی ہم بچوں کی محرومی کا کٹکان بن بھی کیا ہے؟“ وہ کسی پچیس سالہ لڑکی کے مانند..... بے تکاں بولے جا رہی تھی۔

”جب بچے نانا، نانی، خالہ، ماموں ان کی محبتوں کا ذکر کرتے ہیں، چٹھیاں بتانے جاتے ہیں تب ہمارے اندر کیسی محرومی پیدا ہوتی ہے جانتے ہیں آپ لوگ..... دنیا کی ہزار نعمتوں کے باوجود جس کے پاس رشتوں کی دولت نہیں ہو وہ خود کو کتنا قلاش گردانتا ہے، جانتے ہیں آپ لوگ؟“ دونوں کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

شعیب کا دل تھا اس جرأت پہ کائنات کو دو تھپڑ لگائے مگر اس میں بالکل ہمت نہیں تھی۔

”سب نے آپ کو جلد سے جلد میری شادی کا مشورہ دیا لیکن میں اپنے ساتھ یہ نا انصافی نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے پڑھنا ہے، بہت سارا پڑھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے کیونکہ میں جان گئی ہوں باپ، بھائی، شوہر..... بچے، عورت کا کوئی سہارا نہیں بنتا..... اسے اپنے لیے خود مضبوط ہونا پڑتا ہے۔ آپ بھلے مجھ پر لاکھ باندیاں لگائیں، گارڈز کے ساتھ مجھے تعلیمی ادارے بھیجیں مجھے کوئی پروا نہیں، میں پڑھوں گی شعور حاصل کروں گی۔“

وہ کچھ لمحے رک کر دوبارہ گویا ہوئی۔

”مرد اور شادی..... یہ دونوں چیزیں میرے لیے غیر اہم ہیں، میں نفس پرست نہیں ہوں، بھلے میں یہاں بیٹھی بوڑھی ہو جاؤں لیکن میں کبھی آپ لوگوں کی حرکت نہیں ڈرواؤں گی۔ کیونکہ مجھے میری آنے والی نسلوں کی فکر ہے۔ کل کو انہیں یہ نہ سننا پڑے۔

”ارے اس کی ماں بھاگ کر آئی ہے، اس کے باپ نے اس کی ماں کو بھاگ کر شادی...“

شادی جیسے مقدس لفظ کو میں اپنے اور اپنی نسلوں

نکلے جو قدم

معصومیت چھیننے والے کون تھے، اس کے والدین جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات اور جذباتیت کے ہاتھوں ایک نسل کو دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

آنسوؤں سے شاہینہ کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ تب ہی ان کے ہاتھ پہ اک ہاتھ آڑا تھا۔

”کائنات!“ پکار دل سے نکلی تھی۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ شعیب تھے..... جھکے اور پرشمرہ.....

”ماں بچوں کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور میرا وجود میرے بچوں کے لیے ایک بد نما داغ کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ وہ پھر تڑپ کر رو پڑیں۔

”جتنی قصور وار تم ہو، اتنا ہی میں بھی ہوں۔ لیکن کائنات نے سچ کہا ناں سزا صرف تم نے بھگتی۔“ ان کے ہاتھوں پہ دباؤ ڈالتے شعیب نے اعتراف کیا..... شاہینہ کے آنسو ٹھم گئے۔ وہ اقبال جرم کر رہے تھے۔ اس جرم کا جس کی وہ اکیلی عرقید کی سزا بھگت رہی تھیں۔

”معافی طلبی، گناہ سزا کو پیچھے چھوڑ کر، کیا ہم آنے والے کل میں اپنے بچوں کے لیے خوشی کشید نہیں کر سکتے؟ ان کے معصوم ذہنوں سے تلخ یادوں، باتوں کو مٹانا مشکل سہی، کیا ہم کچھ اچھی یادیں نہیں بنا سکتے.....؟“ شعیب آس سے پوچھ رہے تھے۔ کائنات کے بے تاثر لیکن غم لہجے نے انہیں عرقِ ندامت میں بھگو دیا تھا۔ شاہینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اک نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔ بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ شعیب کی ہدایت پر شاہینہ نے سب کا ناشتا ساتھ ہی لگایا تھا۔ صفیہ بیگم اپنی ٹرے لیے صوفے پر چڑھ بیٹھی تھیں۔ شعیب بھی اپنے کمرے سے تیار آگئے تو تینوں بچوں کو ساپ سوگھ گیا۔ وہ دیر سے اٹھتے تھے۔ آج تک شاید ہی انہوں نے بچوں کے ساتھ ایک وقت بیٹھ کر کھایا ہو۔

”تم بھی آ جاؤ۔“ شاہینہ کو چائے لاتا دیکھ کر شعیب نے ہدایت دی تو صفیہ بیگم بھویں اچکا کر دونوں

کے لیے گالی نہیں بنانا چاہتی۔ مجھے سکون سے پڑھنے دیں۔ میں آپ کو یقین دلانی ہوں کہ اگر میری طرف سے آپ کو شکایت کا موقع جس دن بھی ملے ثبوت کے ساتھ آپ میرا سر قلم کر دیں۔ میں آف نہیں کروں گی..... لیکن کسی کی الزام تراشی کی پاداش میں مجرم نہیں بنوں گی، نہ سزا جھیلوں گی..... تعلیم کے بعد آپ لوگ جس سے چاہیں، جہاں چاہیں میری شادی کر دیں میں آپ لوگوں کے حکم کی تعمیل کروں گی..... اب بھی میں تعلیم کی قربانی دے کر سزا کے طور پر شادی کر سکتی ہوں لیکن نا کردہ گناہوں کی سزا پہ ساری زندگی صرف سکتی رہوں گی۔ اور میں اتنی مضبوط نہیں کہ اپنے کردار پہ لگا بد نما داغ برداشت کر سکوں..... میں کائنات شعیب ہوں..... شاہینہ فیروز نہیں۔“

مضبوط لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے کائنات رکی نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔ دونوں کے ہوتے ہوئے بھی کمرے میں موت کی خاموشی تھی۔

☆☆☆

شعیب میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے جانے کیسے سو رہے تھے۔ شاہینہ کو نرم گرم بستر کا نٹوں کی طرح چہرہ رہا تھا..... انہیں کسی کل چین نصیب نہیں تھا۔

گھر کے پچھلے حصے میں آ کر وہ کھلے آسمان تلے گھٹنوں کے بل پچی زمین پر بیٹھ گئیں۔ ایک دل خراش چیخ لبوں سے آزاد ہوئی اگر یہ چیخ اندر دب جاتی تو شاید ان کے دماغ کی لسیں پھٹ جاتیں۔

چندرہ سال ہو گئے تھے انہیں یہ ذلت بھری زندگی گزارتے۔ منہ زور جذبوں نے ان کے مقدر میں سیاہی لکھ دی تھی۔ ہزار بار وہ روئی تھیں مگر آج جس تڑپ کے ساتھ آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ کائنات کے لفظوں کے باعث تھے۔

معصوم، کم سن سی چودہ سالہ لڑکی جب بول رہی تھی تو لگ رہا تھا کہ چونتیس سالہ کوئی عورت بول رہی ہے۔ اتنی سمجھ بوجھ تھی اس میں..... اور اس سے اس کی

کچھ دن اسد اور آصف بھائی کے پورشن میں بھی رونق بخشنے جائیں۔ ہڈی اور نگہت بھائی کو بھی خدمت کا موقع دیجیے..... شاہینہ یوں بھی پھوہڑا اور ست عورت ہے بقول آپ کے: ”شعب کی صلاح پہ صفیہ بیگم کو آگ لگ گئی۔ وہ بڑبڑانے لگیں۔“

”جلدی کرو..... دیر ہو جائے گی۔ اسکول سے۔“ شاہینہ نے کھڑی کی طرف دیکھتے تینوں کو جلدی کرنے کو کہا۔

”آج میں خود ڈراپ کروں گا اپنے بچوں کو.....“ گاڑی کی چابی اٹھاتے شعب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”شاہینہ! تم بھی چلو..... اسی بہانے صبح کی تازہ ہوا میں سانس بھی لے پاؤ گی۔“ شاہینہ پیروں میں چل ڈالے کھڑی ہو گئیں۔

”شعب! مجھے تم سے کل کے قصے کے متعلق بات کرنی ہے۔“ آصف اوپری منزل سے نیچے آ رہے تھے۔ جب وہ سب نکلے لگے تھے۔

”مجھے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنی۔“ کا شان میرا سگا جھنجھانہ ہوتا تو اب تک میں اس کا خون کر چکا ہوتا۔ آئندہ اس قسم کی حرکت تو دور، بری نظر ڈالنے پر بھی میں سارے رشتے بھولنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ مجھے اپنی بچی پر مکمل بھروسہ ہے۔ چلو.....“

شعب نے رک کر آصف کو سخت لفظوں میں تنبیہ کی۔ کائنات کا سر بلند ہو گیا تھا۔ سب تھوڑے فاصلے پر موجود اسکول کی طرف سفر کر رہے تھے۔ ان پانچوں کی زندگی کی یہ حسین صبح تھی۔ چند کلومیٹر کا سفر ان کی زندگی کا یادگار سفر بن گیا تھا۔

شاہینہ نے بھی کھل کر فضا میں آسودگی سے سانس لی تھی۔ ان کی ذات پر لگا بد نما داغ دھلاؤ نہیں تھا۔ مگر مان، محبت، آسودگی، اعتبار کے عکس سے دھندلا ضرور گیا تھا۔

کودیکھنے لگیں۔

”جتنی تم تینوں بچوں کے ساتھ زیادتی ہو چکی اس کا ازالہ تو شاید ممکن نہیں لیکن میں کوشش ضرور کروں گا۔ اگر تم لوگ اپنے اسکول سے خوش نہیں ہو تو مجھے بتا دینا میں دوسرے اسکول میں ایڈمیشن کرا دوں گا۔“ بچے حق دق باپ کو دیکھ گئے۔

”کائنات! تم پر بھائیوں کے ساتھ آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے، تم ماشاء اللہ بہت سمجھدار بچی ہو میری!؛“ شعب نے کہتے ہوئے اسے ساتھ لگا لیا تو اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

جوش جذبات میں رات وہ جانے کیا کہہ گئی تھی۔ دل میں ڈر بھی تھا مگر جو ہور ہا تھا وہ نا قابل یقین تھا۔

”یہ کون سا نیا ناک ہے بھی۔“ صفیہ بیگم نے تیر پھینکا۔

”میں لُچ تم لوگوں کے ساتھ کرنے آؤں گا۔ پھر شام کو ہم باہر جائیں گے، ڈنر باہر کریں گے۔ شاپنگ، پارک جہاں تم تینوں کہو گے وہاں جائیں گے۔“ صفیہ کی بات نظر انداز کر کے شعب بول رہے تھے۔ تینوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

”میری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیا، جو اس بد ذات، گھر سے بھاگی ہوئی عورت کے بچوں کے چونچلے اٹھانے کو باؤ لے ہوئے جا رہے ہو۔“ صفیہ بیگم نے شیخ کر ٹیک کر بولیں۔ شعب کے ماتھے کی لکیریں گہری ہونے لگیں۔

”اماں یہ عورت گھر سے کسی اور کے لیے نہیں میرے لیے بھاگی تھی۔ میرے کہنے پر..... اور یہ میرے بھی بچے ہیں، مجھے ان کے ناز خرے اٹھانے ہیں۔ آئندہ آپ میرے بچوں کو ان کی ماں کے نام کا طعنہ نہیں دیں گی..... اور نہ میں اب شاہینہ کے لیے کوئی غلط بات سنوں گا، یہ میری بیوی ہے۔“ شعب نے قطعیت سے کہا۔

”آپ ایک جگہ رہ کر قنوطیت کا شکار ہو گئی ہیں،

دُیا جلتا رکھا

سیانت عاصم



ڈبو دیے، لاکھوں کی تعلیم خاک کر دی..... اب ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کہ شاہی نوکری کوئی تھاں میں سجا کے پیش کرے تو راجا صاحب کھسکیں..... صاف بہانے ہیں، نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھانا چے کی..... میں تو کہتی ہوں انہیں ان کے کنبے سمیت انہی کے حال پر چھوڑ دیجیے..... جب سر پر پڑے گی تو خود ہی بھگتیں گے۔ یوں مفت کے نوالے کھلا، کھلا کے انہیں ناکارہ بنانے والے بھی، ہم خود ہی ہیں۔“ سین کی زبان فچی کی طرح چل رہی تھی۔ سفید براق کرتا پا جامے میں ایزی چیئر پر جھولنے لگے سگریٹ کے

”سن رہے ہیں ناں ابا..... کُل ملا کے چالیس، پینتالیس ہزار ماہوار سے زیادہ کا خرچ بنتا ہے..... مکان کا ریٹ، بچوں کی فیس، چکن کاراشن اور گوشت ترکاری الگ..... یہ سب اس کے علاوہ مل اور اوپر کے خرچے..... کیا یہ سب صرف آپ کا ہی سر درد ہے..... اس دور میں ایک نہ دو، سات افراد کے کنبے کو سپورٹ کرنا آسان کام ہے بھلا..... ماں، باپ کی اگر جائیداد ہے بھی تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ بھیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہے..... کتنی بار کاروبار کرائے،

جان ہی گئی تھیں کہ شہزاد کی امید کا محور و مرکز سین سے بڑھ کر اس کے والدین کا پیسہ تھا..... جس کی سین برابر کی وارث تھی کہ کل دو ہی اولاد تو افتخار صاحب وصیفہ بیگم کی کائنات تھیں یعنی ثمر اور سین، اس پر سین نے باپ کو ٹھٹھی میں بھی لے رکھا تھا، وہ اسی کے کانوں سے سنتے اور اسی کی بولتے تھے۔ اور یہیں آکر ثمر اور اس کی فیملی کا استحصال ہوتا تھا بہت جلد ان کی گھر میں خانہ جنگی کی صورت حال چل پڑی تھی۔

خیر سین کی باتیں کچھ ایسی بے جا بھی نہیں تھیں..... ثمر کی طبیعت میں سدا سے بے پروائی..... بے نیازی رہی تھی..... جس کے سبب وہ کبھی کہیں قدم نہ جما پایا تھا۔ گھر کا نظام سدا سے وصیفہ بیگم کے ہاتھ تھا، سو ہنوز رہا..... رفتہ رفتہ ثمر کے کنبے کا بار بھی ان ہی کے سر پر پڑا تھا..... ایک دو بھی نہیں پورے پانچ پانچ..... اخراجات کا انبار..... اور اس سب کے سبب جو جج، جج سر اٹھاتی..... انہیں مرج مسالا لگا کر ہائی لائٹ کرتے رہنے میں سین کو کمال حاصل تھا..... اور آخر کار اسی سبب کی بدولت ان کی فیملی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

سین کا شوہر، شہزاد پیسے سے پیسہ بنانے والا آدمی تھا، اسی کی دی ہوئی تجویز سے افتخار صاحب نے اپنے ہزار گز کے بنگلے کے کئی پورشن بنا کر کرایے پر اٹھائے تو کئی لاکھ کی آمدنی کی سمیل نقل آئی لیکن ثمر بیچارے کو..... کرایے کے گھر بھینکنے میں ان کے اخراجات سے دامن بچانے کی ترکیب بھی انہی کے دماغ کی تھی..... خود افتخار صاحب وصیفہ بیگم اپنا اسباب سمیٹ کر سین کے تین کمروں کے فلیٹ میں اٹھ آئے تھے۔ شہزاد کے دینی سدھارنے کے بعد مانوسب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا تھا۔ سین نے دوسرا ہٹ کے بہانے انہیں اپنی جانب کھینچ کر ثمر کی فیملی کا بار نہ صرف اس کے سر پر ڈال دیا تھا بلکہ ہزار گز کے بنگلے کو ان کی آمدنی کا وسیلہ بھی بنادیا تھا۔ اور اس سبب میں مارے گئے تو بیچارے ثمر و سارہ..... وصیفہ بیگم و افتخار صاحب کا جو پیسہ ان کی زندگی بھر کی محنت کا نچوڑ تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اب کہیں سکھ کی چھاؤں

کش لیتے افتخار صاحب تائیدی انداز میں سر ہلاتے بیٹی سے صد فی صد متفق نظر آرہے تھے۔ وصیفہ بیگم لب بھینچ کر اٹھ گئیں۔ سین کی ساری باتیں اپنی جگہ درست تھیں مگر وہ صرف سین ہی نہیں ثمر کی بھی ماں بن کر سوچتی تھیں۔ ہر ماہ ان کی آمدنی کے دس فی صد سے نہ جانے کتنے گھروں کا چلوچلا تھا۔ پھر ثمر تو ان کا اپنا بیٹا تھا۔

سین کی ان ہی باتوں کے سبب ان کے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا..... سارہ ان کی اکلوتے بیٹے ثمر کی من پسند تھی مگر اس نے خود کو ان کی منشا کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی..... جبکہ ان کی اپنی بیٹی سین منہ میں سونے کا چوڑے لے کر پیدا ہونے والوں میں سے تھی۔

افتخار صاحب خود اک شپنگ کمپنی سے ریٹائرڈ تھے اور وصیفہ بیگم نے تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ کر پچیس سال بھگائے تھے مگر اس کا کیا، کیا جائے کہ سین کو سارہ کے مڈل کلاس ہونے سے پر خاش تھی، اسے والدین کی دولت کا ذمہ تھا، وہ دنیا کو پیسے کی کسوی پر رکھ کر رکھتی اور اسی کی بدلت دوسروں کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کی خواہش مند رہتی، چاہے وہ اس کا اپنا خاوند ہی کیوں نہ ہو..... شہزاد سے سین کی مکمل اربن میرج تھی۔ اب اسے سین کی قسمت نہیں تو اور کیا، کہا جائے کہ بیس، پچیس ہزار ماہوار کے ملازم شہزاد کو شادی کے فوراً بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے ملازمت کی آفر ہوئی تو اس میں افتخار صاحب کے تعلقات کا بھی بڑا کمال تھا۔ اور سین کی دور رس نظروں نے یقیناً اس کی علمی قابلیت کے بموجب اس کا شاندار مستقبل ہی جانچا تھا۔ چند ہی سالوں میں شہزاد اپنی فیملی کا ذمہ انہیں سوئپ کر تین سال کے کانٹریکٹ پر دینی سدھار گیا تھا..... اور یہیں سے سارا بگاڑ شروع ہوا..... سارہ، سین کے طعنوں تشوؤں، بلاوجہ کی روک ٹوک اور نکتہ چینیوں کو صبر کے گھونٹ پی کر جھیلی تھی تو صرف وصیفہ بیگم کی ہدایت کے سبب کہ وہ سدا سے سارہ کے لیے ساس سے بڑھ کر اک ہمدرد رہنما بن کر رہی تھیں۔ اتنا تو وصیفہ بیگم بھی

جیا جلتا رہا

کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سرعت سے اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔

”تم آگئے.....“ اس نے چند حیا کی نظروں سے قد اٹھاتے سپوت کو دیکھا تھا۔ کیا شے ہوتے ہیں یہ بیٹے بھی..... مائیں ان کی بابت خواب دیکھتی کتنی دور نکل جاتی ہیں..... علی اس کا پہلا بیٹا تھا اور اس کی آمد کی نوید پر سلیم خود بھی کتنا مسرور و شادماں نظر آتا تھا۔

”اے سنی ہے..... جب ”وہ“ آئے گا ناں تو دیکھنا ہم دونوں باپ، بیٹا مل کر تجھے کتنا سنیں گے۔“

اور اس کی ایک بات جو اسے رہ، رہ کر یاد آتی..... ”جب وہ بڑا ہو جائے گا ناں تو میں اسے بھی ڈرائیوری سکھاؤں گا۔“ اور سلیم کے فرشتوں کو بھی کیا خبر تھی کہ وہ وقت آنے تک زندگی ہی دعا دے جائے گی..... سلیم کہنی کا لوڈنگ ٹرک چلاتا تھا..... بس ایک حادثہ جو اس کی ساری خوشیوں کو نگل گیا..... سلیم کے ٹرک کا ایک ٹرالر سے تصادم شاید یہی قسمت ہے، انسان جو سوچتا ہے، وہ ہوتا نہیں ہے، علی کی عمر ابھی چودہ برس تھی، اس نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھا کر کسی کہنی میں لگا دیا تھا۔

مکان کا گریا، بچوں کے تعلیمی و دیگر اخراجات، سب سے بڑھ کر پیٹ کا ایندھن سر سے سایہ کیا اٹھا تھا لگتا تھا زندگی اپنے منوں وزن سمیت اس کے سر پر آ پڑی تھی۔ خود وہ گھر، گھر جاکر اوپری کام نہلاتی، چند ہی سالوں نے اسے نچوڑ ڈالا تھا۔ چار بچوں کے ساتھ بیوی کا عذاب.....

سسرال برائے نام تھی..... اور میکا تو شاید بیٹی کو وداع کرتے ہی پرایا ہو جاتا ہے، اب وہاں پرایوں کا ہی راج تھا بھادو جوں کی حکومت تھی، ماں کی حیثیت معزول حکمران کی سی تھی۔ بچے چھوٹے تھے، باپ کی بابت پوچھتے اور وہ، وہ سوال جن کے جواب اسے تو کیا اس کے فرشتوں کے پاس نہیں تھے، وہ ان کی امیدوں کو نہیں توڑتا نہیں چاہتی تھی۔ سو ہزار جگہ بہلاوے دیتی۔

نہیں داروئی کو اب بھی یہی امید تھی کہ ایک روز ان کا باپ پردیس سے ڈھیروں ڈھیر تھا کف لے کر لوٹے

لینے کا وقت آیا تو بے خبری میں ڈہری ڈسے داری کا باران کے سر پر آ پڑا تھا۔

بیٹا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ذتے داریاں اٹھانے میں ناکام رہا تھا کہ اس کے مطلب کی نوکری ہی نہیں مل پارہی تھی۔

☆☆☆

”پھر کیا ہوا امی.....؟“ غزالہ کے برابر لیٹی سات سالہ زینب خوف سے اس سے لپٹ گئی تھی۔

”ہونا کیا تھا، لکڑ ہارا ہر روز یہ منظر دیکھتا کہ شیر شکار کر کے لاتا، اسے بھینچوڑ کے کھانا اور بچا کچا وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، تب جھاڑیوں میں چھپا معذور گیدڑ کھسک، کھسک کر باہر آتا اور اس بچے سے اپنا پیٹ بھرتا۔ لکڑ ہارے نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک معذور گیدڑ کی خوراک کے لیے اس شیر کو وسیلہ بنا رکھا ہے تو اسے ہر روز اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اس نے اپنے اوزار سمیٹے اور گھر کو لوٹ آیا..... ایسی ہی غیبی امداد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا..... مگر یہ کیا..... ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ گزر گیا..... مسلسل فاقے سے لکڑ ہارے اور اس کے بیوی

بچوں کا دم لبوں پر آ گیا..... تب لکڑ ہارے نے رب سے شکوہ کیا، اے پروردگار یہ کیا..... تو نے ایک معذور گیدڑ کے لیے تو رزق کی سیمیل بنادی..... مگر میں تیرا عاجز بندہ، تجھ پر توکل کر کے بیٹھ گیا تو بھوکا مر رہا ہوں؟ اسی وقت غیب سے آواز آئی..... اے نادان، تو نے گیدڑ اور شیر کی مثال سے گیدڑ کی زندگی کو چننا، بجائے اس کے کہ تو شیر بن کے دوسروں کے لیے وسیلہ بننا تو معذور گیدڑ بن کے رب کی امداد کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ یاد رکھ، پروردگار بھی اس انسان کے حالات بدلتا ہے جو خود اپنے حالات بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی دوسروں کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے چتا ہے۔“ وہ آنکھیں موندے کہانی سناتی خود بھی نیم غنودگی میں تھی۔ تب ہی سر ہانے آہٹ ہوئی۔

”ای، زینب سو گئی.....“ علی نے غزالہ کے

گا، ان کی فرمائشوں پر اس کی زندگی تنگ پڑتی تھی۔
 موسم سرما کی آمد، آمدھی۔ اسکول میں نئے سیشن کا
 آغاز ہونے کو تھا اور ان سب نے مل کر ماں کی جان
 کھارکھی تھی۔ وہ ہزار جگہ انہیں امیدیں تھاتی تھک جاتی،
 ہار جاتی..... مگر حوصلہ نہ چھوڑتی۔ اور علی کہتا، اک دن وہ،
 اس کے سارے دکھ درد دور کر دے گا۔ وہ ہنس
 دیتی..... مڈل پاس کوئی افسر، منسٹر تو لگنے سے رہا۔

☆☆☆

مال کے مختلف کاؤنٹرز پر ٹرائی دھکیلتی سارہ نے
 اک نظر ہاتھ میں تھی خریداری کی لسٹ اور دوسری شاپنگ
 کی ٹرائی پڑا لی تھی۔

وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنی ساس صفیہ بیگم کی
 دست نگر تھی، یہ بات کبھی اس کے ذہن و دل سے ٹو نہیں
 ہوتی تھی۔ سو وہ ہمیشہ اپنے وسائل محدود رکھتے ہوئے
 ہاتھ بچھنے کی ہی چلتی۔ جینے کی اولین تاریخوں میں کچھ
 دن صفیہ بیگم کا قسطیام سارہ وٹمر کے گھر رہتا..... وہ
 سارے اخراجات بھگتا کر ہی لٹتیں۔

سارہ نے کبھی کسی معاملے میں ان سے سوال نہیں
 کیا تھا نہ ہی اس نے خود کو اور نہ ہی بچوں کو آسانشات کا
 عادی بنایا تھا..... ان کی تعلیم پر ہزاروں کا خرچ تھا۔ وہ اچھے
 اسکولوں میں پڑھ رہے تھے..... پوش علاقے کے دوستوں
 گز کے گھر کا رینٹ بھی کم نہیں تھا..... اور صفیہ بیگم کا اتنا کرنا
 بھی بہت تھا..... وہ ہمیشہ سے بہو کے لیے ساس سے بڑھ کر
 رہنما رہی تھیں..... سنا تھا کہ میکا ماں سے ہوتا ہے اس کی
 ماں نہیں تھی، کوئی بہن نہ تھی گویا پیچھے کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اور
 ٹمر کا بس ایک جملہ.....

”تمہیں یہاں تک لانا میرا کام تھا اب ان سب
 کے دلوں میں جگہ بنانا تم پر ہے۔“ سو سارہ نے ان سب کو
 اپنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر بات وہیں آ کے
 رکتی ہے کہ تالی دونوں ہاتھ سے بچتی ہے۔ سارہ کے
 لیے زندگی تنگ پڑتی تو اس کی نند کے رویے اور اس کی
 لے دے کے سبب..... سین جیسی اسٹیشن کا شس لڑکی
 نے شہزاد جیسے معمولی آدمی کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کے
 لیے اپنایا تھا تو شہزاد کی نظریں بھی بیوی سے بڑھ کر اس

کے والدین کی لاکھوں کی جائداد پر تھیں..... وہ ہلکی پڑتی
 تو اپنی کم مائیگی سے بڑھ کر ٹمر کے ناکارہ پن کے سبب،
 ٹمر کے اپنے لیل و نہار تھے..... کھانا، سونا، عیش کرنا،
 گھنٹوں نیٹ پر جاب سرچ کرتا ادھر، ادھر کے تعلقات،
 سیر و تفریح..... وغیرہ، وغیرہ.....

ماں، باپ دونوں نے خود کئی جگہ اس کی جاب کی
 کوشش کی، لاکھوں لگا کر انٹینیٹیوٹ، کو چنگ کھلوا کر
 دیے..... مگر وہ اپنے انہی خواص کے سبب سب ٹھپ
 کر دیتا..... لاکھوں کی جائداد کے وارث کے بچوں کا نصیب
 کھینچ جان تھی تو یہ وقت تھا اور ٹمر اس وقت کا منتظر تھا جب
 سب کچھ اس کا ہوتا..... اور یہی بات ساری خرابی کی بڑھی۔
 سارہ نے برا وقت جھیلنا تھا اور جمیل رہی
 تھی..... برے وقت کی سفاکیوں سے واقف تھی..... سو
 غزالہ اس کی دوست ہر وقت اس کے ذہن میں گھومتی، کبھی
 ایک کی جگہ دو چیزیں آ جاتیں تو اگلی پر غزالہ کے نام کی مہر
 ہوتی..... یہی دوستی ہے، اب بھی چندہ سو فکل ہی
 آئے..... اس نے کچھ ضروری سامان کا اک شاپر الگ
 سے بنالیا..... اور ٹرائی کا سامان لے کر مال سے نکل آئی۔

☆☆☆

”پھر کیا تھا..... بیٹے نے باپ سے جو دوستی کا
 مطلب پوچھا تو باپ اسی اندھیری رات میں اسے
 اک جانب چل پڑا..... کئی کوس چل کر اک گاؤں پہنچا اور
 اک دروازے پر دستک دی اندر سے آواز آئی کون ہے،
 اس نے کہا میں ہوں تمہارا دوست اور اپنا نام بتایا..... پھر
 خاموشی چھا گئی..... دروازہ بڑی دیر نہ کھلا..... بیٹے نے
 باپ کو طعنیہ نظروں سے دیکھا اور کہا یہ ہے دوستی.....؟“

”تو امی پھر کیا ہوا؟“

”ارے سنی تو جاؤ.....“

”باپ نے اسے کچھ مبر کا اشارہ کیا، کافی دیر بعد
 دروازہ کھلا اور دوست باہر آیا اور کہا۔

”تاخیر پر معذرت چاہتا ہوں میرے دوست،
 دراصل تم نے رات کے اس پہر دستک دی تو مجھے لگا میرا
 دوست کسی مصیبت میں ہے..... سو میں اسی تیاری میں

دیا جلتا رہا

بچہ تھا اور دینو کو خاک بھی پروا نہیں تھی۔ اس نے ایس ایم ایس پڑھا پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ذکیہ بھوکی تھی، کھانا پک گیا تو..... غزالہ نے دسترخوان بچھا یا تھا۔ اس بار دستک ہوئی۔ ذکیہ ہی تھی۔

”ہاجی کچھ کھانے کو بے تو دے دو.....“

ناچار اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔ دینچی میں کنتی کی بوٹیاں تھیں۔ ایک اور کی منجاش کہاں سے نکلتی..... شام کو سہی..... غزالہ نے کر لاتے ضمیر کو بہلایا..... وہ مایوس پلٹ گئی..... بچے ترس، ترس کر ڈھنگ کا کھاتے..... اب بھی بوٹی، بوٹی پر نگرار تھی۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی مگر ذکیہ کا خیال آتے ہی اس کے حلق میں نوالے اگلنے لگے..... ڈھیر سارا ٹھنڈا ٹھار پانی غٹا غٹ چڑھا گئی۔ سالن ڈھانک کر رکھ دیا۔ بچے کچل میں بندر کا تماشا دیکھنے کو لپک گئے..... اس نے علی کو ہرے مسالا کے لیے مارکیٹ دوڑایا خود کبابوں کا مسالا پیسے بیٹھ گئی۔ مگر دھیان ذکیہ میں انک گیا تھا۔ کباب بناتے، تیلے شام پڑ جاتی۔ آج اتوار تھا، اسے جانے کتنے بنگلوں میں اضافی کام نمٹانے تھے۔ کچھا اشیا اور پیسے اضافی مل جاتے۔ کچھ دیر کو کمر کائی مگر نیند، قرار سب لٹ گیا تھا۔ اس پاس جیسے چھین ہی چھین کو شیعہ گئی تھیں۔ اس کے اندر کوئی دھیسے، دھیسے کر لایا تھا، رورہا تھا۔ ہر بچے کی پیدائش پر سلیم تریبوز چیر کر اسے علی الصباح کھلانے کورات بھراوس میں رکھتا اس کا کتنا خیال رکھتا تھا اور ایک جملہ جو وہ بھی بھولتی نہیں تھی۔ ”بس تو خوش رہا کر“

”اور خوشیاں تو بس مقدر والوں کو ملتی ہیں، یہ اسے

اب پتا چلا تھا..... اس کے پاس سلیم کی محبت اس محبت کی یاد تھی اور ذکیہ کے پاس شاید وہ بھی نہیں تھی۔ اس کے اندر کوئی شے آہستہ، آہستہ پھلنے لگی۔ سنا تھا کہ ایک بھوکا ہی بھوکے کو روٹی کھلا سکتا ہے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی..... اپنے حصے کا سالن، روٹی، پلیٹ سے ڈھک کر گھر سے نکل آئی۔ اس کا رخ یقیناً ذکیہ کی کھولی کی طرف تھا۔ شاید ای طرح دیے سے دیا جلتا ہے۔

لگ گیا تھا۔ اگر کسی کا قرض چکانا ہے تو میں نے صندوق سے رقم نکال کر رکھ لی ہے۔ اگر کسی سے بدلہ لیتا ہے تو میں نے نکوار کو آب دے لی ہے اور اگر بیٹے کا رشتہ درکار ہے تو میں نے بیٹی کو دلہن بنا کر بٹھا دیا ہے۔ کہو میرے دوست، رات کے اس پہر میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟“ باپ نے بیٹے کو غریبہ دیکھا..... اور کہا ”دیکھائیے ہوئی ہے دوستی.....“ غزالہ کی کہانی ختم ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی..... ولی لپک کر گیا..... سارہ کا بڑا بیٹا دانیال کئی شاہز لیے کھڑا تھا۔ اس کے اوپری لب پر ہلکا، ہلکا رواں ابھر رہا تھا۔ اب اس کو سٹوڑائے پھرنا..... سارہ مہینہ دو مہینے میں گھر کی صفائی دھلائی بھگتی تو بہت کچھ نکل آتا، پانچ بچوں کے جلدی، جلدی چھوٹے ہوتے پکڑے..... غزالہ نکلے، نکلے کے لیے بڑیاں رگڑتی..... سارہ دو سو گز کے بنگلے میں رہتی..... یہ قسمت تھی اب بھی کافی سامان بچھا تھا۔ بچوں کے کپڑے..... کچھ پرانے جو تے، کم استعمال شدہ کاپیاں اور اب بھی کچھ چھوٹا موٹا سامان اور راشن کا تھیلہ اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کلو بھر فریز کیا گوشت لوجی..... ہو گئیں بچوں کی ضروریات پوری..... اس کے بچے یوں بھی کم میں کم گزارہ کر لیتے، سمجھا بچھا دو مان جاتے..... وہ جھٹ پھٹ سارا سامان ٹھکانے لگانے بیٹھ گئی۔ گوشت کے دو حصے کیے گن کر تین تین کے حساب سے بوٹیاں کر کے دینچی میں ڈالیں۔ بچے دنوں گوشت کو ترستے، ادھر ادھر کے بچے کچھ کھانوں میں کیا سیر ہوتے..... اس نے چاؤ سے ساکن کے لیے گوشت چڑھا دیا تھا۔ یقینہ کے شای کباب، کافی دیر چو لھے کے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ ایک خالی ایس ایم ایس آیا تھا..... اور یہ غزالہ ہی کی ہدایت تھی بوقت ضرورت اسے یکارو..... کہ دیوار ملی تھی، پڑوس کا بڑا حق ہوتا ہے، وہ ذکیہ تھی، مالک مکان نے گھر کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھولی خدا ترسی کو دے رکھی تھی۔ دینو اسے بھگا کر لایا تھا اسی کی سزا بھگت رہی تھی۔ بدکماؤ دینو نشہ کر کے کسی کو نے میں اوندھا پڑا رہتا، ذکیہ کی زبان کھلتی تو وجود پر نسل پڑ جاتے، کس حال سے تھی پہلا



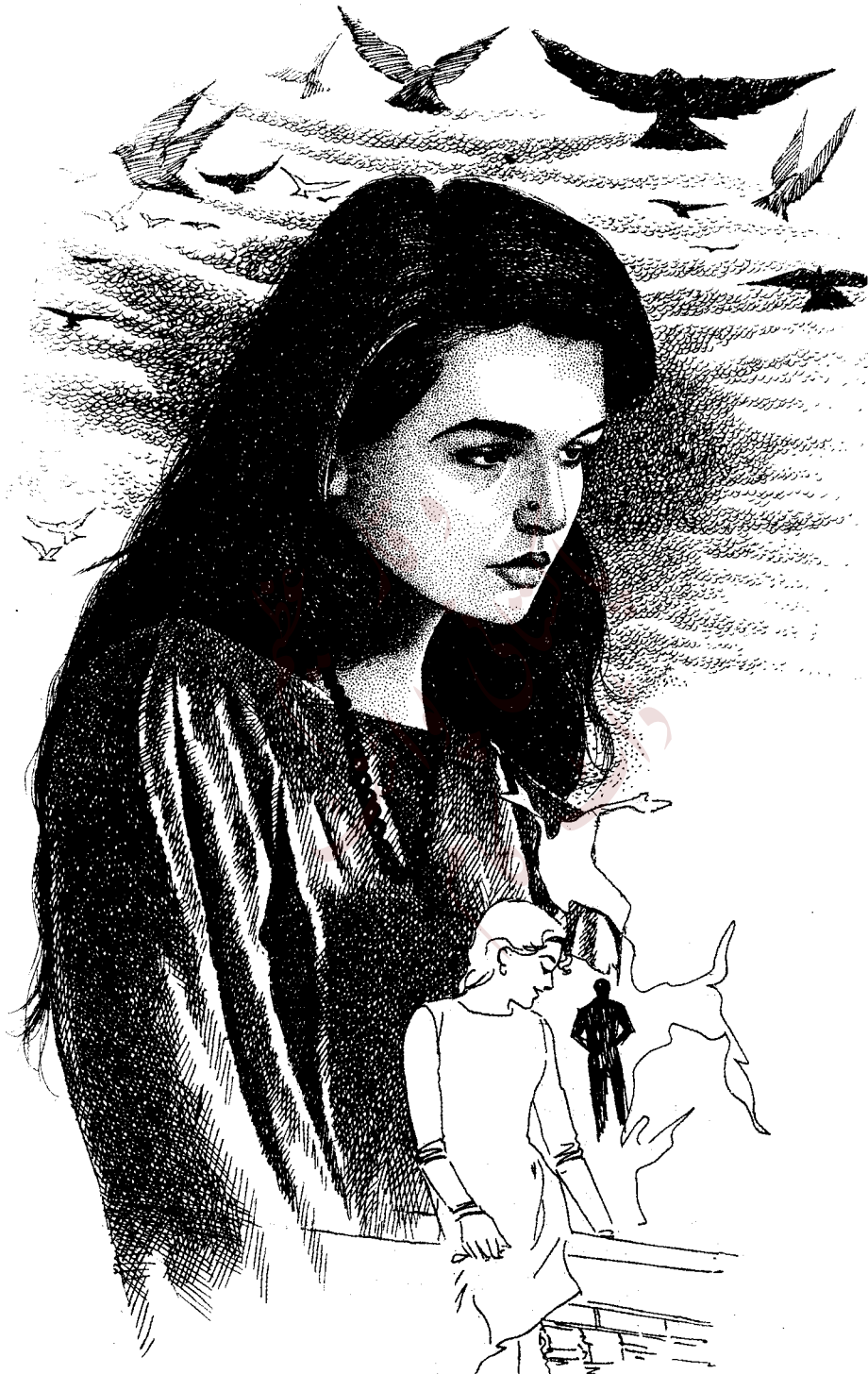
مکمل ناول

کوئی تعویذ ہو روبرو بلا کا

سمیرا یونس ہارون

اپنی رہائش گاہ سے دس منٹ کے پیدل سفر پر
واقع اس جمیل کنارے، شام سے آنا اس کا معمول تھا۔
اور پچھلے نو دنوں سے یہ شعر نوکِ زباں پر آتا بھی جیسے
معمول بن گیا تھا۔

کوئی تعویذ ہو روبرو بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
اس براؤن ریشی بال، براؤن ہی آنکھیں اور
سنہری رنگت والے اس دیوتاؤں جیسے وجہہ کو پچھلے



اور یہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی پچھلے نو روز سے غیر محسوس طریقے سے عادت کا حصہ ہی بنتا جا رہا تھا۔ وہ شخص اب اس سے اتنے فاصلے پر تھا کہ جہاں سے صورتیں واضح دکھائی نہ دیں۔

”مجھے اب یہ اپنی مخصوص جگہ بدل لینی چاہیے اور کسی ایسی جگہ کو چننا چاہیے جہاں سے اس کی صورت واضح دکھے۔“ اپنی مخصوص جگہ بیٹھتے ہوئے اس کے دل میں خیال ابھرا۔ (حالانکہ وہ گزر کے اس کے پاس سے ہی جاتی تھی)

”ایثار مصطفیٰ! جادو بڑا زور آور ہے اور اس کے کانٹے کے منتر میں دم نہیں۔ سو کچھ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو اس سحر کے اثر کو زائل کر کے کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچالے۔“ اس کے پاس سوچنے کے لیے اتنی باتیں ہوتی تھیں کہ بعض اوقات کئی اہم باتوں پر دھیان دینے کی باری ہی نہیں آ پاتی تھی سو اس وقت بھی وہ نہیں جان پائی کہ اس فقرے کی عمر بھی نو دن ہے مگر اس کے جواب میں نزول ہونے والے خیال کا آج پہلا روز تھا۔

”ممکنہ خطرہ.....؟ بھلا محبت کا جادو چل جانے کی صورت میں ایسا کون سا نقصان ہوگا جو کانٹے کا منتر... از بس ضروری ٹھہرا ہے۔“ اس نے دور کھڑے اس شخص پر نگاہ ڈالی۔ فاصلہ ہونے کے باعث اس کے نقش واضح نہیں تھے مگر ایثار مصطفیٰ کو اس کی صورت از بر تھی۔ اس کے خدو خال انگریزوں سے مماثل تھے۔ وہ غیر ملکی تھا اور شاید غیر مسلم بھی۔ اس کے ظاہری چلیے اور مغربی نقش سے ہر انجمنی بیبی اندازہ لگاتا اور وہ شخص اس کے لیے انجمنی ہی ہوتا تھا۔ سو پھر قیاس کیونکر باقی انجمنیوں سے جدا ہوتا۔

”اگر یہ غیر ملکی، غیر مسلم بھی ہے تو یہ محبت مجھے خوار کر کے رکھ دے گی۔ لا حاصل محبت جی کا خیال ہوتی ہے اور محبت کے حصول کے لیے ہم مذہبی از بس ضروری سو لازم بیبی ٹھہرا کر اس ممکنہ خطرے سے خود کو بچا لیا جائے۔“ جمیل میں کلنکر پھینک کر وہ دائرے سننے

روز سے ایثار مصطفیٰ اسی جمیل کنارے دیکھتی چلی آ رہی تھی مگر پچھلے نو روز سے ہی اس شخص سے اس کی نگاہ اتنے ہی بغیر کسی ارادے، پتا کسی شعوری کوشش کے یہ اختیار یہ شعر اس کے ذہن کے نفس میں کسی۔۔۔ برباب پتیلی کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا تو وہ اپنے اختیار، ارادے اور کوشش سے دل نادان کو بھلاتی۔

”ایثار مصطفیٰ! حسین صورتیں سب ہی کو دلکش لگتی ہیں سو اگر تم بھی متاثر ہو گئی ہو تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہ اسے محبت کا نام دے دیا جائے۔“ محبت کا سحر بیناد و مگر کر دے گا، اس اندیشے کے تحت وہ پچھلے نو دن سے اس جادو کے توڑ کے لیے یہی ایک منتر پڑھتی آ رہی تھی۔ سو اس وقت بھی پڑھ ڈالا اور نگاہیں خدا کے اس نامہ کار سے ہٹ کر اپنے ارد گرد پھیلے حسین مناظر سے ڈالٹھانے لگیں۔

”اس ایک بات کا تو تمہیں اعتراف کرنا ہی پڑے گا ایثار!“ اس کے اندر کوئی بولا تھا۔ ”اس جمیل کا سن بھی اس دیوتا کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔“ گزرے نو دنوں کی طرح آج بھی اس نے اپنے اندر بے اطمینان آواز پر گہری سانس بھری تھی۔ اس سے انکار ہو سکا تھا نہ اعتراف۔

انکار کی صورت میں اپنی بات ثابت نہ کر سکنے کا اندیشہ تھا اور اعتراف اس منتر کے اثر کو زائل کر دیتا جو وہ پچھلے کئی روز سے محبت کے جادو کے توڑ کے لیے پڑھتی آ رہی تھی۔ عجب بے بسی بے بسی تھی۔ سر جھٹک کے وہ جمیل کے اس حصے کی سمت بڑھنے لگی۔ جہاں رکھی لٹک پر بیٹھ کر پانی سے الوداعی مصافحہ کرتی، سورج کی کرنوں کا نظارہ کرنا اب اس کی ایسی پختہ عادت بن گئی تھی جو بڑی دقتوں سے چھوٹ پاتی۔

وہ حسن مجسم، سر پر پی کیپ پہنے، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، اپنی بھوری آنکھیں نیلی جمیل پہ جمائے درخت سے اسی جگہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ بہاں اس نے اسے اول روز دیکھا تھا۔

اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا

گئی۔ ایک، دو، تین.....

حقیقت کو تسلیم نہیں بھی کر پائی تھی تو اس کے چند روز بعد ہی اسے قبول کرنا پڑا تھا کہ جب کھانے کی میز پر اس کی مئی، بابا کے درمیان ہونے والی جھڑپ نے اسے انفرادی کی انتہاؤں پر پہنچا دیا تھا۔

یہ جھڑپ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ یہ تو روزمرہ کی ان کی جیسے کوئی ڈیوٹی تھی۔ جسے دونوں ہی کسی فرض کی طرح پوری ڈتے داری سے نبھاتے تھے۔ نئی بات تو یہ بھی نہیں تھی کہ دونوں ہی غصے کی انتہا میں جہالت کے پاتال میں اتر کر ایک دوسرے کی کردار کشی میں سبقت لے جانے کی دھن میں بے قابو ہو رہے تھے۔

مگر یہ قصہ ضرور نیا تھا کہ بابا نے ایک دم ضبط کھو تے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی تیز دھار چھری مئی کی طرف پھینکنی چاہی تھی۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو بھی جاتے اگر جو تہیٰ سرعت سے اٹھ کر انہیں قابو نہ کرتا۔ اس صورت حال پر زار اور امراہیم نے فقط چند لمحوں کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا تھا اور دوبارہ پلیٹ پر جھک گئے۔ ان دونوں کے پاس اس سارے ڈرامے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ اس نے نہایت دل گرفتگی سے یہ سارا منظر دیکھا اور پھر اداسیوں میں گھر کے سوچا۔

”یہ تو روز کا قصہ ہے تو میرا دل اس کا عادی کیوں نہیں ہو جاتا؟ میرا من کیوں برسوں سے اس گھر کے امن کے نامکون قیام کے لیے ہلکتا ہے؟ جتنی محنت، کوشش یہ ایک دوسرے کو نچا دکھانے میں کرتے ہیں اگر اس سے نصف جدوجہد خود کو اچھا ثابت کرنے میں کریں تو زندگی اتنی بیزار ہو نہ اتنی دشوار۔“ مایوسی اور قنوطیت کا دورہ آج پھر پڑا تھا۔

جتنی، بابا کو لے کر ان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد مئی نے بھی بڑ بڑاتے ہوئے ڈائننگ روم چھوڑ دیا۔

اس نے چیخ پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دور کھسکائی۔ کھانے سے دل اچاٹ تو جھگڑے کی ابتدا سے ہی ہو گیا تھا۔ ڈائننگ روم اس وقت جنگ کے بعد

”یوں بھی محبت کے معاملے میں میرے نصیب نے کب اتنا ساتھ دیا ہے کہ کسی قسم کی خوش گمانی کی گنجائش بھی نکلتی۔“ اس نے گہری سانس بھر کے سوچا تو چار برسوں کی دوری پر کھڑی بچنی مسعود کی آواز قریب ہی سے سنائی دی جو اس نے ایثار کے خونی رشتوں کی بے جسی پہ گوش گزار کی تھی۔

”ایثار جن بے حس لوگوں سے تم محبت کرتی ہو ناں! ان سے بدلے میں محبت کی خواہش، تمہاری حماقت ہے۔ اسی حماقت کے سبب تم نے اپنی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اب تمہیں خدا کا واسطہ ہے اگر کسی سے محبت کرنے لگو تو مقابل سے بدلے میں محبت کی خواہش نہ رکھنا یا پھر محبت ہی کسی ایسے شخص سے کرنا جس کے نزدیک تم پہلے ہی بہت اہم ہو۔“ جتنی مسعود کی بہت پہلے کئی بات اسے بڑے ہی غلط وقت پر یاد آ کر بے گل کر گئی جو اگر اس وقت یاد نہیں آتی تو وہ دل کو بھلانے کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیتی۔

”اگر میں بدلے میں محبت پانے کی تمنا سے تاب نہ ہو بھی جاؤں تو ایسے کئی اور معاملات بھی ہیں جو جینا دشوار کیے ہوئے ہیں۔“ جتنی مسعود کی بات کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

”جانتا ہوں بخوبی! تمہارے ساتھ مسئلہ ہوتا ہے کیا ہے؟“ ایثار مصطفیٰ کو خود اس سے زیادہ جاننے کا دعویدار اب اس کی ذات کے متعلق تجزیہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

”تم اکثر چیزوں کو ”جو ہے“ اور ”جیسا ہے“ کی بنیاد پر قبول کر لینے کے بجائے ”کیوں ہے؟“ اور ”کیسے ہے؟“ کی کنوج میں نکل پڑتی ہو۔ سوچنا اور گہرائی میں اتر کر سوچنا جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہوتم۔“ جتنی نے مرض تشخیص کر کے اسے آگاہ کیا تھا اور ایثار مصطفیٰ کی رگ، رگ سے واقفیت کا عویدار بھلا غلط کیسے ہو سکتا تھا۔

چار برس پہلے وہ اگر جتنی کی تشخیص کردہ بیماری کی

بھالو اور جولا ہانٹانے لگی۔

”یا پھر شاید می ہی ہار مان لیں۔ آخر بابا نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا جو کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔“ بادلوں کا ”گھوڑا“ چاند پر سوار ہوا تو چاندنی چند لمحوں کے لیے قید ہوئی۔

”اگر جو حملہ کامیاب ہو جاتا تو.....؟“ اس سے آگے سوچ کے ساتھ سانس بھی رک جاتی تھی۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔

”یہ بھی مقام شکر ہے کہ جتنی آج ڈنر کے لیے یہاں رک گیا تھا۔ ورنہ بابا کو بروقت ان کے ارادے سے باز رکھنا کیسے ممکن ہو پاتا۔“ بادلوں کا گھوڑا چاند سے اتر تو چاندنی بھی آزاد ہو کر چاروں اور پھیل گئی مگر چند پل کے لیے ہی... اس کے پیچھے بادلوں کی پری سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”اور یہ بھی صد شکر کہ پھوان دنوں دادو سے ملنے راولا کوٹ گئی ہیں، اگر جو یہیں ہوتیں تو جتنی کی یہاں موجودگی ممکن نہیں تھی۔“ وہ آفس سے واپسی پر ہمیشہ سب سے پہلے اپنی صورت اپنی ماں کو ہی دکھانے میں آسودگی محسوس کرتا تھا۔

”پری“ نے چاند کی سواری چھوڑی تو چاروں اور پھیلی ٹھنڈی چاندنی میں اس نے ابراہیم اور زارا کو پورچ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ خوش باش، شاد، مکن سے..... فردا کی کسی بھی قسم کی فکر سے آزاد..... ہنسی، قہقہے کی مالا چپتے ہوئے جو ہوگا، دیکھا جائے گا کا زندہ اشتہار.....

”یہ بھی خوب زندگی جی رہے ہیں۔ کسی بھی پریشان کن بات کو زیادہ اہمیت دیے بغیر مگر میرے لیے ایسی زندگی جینا کیوں دشوار ہے؟“ کھڑکی سے آسمان کی دستکوں پر نگاہیں جمائے گویا وہ خدا سے استفسار کر رہی تھی۔

”شاید اس لیے کہ میں گہرائی میں اتر کر سوچنے جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہوں۔“ جواب میں.... بے اختیار ہی اسے جتنی کی کئی بات یاد آئی تو وہ مسکرا دی۔

”خدا جانے یہ بندہ اس قدر درست انداز سے

کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بابا، می پر چھری کا وار کرنے کی کوشش میں ٹیبل پر رکھی سوٹ ڈش کے علاوہ پانی کا جبک بھی گرا چکے تھے۔ جسے اب ملازمہ سمیٹ رہی تھی۔ اس نے لائق سے ڈنر کرتے اپنے بھائی ابراہیم اور بہن زارا کو ایک نظر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”الٹی امیرے والدین کی فضول ضد کہاں جا کے رکے گی؟“ بڑے ضبط کے باوجود بھی ایک موتی پلک پر اٹھ رہا تھا۔ بابا سے خلع کا مطالبہ کر کے می اپنی حق مہر کی رقم گنوا نا نہیں چاہتی تھیں اور بابا می سے انتہائی حد تک بیزار ہو چکنے کے باوجود گرمی کے دل میں ہلکی خواہش کو پورا کر دیتے تو انہیں حق مہر کے پانچ لاکھ دینے پڑتے مگر کروڑوں کا کاروبار کرنے والے بابا کے لیے پانچ لاکھ کی ادائیگی کیوں مسئلہ بنی ہوئی ہے؟ وہ اس سوال کے متعلق سوچتی تو جواباً ضد اور اتنا کے سوا کوئی تیسرا لفظ اس حوالے سے ذہن میں جگہ نہیں بناتا تھا۔

ضد اور اتنا کی اس دوڑ میں ہارنا کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ سومی گھر چھوڑنے کے بجائے دن میں تین بار تو کم از کم ضرور بابا کو اپنی صورت دکھاتی تھیں۔ کیونکہ بابا نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ”مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے، اپنی شکل ذرا کم ہی دکھایا کرو۔“ اسی لیے وہ بابا کو زیادہ سے زیادہ نہ صرف اپنے درشن کراتی تھیں بلکہ ہر پار سامنا ہونے پر اپنی زبان کی کرامات بھی ضرور دکھاتی تھیں۔ وہ بابا کو اتنا زچ کر دینا چاہتی تھیں کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر کے اور ان کا کہا مطالبہ مان کر انہیں فاتح قرار دے دیں۔ لیکن بابا میں بڑا اسیٹھنا تھا۔ وہ می کی حرکتوں سے زچ ہو جانے کے بعد بھی ان کا ان کہا مطالبہ ماننے پر رضامند تھے، نہ اپنی ہار.....

”مگر شاید بابا اب ہارنے لگے ہیں۔ آج جس طرح انہوں نے ضبط کھودیا اس سے لگتا ہے وہ اب می کا وجود زیادہ برداشت نہیں کر پائیں گے۔“ کمرے میں ٹھٹھن کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ اس نے بے چینی ہو کر کھڑکی کھول دی اور آسمان پر تیرتے بادلوں سے شیر،

”بیچارے فکروں سے دور رہو گی تو وہاں تمہارے دن یہاں سے بہتر گزریں گے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں پرسکون رہا کرتی تھی۔ ٹینشن زدہ ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے بھی اور دادو کی ہر شفقت اور مہربان وجود کے زیر سایہ ہونے کے سبب بھی۔ مگر پھر بھی دل یوں لمحوں میں رضامند ہو جانے پر متاثر تھا سو وہ اتنی جلدی ہامی کیسے بھرتی۔

”اوہ گوتم بدھ!“ وہ زچ ہوا اس کے اتنا سوچنے پر۔ ”میں تمہیں یونہی تو گوتم بدھ نہیں کہتا۔ اتنا غور و فکر تو کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ آنے پر بھی نہیں کرتی ہوگی۔“ اس کے چڑنے پر وہ ہنس دی۔

”جب کوئی فیصلہ کرلو تو مجھے آگاہ کر دینا، میں چلا۔“ وہ ہنوز چڑا ہوا تھا۔

اور پھر دادو کی شفقت بانہوں میں سماتے ہوئے اور پھوسے پر خلوص پیار وصول کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”بابا اس فیملی کا حصہ ہوتے ہوئے ان سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ بقول دادو کے دادا ابھی محبتوں کے معاملے میں دوسروں کو مقروض کر دیا کرتے تھے تو پھر بابا کیوں حقدار کو بھی محبت خیرات کے مانند دیتے ہیں؟“ ان سوالات کے جوابات اسے نہ پہلے کبھی مل سکے تھے نہ اس وقت..... مگر اس کے باوجود اس نے اتنا ضرور محسوس کیا تھا کہ اس کے لیے راولا کوٹ کی فضا میں افسردگی اور ٹینشن کا تناسب کراچی کے مقابلے میں کافی کم تھا۔

”منسوتم تانی امی کے پاس مستقل رہنے کا فیصلہ کرلو۔ شاد رہو گی۔“ یہ بات اگلے شام وہ جھیل کنارے اس کے ہم قدم، پھل قدمی کرتے ہوئے اور اسے تروتازہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اتر تمہارا تمام ہوا، اب گریجویشن یہیں کسی اچھے کالج سے کر لینا۔“ وہ کس طرح خوش رہ سکتی ہے؟ اس بات کے متعلق سوچنا اور کوشش کرنا مجتبیٰ کی آرزو بنتی جا رہی تھی۔

”مجتبیٰ! بونگ کریں؟“ اس کا مشورہ مناسب

کیسے لگتا ہے؟“ اس نے تسلیم کیا۔ اس کی صلاحیت بھی اور اپنے عارضے کو بھی۔

”گوتم بدھ کے گیان دھیان میں اگر خلل نہ پڑے تو میں اندر آ جاؤں؟“ مجتبیٰ نے کمرے میں داخل ہو جانے کے بعد اجازت طلب کی اور آ کر مسہری کے سر ہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا اور اس کی مخالف سمت میں مسہری کی پائنتی بیٹھ گئی۔

”بابا کے انداز سے لگتا ہے کہ اب وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچ کر رہی رہیں گے۔“ دل میں پلٹے خدشے کو اس نے زبان دی۔

”کیا کہہ سکتے ہیں؟“ اس نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے۔ ”ویسے ماموں کہہ رہے تھے وہ اب تک یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ چکے ہوتے مگر کوئی وجہ ہے جو انہیں روکے ہوئے ہے۔ اپنے دونوں بڑے بچوں کو وہ کافی سمجھدار سمجھتے ہیں جو اپنے والدین کی چچقلش کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ مگر ایثار مصطفیٰ کی وجہ سے وہ اپنے ضبط کو بہت آزماتے ہیں۔ وہ اسے کسی صورت دیکھی نہیں کرنا چاہتے۔“ مجتبیٰ مسود نے اس کو کسی قسم کے برے خیال سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ خدا جانے کامیاب یا ناکام.....؟ اس نے بغور ایثار کی صورت دیکھی۔

”اچھا.....؟“ طرہ یہ ہنسی کے ساتھ اس نے سر جھٹکا۔ ”اس کے والدین اپنی اولاد کے لیے فکر مند رہے ہیں۔“ اس ایک بات پر اعتبار شاید وہ اس وقت بھی نہ کرے جب اس بات کی سچائی میں کوئی شک نہ ہو۔

”میں چند دنوں میں امی کو لینے راولا کوٹ جا رہا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے لب بھیج کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم چلو گی؟“ مجتبیٰ نے استہمامیہ نگاہیں اس پر جمائیں۔

طبیعت پر عجب بیزار محسوس طاری رہتی تھی۔ دل بھلنے پہ کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔ سواں نے انکار کرنا چاہا۔

”میری بات مانو! چلی چلو۔“ اس نے ایثار کا

ارادہ بھانپتے ہوئے مشورہ دیا۔

..... کے جیسے حسن والا) کی جانب دیکھا اور واپسی کی راہ پر قدم بڑھائے۔ وہ ماتھے پر نکلے گاگلز، شرٹ کے گریبان میں انگا کر ہاتھوں سے بال سنوار رہا تھا۔

اُگ چہرہ میری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے
دل پھر من مانی پر اتر آیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا،
نگاہوں کا رخ بدلا اور اپنی راہ چل دی۔
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔“ دل کا دھیان
پھر محبت میں انک گیا۔

”اُف! تم خاموش کیوں نہیں ہو جاتے؟“ اس
نے نگاہیں نیچی رکھے دل کو ڈپٹا۔

”پیور بلیک۔“ کی خوشبو بتدریج قریب آرہی
تھی۔ اپنی راہ پر چلتے ہوئے وہ اس کے قریب سے
گزری تھی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اپالو نے
بھی واپسی کی راہ لی ہے اور اس کے پیچھے قدم بڑھائے
ہیں۔ پیور بلیک کی مہک اس کے تعاقب میں چلی آرہی
تھی۔ ریست ہاؤس کی بگلی راہ سے ہوتے ہوئے سرسبز
پھاڑ سے گزر کر اور سڑک تک پہنچنے تک، وہ کسی کے
قدموں کی چاپ اپنے عقب میں سنتی آئی۔ پھر دفعتاً
ایک آواز نے متوجہ کیا۔

”ایکسیکو زمی میم!“ وہ بے اختیار پلٹی۔

”اس نے مجھے مخاطب کیا ہے؟“ وہ بے یقین
تھی۔ مگر اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہاں ان دونوں
کے علاوہ کوئی تیسرا فرد موجود نہیں سوا سے یہ یقین کرنا
ہی پڑا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے۔

”وہ مجھ سے ہوئے بمکلام اللہ، اللہ.....“ اسے
معروف کا نیک فریدہ خانم کسی پکی سبکی کی طرح یاد آئیں۔
”یہاں قریب ہی کہیں مسٹر جوزف کا گھر ہے۔
مگر میں راہ بھول گیا ہوں۔ آپ اگر رہنمائی فرمادیں تو
عنایت ہوگی۔“

شستہ اردو، نرم لہجہ اور رہنمائی کی بات۔ اس کے
حیران ہونے کے لیے کوئی ایک بات تو تھی نہیں۔ یہ وہ
جی بھر کے حیران ہوئی۔

کتنے کے باوجود وہ اپنی عادت کے مطابق فوری فیصلہ
نہیں کر پائی۔ سو بات بدل کر اس نے جتنی کا دھیان بھی
اس طرف سے ہٹانا چاہا۔

جتنی اس کی اس کوشش پہنس دیا۔

”اور اگر تم میرا مشورہ مان لو گی تو میرا وجدان کہتا
ہے کہ تم تانا ابو کی طرح روز اس خوب صورت جمیل کو
خارج تحسین پیش کرنے ضرور آؤ گی کہ اس کی دلکشی
تمہاری کلفت دور کرنے کا سبب ثابت ہوگی۔“

اس کے دادا عمر کے اس حصے میں جب ناتوانی
جسم کا اضافی عضو بن جاتی ہے، اپنے سارے کاروبار کی
ذمہ داری بیٹے مصطفیٰ شاہد کو سونپ کر فارغ ہوئے تو
ڈپریشن نے کسی ان چاہے وجود کی طرح ان کے اندر
گویا ڈیرا ہی جمالیا۔ اپنے ڈاکٹر دوست کے مشورے پر
جب وہ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے راولا کوٹ پہنچے تو
جبوہ جمیل نے انہیں اپنے بحر میں جکڑ کر گویا عمر قید کی سزا
سنادی۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر کراچی نہیں جاسکے۔

جمیل کے قریب خوب صورت گھر کی تعمیر اور
بلاناغہ جمیل کی سیر ڈپریشن کا بہترین علاج ثابت ہوئی۔
یہاں کے شدید موسم نے قوت برداشت بڑھائی تو
برلمباری اور جھی ہوئی جمیل کا نظارہ بھی دشوار نہ رہا۔

عمر قید کی یہ خوب صورت سزا انہوں نے زندگی
کی آخری سانس تک کاٹی اور اگلے جہاں کا رخت سفر
باندھا تو دادو کو لگا کہ وہ بھی اب راولا کوٹ کی ہی عادی
ہو گئی ہیں۔ اور اسی لیے شاید جتنی کو یقین ہو چلا تھا کہ
ایثار بھی یہاں خوش رہے گی۔

اس نے جتنی کا مشورہ مان لیا تھا۔ اور آج چار
برس بیت جانے کے بعد جتنی کی پیش گوئی بھی سچ ثابت
ہو گئی تھی، وہ مطمئن رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔
مغرب کی اذان میں وقت اتنا زیادہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ
کھڑی ہوئی۔ آس پاس سیاحوں کی تعداد بتدریج کم
ہورہی تھی۔ اس نے کن کنکھیوں سے اپالو (دوبی دفنوں)

اپنے گھر لے گئے۔ اب پہلی دفعہ میں ہی راستہ ذہن نشین کر لیتا میرے لیے کافی دشوار ہے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں کافی کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ پلیز آپ مدد کر دیں۔“ اس نے ایثار کے تاثرات سے خدا جانے کیا اندازہ لگایا تھا جو اب سرکھاتے ہوئے کسی قدر شرمندگی سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

مسٹر جوزف نہ ساجی کارکن تھے، نہ ٹی وی پر آنے والی کوئی معروف شخصیت جو وہ بنائے ذہن پر زور دے محض نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ جاتی۔ مگر وہ فقط نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ گئی تھی کیونکہ بقول دادو، دادا کی ان سے اچھی صاحب سلامت تھی۔ جس کے سبب دادو کی شناسائی بھی ہو گئی۔ جواب دادا کی وفات کے بعد دور کی سلام دعا تک رہ گئی تھی۔

اس نے گردن ہلا کر رخ موڑا اور راستہ بتانے کا قصد کیا۔

”میں ڈالاس سے آیا ہوں اور یہاں کشمیریوں کا مہمان ہوں، مہمان ہونے کی حیثیت سے میں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں؟“ اس نے ایثار کا ارادہ بھانپتے ہوئے عاجزانہ کہا۔

ایثار کے کچھ کہتے لب باہم پیوست ہوئے اور سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

”آپ اگر راستہ بتانے کے بجائے میرے گھر تک کہنی ہی دے دیں تو.....“ اس نے سرکھایا۔ ججک کر کی گئی فرمائش شاید وہ اسی طرح سرکھاکر ہی بیان کرتا تھا۔

ایثار نے گہری سانس فضا کے سپرد کی اور آگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”بہت شکریہ.....“ مسکرا کر اس نے ایثار کے پیچھے قدم بڑھائے۔

”میں اتنی اچھی تو نہیں کہ کسی بھی اجنبی کی ایسی فرمائش بغیر کوئی عذر پیش کیے مان جاؤں۔“ اس نے ہم قدم چلتے ہوئے شخص کو اس نے کن انگیوں سے دیکھتے

”انگریزی خدو خال، انگریزی وضع قطع اور اتنی بہترین اردو۔“ پہلی حیران کن بات۔

”اردو بولتے ہوئے اس کے لہجے پر انگریز ہونے کا بس گمان ہی گزرتا تھا، یقین میں نہ بدلنے والا شک۔“ دوسری حیران کن بات۔

”مسٹر جوزف کے گھریک رہنمائی اور راہ بھول جانا۔“ یہ ایک ایسی بات تھی جو اس کے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ، ساتھ کئی وجوہ کی بنا پر ناقابل قبول بھی تھی۔

”پچھلے سترہ روز سے کسی معمول کی طرح مخصوص راہ پر آنے والا شخص واپسی کی راہ کیسے بھول سکتا ہے؟“ وہ متحیر تھی۔

”اور راستہ اگر پیچیدہ ہو تب بھی یقین کی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ سڑک کی سیدھ میں چلتے ہوئے بائیں سمت پہلا موڑ مڑتے ہی دور سے دکھائی دینے والا خوب صورت کا منچ نہ اتنی دور تھا نہ ہی آڑھی نیڑھی گلیوں میں آباد کہ راستہ بھٹکنے کا اندیشہ ہو۔“ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر باقی کسی بھی تاثر سے گہرا تھا۔

”یہ شخص راہ بھٹک گیا ہے، کیا یہ بات ایسی ہے کہ اس پر اعتبار کر لیا جائے؟“ وہ بے یقین تھی۔

”بہت ممکن ہے کہ یہ شخص بھی آج محبت کے توڑ کا منتر پڑھ، پڑھ کر بیزار ہو گیا ہو اور آج بے بس ہو کر مجھ سے گفتگو کی چاہ میں یہ بہانہ بنا بیٹھا ہو۔ یہ دل اور اس کی خوش فہمیاں اسے اپنے دل میں وارد ہونے والے اس اچانک خیال پر ہنسی آئی۔

”کہاں تو محبت کا جذبہ مظلوم نہ ہو جانے کے لیے“ وظیفہ“ پڑھا جا رہا تھا۔ اور کہاں سیدھی سادی مدد کی درخواست کو بھی محبت کے معنوں میں ڈھالا جا رہا ہے، تم بھی ناں ایثار..... کبھی، کبھی کمال کر جاتی ہو۔“

اس نے اپنا ہی مذاق اڑایا۔

”میں دراصل پچھلے کئی روز سے ریٹ ہاؤس میں رہائش پزیر تھا۔ کل شب میرے ناتا مجھے زبردستی

ہوئے ۲ ما۔ ”بہت بہتر ہوتا اگر جو میں کوئی بھی وجہ بیان کر کے سہولت سے انکار کر دیتی۔“ وہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے راستہ طے کرنے لگی۔

”میرا نام ڈیوڈ ہے۔ امریکی نژاد ہوں۔ یہاں اپنے نانا سے ملنے آیا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور نگاہوں میں ”اور آپ؟“ کا سوال سموئے اس کی سمت دیکھا۔

ایثار نے اس کی مسکراہٹ کا جواب لبوں پر مسکان سجا کے ضرور دیا مگر اس کی آنکھوں میں چلتے تعارف کے سوال کو بہت خوبی سے نظر انداز کر کے نگاہوں کا رخ بدلا۔

”محض تعارف ہی تو چاہ رہا ہے۔ سو کیا قباحٹ ہے جو تم اپنا تعارف نہیں کروا رہی؟“ ڈیوڈ کی ہمراہی میں سرور، دل، دماغ کے اس فیصلے پر تزلزلایا۔

”اس شخص سے روابط کہیں جان کا عذاب نہ بن جائیں۔“ اس نے ضدی دل کو سمجھانے کی بیکاری سعی کی۔ مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ بدستور چلتے لگا۔

”دل کی ایک مانو۔ تو وہ اپنی منواتا چلا جاتا ہے۔“ اس کے قدم سست پڑنے لگے۔ اس کے برابر چلتا شخص جو اس کی خاموشی اور بنجیدگی کے باعث اب خود ہی خاموش تھا۔ ایثار کے سست پڑتے قدموں کے باعث اس سے دو قدم آگے بڑھ گیا اور اس سے اگلے قدم پر ہی وہ موڑ تھا جس کے مڑتے ہی انکل جوزف کا خوب صورت کالج نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔

ڈیوڈ، ایثار سے قبل ہی وہ موڑ مڑ گیا اور اچانک ہی چوٹک کے پلانا۔

ایثار متحیر سی موڑ پر ہی رک گئی۔ اس نے ایثار کی متحیر صورت دیکھی اور لب بھیچے۔

”تو کیا یہ شخص راستہ نہیں بھولا تھا.....؟ تو کیا یہ شخص میرے اندازے کے مطابق واقعی آج جادو کے توڑ میں ناکام ہونے کے بعد یہ حرکت کر بیٹھا ہے.....؟ کیا واقعی؟“ پیشتر اس کے کہ دل خوش گمانیوں کے محل

تغیر کرتا وہ بول اٹھا۔

”یہ سچ ہے کہ میں راہ بھول گیا تھا مگر اس موڑ کو دیکھ کر میری میموری ری فریش ہو گئی۔ سو.....“ اس نے مسکرا کر کاندھے اچکائے۔

”میرے خدا! حد ہوتی ہے خوش فہمی کی بھی۔“ اس کا اپنا دل اس کے کہے میں بالکل نہیں تھا سو وہ جھنجھلائی۔

”بھلا ایک انگریز، مغربی معاشرے کا پروردہ، ایک لڑکی سے بات کرنے کے لیے ڈرامے کیوں کرے گا؟ کبھی تو عقل کو بھی کام میں لے آیا کرو۔ پڑے، پڑے موٹی بھی ہو گئی ہے اور رنگ آلود بھی۔“ اس نے خود اپنے آپ کو ہی لٹاڑا۔ اور تیزی سے مڑ کر واپسی کی راہ لی۔ وہ دل کو مزید بے وقوفیاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

سو اپنے پیچھے ”رکے، سنئے“ کی آواز کون کر بھی ان سنی کر گئی۔

☆☆☆

اس کے اندر کوئی خوف تھا، جو روز کے معمول میں غل ہوا اور چار برسوں سے جھیل کنارے کی سیر کی روٹین، پچھلے دوروز سے ترک ہوئی۔ اور شاید جھیل کی سیر ہمیشہ کے لیے ترک ہو جاتی کیونکہ خوف شدید تھا مگر دل کی من مایاں اس سے زیادہ شدید، سو تیسرے روز اس کے قدم پھر جھیل کی سمت بڑھنے لگے۔

وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مسکرایا تھا۔

ایثار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی مخصوص جگہ کی سمت بڑھنے لگی تو وہ دائیں جانب سے اس کے ہم قدم ہوا۔

”ہیلو!“ اس نے دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائی جو اب ایثار نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”آپ دو دن سے آئیں نہیں، خیریت رہی؟“ ”اس نے میری عدم موجودگی محسوس کی۔“ دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔ ”ہاں کی مگر اس کا مطلب یہ

خدارا۔ خدارا۔ بے اولاد حضرات مایوسی اختیار نہ کریں

کیونکہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا تو سخت گناہ ہے۔ آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے۔ خدا کی رحمت سے آپ کے گھر بھی چاند سا خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ خواتین کے پوشیدہ مسائل ہوں یا مردانہ کمزوری یا مردوں میں جراثیم کا مسئلہ ہو۔ آپ پریشان ہونے کی بجائے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے بے اولادی کورس منگوائیں۔ خدا کے لئے ایک بار ہمارا بے اولادی کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ خدا کی رحمت سے آپ کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

ہرگز نہیں کہ تم اس کے اس عمل کو کوئی لٹے سیدھے معنی پہناؤ۔ اس کی اب اپنے دل سے کم ہی بنتی تھی۔ سو اس نے نظروں کا رخ بائیں جانب موڑا اور اثبات میں گردن ہلادی۔

”اس روز میری راہ بھول جانے کی بات کو آپ جھوٹ جان کر شاید برا مان گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جھوٹ بالکل نہیں تھا مگر پھر بھی معذرت۔“ وہ شرمندہ تھا، ایثار نے اس کی سمت دیکھا اور گویا ہوئی۔

”میں نے آپ کی بات کو کچھ ہی مانا سو برا لگنے کا کیا سوال؟“

”اوہ خدا.....! تیرا شکر ہے۔“ اس نے ایثار کی بات کے جواب میں بے اختیار شکر ادا کیا۔

”آپ کچھ بولیں تو..... ورنہ پچھلے تین روز سے میں اس ایک بات پر خدا کی بہت ناشکری کر چکا ہوں کہ اتنی حسین صورت اور قوت گویائی سے محروم۔“ وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر شرارت سے گویا ہوا۔

”حسین صورت۔“ اسے اپنا سنا لیا، عام سے نقوش والا چہرہ یاد آیا۔ ”کمال ہے یہ شخص بھی۔“ وہ سر جھٹک کے مسکرا دی۔ ڈیوڈ نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور حوصلہ پا کر گویا ہوا۔

”آپ کا نام پتا چل سکتا ہے؟“ وہ جھجک کر اور سر کھچا کر کی گئی فرمائش جسے وہ دو روز قبل نظر انداز کر گئی تھی۔

”ایثار۔“ وہ دھیسے سے گویا ہوئی۔

”ایثار..... گڈ! یعنی قربانی؟“ اس نے نام کا مفہوم پتا کر اس سے تائید چاہی تو ایثار حیران رہ گئی۔

کسی اردو بولنے والے کی انگریزی بہت اچھی ہو تو یہ بات کوئی ایسے اچھے کی نہیں۔ کوئی انگریز اگر اردو بولے تو یہ بھی کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اگر

اردو بولنے والا انگریز شخص اپنا لب و لہجہ بھی اردو بتالے اور مشکل الفاظ کے معنی بھی یہ آسانی بتادے تو سننے والا

کسی قدر حیران ضرور ہوتا ہے سو اسے بھی حیرانی ہوئی۔

”حیران نہ ہوں۔“ وہ اس کی حیران صورت سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”سات سے سولہ سال تک کی عمر کا عرصہ میرا لڑائی میں بیٹا ہے۔ اردو سے واقفیت ہوئی تو مجھے یہ زبان اتنی اچھی لگی کہ واپس ڈالاس چلے جانے کے بعد بھی اس زبان کو مزید سیکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ سواب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔“ اس نے اترانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس بیٹے کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں سیاحوں کی تعداد نسبتاً کم ہونے کے باعث ایثار کی نشست خاص تھی۔ ”نوبرس تک کا عرصہ کراچی میں گزارنے کے باعث میں یہاں کے رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن، مذہب اسلام اور عورتوں کے مقام و مرتبے سے بھی کسی حد تک آگاہ ہوں۔“

وہ ایثار کے ساتھ بیٹے پر کافی فاصلہ چھوڑ کر بیٹھا اور اپنی بات کو ثابت کر دیا۔ ایثار مسکرا دی۔ ”آپ کی مسکراہٹ بہت دلکش ہے۔“ ایثار کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اس کے دل میں جو خیال ابھرا، اس کا اس نے برملا اظہار بھی کر دیا۔ بے اختیار ہی ایثار نے لب بھینچ لیے۔ اس مغربی معاشرے کے پروردہ شخص کے لیے یہاں کے اقدار و روایات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کے مطابق چلنا مشکل نہیں بھی تھا تو اسے یاد رکھنا دشوار ضرور تھا۔ ”اوہ گاڈ.....!“ ایثار کے لب بھینچ لینے پر اسے اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر گویا اپنی کمزور یادداشت کا ماتم کیا۔ ”یا اللہ! یہ شخص اور اس کے انداز.....“ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

”ہمارے یہاں لڑکیاں کسی غیر مرد کے یوں سراپے پر برامتی ہیں۔“ ”میرے علم میں تھا مگر میں بھول گیا۔“ وہ شرمندہ تھا۔ ”سوری۔“ اس نے اپنے کان پکڑ کر اپنی براؤن آنکھیں اس پر جمادیں تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ”یار رب! یہ میرے لیے کوئی راہ فرار چھوڑے گا یا یونہی چاروں جانب سے گھیرا تنگ کرتا جائے گا؟“ وہ گھبرا کر

اٹھ کھڑی ہوئی اور واپسی کے لیے بہانہ تلاش کرنے لگی۔ ”وہ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“ اس نے کلائی موڑ کے وقت دیکھا۔ ”چلوں گی اب۔“ اس کی سمت دیکھے بغیر وہ تیزی سے چلتی چلی گئی۔ ”یہ شخص کسی بھوت کی طرح میرے ذہن سے کیوں چٹ گیا ہے؟“ اس نے بے بسی سے سوچا۔ ایسا کیا کروں کہ اس کا خیال دل و دماغ سے نکل جائے۔“ گھر کی سمت بڑھتے ہوئے وہ لا چاری سے سوچنے لگی۔ ”چند روز یہاں کا رخ نہ کرو، وہ مہمان ہی ہے۔ چلا جائے گا۔“ دماغ نے راہ بجھائی۔

”بہت خوب.....! ایسا کرنے سے میں تمہیں چین لینے دوں گا کیا؟“ دل آج کل اس کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ”کوئی بات نہیں، میں بے چینی سے رہ لوں گی۔“ اس نے پیچاری سے دل کو جواب دیا۔ ”اس سے کیا ہوگا؟ دل و دماغ سے اس کا قبضہ ہٹانے کے لیے یہ طریقہ علاج کامیاب نہیں ہوگا۔“ ”کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں،“ وہ دل پر غلبہ پانے کے چکر میں تھی۔

”یہ کوشش بھی تم دو روز قبل کر کے دیکھ چکی ہو۔“ دل غالب ہونے کے موڑ میں بالکل نہیں تھا۔ ہم نے اے دل! تجھے سینے سے لگایا ہوا ہے اور تو ہے کہ میری جان کو آیا ہوا ہے انہی سوچوں میں الجھتے ہوئے وہ مخصوص راہ پر چلتی چلی گئی۔ دھیان ارد گرد کے بجائے کہیں اور ہی تھا۔ ”شکر ہے تمہیں گھر کا راستہ مل گیا۔ میں بس ابھی آدھے کھٹے میں نکلنے ہی والا تھا۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پر بیٹھے بھتیجی نے اسے کچھ شکر کا کلمہ پڑھ بھتیجی کی آواز پر اس نے بڑی دقتوں سے منتشر دھیان کو سمیٹنا شروع کر لیا۔ ”کب آئے؟“ وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔“ بھتیجی نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کا نوٹس لیا۔

بابا کے کاروبار میں بھتیجی کے والد برابر کے حصے دار تھے۔ دو برس قبل اسلام آباد میں ان کی کمپنی کی برانچ

”کراچی کی خبریں تم نے سن لیں، اب تم مجھے یہاں کی خبریں سناؤ۔“ اس کے ذہن میں ایثار کا کھویا، کھویا، الجھا، الجھا سا انداز پھر نمودار ہوا۔

”یہاں کی خبروں میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں جو گوش گزار کیا جائے۔“

”لیکن آج یقیناً کچھ ایسا خاص ہوا ہے جس نے تمہارے ذہن پر اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔“ مجتبیٰ کے یقین سے کہنے پر اس کا دل یک بارگی دھڑکا۔

اس سے حقیقت چھپانا دشوار تھا اور سچائی بتا دینا اس سے زیادہ دشوار.....

”نہیں تو ایسا کچھ خاص تو نہیں ہوا۔“ اس ایک لمحے اس پر مشکف ہوا کہ وہ یہ حقیقت اسے کبھی نہیں بتا پائے گی۔ سو گناہیں چرانے لگی۔

مجتبیٰ نے شدت سے اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایثار کوئی بات اس سے پوشیدہ رکھنا چاہ رہی تھی۔

”اوکے..... شاید میرا وہم ہی ہو۔“ وہ ایثار پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ اسے اس کی بات پر اعتبار نہیں ہو سکا کہ اس کے جھوٹ کو قبول کر لیا۔

☆☆☆

”میں جب سات برس کا تھا تب میری ماں نے مجھے میرے نانا، نانی کے پاس کراچی بھیج دیا کیونکہ تب وہ بیمار رہتی تھیں۔“ اس نے اپنے کاغز اتار کر اپنے اور ایثار کے درمیان رکھے۔

دل و دماغ کے درمیان جاری جنگ میں جیت خدٰی دل کی ہوئی تھی۔ اب یہ اس کی ڈیوڈ سے کون سی ویں ملاقات تھی اسے یاد نہیں تھا۔

”کراچی میں میرے دن اچھے گزرے۔ اپنے نانا سے میری خوب دوستی ہو گئی۔ آج بھی میرے بہترین دوست میرے نانا ہی ہیں۔“ اس نے دور جمیل میں نگر پھینکا۔

”جب میں سولہ سال کا تھا تب نانی کے انتقال کے بعد نانا ادا اس رہنے لگے تھے۔ جب میں نے حد درجہ

کھولی گئی تھی۔ تب سے وہ جب بھی کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تو کئی گھنٹوں کا سفر طے کر کے راولا کوٹ بھی ضرور آتا۔ اکثر وہ اتنی جگہ میں ہوتا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہی واپس جانے کے لیے تیار ہوتا۔

”کراچی میں سب ٹھیک ہیں؟“ ہمیشہ کی طرح آج بھی مجتبیٰ سے ملاقات کے بعد اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

”ہاں.....“

”اور می، بابا؟“ مجتبیٰ اس کے آدھے سوال سے پورے سوال تک پہنچا۔

اگرچہ وہ اس کا جواب جانتی تھی مگر اس سوال سے وابستہ امید سے وہ کبھی جھگڑا نہیں کرتی تھی۔

”ان کے تعلقات ہنوز ویسے ہی ہیں۔ بہتری کے آثار دور تک دکھائی نہیں دیتے۔“ مجتبیٰ یہ جاننے کے باوجود کہ ایسے حقائق اس کی افسردگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں، اس سے کوئی بھی بات چھپا نہیں پاتا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

”زارا نے اپنے انٹرنیٹ ڈیزائننگ شوروم کھولنے کے ارادے پر اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر عمل کر ڈالا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی افتتاحی تقریب تھی۔“ مجتبیٰ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے نسبتاً اچھی خبر سنائی۔

”یعنی اس بار اچھی خبر بھی لائے ہوساتھ۔“ وہ مسکرائی۔

”ناموں نے تمہارے لیے یہ کتابیں بھجوائی ہیں۔“ تھوڑی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے سائڈ ٹیبل سے چند کتابیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔

اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ بابا اس پر ایسی کوئی عنایت نہیں کر سکتے، اس نے مجتبیٰ کی بات کو بچ مان لینے کا بھرپور تاثر دیا تھا۔

اگر کوئی شخص شخص آپ کی خوشی کے لیے آپ سے جھوٹ بولے تو پھر آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اس شخص کی خوشی کے لیے حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر

مجتبیٰ تو وہ تھا جو اس کے تاثرات سے اس کے دل کی بات تک پہنچتا تھا۔ سو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

بورہ، رہے وفا کی حد کردی اور نانا کو ان کے حال پر چھوڑ کر وہاپس چلا گیا۔“ وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

”ڈالاس پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میری ماں کسی مسلمان شخص سے شادی کر کے خود بھی مسلمان ہو گئی ہے۔“ اپنی ماں کی دوسری شادی کی بات وہ بڑے آرام سے، عام سے لہجے میں کر رہا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

”میری ماں کی دوسری شادی میرے لیے اتنی حیران کن نہیں تھی، وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے مگر میری ماں کے مذہب بدل دینے نے مجھے حیران کیا تھا۔ میری ماں اچھی خاصی مذہبی عورت تھی، اس نے کیسے اتنی آسانی سے اپنا مذہب چھوڑ دیا؟ یہ بات اکثر مجھے حیران کرتی۔“

”آپ کی ماں کو اس مسلمان شخص سے محبت ہو گئی ہوگی اور محبت ایسا کروادیتی ہے۔“ کچھ جاننے کی جستجو میں وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”محبت.....؟“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”ایسی کسی محبت کو میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھٹکا۔
”محبت ہر مذہبی شخص کو اپنے مذہب سے بھی تو ہوتی ہے۔ مگر یہ کیسی محبت ہے جو آپ کو ایسے محبوب مذہب سے موثر دیتی ہے، جس سے آپ کا تعلق اپنی پیدائش سے ہوتا ہے۔“

”یارب! کیا ضروری تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہوتی جس سے ملن کی امید ایک فی صد بھی نہیں۔“
ڈیوڈ کے خیالات جان کر وہ بے اختیار ہی خدا سے شکوہ کر گئی۔

”لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی بھی تو نہیں جنہوں نے اپنا مذہب بدل دیا ہے۔ صرف ایک آپ کی والدہ تو نہیں۔“

”لیکن میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو بہت مذہبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے مذہب سے بھی

محبت ہوتی ہے۔ مذہب کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دینے والوں کے لیے تو یہ عمل شاید کچھ ایسا مشکل نہیں ہو جبکہ میری ماں تو مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔“
اس نے اپنی پچھلی بات کی وضاحت کی۔

”پھر تو آپ خود بھی کافی مذہبی ہوں گے؟“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”میں زیادہ تر اپنے نانا کے ساتھ رہا ہوں تو مذہب سے میں بھی ان کی طرح کوسوں دور ہوں۔“ اس کے جواب نے ایثار کے دل میں کسی قدر اطمینان اتارا تو امید بھی آس پاس ہی منڈلانے لگی۔

”یہ کہتا ہے کہ میں مذہب سے دور ہوں اور مذہب سے دور رہنے والوں کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سو یہ ناممکن تو نہیں کہ یہ اپنا مذہب چھوڑ دے۔“ آس پاس منڈلانے والی امید نے سرگوشی کی۔

”یعنی مذہب کی تبدیلی آپ کے لیے کبھی دشوار ثابت نہیں ہوگی؟“ اس نے نگاہیں چراتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بھی امید افزا ہو۔

”نہیں، میرے لیے ایسا عمل دشوار نہیں ہوگا۔“
دل ایسا ہی کچھ سننے کا متنی تھا۔
مگر..... یہ دل اور اس کی تمنائیں۔

”مگر میم! میں کیوں بلاوجہ ہی اپنا مذہب بدلے لگاؤ؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”بلاوجہ نہیں۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔ ”ایسا ہونا ناممکن تو نہیں کہ کوئی آپ پر اپنا دل ہار دے۔“
”نہیں.....! ایسا بالکل نہیں ہو سکتا۔“ اسے گواہ یقین تھا۔

”ایسا ہو چکا ہے۔“ رواروی میں اس کے لبوں سے پھسلا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔
”آف خدا! یہ زباں سے ادا ہو جانے والے

الفاظ واپس کیوں نہیں ہوتے۔“ اس نے دل میں خود کو ملامت کی۔

”میں کہنا دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ فرض کریں ایسا ہو چکا ہے تو.....“

”چلو فرض کر لیا کہ ایسا ہو چکا ہے۔“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تب بھی مذہب تو وہ بدلے ناں جس کے ساتھ محبت کا حادثہ ہو گیا ہو۔“ وہ ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

ایثار کا دل یکبارگی دھڑک کر رکا۔ اس لمحے اس پر کھلا کہ وہ اپنے مذہب سے محبت اس شخص سے زیادہ کرتی ہے۔

”تو پھر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ محبت کا حادثہ آپ کے ساتھ پیش آ گیا ہے۔“ اسے جو جواب درکار تھا وہ پچھلے سوال سے منسلک تھا تو اس نے سوال بدل ڈالا۔ اس کے خوابوں کی زندگی کا انحصار ڈیوڈ کے جواب پر تھا سو وہ ہمتن گوش ہوئی۔

اس نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”شاید مذہب کو اہمیت دوں۔“ وہ یقین و یقینی کی کیفیت کے درمیان بولا۔

ایثار کے دل میں اداسی بڑے اطمینان سے لیے قیام کے لیے پاؤں پسارے بیٹھ گئی۔

”شاید کیوں.....؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟“ دل میں ایک موہوم سی امید اب بھی باقی تھی۔

”نہیں، مجھے یقین ہے کہ میں شاید ایسا نہیں کر سکوں۔“ الجھتے ہوئے وہ پھر ”شاید“ کہہ گیا۔

موہوم سی شمشاد! امید ایک دم بجھ گئی۔ دل میں ملال اتر آیا اور آنکھوں میں نمکین پانی۔

”چلیں.....؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخ موڑے جانے کے لیے بالکل تیار۔

آنکھوں کے کنارے ٹھہرے اشکوں کو اس نے بڑی دقت سے حد پار کرنے سے روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو قدم اٹھانے کے بعد وہ تیسرے قدم پر ٹھک کر

مک گئی۔ نگاہ دور سے آتے بھتی پر پڑ گئی تھی اور دل.....

بلے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ یہیں متوجہ تھا۔

اس کے اس طرح ٹھہر جانے پر ڈیوڈ بھی رکا۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے بھتی عین اس کے سامنے آکا۔ چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات لیے وہ اسے کچھ برہم بھی لگی۔ دل میں موجود چور کے باعث ایثار کو اس سے نگاہیں ملانا دشوار ہوا۔ ورنہ بظاہر ایسی کوئی بات تو نہیں تھی جو یوں نگاہیں چرائی جائیں۔

”السلام علیکم..... بھتیجی کیسے ہو؟“ بالآخر وہ ہی بولی۔

بھتیجی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی کھوجتی سنجیدہ نگاہوں سے ڈیوڈ کو گھورے گیا۔ ایثار کو اس کے انداز بڑے عجیب لگے۔

”یہ ڈیوڈ ہیں۔“ ایثار نے پلٹ کر ڈیوڈ کی سمت دیکھ کر کہا۔ ”ڈالا اس سے آئے ہوئے ہمارے مہمان۔“ بھتیجی ساٹ چہرہ لیے کھڑا رہا۔ ایثار کو اس کے انداز ابھمن میں جھٹکا کرنے لگے۔

”اور مسٹر ڈیوڈ..... یہ میرے کزن ہیں بھتیجی۔“ ڈیوڈ نے مسکرا کر آگے بڑھ کر خوش دلی سے بھتیجی کی سمت ہاتھ بڑھایا۔ جسے بغیر گرم جوشی بلکہ کسی قدر سرد مہری سے تھا گیا۔

”میں پچھلے بیس منٹ سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہاں نہیں آتا تو تم سے ملے بغیر ہی جانا پڑتا۔ اور ایسا میں چاہتا نہیں تھا سو یہاں آ گیا۔“ ڈیوڈ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ایثار کی جانب مڑا۔

”اوکے..... مس ایثار.....! میں چلا..... آپ سے ملاقات اب کل ہوگی..... اوکے بائے۔“ اس نے گاگڑ آنکھوں پر جمائے اور آگے بڑھ گیا۔

”کیوں ہوگی ہماری ملاقات کل؟ ان بے مقصد ملاقاتوں سے بھلا کیا فائدہ حاصل ہوگا ہمیں؟“ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے، ڈیوڈ کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچنے لگی۔

”کہتے ہیں محبت ملن کی محتاج نہیں، وہ خدا جانے محبت کا کون سا درجہ ہوتا ہے؟ میں تو یار اب اس سوچ سے ہی ہلاک ہو جاتی ہوں۔“ اس نے لب نہینچنے۔

بھتیجی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پیچھے مڑ

کردیکھا اور ناگواری نگاہ ڈال کر اس کے اور ڈیوڈ کے درمیان آیا۔

ایثار نے خود کو کمپوز کیا اور مسکرائی۔

”تم میں بڑا اسٹیمنا ہے مجبئی! خدا جانے محض تمس، پینتیس منٹ کی ملاقات کے لیے تم اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیتے ہو؟“

”تم بھی تو روز، بلا تاخیر ہی یہاں آنا فرض کی طرح نبھاتی ہو، تم میں بھی تو بڑا اسٹیمنا ہے۔“ اس کے فقرے میں طنز اور جی کی آمیزش بڑی واضح تھی۔

”میری بات اور ہے..... میں تو.....“ ایثار نے اس کے طنز اور جی کو اپنا وہیم سمجھ کر نظر انداز کیا اور کچھ کہنا چاہا..... مگر مجبئی نے اسے فقرہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

”بات اور نہیں ہے ایثار.....! بات ایک ہی ہے۔ میرے یوں پندرہ، بیس منٹ کی ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر طے کرنے میں بھی اور تمہارے.....“ اس نے نچلاب دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”یہ مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہا ہے؟“ اس کا رخ لہجہ ایثار کو رخ پہنچا رہا تھا۔

”میرے علم میں نہیں تھا کہ تمہیں میری آمد اتنی ناگوار گزرے گی۔“ وہی تلخ و ترش لب ولہجہ.....

”مجھے تمہاری آمد کبھی بری نہیں لگی مجبئی! تم بات کو غلط معنوں میں کیوں لے رہے ہو؟“ اسے مجبئی کے ایسے رویے پر دکھ بھی تھا اور حیرت بھی۔

”اور یہ شخص کہتا ہے کہ میں تمہیں خود سے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تمہارے چہرے کے رنگوں سے تمہارے دل کی بات آرام سے پالیتا ہوں پھر آج اسے دشواری کیوں پیش آ رہی ہے؟“ وہ دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے سوچنے لگی۔

دشواری تو درحقیقت اسے ہی پیش آ رہی تھی مجبئی کے اس نا زیار رویے کو سمجھنے کے لیے مگر نہ مجبئی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے چہرے سے اس کے دل کا راز پا گیا تھا..... اور نتیجتاً رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

”مگر آج تمہیں میری آمد بری لگی ہے اور اس کی وجہ وہ انگریز کا بچہ ہے، جس سے تمہاری آج بھی ملاقات ادھوری رہ گئی۔“ طیش میں اس کے تندر لب لہجے سے جن الفاظ کی ادائیگی ہوئی، اس نے ایثار کے لہو کی گردش تیز کر دی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ غصے سے بھی اور اپنی ہنک کے احساس سے بھی۔

”یوں آپے سے باہر تو وہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوا بھی تھا تو وہ ایسی زبان.....؟“ وہ متحیر تھی اس کے لب ولہجے پر.....

”مجبئی! غصے کے سبب تم اپنی عقل کھو رہے ہو، تمہارے الفاظ مجھے دکھ پہنچا رہے ہیں۔“ اس نے مجبئی کو اس کے بدترین رویے کا احساس دلانا چاہا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔“ اس نے نہایت درشتی سے کہا۔

”مجبئی!“ دکھ اور صدمے سے اس کی زبان..... بے جان ہوئی اور حرکت کرنے سے معذور ٹھہری۔

مجبئی پلٹا اور تیز قدموں سے واپسی کی راہوں پر چل پڑا۔ آنکھیں جو کب سے برسنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں ایک دم چمک پڑیں۔ ارد گرد کا منظر دھندلا گیا اور دکھ کی کہر سے اندر کی دنیا بھی۔

☆☆☆

”رات، تمہارے باپ کا فون آیا تھا۔“ دادو نے صوفے پر اس کے برابر نشست سنبھالی اور ہاتھ میں پکڑے سیب کی ایک قاش کاٹ کر اس کی سمت بڑھائی۔

”حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ تمہارے باپ کو میرا نمبر یاد رہا۔“ دادو کو بھی اس کی طرح، اس کے باپ سے دوسری کئی شکایتوں کے ساتھ، یہ شکوہ بھی تھا کہ وہ شاذ و نادر ہی فون کیا کرتے تھے۔

”کہہ رہا تھا، مریم نے مجبئی کے لیے تمہیں مانگا ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں..... تمہاری مرضی پوچھ کے بتا دوں۔“ دادو نے بلا وجہ کی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھے سہاؤ مطلب کی بات کی۔ وہ بے چین

نہیں آتے۔“ ایک نہایت ضدی اور سرکش آنسو بڑے ضبط کے باوجود پلکوں پر آن بھرا۔

”اور اگر زندگی میں آج بھی جاتے ہیں تو پھر دل میں یہ خواہش ہی کیوں پیدا ہوتی ہے کہ یہ ہماری زندگی سے بھی نہیں جائیں۔“ عجب بے بسی ہی بے بسی تھی۔

”یا الہی آپ کے اختیارات میں تو سب کچھ ہے پھر آپ نے اپنے اختیارات کو میرے خلاف ہی کیوں استعمال کیا؟“ اس حوالے سے اپنے خدا سے شکوے شکایات کا سلسلہ بھی اب پرانا ہو چکا تھا۔

زندگی بھر بھی اگر ہم خدا کی نعمتوں، احسانوں اور عنایتوں کے سائے تلے رہیں بھی تو شکر کا کلمہ زباں پر شاذ ہی آتا ہے اور اگر دکھ کی مشکل کی یا تکلیف کی پر چھائی بھی دیکھ لیں تو شکوے شکایات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی تو انسان کا ناشکرا پن ہے اور انسان کی ایسی کوتاہیوں سے صرف نظر صرف وہی کر سکتا ہے جو ماں سے بڑھ کر چاہے۔ سوچ ہے کہ خدا اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے بڑھ کر چاہتا ہے۔

وہ مخصوص راہوں پر چلتی ہوئی، مخصوص جگہ پر پہنچی تو ٹھک کر رک گئی۔ وہ سانس ہی تو بیٹھا تھا۔ جس سے اب کبھی نہیں ملنے کا اس نے گیارہ روز پہلے قصد کیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں اس سمت نہیں آئی تھی مگر یہ خیال دل میں ضرور موجود تھا، یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں اس کی موجودگی کا امکان بھی ہو۔ سو وہ اس سمت آگئی اور اگر وہ اسے دیکھ نہ لیتا تو وہ خاموشی سے پلٹ بھی جاتی۔ مگر اس نے اسے دیکھ لیا تھا سو وہ خاموشی سے بیٹھ بیٹھ گئی۔

”ٹھیک گاؤ! آپ نظر تو آئیں۔ آج اگر آپ نہ آتیں تو میں نے پکارا وہ کر لیا تھا آپ کی طرف آنے کا۔“ اس نے بڑی بے ساختگی سے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

وہ خاموش ہی رہی۔ دل کچھ بھی کہنے سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”ویسے خیریت تو تھی ناں؟“

ہوا تھی۔ ہاتھ میں پکڑی سیب کی قاش اس نے سانسے لہلہ پر پلٹ میں رکھ دی۔

”نہ جانے کیوں؟ دل میں ہلتی وہ شدید خواہش، جس کی تکمیل کا دور تک کوئی امکان ہوتا ہے نہ اشارہ، ایسی خواہش کے پورا ہونے کے لیے لاشعور کی معجزے کا ہمہ وقت منتظر کیوں رہتا ہے؟“

”جتنی دہنی ہم آہنگی تم دونوں کے درمیان ہے اس کے بعد لگتا تو نہیں کہ تمہاری مرضی، ہماری مرضی سے الگ ہوگی۔ مگر پھر بھی میرا خیال اگر غلط ہے تو تبادلو۔“

دادو کی بات پر اسے چند روز قبل کے مجتبیٰ کے وہ دل دکھانے والے الفاظ پھر سے تنگ کرنے لگے جسے ملانا بڑی دقتوں سے ممکن ہوا تھا۔ غصے کا احساس ایک بار پھر تمام احساسات پر حاوی ہوا۔

”اسے احساس کیوں نہیں ہوا اب تک کہ اس نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔“ مجتبیٰ کی طرف سے حضرت کی امید بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

”پھر کیا جواب ہے تمہارا؟“ اس کی خاموشی پر دادو کو پھر پوچھنا پڑا۔

”دادو پلیز.....!“ وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ایسی کسی بات کا جواب میں فی الحال نہیں دے سکتی۔“ بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے باہر کی سمت قدم بڑھائے۔

دادو نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسے بڑے پن کا مظاہرہ تو اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

”میں کچھ دیر میں آئی دادو۔“ اس نے دووازے کے پاس رک کر انہیں اطلاع دی اور باہر چلی گئی۔

”قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں، کبھی نہ سمجھ میں آنے والے۔“ اس نے بے بسی سے لب کھلتے ہوئے او میں آئے پھر کوہلی کی شوکر لگائی۔

”آخر ایسے لوگ ہماری زندگی میں آتے ہی یوں ہیں جو قسمت میں کسی حساب سے بھی

وقت لگا۔

”سوری.....“ ایثار نے بیچارگی سے لب کاٹے۔
 ”در اصل کبھی کبھار مجھے دورہ پڑتا ہے، بے سبب ہی،
 بلا وجہ ہی غصہ کرنے کا۔“ وہ دانستہ مسکرائی تو وہ قہقہہ لگا
 کر ہنس دیا۔

”آپ کی بات پر مجھے اپنی زندگی کی پہلی محبت
 یاد آگئی۔“ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھی۔
 ”پہلی محبت... یعنی کئی محبتیں منسا چکا ہے۔“ اس
 نے سوچا مگر خاموش رہی تو وہ از خود کہنے لگا۔

”مجھے زندگی میں پہلی محبت بیس برس کی عمر میں
 ڈور تھی سے ہوئی تھی۔ تعلیمی اخراجات پورے کر لے
 کے لیے میں جس شاہنک سینٹر میں کام کرتا تھا وہاں وہ
 سیکرٹری لگ گئی تھی۔“ لیوں پر مسکراہٹ سجائے وہ جیسے ماضی
 کے کسی واقعے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”اچھی لڑکی تھی۔ سنہری بالوں اور گوری رنگھ
 والی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح
 مبتلا ہو گیا ہوں۔ اسی قسم کے احساسات وہ بھی میرے
 متعلق رکھتی تھی۔ اسے بھی اکثر بلا وجہ ہی غصہ ہونے کا
 دورہ پڑتا تھا اور میری کبھی یہ عادت نہیں رہی کہ میں کسی
 کی اونچی آواز آسانی سے برداشت کر لوں۔ سو ایک
 روز وہ غصے سے مجھ پر چلائی تو میں بالکل برداشت نہیں
 کر سکا اور گھما کے ایک ہاتھ جڑ دیا۔“ بات کی ابتدا سے
 لیوں پر بھی محظوظ سی مسکراہٹ جو درمیان میں دھیمی پڑی
 تھی، وہ دوبارہ سے ہونٹوں پر چھلنے لگی۔

ایثار کو افسوس ہونے لگا کہ وہ ایک کمزور لڑکی پہ
 ہاتھ اٹھا کے اب تک محظوظ ہو رہا تھا۔

”نتیجتاً وہ غصے سے پاگل ہو گئی اور پاس پڑا ہوا
 ایئر ٹریٹر اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ میری نگاہوں
 کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور جب تک تکلیف کچھ کم
 ہوئی اور آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تب تک وہ
 فرار ہو چکی تھی اور کچھ ایسی فرار ہوئی کہ آج تک نہیں مل
 سکی۔“ وہ اب ہنس رہا تھا۔

”میرے خدا.....“ وہ اس کمزور سی لڑکی کی ایسی

”ہاں.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”کراچی گئی ہوئی تھی۔“ اسے اندازہ تھا کہ اگلا سوال
 کیا ہوگا۔ سو اس نے بغیر پوچھے ہی ذہن میں آنے
 والے اس بروقت جواب کو گوش گزار کیا۔

”اچھا.....“ وہ ہلکے سے ہنسا۔
 ”میں تو پچھلے کئی روز سے بڑی مستقل مزاجی
 سے دن میں کئی بار یہاں کے چکر لگاتا رہا ہوں، آپ
 آگاہ کر کے بھی تو نہیں گئی تھیں ناں..... اپنے کراچی
 جانے کے متعلق.....“ اس نے شکوہ کیا۔

”کیوں آگاہ کرتی؟“ طبیعت کا چڑچڑاپن
 بڑھا اور مزید بڑھ کر کمال کو پہنچا۔

”میں یہاں آپ سے ملنے کے ارادے سے تو
 کبھی نہیں آئی۔“ اسے اس شخص پر شدید غصہ آیا جس
 کے باعث اس کا جینا از حد دشوار ہوا تھا۔

”پچھلے چار برسوں سے یہاں آتا میرا معمول
 ہے اور آپ سے ملاقات اسی معمول کے سبب ہوئی
 رہی ہے۔“ آنکھوں میں نمی اترنے کا احساس ہوا تو
 اس نے رخ موڑ لیا۔

اس کے یوں معمولی بات پر اتنا برہم ہونے پر
 ڈیوڈ نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”اوکے جو کچھ آپ نے کہا سو فی صد
 درست..... میں اس سے انکاری نہیں مگر.....“ اس نے
 ایثار کا مزاج ٹھنڈا کرنے کی ایک کوشش کی۔

”مگر جتنا آپ میری بات سے ناراض
 ہوئیں ناں، بات اس قدر ناراضی والی تھی نہیں۔“ اس
 خدشے کے تحت کہ وہ مزید مشتعل نہ ہو جائے، ڈیوڈ نے
 جھجکتے ہوئے سر کھجاتے ہوئے اپنا فقرہ ملل کیا۔

”پھر بھی بہت معذرت.....“ ایثار نے رخ موڑ
 کر اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور نام نہ نہ ہوئی۔

خواب جتنے مرضی اونچے دیکھ لو مگر قسمت یہ بس
 نہیں چلتا۔ اس کے مزاج کی کئی اور چڑچڑاپن اسی۔
 بے بسی کے باعث تھا۔ قسمت کی بے رحمی کا احساس اس
 وقت شدت سے ہو رہا تھا سو اسے خود کو کمزور کرنے میں

اور آوری پر متحیر ہوئی۔

”بڑے ہی پیار و محبت سے رہے۔“

”ایک ساتھ، ایک ہی فلیٹ میں؟“ ایثار ایک دم چوکی۔ ”خدا جانے یہ شادی سے قبل کا ذکر کر رہا ہے یا بعد کا؟“

”مگر بعد میں، میں پور ہونے لگا۔ اس کی قربت سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی، وہ میرے قریب بھی آتی تو مجھ پر بیزاری طاری ہونے لگتی۔“

اس کی گفتگو سے ایثار کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”اس لیے میں نے جولیا سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ مجھے لگنے لگا تھا کہ میری دوسری محبت مدت بھی ختم ہو گئی ہے۔“ وہی مسکراتا لہجہ.....

”یعنی شادی سے پہلے ہی.....“ اسے شاک لگا۔ ”یار! یہ مجھے کس شخص سے محبت ہو گئی ہے؟“ اسے بے انتہا افسوس ہوا۔

وہ جانتی تھی وہ جس ملک کا شہری ہے وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے مگر یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا کہ وہ خود بھی ایسی برائیوں میں ملوث ہو سکتا ہے۔

”اور اس محبت کو بھی آپ میری آخری محبت مت سمجھیے گا۔“ وہ اس کے خیالات سے بے خبر کہے گیا۔

”آخر میرا دل اس کی طرف مائل ہی کیوں ہوا؟“ کاش یہ میرے لیے اک عام سا شخص ہوتا، اتنا خاص نہیں ہوتا تو میرا دل یوں دکھی تو نہیں ہوتا..... ان انکشافات پر۔“ وہ مضطرب بھی ہوئی اور اس کی بات از سر نو سوچ کر مشتعل بھی۔

”دوسری کے بعد بھی کئی محبتیں ہوئیں..... مگر اب پتا چلتا ہے کہ جب واقعی محبت ہوتی ہے تو ہم اس سے اکتاتے ہیں، نہ بیزار ہوتے ہیں بلکہ مزاج کے... برخلاف اونچی آواز بھی برداشت کر لیتے ہیں۔“

”اور اب یہ“ واقعی محبت“ اللہ جانے کیسی محبت ہوگی اور کیا کچھ سننا پڑے گا۔“ غصہ جوتھا نہیں تھا مزید بڑھا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ اس کے یوں اچانک اٹھ جانے پر ڈیوڈ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے گویا کرنٹ

”شروع میں تو میں نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن سر پر موجود زخم تکلیف دیتا تھا۔ پھر رفتہ، رفتہ اہولتا گیا۔ اب جب کہی اس سارے معاملے کو سوچتا ہوں تو نہ جانے کیوں غصے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔“

”اس کی بات کی صداقت کا اندازہ لیوں سے جدا نہ ہونے والی مسکراہٹ سے بخوبی ہو رہا تھا۔

”کبھی، کبھی تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ آخر کی کہاں؟ اس خوب صورتی سے غائب تو صرف جادوگر ہی ہوا کرتے ہیں۔ کبھی وہ سچ جادوگر تو نہیں تھی؟“ اس نے شرارت سے استفسار کیا۔

ایثار نے کا ندھے اچکائے تو وہ ہنس دیا۔

”یہ پہلی محبت، آخری بھی تھی یا.....؟“ وہی قسمت لے بے بسی جو اس وقت لفظوں میں طنز بن کر اترتی۔

”خدا نہ کرے، آخری کیوں ہونے لگی؟“ اس نے ہلے کا ڈراما کرتے ہوئے مصنوعی خشکی سے ایثار کو گھورا۔

”ڈور تھی کی جادوگری کا تو علم نہیں مگر اتنا ضرور فہم ہے کہ تمہارا جادو مجھ پر کچھ یوں اثر انداز ہوا ہے کہ توڑ کا کوئی عمل بھی اثر انگیز ثابت نہیں ہو رہا۔“ ایثار اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

”دوسری محبت کا آغاز، پہلی محبت کے اختتام کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔“ وہ اپنا دوسرا کارنامہ ان کرنے لگا۔

”خدا جانے یہ محبت کسے سمجھتا ہے۔ یہاں تو ایک بات ہی جان کو آگئی ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”دوسری بار بھی مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں جولیا سے شدید محبت کرنے لگا ہوں جب جولیا کو بھی یہ وہم لگنے لگا تو ہم دونوں ہی شادی کرنے کے لیے سنجیدہ

”مگے۔“ ہر بات پر مسکراتے ہوئے وہ ایثار کو آج اسے ہی خوشگوار موڈ میں لگے رہا تھا جبکہ خود اس کا دل اسی مضطرب اور بے کل تھا۔

”ہم دونوں ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہنے شروع، شروع میں تو ہم اچھے دوستوں کی طرح

لگا۔ ایک دم جلال میں اس نے ڈیوڈ کا ہاتھ پوری شدت سے جھٹکا۔

”آتم سوری.....“ اسے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہو گیا۔ مگر ایثار نے اس کی تادم صورت پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا..... اور نہایت ناگواری سے رخ موڑ کر تیز قدموں سے اس سے دور ہوتی گئی۔

”بہبود، ہٹھیا انسان۔“ اس کا خون کھولنے لگا۔ ”بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ یہ کس کردار کا ہوگا۔“ اس نے لب کاٹے۔

”لیکن مجھے اگر اندازہ بھی ہوتا تو میں کیا کر لیتی؟“ دل پھر اس کے آگے تن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا۔ اس شخص سے نفرت کرنا کبھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ بیچارگی سے سوچے گی۔

”شکر ہے، شہزادی صاحبہ آج جلدی لوٹ آئیں۔“ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی بھتیجی جو دادو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، ٹھٹھک کے رکا اور مسکرا کے گویا ہوا۔

”اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے..... اپنی جاگیر یا کوئی غلام جو یوں طنز کر رہا ہے۔“ غصہ، بے بسی..... بے کلی اور نارسانی کے طے نیچلے احساسات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو نا کارہ کیا۔

وہ آج اپنے پچھلے رویے پر معذرت کرنے کے موڈ میں تھا سو طنز یہ گفتگو کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اب تو تم سے ملنے کے لیے ایکٹوٹ لیتا پڑے گا۔“

”چھٹی بار بھی میں بے سبب ہی اس کے عتاب کا نشانہ بنی تھی۔“ غصہ تمام احساسات پہ غالب آیا اور نقطہ عروج پر پہنچا سو وہ کہیں تو لکنا تھا۔ اس لیے بھتیجی پر ہی لٹکا اور اس نے بھتیجی کو طمانچہ جزدیا۔

بھتیجی ہٹکا یا اس کی صورت نکمے گیا اور وہ تیزی سے اس کی سائڈ سے ٹکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

”ایثار.....! آخر ایسی کون سی وجہ ہے جو تم مجھے سے شادی کے لیے رضا مند ہی نہیں ہو رہی؟“ دادو آج اچھی خاصی جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

”میں نے انکار تو نہیں کیا دادو۔“
”تو ہامی بھی تو نہیں بھری..... کوئی فیصلہ کر لو..... چاہے ہم سب کو مایوس کر دینے والا ہی۔“
دادو کا بیٹا نہ صبر لبریز ہوا تھا اور اب ان کی گفتگو سے ناراضی جھلکتی تھی۔

”ہامی کیسے بھریں دادو؟ بھتیجی میرے دل میں کسی اور کے بسیرے کا سراغ پا گیا ہے۔ اب وہ بہت بدل گیا ہے۔“

”دادو.....“ اس کا دل چاہا وہ یہ سب دادو سے شیر کر کے اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لے..... مگر اسے اپنے اس خیال پر عمل کرنا دشوار لگا سو وہ خاموش رہی۔

”اسے اب میری پروا نہیں رہی..... ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو چلا ہے مگر اسے بالکل احساس ہی نہیں ہے کہ اس کے الفاظ نے مجھے اتنا دکھی کیا تھا کہ بلا ارادہ ہی میرا ہاتھ اٹھ گیا۔“ اسے اپنی خطا کا احساس نہیں تھا۔ اس نے سارا تصور بھتیجی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

”جو کچھ دل چاہتا ہے وہ تو ممکن ہے ہی نہیں تو پھر میں کوئی ایسا فیصلہ کیوں کروں جو سب کو مایوس کر دے۔ ہامی تو بھرنی ہی ہے اس رشتے پر مگر بس ایک معصوم سی خواہش تھی کہ وہ اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے ناروا رویے پر شرمندگی کا اظہار کرے جو اگر اس کے لیے مشکل ہے تو یونہی سہی۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی معصوم خواہش سے دستبردار ہوئی۔

”دادو.....“ دادو جو اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر جانے لگی تھیں اس کی پکار پر رکیں۔

”بابا تک میری بات پہنچا دیں کہ میری مرضی ان کی مرضی سے مختلف نہیں..... وہ میرے لیے جو مناسب سمجھیں اس پر عمل کر ڈالیں۔“ بات کے اختتام تک لی لہجے میں کل سی گئی۔ نہ جانے کس دکھ پہ وہ اس کا اندازہ نہیں لگائی۔

بے بسی سے اس نے لب کھلے۔
 ”لا حاصل محبت بھی کسی گناہ کی سزا سے کم نہیں۔“
 افسردگی اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرنے لگی۔
 ”اور اب یہ اللہ ہی جانے کہ کسی کو بھلا ناواقعی اتنا
 دشوار ہوتا ہے یا میں ہی اس معاملے میں بہت کمزور
 ثابت ہو رہی ہوں۔“ اپنی کوششوں میں پیہم ناکامی
 اسے مایوس کرنے لگی۔

”اور اب بابا کا یہ فیصلہ.....“ اس نے میزبانی
 سے اپنی پشت صوفے کی بیک سے لگا لی۔
 ”یوں لگتا ہے جیسے تقدیر مجھے سنہلنے کا وقت دینے
 کو بھی تیار نہیں۔“

اطلاعی کھنٹی بجی تھی۔ اس نے چوک کر گھڑی کی
 سمت دیکھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ کراچی سے اس کی
 فیملی کے آنے میں۔ دادو سے خود ساختہ ناراضی کا دور
 چل رہا تھا۔ سواس نے بڑی ڈھٹائی سے بیل کی آواز کو
 نظر انداز کیا اور بدستور صوفے کی بیک سے ٹیک
 لگائے آنکھیں موند لیں۔

”ڈیوڈ تم سے ملنے آیا ہے۔“ دادو کی آواز پہ اس
 نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ دل کی دھڑکنوں کی
 ترتیب بری طرح مجبوری۔

”ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے جا کے مل لو.....“
 ڈیوڈ کا ذکروہ سرسری طور پر دادو سے کرچکی تھی سو وہ اس
 سے عاتبانہ متعارف نہیں۔

”جی اچھا.....“ یکفخت میزبانی نے اڑان بھری
 تھی۔ اکٹا ہٹ..... اکٹا کر بھاگی اور افسردگی اپنا
 محاصرہ توڑ کر۔ دادو بچن کی جانب چل دیں اور اس نے
 ڈرائنگ روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

وہ سیٹی پر دھیمے سروں میں کوئی مدھن بجاتا،
 دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، طائرانہ نگاہوں
 سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا وقت گزاری
 مقصود ہو۔

وہ اسے مدتوں بعد دیکھ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو
 یہی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے دلکش انداز میں

دادو نے مسکراتے ہوئے آسودگی سے اس کی
 پیشانی چومی۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو اپنی ایثار
 کو آسودہ و مسرور دیکھنا ہے۔ اس ایک بات کی
 صداقت پر تم کبھی شبہ نہ کرنا کہ میرے لب ہمیشہ تمہاری
 خوشیوں کے لیے دعا گو رہیں گے۔“

انتظار صرف اس کے ہامی بھرنے کا تھا سو بات
 فوراً کراچی پہنچی اور ایک ہفتے بعد کا دن مقرر ہو گیا۔

”مگنی کی تقریب میں ہی شادی کی تاریخ بھی
 طے کر دیں گے۔“ مگنی سے ایک روز قبل صبح ناشتے کے
 بعد دادو نے جو خبر سنائی اس نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

”دادو! یہ بہت جلدی ہے، میں شادی ابھی نہیں چاہتی۔“

”شادی ابھی نہیں ہو رہی..... صرف ڈیٹ فکس
 کی جائے گی۔“ دادو نے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔
 ”تو ٹھیک ہے پھر ڈھائی، دو سال بعد کی ڈیٹ
 فکس کیجیے گا۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔“ اس
 نے تند لہجہ میں ہٹ دھری سے کہا۔

”ایثار.....! فضول ضد کیوں کرنے لگی ہو؟ جب

سب کچھ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ چکی ہو تو اب اس
 انتہائی غیر اہم بات کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔“ دادو ان
 دنوں اس کے وجہ بے وجہ کے چڑچڑے پن سے عاجز
 آگئی تھیں سوائے لہجہ کو تیز ہونے سے نہ بچا سکیں۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ اس قدر بے ٹکا فیصلہ آپ کو
 میرے لیے مناسب لگے گا۔“ وہ جھنجھلائی۔

”ایثار.....! مجھے بحث و مباحثے سے کبھی دلچسپی
 نہیں رہی۔ تمہیں جو کچھ کہتا ہے، اپنے باپ سے کہو۔“

دادو ناگواری سے کہتے ہوئے لاؤنج میں چھوڑ گئیں۔
 اس نے برہمی سے گود میں دھراکشن سائڈ پہ

پھینکا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے

لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب

”جو کچھ دل کی خواہش ہے وہ کسی طور ممکن نہیں،

خدا جانے اب اطمینان قلب نصیب ہو گا بھی یا نہیں؟“

خوش دلی سے مسکرایا۔

”السلام علیکم.....!“ ڈیوڈ نے بڑے بشاش لہجے

میں سلام کیا۔

”وعلیکم.....!“ ایثار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انفرہ دل کی کیفیت آن کی آن میں بدلنے پر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔

”خوشی اگر یونی اس کی ملاقات سے مشروط رہی

تو آنے والے شب و روز کیسے ہوں گے؟ اس کا اندازہ

لگانا مشکل نہیں۔“ پریشانی کی بات یہی تھی۔

”سوری ایثار.....!“ بیٹھتے ساتھ وہ بولا۔

”ایثار.....! میں اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہوں جو

آپ کے مزاج پر اپنی گراں گزری کہ آپ نے پلٹ کر

خبر ہی نہیں لی۔ حالانکہ وہ ایک غیر اختیاری حرکت تھی،

جس پر میں بعد میں بہت پشیمان ہوا۔“ شرمندگی اس

کے الفاظ سے ہی نہیں چہرے سے بھی عیاں تھی۔

”مجھے اگر کوئی بات ناگوار گزری بھی تھی تو اب تو

میں اسے بالکل بھول گئی ہوں سو آپ بھی بھول جائیں۔“

اس کی شرمندہ صورت ہی ایثار کے لیے کافی تھی۔

”شکر ہے آپ کی کمزور یادداشت میرے حق

میں بہتر ثابت ہوئی ہے۔ ورنہ میں تو گھر سے ناک

سے لکیریں کھینچنے کی مشق بھی کر کے آیا تھا۔“ اس نے

مسکرا کر شرارت سے کہا۔

”تو پھر لکیریں کھینچ ہی لیں، ورنہ آپ کی مشق تو

رانگاں جائے گی۔“

”اس کی پروا نہیں..... مجھے فکر ہے آج کا دن نہ

رانگاں جائے۔“ وہ سنجیدہ ہوا اور اس کی معنی خیزی پر ایثار چونکی۔

”آج میرے نانا کی بہتر ورس سالگرہ ہے۔“

اسی بل دادوٹی ٹرائی سمیت نمودار ہوئیں۔ وہ منووب

ہو کے بیٹھا۔

”باقاعدہ طور پر تو کبھی نہیں منائی اور آج بھی

ایسا کوئی ارادہ نہیں..... لیکن اگر آپ میری گزارش پر

سالگرہ اینڈ کرنے آجائیں تو.....“ سر کھجاتے ہوئے

اس نے جبک کراچی خواہش گوش گزار کی۔

”آپ بلائیں اور ہم نہیں آئیں..... ایسے!

حالات نہیں۔“ بے اختیار ہی زبان کی ٹوک تک

آجانے والے الفاظ کو اس نے لب بھینچ کے روکا۔ ”م

اپنے دل کے آگے اتنا مجبور نہ ہوا کرو، تمہیں یہ نہیں

بھولنا چاہیے کہ تم نے اب اس سے بھی نہیں ملنے کا قصہ

کیا تھا۔“ اندر سے اٹھنے والی آواز کو اس نے واضح طور

پر سنا اور گہری سانس بھری۔

دادو نے ایک نظر ڈیوڈ کو دیکھا اور پھر اس کی

متذبذب صورت کو۔

”تقریب کتنے بجے ہے؟“ دادو نے اس کی

سمت چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

”تقریب دو تقریب کچھ نہیں ہے دادو.....! اس

میں دس کروں گا اور نانا کیک کاٹیں گے۔“ اس نے

مسکرا کر واضح کیا۔

”اچھا.....“ دادو بھی مسکرا دیں۔

”چلی جانا ایثار.....! شام میں۔“ دادو نے گویا

اس کی مشکل، سہل کی۔

”شام میں نہیں دادو.....! ابھی میرے

ہمراہ..... میرے نانا میرے ساتھ، ساتھ ایثار کے بھی

منتظر ہوں گے کیونکہ میں یہاں اسی مقصد کے تحت آ

ہوں اور انہیں بتا کر آیا ہوں۔“ اس نے دادو کو تفصیل

سے آگاہ کیا۔

”آئندہ کبھی نہ ملنے کے فیصلے پہ عمل میں آج تک

نہیں کر پائی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے جو سارے

ارادے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔“ دل نے کسی بھی الزام

سے خود کو بری کیا۔

”لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا جو تمہارا جانا لازمی

ٹھہرے، تم معذرت بھی کر سکتی ہو جانے سے۔“ اس

کے اندر کی یہ مانوس آواز بڑی فرض شناسی سے موقع پہ

وارد ہو جاتی تھی۔

”مگر میں کیسے انکار کر کے اسے مایوس کر دوں؟

وہ بڑی آس سے آیا ہے۔“ دل کے پاس ہر بات کا

جواب تھا۔

ماہنامہ سوسیٹلی



موسم کی بدلتی گرماہٹ

نمبر کے شمارے

کی یادگار زماہٹ

اولین صفحات

ظلم و زیادتی کی ایک حد ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسا کردار تھا جس نے زندگی و سفاکیت کا لبادہ اوڑھ کر رکھا تھا۔ ایچ اقبال کے قلم کی نشتر زنی

انکارے

دشمنوں کے قتلے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور زکری

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے سرسری پیکار نو جوان کی سرگزشت..... عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سورق کے رنگ

نفرت..... محبت..... سادگی و وارفتگی کے رنگوں سے مزین سرورق کے رنگ

ان کے علاوہ

مظفر امام، تنویر، یاض، سلیم، انور، امیر شادیگ، جمال دستی، تمکین رضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

جینی نکتہ چینی

آپ کے تھرے... مشورے... تجلیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

”تم جب ایک فیصلہ کر چکی ہو تو پھر تمہیں کسی کی آس ہراس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“ دل و دماغ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند ہو گئے تھے۔ اب پسپائی کس کا مقدر ٹھہرتی تھی؟ یہ دیکھنا تھا۔

”چلی جاؤ ایثار! مگر جلدی آ جانا..... اپنی ماں اور بہن کے آنے سے پہلے ہی۔“ جس سے وہ نہ جانے کا پکا ارادہ کر کے انکار کا بھانہ سوچ رہی تھی، اسی سے دادو نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی مگر اس سے دادو کی بات ٹالی نہ گئی۔ سو چند بل متذبذب رہنے کے بعد اس نے نہ چاہتے ہوئے دادو کی بات مان لی۔

”موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔“ گھر سے نکلتے ہی ڈیوڈ نے کہا۔

موسم بہار کے اوائل دن تھے۔ امیر آلود فضا کی بنا پر بارش کا امکان تھا۔

”ویسے کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے۔ باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگے گی۔“ اس کی جگر جگر کرتی بھوری آنکھوں میں آج کچھ ایسا ضرور تھا جو اس کے دل کی بے پناہ خوشی کا پتا دے رہا تھا۔

”لب معلوم نہیں موسم واقعی اچھا ہے یا مجھے ہی لگ رہا ہے۔“

ایثار نے اپنے ہم قدم چلتے اس خوش باش سے غصے کو نظر بھر کر دیکھا۔

”کیا آپ ہمیشہ ہی اپنے نانا کی سالگرہ پراتنا ہی خوش ہوتے ہیں؟“ اس نے کسی قدر حیرت سے استفسار کیا تو جواب دہ بے ساختہ تہقیر لگا کر ہنس دیا۔

”اچھا! یعنی آپ کے خیال میں میری غیر معمولی خوشی کا سبب یہی ہے؟“

”ظاہر ہے پھر اور کیا سمجھوں؟ کوئی اور وجہ ہے بھی تو آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔“ یہ شکوہ نہیں تھا وجہ جاننے کی ایک کوشش تھی۔

”نہیں..... یہی وجہ ہے کوئی اور نہیں۔“ متبسم

”بہتر ہوتا جو میں اس کے ساتھ نہ آتی۔ اس سے مل کر تو احساسِ زیاں مزید شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔“ وہ عاجز ہوئی۔
تمام راستہ اسی قسم کی سوچیں دامن گیر رہیں سو موڈ بھی آف رہا۔

ڈیوڈ کی چپ نے بڑی وفاداری سے رہائش گاہ تک ساتھ نبھایا۔ مگر مزید اس کے نانا نے ڈیوڈ کی خاموشی کو ساتھ نہیں نبھانے دیا۔

”تم ان دنوں اپنی من مانی بہت کرنے لگے ہو۔ چھوٹی باتوں میں بھی اور اہم معاملات میں بھی۔“ جوزف انگل نے اس وقت قدرے ناراضی سے کہا جب ڈیوڈ نے انہیں زبردستی چھری تھماتے ہوئے باقاعدہ کیک کاٹنے کو کہا۔

”اس سالگرہ کا اہتمام جوزف انگل کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے۔“ جوزف انگل کے برہم مزاج سے اس نے امداد لگایا۔

”میری تو کسی بات کو بھی تم قابلِ عمل نہیں سمجھتے۔ جو دل میں سما جائے پھر اس پر عمل مجھے دکھ پہنچا کر بھی ضرور کرتے ہو۔“ وہ کسی بات کی وجہ سے ڈیوڈ سے ناراض تھے۔ سو اس کا اظہار بر ملا..... بغیر کسی لحاظ کے کر رہے تھے۔

”کچھ خیال کر لیں۔ مہمان کے سامنے ہی میری عزت رکھ لیں۔ میری بقیہ“ تعریف“ بعد میں کر لیجے گا۔“ شاکی لہجے میں اس نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔
”ہاں..... مہمان کے دل میں کوئی برا خیال نہ آئے۔“ انہوں نے چبھتی ہوئی نگاہ ایثار پر ڈالی۔
”باقیوں کی خیر ہے..... ان کی تمہیں پروا بھی کب ہے۔ ایک بس یہی اہم ہے۔“ جوزف انگل کے لب لہجے پر ایثار کے پورے جسم کا لہو چہرے پر سمٹ آیا۔
ڈیوڈ نے ہنر بڑا کر پہلے اسے اور پھر اپنے نانا کی سمت دیکھا۔

”آپ کی ناراضی مجھ سے ہے تو پلیز اسے مجھ تک ہی محدود رکھیں۔“ اس نے التجائی۔

لہجہ میں اس نے اصل وجہ جتاتے ہوئے چھپائی۔
”اب ایسی بھلا کیا وجہ ہوگی جو یوں غلطی رکھی جا رہی ہے۔“ اس کے یوں پوشیدہ رکھنے پر وہ بد مزہ ہوئی۔
”ایک بات پوچھوں؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ایثار سے استفسار کیا۔

جواباً ایثار نے استغناء سے نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ سر کھجاکے کہنے لگا۔

”جیتے دن میرے بغیر کیسے گزرے؟“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرورت تھا جس نے ایثار کو چونکا دیا۔

”کہیں اسے شک تو نہیں پڑ گیا کہ میرے وہ دن بڑے بے کیف و بے رونق گزرے ہیں۔“ ایثار نے اس کا چہرہ ایک نظر میں کھوجنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی تو رہنا جواب دیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

”میرے خدا.....“ ڈیوڈ نے لب بھینچ کر کسی قدر افسوس سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”شاید پھر آپ کے مزاج کے خلاف بول گیا ہوں۔“ ایثار کی خاموشی اسے غلطی لگی۔

”افوہ..... اب اتنی سی بات پر اسے غلطی کا گمان ہونے لگا ہے۔“ وہ جھنجھلائی۔

”سوری..... معافی چاہتا ہوں، آئندہ ایسی کوئی بات نہیں بولوں گا جس میں آپ کی ناراضی کا شبہ بھی موجود ہو۔“ وہ پشیمان تھا اپنے لفظوں کی ادا نیگی پر۔

”کیا مصیبت ہے۔“ بظاہر ہنستے کھیلتے ہوئے بھی کوئی احساسِ ضرورت تھا جو بے کل رکھتا تھا۔ سو مزاج کا.....

پہلے اپنا از سر نو عود آیا۔

”مجھے کوئی بات گراں نہیں گزری..... آپ برائے کرم.....“ لب کاٹتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس کے بیزار لب و لہجے پر ڈیوڈ نے لب بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”آخر کیوں میں اس کے احساس سے خود کو آزاد

نہیں کر پار پی؟“ بے بس سی سوچ دماغ میں ادھر سے ادھر چکرانے لگی۔

اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریزاں رہتی تھی سواس وقت بھی نگاہیں سامنے راستے پر جمی رہیں۔

ایثار کے انکشاف پہ ایک لمبی چپ ان دونوں کے بیچ دبک کے بیٹھ گئی۔

”اسے ایک دم چپ کیوں لگ گئی ہے؟“ خوش فہمی پھر سر اٹھانے لگی۔ ”کہیں اسے میری مفتی کی خبر نے رنج تو نہیں پہنچایا۔“ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر اس کی چابی گھما رہا تھا۔

اسے اپنی جانب متوجہ پائے مسکرایا۔
”بند ہو گئی ہے۔“ وہی خوش باش بے فکر ا لہجہ..... جس میں کسی بھی قسم کے ہلکے سے دکھ کی رتق کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا..... غنڈی آہ بھر کے اس نے نگاہیں دوبارہ سامنے کی جانب موڑ لیں۔

”جی تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟“ اس نے گھڑی جیب میں رکھی اور سابقہ موضوع کی طرف آیا۔ ”کل آپ کی مفتی ہے۔ بے خوشی کی خبر مجھے تو شاید برسبیل تذکرہ مطلع کیا جا رہا ہے۔“ اس نے دھیسے لہجے میں ہچکچاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ شکوے کا بالکل حق ہی نہیں رکھتا ہو۔ بات سچ تھی، سو وہ خاموش رہی۔ اس سے مروتا بھی تردید نہ ہو سکی۔

”اب شاید یہ مجھ سے مدعو کرنے سے متعلق استفسار کرے۔“ یہ اس کا خیال تھا سو وہ مختصر بھی رہی مگر وہ پھر مزید کچھ اس وقت تک نہیں بولا جب تک ایثار کی رہائش گاہ تک نہیں پہنچ گیا۔

”اوکے مس ایثار.....!“ اس نے الوداعی لہجے میں کہا اور گیٹ کے باہر ہی اپنے قدم روک لیے۔

”میں اب چلوں۔“ وہ مسکرایا۔

نارسائی کا کرب دل میں اس وقت اپنی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلانے لگا۔ اس نے بے بسی سے لب کپلے۔

”سدا خوش رہنا۔“ دھیسے لہجے میں آخری فقرہ کہہ کر وہ پلٹا اور قدم بقدم اس سے دور ہونے لگا۔

”تمہاری زندگی میں ان چند دنوں میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں سو اب مزاج کی تبدیلی معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اب تمہارا رویہ بہت کم تکلیف دیتا ہے۔ حالانکہ کسی اور کو بہت اہمیت دینا میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔“ بات کے اختتام پر انہوں نے پھر اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔

ان دونوں کے درمیان وجہ ناراضی اس کی ذات ہے۔ اس نے ٹھیک، ٹھیک اندازہ لگایا۔ شفق سے جوزف انگل جو ہمیشہ ہی اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے مگر آج ان کا ناقابل فہم رویہ اسے تعمیر کر رہا تھا ان کی ناراضی اپنے نواسے سے بھی مگر وہ اسے کیوں بیچ میں.... رگید رہے تھے؟ وہ یہ جاننے سے قاصر تھی۔

”میں چلتی ہوں..... دادو راہ تک رہی ہوں گی۔“ وہ پلٹی اور تیز قدموں سے واپسی کی راہ لی۔

”ایثار.....“ وہ پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ ”مس ایثار.....! پلیز بات نہیں۔“ اس کے عقب میں وہ باہر تک آیا۔ ایثار نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

”سوری ایثار میں بہت شرمندہ ہوں اپنے نانا کے رویے پر۔“ ایثار نے اس وقت بھی اس کی سمت نہیں دیکھا جب، جب وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں..... مجھے ناگوار نہیں گزرا..... وہ میرے بزرگ ہیں۔“ جوزف انگل کی تلخ باتیں پھر سے ذہن میں ابھریں تو رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک بار پھر بڑھی..... مگر اس نے دل میں کچھ نہ بولا کہ کچھ کے مصداق منافقت سے کام لیا۔

”پھر آپ یوں اچانک کیوں اٹھ آئیں؟“ اس نے چند لمحوں تک خاموشی سے ایثار کی سمت دیکھنے کے بعد استفسار کیا۔

”مجھے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ دادو نے جلد آنے کا کہا تھا۔ کراچی سے میری پہلی آ رہی ہے ناں..... مری مفتی کے سلسلے میں۔ کل مفتی ہے میری۔“ وہ اب

متعلق کہہ رہی ہیں۔

”جوزف صاحب اور کون.....؟“ دادو نے اس کی غائب دماغی پر کسی قدر حیرت سے کہا۔

”اچھا.....“ وہ سنبھلی۔ ”کیا کہہ رہے تھے؟“

”کہہ رہے تھے کہ مجھ سے آگے مل لے..... کوئی ضروری بات کرتی ہے۔“ دادو نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہواؤں دادو.....؟“ بے اختیاری میں وہ اپنی بے تابی پہ قابو پانا بھولی۔

اس کی تابی نے دادو نے کسی قدر تعجب سے گھور کے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”خدا جانے ضروری بات کیا ہو؟“ شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”بیکار کا سسپنس بے چین کیے دے رہا ہے۔“ اس نے اپنی بے تابی کے مظاہرے پر گویا صفائی پیش کی۔

”چلی جاؤ۔ میں نے کب تم پر پابندی لگائی ہے۔“ دادو بھلا کب اسے شرمندہ دیکھ سکتی تھیں سو خالی کپ اٹھا کے وہاں سے چل دیں۔ گہری سانس لے کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی راہ لی۔

آسمان مکمل بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

”موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔“ اس کے کان کے قریب جیسے کوئی بولا۔ اس نے بے بسی سے مچلاہ دانتوں تلے دبایا اور دانستہ اپنا دھیان سامنے رخسارے بیٹھے پرندوں کی جانب مبذول کیا۔

”انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے، باہر کی مٹ خود بخود خوب صورت لگے گی۔“ وہی آواز وہاں سنائی دی۔

فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف اٹکل کو اپنا ہاتھ پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پرکھنے سے غلط برداشت کی۔ وہ ضروری بات جاننے کے لیے ہاتھ اٹھائی تھی سو اسے ان کی یہ بلاوجہ کی ڈرامے بازی سہی۔

”آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟“

”سدا خوش رہنا۔“ ایثار نے اس کے الفاظ پر لب ہرائے اور سوچا۔ ”یہ التجا تھی، دعا یا ہدایت؟“ وہ یہ بات اس کے لب و لہجے سے پہچان سکی نہ تاثرات سے، سو بے دلی سے سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”جوزف صاحب آئے تھے، تم سے ملنے۔“ وہ قیلو لے کے بعد ابھی تو دادو نے اسے مطلع کیا۔ وہ ایک دم چوکی۔

”کیوں..... خیریت؟“ ذکر چھڑتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ ان کے وہ کئی روز پہلے کے دل دکھانے والے الفاظ آج بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہیں۔

”خدا جانے۔“ دادو نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔ ”تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے شاید.....“ دادو نے خیال ظاہر کیا۔

”تو مجھے اٹھا دیتیں ناں.....“ اس نے بے چینی چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہیں جگانا چاہا تھا مگر انہوں نے خود ہی روک دیا۔“ دادو نے اس کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

”تمہا تھے یا.....؟“ اس نے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”ہاں تمہا تھے، تم تو شاید آگاہ ہو کہ ان کا نواسہ تو اپنے وطن لوٹ گیا ہے۔“ دادو کے جواب پر دل کی سر زمین پر گہرا ساننا چھا گیا۔

”ہاں مجھے اندازہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی تو اپنے وطن لوٹ جائے گا۔“ اس نے اداسی سے سوچا۔

”مگر دل خوش فہم کو لگتا تھا کہ وہ جانے سے قبل ملنے ضرور آئے گا۔ سو اب پتا چلا کہ میں اس کے لیے نہایت غیر اہم تھی۔“ اس نے کپ جوں کا توں میز پر رکھ دیا۔

”جاتے سے پیغام چھوڑ گئے تھے تمہارے لیے۔“ ”کون.....؟“ دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں.....

دھیان ڈیوڈ کی طرف تھا سو اسے لگا دادو، ڈیوڈ کے

تھا۔ میں اس کی طرف سے فکر مند رہنے لگا تھا۔ سو جلد ہی اس کی شادی ڈالاس میں مقیم اپنے خالہ زاد کے بیٹے سے کر دی۔ شادی کے بعد اس کی فون کالز سے اس کی خیریت اور اپنے مذہب سے اس کی انسیت کی خبر نے مجھے کافی مطمئن کر دیا۔ وہ بات اپنے اطمینان کی کر رہے تھے مگر وہ ایسا کر اس سے حد درجہ آزرده خاطر لگے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

”شاید ماضی کے واقعات اس وقت ذہن پر تسلط جمائے ہوئے ہیں۔“ اس نے ان کی پرسوج لگا ہوں سے اندازہ لگایا۔

”گزرتے وقت نے اسے ایک بیٹے سے نوازا جو سات برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی ماں نے اگلے بچے کی آمد کے سبب اسے ہمارے پاس کراچی بھیج دیا۔ وہ وقت بڑا حسین تھا۔“ ان خوب صورت دنوں کی یاد بھی ان کی رنجیدگی میں کمی کی وجہ نہیں بن پارہی تھی۔ وہ مسلسل افسردگی کے حصار میں ہی تھے۔

”اور وقت کو تو یوں بھی گزرنے کی جلدی ہوتی ہے سو حسین وقت اور بھی سبک رو ہوا۔ ایک روز اطلاع ملی میری مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً میری بیوی کے لیے۔ اس کے لیے یہ صدمہ سہارا تا حد درجہ دشوار تھا سو میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ میری بیوی کی موت کا سبب یہی خبر تھی۔ پھر تو جیسے زندگی سے ساری رونق ہی اٹھ گئی۔ ڈیوڈ ابھی کم عمر تھا۔ یہ بے رونق قبول نہیں کرایا اور واپس اپنے وطن لوٹ گیا۔ زندگی بے کیف تو تھی ہی سو ڈیوڈ کے جانے کے بعد مزید ہونی بہر حال.....“ انہوں نے آہ سرد بھری۔

”وہ وقت بھی بالآخر گزر ہی گیا مگر اب کراچی کی فضا میں میرے لیے پہلے جیسا سکون نہیں تھا سو میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ ڈیوڈ سے میرا ٹیلی فونک رابطہ برقرار تھا۔ سو بارہ برس بعد اس کی آمد کی اطلاع نے میرا دل خوش سے بھر دیا۔..... وہ یہاں صرف مجھ سے ملنے کی خاطر، صرف میری محبت میں آیا تھا مگر پھر یہاں اس کے طویل

اسے استفسار کرنا پڑا۔ چند ملی انہوں نے اس کی صورت تکلیف گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

”اپنے نواسے کی زندگی کی چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، سو سوچا آج اس ضرورت کو پورا کر لوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”خدا خیر کرے۔“ اس کا دل بلا وجہ ہی وسوسوں میں گہرا۔

”ڈیوڈ سے متعلق.....؟“ اس نے استفسار کیا۔

”خیریت؟“

”ڈیوڈ نہیں عبد اللہ.....“ انہوں نے گویا صبح کی۔

”عبد اللہ.....“ نا سنجھی کے عالم میں اس نے ریل ب دہرایا۔

”ہاں..... وہ اب مسلمان ہو گیا ہے۔“ ان کے سپاٹ چہرے کو وہ چند ثانیوں تک بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

”اچھا.....؟“ یقین آنے کے بعد اس نے اپنی بے ساختہ خوشی کو بڑے جتنوں سے چھپایا۔

”کیسے.....؟“ ان کے ہر قسم کے جذبات سے فاری چہرے کو دیکھ کر اس نے جھج کر پوچھا۔

”یہ سب بتانے کے لیے تو آپ کو بلایا ہے۔“ انہوں نے گہری سانس لے کر صوفے کی ایک سے لگ لگائی۔ یوں جیسے یہ ذکر ان کے لیے ناپسندیدہ ہویا مگر یوں جیسے کوئی مجبوری حقیقت بتانے پر مصر ہو۔

”ڈیوڈ، میری چہیتی بیٹی ”میری“ کا بیٹا ہے۔“

میری کی تربیت میں بچپن ہی سے اس کی ماں نے سنی مذہب کی محبت کا درس دیا جو اس کے مذہب سے لگاؤ سے ظاہر بھی تھا مگر اس کی ایک عادت سے میں خائف بھی رہتا تھا اور نالاں بھی..... وہ اکثر اپنے مذہب کا مذہب اسلام سے موازنہ کرتی رہتی اور پھر انجنتی بات۔“ انہوں نے تھکی، تھکی سر آہ بھری۔

”وہ نہیں جانتی تھی کہ بے خبری میں وہ مذہب اسلام سے متاثر ہونے لگی تھی..... مگر میں بے خبر نہیں

قیام کا سبب محض میری ہی محبت نہیں تھی۔ کسی اور کی محبت

بھی تھی جو اس کے واپسی کے ارادے کو متزلزل کرنے کا موجب بن رہی تھی۔“ وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئے تھے مگر محض دم لینے کے لیے ہل بھر کوئی۔

”شروع کے چند دن اسے جھیل کا سحر اپنی جانب کھینچتا تھا مگر رفتہ رفتہ جھیل کے سحر پر کسی اور کا سحر غالب آنے لگا۔ جس روز اسے اس بات کا ادراک ہوا اس نے مجھ سے آگے کہا۔“ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ دن پوری جزئیات کے ساتھ ابھرا۔

”نانا! روز شام سے جھیل کنارے ایک لڑکی آتی ہے۔ نہ اس کی آنکھیں جھیل سی گہری ہیں، نہ رنگت سونے جیسی مگر اس میں کوئی بات ایسی ضرور ہے جو اس کی موجودگی تک مجھے صرف اسی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔“ اس نے سیب پر اپنے دانت کا ڈے۔

”بیٹا جی! ذرا دھیان سے..... یہ ڈالاس نہیں، کشمیر ہے۔ یہاں اگر کسی لڑکے کو کوئی دوشیزہ اچھی لگتی بھی ہے تو وہ اس کا اظہار اسی صورت کر سکتا ہے اگر جو وہ لڑکی اس کی بیوی ہو۔“ نانا نے اپنے لیے کافی چھینٹے ہوئے، مصروف سے انداز میں اسے آگاہ کیا۔

”جانتا ہوں۔“ اس نے اپنے نانا کو اپنی آگاہی سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

”تجھی مجھے اس سے بات کرنے کے لیے ڈراما کرنا پڑا۔“ وہ اپنا ”کارنامہ“ یاد کر کے محظوظ سے انداز میں مسکرایا۔

”میں نے اس سے کہا میں راہ بھول گیا ہوں۔ برائے مہربانی مسٹر جوزف کے گھر تک رہنمائی کر دیں۔ میرا خیال تھا وہ استفسار کرے گی۔“ کون مسٹر جوزف.....؟“ مگر آپ تو کافی مشہور شخصیت ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف پہچان گئی بلکہ گھر تک پہنچا دیا۔“

اس انکشاف پر اپنا رنرے چونک کر جوزف انکل کی سمت دیکھا۔

”تو کیا میں جسے اپنے دل کی خوش فہمی سمجھ رہی تھی وہ حقیقت تھی۔“ اس کے دل کی دھڑکن بری طرح۔۔۔

تھا۔ میں نے اس پر خوب سچ چلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ میری کڑوی تسلی سر جھکا کے سننے کے باوجود اپنی من مانی سے باز نہیں آیا تھا۔ ”وہ خاموش ہوئے اور اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”جانتی ہو میری سالگرہ والے دن وہ تمہیں یہاں کیوں لایا تھا؟“ اس نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔ ”تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کرنے کے لیے اور تمہاری مرضی معلوم کرنے کے لیے۔“ اس نے گہری سانس لے کر نظریں جھکا لیں۔

”وہ مجھے اس حد تک چاہتا رہا اور میں بے خبری رہی۔ جب اس وقت لاعلم رہی تو یارب اب اس حقیقت سے آگاہی کیوں ہوئی؟ اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے منزل دو گام پر تھی مگر میں اپنی تم قحطی کے سبب خود اسے کھو بیٹھی۔“ اسے لگا دل کی سر زمین سے رخصت ہونے والا اطمینان اب بھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔

”وہ اس روز بے انتہا خوش تھا۔ مگر تمہاری معافی کی خبر نے اس کے ارادے ملیا میٹ کیے اور ساری خوشی بھی۔ اس کی شوخی، مسکراہٹ، بے فکری کہیں دور دس جا کے بس گئیں۔“ تو اسے کے اضطراب کا اثر ان کے لب و لہجہ پر بھی پڑ گیا تھا۔

”اسے یقین تھا کہ وہ اگر اس وقت بھی تمہیں پروپوز کرتا تو تم اپنے منگیتر کے مقابلے میں اسے ترجیح دیتیں مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ عین ممکن والے روز تمہارا اس طرح کا کوئی بھی فیصلہ تمہارے لیے کئی مشکلات پیدا کر دے گا۔ اور وہ تمہیں کسی بھی طرح کی آزمائش میں جتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

اسے ہر بات سے آگاہ کر دینے کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو کر کسی سوچ میں ڈوبے۔ خاموشی کا وقفہ جب سیکنڈز سے منٹوں تک پہنچا تو وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی دل پر دھرا بوجھ اب آنسوؤں کے ذریعے کم ہونا چاہتا تھا۔

”کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلوں گی اب۔“ مزے

اس کے گوش گزار کرنے کا مکر وہ اپنے اس ارادے پر عمل نہیں کر پایا۔ کیونکہ اس لڑکی نے جمیل کنارے آنا چھوڑ دیا تھا جبکہ ڈیوڈ روز بلا تاغ اس سے ملنے کی چاہ میں وہاں پہنچ جاتا تھا مگر وہ اسے نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں وہ حد درجہ بے چین و مضطرب رہنے لگا تھا۔ وہ دن میں کئی بار ہر اس جگہ سے گزرتا جہاں سے اس کے گزرنے کا امکان بھی ہوتا۔ کئی روز بعد جب ملاقات ہوئی تو حد درجہ خوشی کے سبب وہ اپنے آپ سے نہیں رہا سو اپنی بے اعتیاری حرکت سے اسے ناراض کر بیٹھا۔ ”انہوں نے نگاہ اٹھا کر اپنی بات کی اثر انگیزی اس کے چہرے پر کھوجنی چاہی تو انہیں سوائے..... بے قراری کے کچھ نہیں ملا۔

”کاش..... اے کاش یہ سب اگر مجھے اسی وقت پتا چل جاتا تو زندگی میں یہ اضطراب مقدرنہ ٹھہرتا۔“ اس نے لب کاٹتے ہوئے آنسوؤں پر پابندی لگانے کی سعی کی۔

”تھو تو گویا بے چینی اس کے اندر اپنا مسکن بنا بیٹھی۔ وہ اس سے ملنے کی چاہ میں سارا، سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ مگر سب کچھ بیکار جاتا رہا۔ اسی بے چینی کی حالت میں اس نے مذہب اسلام اپنایا۔ اس روز قدرے سکون کی حالت میں اس نے مجھ سے کہا۔ ”مذہب کی تبدیلی کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا آدھا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ بڑا پریشان تھا میں اس حوالے سے۔“ اس پل میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام اس کے لیے بھی اتنا ہل نہیں تھا۔ ”بولتے، بولتے ان کے لہجے میں تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ انہوں نے پانی کا گلاس لیوں سے لگایا۔

”خدا کی دین کا حال بھی عجب ہے۔ وہ، وہ چیزیں نواز دیتا ہے، جہاں تک سوچوں کی رسائی کا بھی امکان نہیں ہوتا۔“ ڈیوڈ کو یوں یہ آسانی ہدایت مل جانے پر دل چند لمحوں کے لیے ہی سہی اداسی سے کنارہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بغور انہیں سن رہی تھی۔

”اس کی اس حرکت پہ میرا ضبط جواب دے گیا

اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

”آپ جانتی ہیں ان سب باتوں سے میں نے آپ کو کیوں آگاہ کیا ہے؟“ اس نے اپنے عقب میں ان کی آواز سنی تو ٹھٹھک کر رہی۔

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سب باتوں سے تمہیں لاعلم ہی رکھوں، ورنہ حقیقت جان لے کر تمہارے دل کی کسک مزید بڑھ جائے گی۔ اس نے خیال میں بظاہر جس خواہش کا پورا ہونا ناممکن لگا رہا ہو اور پھر ہمیں پتا چلے کہ اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن تو کیا مشکل بھی نہیں تھا بس ہماری لاعلمی اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں حائل رہی تو اس وقت کا افسوس ایک ”کاش“ کی صورت ساری زندگی ساتھ بٹھاتا ہے۔ وہ تمہاری زندگی کو اس ”کاش“ سے بچانا چاہتا تھا۔“

”کس قدر درست اندازہ لگایا ہے اس نے.....“

”ایہ ”کاش“ اب پیچھا چھوڑنے والا نہیں۔“ اس نے اس کی طرف سے سوچا۔

”مگر انہوں نے اس کی ہدایت کے برخلاف مجھے اپنی طرف حقیقت کیوں بتادی؟“ وہ حیران تھی۔

”اسی لیے میں نے تم کو تمام حقیقت بتادی۔“ وہ اس کی حیرانی بھانپتے ہوئے بولے۔

”دل پہ مت لینا مگر ایثار حقیقت یہی ہے کہ میں اپنا دل اسے کی محبت میں بہت خود غرض ہو گیا ہوں۔“

”اب اس سے اس کا اداس چہرہ ہٹا نہیں۔“ ان کے لہجے میں وہی بیگانگی اور درشتی سمٹ آئی تھی جو اس نے ان کی سالگرہ والے دن سہی تھی۔

”جس ہستی کے سبب میرے نواسے کا چین و غم اب بڑھاد ہوا، اسے پرسکون دیکھنے کا میں خود میں سے لیں پاتا تھا۔ اب آپ چاہے میری اس حرکت پہ

بہم لگی سوچیں مجھے اس کی پروا نہیں۔“ ان کا حسد بھرا لہجہ ان کے منہ سے نکلنے لگا۔

”ایسا ہٹنے اس کے لبوں پر چھب دکھائی اور وہ مڑ مڑا ہوا دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

”خدا جانے میں انہیں اتنی پرسکون کب لگی جو یہ مجھے بے سکون کرنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔“ چہرے پر چند بوندیں گری تھیں۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ بادل پانی سے لبا لب بھرے ہوئے تھے بالکل اس کے دل کی طرح۔

”مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں جوزف انکل کہ آپ کی محنت بھی رانگاں نہیں گئی۔“ اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا۔

”آپ کی ”محنت“ کے ”کاش“ کا پچھتاوا اب تمام عمر مجھے اپنی کوتاہی یاد دلانے گا۔ میں کیوں اتنی بے خبر رہی؟ مجھے تو بغیر کہے میرے دل کی بات پالیتا ہے۔ ڈیوڈ میرے جذبات سے باخبر تھا پھر میں ہی کیوں نہ جان پائی؟“ برستی بارش کا فائدہ اٹھا کے اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

”کیا میری محبت اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی کہ میں اس کی ان کہی تک بھی یہ آسانی پہنچ پاتی؟“ برسات کے پانی میں گھٹکین پانی گھٹکا جا رہا تھا۔

”اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ برسات کے سبب تمہارے آنسو نظروں میں نہیں آسکیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ اس کے برابر چلتا شخص نہ جانے کب سے اس کا ہم قدم ہوا تھا وہ محسوس ہی نہیں کر سکی۔

”تمہارے آنسو میری نظروں میں بہنے سے پہلے آجاتے ہیں۔“

”یہ شخص ہر بات سے آگاہ ہے۔ سو اس سے کوئی بات مخفی رکھنے کی کوشش بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔“ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”ایثار.....“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل رکا۔ اس نے رک کر نگاہ اٹھائی۔

”تمہارے آنسو مجھے تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔“ ایثار نے دھندلی نگاہوں سے سامنے دیکھا اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ اس شخص کے لیے جو اسے شدید اور بے لوث چاہتا تھا۔





حُبِ دنیا..... غفلتِ الہی

بے تحاشا رحمتوں سے نعمتوں سے لوا رہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس کے شکر گزار بن جائیں اور شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے فرماں بردار بن جائیں اور فرماں برداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی ناپسندیدہ باتوں سے اپنے آپ کو روک دیں۔ اور اس کی اطاعت گزاری کریں تاکہ وہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے تو ہمارا اصل مقصد اپنے رب کو راضی کرنا ہے تو زندگی امتحان ہے اور یہ دنیا دار الامتحان سوالنامہ مشکل ہے اور مہلت عمر محدود..... کامیابی کا انحصار ایک، ایک لمحے کے صحیح استعمال پر ہے..... اس امتحان میں انسان کی ناکامی کے لیے شیطانی قوتیں بھی سرگرم ہیں۔

ایک بار سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مردار بکری کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: ”تم میں سے کون ہے جو اسے ایک درہم کے بدلے میں لینا چاہتا ہو۔“ صحابہؓ نے عرض کیا:..... ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو کون لے گا عیب دار ہونے کی وجہ سے اسے کوئی نہیں خریدے گا کیونکہ اس کے کان کٹے ہوئے ہیں اور یہ مردہ ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”خدا کی قسم جتنی ذلیل تمہاری نظر میں یہ ہے، دنیا اللہ کے نزدیک اس مردہ بکری سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک چمچ کے پر کے برابر بھی ہوئی تو کافر کو اس سے ایک ٹھونٹ پانی نہ ملتا۔“

یہ دنیا اللہ کے بندوں کی دُشمن ہے۔ اللہ کے بندوں کی دُشمن اس لیے ہے کہ اس کے بندوں کو راہِ راست پر چلنے نہیں دیتی۔ یہ اللہ کے دوستوں کی اس لیے دشمن ہے کہ ان کے سامنے اپنی زینت، رونق اور شادابی سے اپنے فریب میں جتلا کر دیتی ہے اور وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور آخرت کی رسوائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار مواقع پر دنیا کی حرمت کی گئی ہے کہ وہ دنیا سے اعراض کریں اور اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔

تمام تر حمد و ثنا اللہ عزوجل کے لیے ہے۔ جو ہمارا پیارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق، ہمارا رازق ہے۔ ہمارا اللہ رحمن ہے، رحیم ہے، اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ وہ ہمارا ولیؑ، ہمارا نگہبان جو ہمارے اندر سے واقف ہے جو ہمارے تمام احساسات سے آگاہ ہے۔ اسے مٹانے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی صرف چند آنسو اس کی بارگاہ میں سچے دل سے پیش کر دیے جائیں تو وہ ہمیں بخش دیتا ہے..... کتنا مہربان ہے ہمارا آقا.....

اے اللہ! تو رحمت اور برکت نازل فرما سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کی آل پر درود و سلام ہو۔ ہمارا آج کا موضوع ”حُبِ دنیا“، یعنی دنیا کی محبت ہے۔ دنیا کے لغوی معنی ہیں کرۂ ارض، جہان، عالم، کائنات..... لوگ بہت سی چیزیں۔ یہ لفظ ادنیٰ کا موٹ ہے جس کے معنی کم رہتے ہیں یعنی اعلیٰ کی ضد ہے۔

”اللہ“ لفظی ضدِ کم ہے اس لفظ میں کتنی تسکین، کتنی راحت ہے سکون و طمانیت ہے اور کتنی زیادہ ممتا ہے۔ اللہ وہ خالق کائنات جس نے ہمیں بنانے سے پہلے ہمارے لیے ایک خوب صورت دنیا تخلیق کی..... اسے خوب صورت مناظر سے سجایا۔ یہ برف پوش چوٹیاں، اونچی نیچی پہاڑیاں بوجھل بادل، ٹھنڈی مہکتی ہوائیں، سرسبز میدان..... دریا، جنگل بیابان، صحرا، جھیلیں اور وسیع سمندر..... یہ سب کچھ

ہمارے پروردگار نے ہمارے لیے بنایا تاکہ ہم اس کی قدرت کو دیکھ سکیں اس کی بڑائیوں کو محسوس کر سکیں اسے پہچان سکیں اور پھر اپنے اس عظیم رب کا شکر ادا کر سکیں..... اس نے ہماری ہدایات کے لیے عظیم کتاب قرآن مجید عطا کی..... اور ہماری رہنمائی کے لیے ایک کامل ترین ہستی کو اپنا نمائندہ اپنا محبوب یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ ہم ہلک نہ جائیں..... اب ہمیں اپنی تخلیق کا مقصد سمجھنا ہے کہ جس رب نے ہمیں.....

انہی کی بابت کا مقصد بھی یہی رہا کہ وہ اللہ کے بندوں کو دنیا سے غمگین کر کے آخرت کے راستے پر چلائیں۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ.....
 ”دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔“
 ”دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے۔“
 ”بجز اس کے جو اللہ کے لیے ہو۔“
 ”دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔“

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں..... ”دنیا کو اپنا مالک نہ بناؤ وہ تمہیں اپنا غلام بنالے گی۔ اپنا خزانہ اس کے پاس امانت رکھو جو ضائع نہ کرے اور تمہارے مال کی حفاظت کرے.....
 جس کا خزانہ خدا کے پاس ہے اسے کی طرح کا خوف نہیں ہے۔“
 ایک مرتبہ ارشاد فرمایا اے حواریو!..... میں نے تمہارے لیے دنیا کو ادھار دیا ہے منہ کر دیا۔ تم میرے بعد اسے اٹھا نہ دینا..... دنیا کی خفاش میں سے یہ بات ہے کہ آدمی دنیا کی خاطر خدا کی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ جب تک دنیا نہیں چھٹی آخرت نہیں ملتی..... اگر تم آخرت چاہتے ہو تو دنیا کو زرخیز گاہ سمجھ کر ہوا سے آباد مت کرو..... اور یہ بات جان لو کہ ہر گناہ کی جڑ یہ دنیا کی محبت ہے۔ ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کے ہمراہ کسی عابد کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ کے دائیں بائیں جن دائیں صفیں بنائے ہوئے تھے اور پرندے آپ کے اوپر سایہ کر رہے تھے..... عابد نے عرض کیا۔ اے ابن داؤد!..... اللہ نے آپ کو بڑی سلطنت عطا فرمائی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ..... ”دن کے اعمال میں ایک شیخ اس تمام دنیا سے بہتر ہے جو ابن داؤد کو عطا کی گئی ہے اس لیے جو کچھ ابن داؤد کے پاس ہے وہ ضائع ہونے والا ہے۔ اور شیخ باقی رہنے والی ہے۔“
 سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”غفلت میں رکھنا تم کو زیادتی کی حرص نے..... ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال ہے حالانکہ حیرانسی قدر ہے جتنا تو نے کھا کر ضائع کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا۔ صدق کر کے بانی رکھ چوڑا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ ”اے ابو ہریرہؓ کیا میں تجھے دنیا اور اس کی تمام چیزیں دکھا دوں؟ میں نے عرض کیا ضرور دکھائیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مدینے کی ایک وادی میں لے گئے وہاں ایک کوڑی مٹی جس میں کھوپڑیاں، نجاستیں،

ہڈیاں اور گندے جینھڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”یہ سرائی ہی حرص کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو اور ایسے ہی امیدیں کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو پھر وہ آج بغیر کھال کے ہڈیاں بن گئے ہیں پھر راکھ ہو جائیں گے اور یہ وہ نجاستیں ہیں جو ان کے انواع و اقسام کے کھانے تھے نہ جانے کہاں، کہاں سے کمائے تھے پھر ان کھانوں کو انہوں نے اپنے پیٹوں میں اٹھایا اور آج ان کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ ان سے بچتے ہیں اور یہ بوسیدہ جینھڑے ان کا لباس تھے آج یہ ہوا سے مارے، مارے پھرتے ہیں اور یہ ہڈیاں ان کے جانوروں کی ہڈیاں جن پر سوار ہو کر وہ شہر، شہر کھوٹا کرتے تھے جو شخص دنیا پر رو سکے روئے۔“ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب تک ہم خوب رو نہ لیے وہاں سے نہیں بٹے۔

حضرت امیرِ اہم علیہ السلام کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے۔ ارشادِ ربّیہ وہاں ہے۔ ”اے دنیا! تو نیک لوگوں کی نظر میں بڑی ذلیل ہے جن کے لیے تو بن سنور کر نکلتی ہے میں نے ان کے دلوں میں تیری طرف سے نفرت پیدا کر دی ہے اور وہ تجھ سے اعراض کرتے ہیں کوئی مخلوق میں نے تجھ سے زیادہ ذلیل پیدا نہیں کی تیری ہر حالت ذلیل ہے تو فنا ہونے والی ہے جس روز میں نے تجھے پیدا کیا تھا اسی روز یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ تو بھی کسی کے پاس نہیں رہے گی نہ کوئی تیرے پاس رہے گا اگرچہ کوئی دنیا دار کتنا ہی بخیل کیوں نہ ہو..... خوش خبری ان نیکو کاروں کے لیے ہے جن کے دل میری رضا اور جن کے ضمیر صدق و استقامت سے بھرے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کی جزا میرے پاس یہ ہوگی کہ جب وہ اپنی قبروں سے نکل کر میری طرف چلیں گے تو ایک نور ان کے آگے، آگے ہوگا اور ملائکہ انہیں اپنے گھرے میں لے لے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ جس قدر وہ مجھ سے رحمت کی امید رکھتے تھے میں انہیں عطا کروں گا۔“

☆☆☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعض خطبوں میں ارشاد فرمایا۔

”مومن دو خوف کے درمیان ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس مدت کے درمیان جو گزر چکی ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا کرے گا اور اس مدت کے درمیان جو باقی ہے وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں کیا حکم جاری کرے گا۔ بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کے لیے اپنے نفس کے اپنی آخرت کے

ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔“
حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے کو نصیحت کی کہ ”اے بیٹے! دنیا ایک سمندر ہے اس میں بہت سے لوگ ڈوب چکے ہیں اس میں خوف خدا کی کشتی میں سفر کرو۔۔۔ ایمان کو ہم سفر بناؤ۔۔۔ اور توکل کو با دہانی قرار دو۔ اس طرح شاید تم غرق ہونے سے بچ جاؤ۔“

ایک مرتبہ حضرت چراغ دہلوی نے شیخ عبد اللہ خفیفؒ کا قصہ سنایا۔ حضرت شیخ عبد اللہ خفیفؒ کو کہیں دعوت میں بلایا گیا۔ وہاں قسم، جسم کے کھانے تھے۔ حلوائے لوزینہ سب کھانوں سے زیادہ شیخ کے قریب تھا۔ شیخ نے ایک لوزینہ اٹھا کر نوش کیا، اچھا لگا تو دوسرا بھی اٹھا کر کھایا۔ اس وقت یہ خیال آیا کہ یہ دوسرا لوزینہ خدا کے واسطے نہیں کھایا بلکہ لذت کو کھایا دل کو پسند آیا تھا۔ ابھی وہ لوزینہ آپ کے منہ میں تھا کہ آپ نے اپنی زبان چبائی۔ خون نکلنے لگا۔ لوگ پریشان ہو گئے سب دریافت کیا تو فرمایا کہ۔۔۔ پہلے ایک لوزینہ کھایا تھا بہت لذت تھا دوبارہ پھر وہی کھایا تو خیال آیا کہ یہ کھانا خدا کے واسطے نہیں بلکہ لذت کو تھا لہذا نفس کو سزا دیتے ہوئے زبان چبائی تھی۔“

حضرت نظام الدین اولیاؒ مخلوق خدا کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ایک روز جبکہ خانقاہ میں میٹروں طالبان حقیقت جمع تھے۔ کسی درویش نے عرض کیا۔

”شیخ! ترک دنیا کیا ہے؟“ جواب میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔

”میرے ایک دوست خواجہ محمود ہیں ایک دن راستے میں انہوں نے ایک درویش کو دیکھا جو اپنے فقر کے باعث فاقہ کشی میں مبتلا تھا۔ اکثر اوقات بھوکا رہنے کے سبب اس کا پیٹ کمر سے جا لگا تھا۔ خواجہ محمود نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے ایک تانبے کا سکہ دینا چاہا۔۔۔ درویش نے خواجہ سے کہا۔ ”آج میں نے نکل (جنگلی پھل) جی بھر کے کھایا ہے۔ اور روزی کی طرف سے آج کے لیے استغنیٰ حاصل کر لیا ہے۔ اس لیے اے خواجہ مجھے اس کے کی حاجت نہیں، یہ کسی ضرورت مند کو دے دو۔“ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا۔ یہ ہے صبر اور قناعت۔۔۔ اور اسی صبر و قناعت کو ترک دنیا کہتے ہیں۔“

مجلس کے اختتام پر حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ ”ترک دنیا کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ انسان نکلا ہو کر لنگوٹ باندھ کر ایک جگہ بیٹھ رہے۔ بلکہ ترک دنیا یہ ہے کہ ستر پوشی

لیے اپنی دنیا، اپنی موت کے لیے اپنی زندگی سے اور اپنے بڑھاپے کے لیے اپنی جوانی سے توشہ لے، لے کیونکہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔۔۔ اس ذات کی قسم!۔۔۔ جس کے قبضے میں میری جان ہے موت کے بعد معافی چاہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ دنیا کے بعد جنت اور دوزخ کے علاوہ کوئی گھر ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ”مومن کے دل میں دنیا و آخرت کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جس طرح کسی ایک برتن میں آگ اور پانی کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔“ مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ ”دنیا والے برحیرت یہ وہ موت کے یقین کے باوجود دنیا کے فریب میں آ جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ کر مر جاتا ہے۔“

حضور اقدس کا ارشاد ہے کہ ”زیادہ تر میں تم پر اس چیز سے خوف کرتا ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ۔۔۔ برکات ارض میں سے تمہارے لیے نکالے گا۔۔۔ عرض کیا گیا برکات ارض کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا۔۔۔ دنیا کی تر تاز زمی۔۔۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”اپنے دلوں کو دنیا کے ذکر میں مشغول مت کرو۔۔۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک شخص کے پاس سے گزرے۔ وہ دروہا تھا جب آپ واپس آئے تب بھی اسے روئے ہوئے پایا۔۔۔ آپ نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا۔ ”اے اللہ!۔۔۔ تیرا یہ بندہ خوف سے رو رہا ہے۔ وحی آئی کہ اگر یہ شخص آسودوں کے ساتھ اپنا مغربی بہادے گا یا اتنی دیر اٹھا اٹھائے رکھے گا کہ کمر اکڑ جائے تب بھی میں اس کی مغفرت نہیں کروں گا کیونکہ یہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہے۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ”جس نے اپنے اندر چھ خصلتیں جمع کر لیں اس نے جنت حاصل کرنے اور دوزخ سے بچنے کے سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔۔۔ پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ کو پہچان کر اس کی اطاعت کی۔۔۔ دوسری شیطان کو پہچان کر اس کی نافرمانی کی۔ تیسری حق کو پہچان کر اس کا اتباع کیا۔ چوتھی باطل کو پہچان کر اس سے اجتناب کیا۔۔۔ پانچویں دنیا کو پہچان کر اس کو ٹھکرایا۔ چھٹی آخرت کو پہچان کر اس کی جستجو کی۔“

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ کے کچھ ملنے والے ان کی خدمت میں پہنچے اور دنیا کی برائی کرنے لگے آپ نے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ ”اگر تمہارے دلوں میں دنیا کی برتری کا احساس نہ ہوتا تو تم ہرگز اس کا ذکر نہ کرتے۔۔۔ قاعدہ ہے جو شخص کسی چیز سے محبت رکھتا

اور بد شکل عورت ہے۔ جس نے اپنی بد صورتی کو فریب و زینت میں چھپا رکھا ہے تو وہ سانب ہے جس کی کھال نرم مگر اندر زہر گھلا ہوا ہے تو وہ مردہ ہے جس کی قبر کو چوٹا مل کر اچلا کیا گیا ہے۔ جا..... میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں تو میرے لیے نہیں اور میں تیرے لیے نہیں۔“

☆☆☆

حضرت محمد ابن حسینؑ فرماتے ہیں کہ ”جب علم و فضل اور اہل معرفت کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو حقیر سمجھا ہے اور اسے اپنے دوستوں کے لیے پسند نہیں فرمایا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس دنیا سے متنفر رہے ہیں اور اپنے رفقا کو بھی دنیا میں لٹنے سے منع فرمایا ہے تو ان حضرات نے میانہ روی اختیار کی جو رائد بچا سے آخرت کا توشہ بنا کر رکھا..... صرف اتنا لیا جو کفایت کر جائے اور عیش کوئی کے تمام وسائل ترک کر دیے۔ غذا میں معمولی کھانا کھایا اور وہ بھی اتنا جس سے بھوک ختم ہو اور اعضا اپنا وظیفہ ادا کر کے قابل رہیں۔ انہوں نے دنیا کو اس نگاہ سے دیکھا کہ وہ فنا ہونے والی ہے۔ اور آخرت کو اس خیال سے دیکھا کہ وہ باقی رہنے والی ہے۔ انہوں نے کچھ دنوں کی مشقت سے ابدی راحت خریدی، انہوں نے وہ بات پسند کی جو ان کے رب کو پسند تھی اور وہ بات ناپسند کی جو ان کے رب کو ناپسند تھی۔

تو اسے لوگو..... آہستہ اور اچھے عمل کرو..... اللہ سے ڈرتے رہو، آرزو سے فریب مت کھاؤ..... موت کو نہ بھولو اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے رب کو نہ بھول جاؤ.....“ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اور ہم خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور بے ہوشی کا لبادہ اتار کر اپنے رب کی رضا تلاش کرنے میں لگ جائیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی توفیق کی بدولت ممکن ہوگا.....

اللہ رب العزت ہمیں دنیا کے فریب سے بچائے رکھے..... اور ہمیں اپنی محبت میں مبتلا کر دے کہ حقیقی مومن تو صرف اللہ کی رضا کا طلب گار ہوتا ہے..... آمین!

حرفہ آخر.....

اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون کی تیاری میں نہیں کوئی غلطی کوئی کمی ہوگئی ہو تو وہ مجھے معاف فرمادے..... کہ وہ اپنے بندوں کو معاف کرنا پسند فرماتا ہے..... اور اس کو اپنی بارگاہ میں قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے توشہ آخرت بنا دے..... آمین۔

کو لباس پہنے..... کھانا کھائے اور جو فتوحات حاصل ہوں انہیں بندگانِ خدا میں تقسیم کرتا رہے جمع نہ کرے اور اپنی طبیعت کو کسی دنیاوی شے کی جانب مائل نہ ہونے دے۔“ ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ ”مجھے دنیا کے بارے میں کچھ بتائیں آپؑ نے ارشاد فرمایا..... میں ایسے مکان کی کیا تعریف کروں جس میں صحت مند بیمار ہو جاتا ہے۔ جو محفوظ رہتا ہے وہ ندامت اٹھاتا ہے۔ اور جو محتاج ہوتا ہے وہ غم کرتا ہے، اس کے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عذاب ہے۔“ حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ”اگر تمام دنیا مجھے حلال طریقے سے مل جائے اور آخرت میں مجاہدے کا خوف بھی نہ ہو تب بھی میں اس سے اتنی نفرت کروں جتنی تم بڑے ہوئے مردہ جانور سے کرتے ہو اور اس سے بچ کر چلتے ہو کہ کہیں اس کی نجاست سے تمہارے کپڑے آلودہ نہ ہو جائیں۔“

حضرت سعید ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ”جب تو کسی کو دیکھے کہ اس کی دنیا بڑھ رہی ہے اور دین کم ہو رہا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہے تو وہ شخص بڑے خسارے میں ہے۔ اپنی زندگی سے کھیل رہا ہے اور اس کا ذرا احساس نہیں ہے۔“ حضرت یحییٰ ابن معاذؒ رازیؒ فرماتے ہیں کہ ”ظنندتین ہیں..... ایک وہ جو دنیا کو چھوڑ دے اس سے پہلے کہ دنیا اسے چھوڑ دے۔ دوسرا وہ جو قبر میں جانے سے پہلے اپنی قبر بنالے..... تیسرا وہ جو خالق کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے اسے راضی کر لے۔ یہ بھی فرمایا کہ دنیا اس قدر منحوس ہے کہ شخص اس کی تمنا اللہ کی اطاعت سے روک دیتی ہے۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ”دنیا میں چھ چیزیں ہوتی ہیں کھانا، پینا، لباس، سواری، نکاح اور خوشبو تو سب کھانوں میں عمدہ شہد ہے اور یہ ایک کھسی کا لعاب ہے۔ مشروبات میں سب سے اعلیٰ پانی ہے۔ جس میں نیک و بد سب برابر ہیں۔ لباس میں عمدہ ریشم ہے جسے ایک حقیر کٹر اپنے لعاب سے بناتا ہے۔ بہترین سواری گھوڑا ہے اس پر بیٹھ کر لوگ لڑتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ نکاح میں اہم چیز عورت سے محبت ہے، عورت اپنے آپ کو تو سوارانی ہے لیکن اس کی بری چیز کی طلب ہوتی ہے..... سو گھنصے کی چیزوں میں عمدہ مشک ہے اور یہ ایک جانور کا جما ہوا خون ہے۔“ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک بار دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے دنیا! میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں۔ میں جانتا ہوں کہ تو نے کسی سے وفا نہیں کی..... تو وہ بوڑھی

عمر کے کاسفر

سبل ملک اعوان

بڑی خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی جو تو نے پوری کر دی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے اللہ تیرا کرم ہے۔ یا اللہ بڑی مہربانی ہے تیری۔

پہلی نظر کی دعا قبولیت کی ہوتی ہے اور میں نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر تمام دعائیں مانگ لیں۔

پھر پورا گروپ عمرے کی نیت کر کے بزمی کے پاس آیا۔ اور طواف شروع کیا۔ میں نے بھی طواف کی نیت کی اور طواف کا آغاز کیا۔ دوسرے چکر میں مقام ابراہیم تک بھی پہنچ گئے۔ سات چکروں کے بعد نفل ادا کیے۔ خلاف کعبہ کو بھی چوما۔ دعا کی پھر سائڈ پر رکھے ٹھنڈے پانی کے گولرے آب زم زم پیا۔ پھر صفا وروہ کی سعی سے پہلے نیت کی اور توبہ و استغفار کا ورد کرتے کرتے چکر لگائے ساتھ ساتھ دعائیں بھی مانگیں۔ سات چکروں کے بعد ادھر ہی ایک سائڈ پر بیٹھ گئے۔ چونکہ جمعہ کا دن تھا تو لوگ جمعہ کی نماز کے لیے دس بجے ہی آنا شروع ہو گئے۔

جب ہم سعی کر کے بیٹھے تو ہر طرف لوگ ہی لوگ ہی نظر آرہے تھے جب باہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے پیدائش دیکھنے گئے تو جہاں لوگ ہی لوگ تھے چونکہ ہم لوگ بھی احرام میں ہی تھے تو بال کٹوا کر ہی ہم احرام سے نکل سکتے تھے۔ ہم پہنچی اپنے ساتھ لے کر گئے تھے پہلے میں نے اپنے گروپ کی ساری عورتوں کے بال کاٹے آخر میں ماما نے میرے بال کاٹے۔ اب ہم عمرے کا احرام اتار سکتے تھے مگر چونکہ آج جمعہ تھا اگر ہم لوگ واپس ہو کر چلے جاتے تو ہمیں واپس حرم کے صحن میں بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔

اور یہ جگہ تو ایسی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ بس دیکھتے جاؤ اور دل نہ بھرے، ہم لوگ واپس حرم میں آئے اور

میں اپنے رب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے عمرے کی سعادت نصیب کی۔ میرے اللہ نے مجھ گناہ گار، مجھ خطا کار کو چن لیا۔ میں گزشتہ چھ سالوں سے پیسے جمع کر رہی تھی عمرے کے لیے۔ میری ماما بھی میرے ساتھ جا رہی تھیں۔ ہم نے دعائی سے ہوتے ہوئے جدہ جانا تھا۔ دعائی انٹرپورٹ پر ہم نے فرض و نوافل پڑھ کر احرام باندھا۔ ہم صبح ڈھائی بجے مکہ مکرمہ اپنے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ اور جمعہ کا دن شروع ہو گیا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ چار بجے کے قریب سب لوگ حرم پاک میں فجر کی نماز ادا کر کے عمرے کا طواف کریں گے۔ لہذا اپنے، اپنے کمروں میں جا کر تازہ دم ہوئے۔ دوبارہ سے وضو کر کے حرم پاک میں جانے کے لیے تیار تھے۔ چونکہ ہوٹل بہت قریب تھا۔ صرف دس منٹ نکلے ابراہیم خلیل اللہ روڈ سے ہم حرم کے صحن میں پہنچ جاتے۔

سب اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ دل کی حالت تو عجیب تھی۔ لیوں پر سوائے اللہ کی وحدانیت کے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ماما کا ہاتھ تھام لیا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آنسو بہہ رہے تھے۔ باب فہد سے سیدھا چلتے، چلتے ہم اندر داخل ہو گئے۔ آہ میرے اللہ تو کس قدر جاہ و جلال والا ہے۔ پوری آب و تاب سے خانہ کعبہ سامنے تھا۔ مجھے تو کچھ ہوش نہیں تھا میں نے زاہد قطار رونا شروع کر دیا۔ اپنا سارا درد اپنا سارا غم آنسوؤں کے ساتھ بہا دیا۔ یہ گھر جسے اذان کے وقت لیوی اسکریں پر دکھا کرتے تھے آج یہاں پہنچ گئے۔ میرا اللہ بہت مہربان اور بزرگ والا ہے۔ میں حقیقت میں اللہ کے گھر آ چکی ہوں۔ تیرا شکر ہے مالک، میری

راستے میں پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ کہیں اونٹ بھی نظر آئے۔ جس راستے سے آپ نے ہجرت کی وہ تفصیل سے بتایا۔ جب حضرت ابو بکر آپ کے ہمراہ تھے۔ خبر ہم لوگ مغرب کے وقت مدینہ پہنچ گئے، الحمد للہ کہ ہوٹل بھی قریب تھا۔ کمرے میں جا کر سامان رکھ کر تازہ دم ہوئے اور مسجد نبوی کی جانب چل پڑے چونکہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا تھا لہذا ہم لوگ لیٹ ہو گئے۔ نماز بیرونی دروازہ نمبر 26 پر پڑھی۔

پھر قریبی ہوٹل پر جا کر کھانا کھایا اور مسجد نبوی میں واپس گیٹ نمبر 22 میں آئے اور نماز عشاء پڑھی۔

ساتھ کر ریاض الجنۃ کا دروازہ 3 بار کھلتا ہے ایک فجر، دوسرا ظہر، تیسرا عشاء کے بعد..... فیصلہ ہوا کہ تازہ دم ہو کر فجر کے وقت آئیں گے لہذا ہم نے نماز عشاء پڑھی۔ پوری مسجد کا طواف کیا۔ جنت البقیع کے باہر ہی کھڑے ہو کر دعا کی۔ عورتوں کو تو اجازت نہیں لہذا گیٹ کے پاس ہی کھڑے رہے۔

صبح ڈھائی بجے ہم مسجد نبوی کی جانب چل دیے کچھ دیر بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کی پھر فجر کی اذان ہوئی۔ فجر کی جماعت ہوئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہم لوگ بھی ریاض الجنۃ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انمول اللہ کی عنایت تھی کہ آج میں اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درہم حاضری کے لیے موجودھی۔

سب لوگ دعاؤں میں مصروف تھے۔ اور اس انتظار میں کہ کب دروازہ کھلے اور کب زیارت نصیب ہوگی۔ اس لمحے مجھے ایک بار ایسا بھی لگا کہ میری دھڑکن رک جائے گی میں یہاں سرکار کے قدموں میں ہی ڈھیر ہو جاؤں گی۔

میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے معافی مانگ رہی تھی کہ اچانک پھل پچی کے دروازہ... کھلنے میں چند منٹ ہیں۔ اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ خوش قسمتی سے ہمارے سامنے والا ہی دروازہ کھلا اور عورتوں کا جم غفیر تھا کہ تیزی سے دوڑتا ہوتا اندر چلا گیا۔ ماما کا ہاتھ تھامے میں بھی دوڑتی گئی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ قدم

نیچے نیچے قالینوں پر بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ سامنے خانہ کعبہ تھا اور آنسوؤں کی جھڑی پھر لگ گئی۔ ہر بندہ اللہ کی عبادت میں مشغول تھا۔ کوئی نوافل ادا کر رہا ہے تو کوئی قرآن پاک کی تلاوت، کوئی آنسوؤں سے اپنی فریاد پہنچا رہا ہے تو کوئی ہاتھ اٹھا کر مننامت سے کھڑا معافی کا طلبگار ہے۔ ہر شخص اپنی جبین اللہ کے حضور جھکائے ہوئے ہے۔ اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ غفور الرحیم ہے، وہ تو انسان کی معافی کا انتظار کرتا ہے، خود بلاتا ہے کہ اے میرے بندے مجھ سے مانگ میں عطا کروں گا۔ دعاؤں کے بعد نوافل پڑھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کی اور جب خانہ کعبہ کو دیکھ، دیکھ کر دل نہ بھرا تو میں اٹھ کر بیٹھیوں سے پہلی منزل پر آ گئی۔ ماما کے ساتھ کھڑے ہو کر اللہ کے گھر کا نظارہ کرنے لگی۔ اتنی دیر میں نماز جمعہ کا خطبہ شروع ہوا پھر نماز کے لیے جماعت کھڑی ہوئی۔

کیا بتاؤں کہ کیا سکون تھا، عمرے کی ادائیگی..... سبحان اللہ اور شکر الحمد للہ..... مکہ مکرمہ میں قیام ہمارا پانچ دن تک رہا اور میں صبح سے شام تک حرم میں گزارتی۔ ہر نماز حرم پاک میں ادا کرتی، صبح فجر سے گھنٹا پہلے آ کر طواف کرتی اور خانہ کعبہ کو نگہی رہتی۔ ہم لوگ بادام کی گریاں، خشک بھنے پنے اور ساتھ تھوڑے بھنے مکئی کے دانے بھی لے کر گئے تھے جو تھوڑی سی مقدار میں تھیلے میں پانی کی بوتل کے ساتھ ڈال کر ساتھ لے جاتے۔ فجر کی نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل پڑھتے اور دوسری منزل پر کبھی تیسری منزل پر میں چلی جاتی۔

پانچ دن بعد ہم مدینہ جانے کو تیار تھے۔ سامان بس میں لوڈ کر دیا اور... جب سارا گروپ بیٹھ گیا تو بس میں گروپ لیڈر نے سفر کی دعا پڑھائی اور ہمیں مدینہ منورہ کا تعارف کروا کر مدینہ کے حالات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے اور بعد کے بتائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالی۔ ظہر، عصر کی نمازیں ہم نے راستے میں پڑھیں۔

اس کی طرف لپکتا ہے۔

مدینہ شریف میں بہت سکون اور اطمینان نظر آیا۔ ہم نے دس دن مدینہ منورہ میں گزارے۔ آتے ہوئے الوداعی زیارت بھی کی اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اپنے گھر والوں، ملنے جلنے والوں، اولاد والوں، بے اولاد..... جن کے رشتہ ہوئے ہیں، جن کے نہیں ہوئے سب کے لیے دعائیں کی۔ مجھویں وغیرہ مدینہ سے ہی لے لیں۔ عجبہ مجبور کا ذائقہ پہلی بار مدینہ میں چکھا اور ماما سے ضد کر کے عجبہ ایک کلوزڈ بھیجی۔ کیونکہ مہنگی تھی یہ مجبور۔ گیارہویں دن فجر پڑھ کر ہم لوگ دوبارہ مکہ شریف روانہ ہوئے پھر وہاں کی زیارت میں..... مسجد بلال، عارحہ، غار ثور اور حاجیوں کے قیام کی جگہ مزدلفہ، منیٰ کی بھی زیارت کی جہاں پر حاجیوں کے لیے مستقل شینڈل کمپ بنے ہیں وہ دیکھے، حاجیوں کے لیے بنائی گئی ریل کو دیکھا نہر زبیدہ..... اور جہاں حضرت خوا اور حضرت آدم علیہ السلام کی ملاقات ہوئی اس پہاڑ پر بھی گئے۔ غرض یہ کہ خوب دل لگا کر ہر جگہ عبادت کی خانہ کعبہ کو چومنا، غلاف کعبہ کو ہاتھ لگایا۔ حطیم کی دیوار کے اندر مقام ابراہیم پر نوافل ادا کیے۔ یہ سب اللہ کا کرم تھا اللہ کی مہربانی تھی۔ مکہ سے مدینہ اور پھر مکہ جاتے ہوئے پہاڑوں سے گزرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہمارے پیارے آقا نے ہمارے لیے کس قدر تکلیفیں برداشت کیں۔ آج کل تو پھر بھی سفر کے لیے سڑکیں بنادی گئی ہیں ہم قربان ہو جائیں اپنے پیارے آقا پر۔ اب واپسی کا سفر شروع تھا۔ جدہ جانے سے پہلے الوداعی طواف کیا۔ گناہوں کی معافی مانگی۔ دوبارہ آنے کی دعا کی۔ پھر یہ سفر براستہ دہی واپس تمام ہوا۔ یوں ہم 21 دن کے بعد 29 مارچ کی صبح 3.30 بجے لاہور ائر پورٹ پر موجود تھے۔ بس اللہ کا کرم تھا اور بلاوا تھا کہ ہم نے بہت سکون سے عمرے کی سعادت حاصل کر لی۔ اللہ پاک قبول فرمائے اور آخر میں دعا ہے کہ اللہ پاک مجھے اتنی توفیق دے کہ میں کسی کو عمرہ کراسکوں (آمین)

☆☆☆

کاتب رہے پھر بھی میں دوڑتی گئی۔ سامنے سفید دیوار سی بنا کر نیچے سبز قالین بچھائے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا جہاں جہاں سبز قالین ہیں وہ ہی ریاض الجنہ ہے۔ میں اسی دیوار کے ساتھ سجدہ رہ رہتی ہوئی۔ میں نے ماما کو بولا کہ پہلے آپ نوافل پڑھ لیں میں کھڑی ہوتی ہوں پھر میں پڑھ لوں گی۔ چنانچہ ماما نے نیت باندھی اور میں بازو کھڑے کر کے کھڑی رہی کہ کوئی عورت دھکوں کی وجہ سے ماما پر نہ گر جائے۔ ماما نے چھ نوافل پڑھے۔ پھر میں نے نوافل ادا کیے اور ہم لوگ بہ مشکل جہوم سے نکل کر باہر آئے۔ میں خوب دل کھول کر روئی، آنسو بہائے دوبارہ سے نوافل پڑھے کہ اللہ پاک نے توفیق عطا کی۔ اپنے نبیؐ کے در پر بلایا۔ مسجد نبویؐ ہوا یا کہ حرم پاک ہر وقت جہوم ہی رہتا ہے ہر طرف رونق سی رونق تھی۔

سب سے خوب صورت نظارہ جورات کو پہنچنے کی وجہ سے ہم لوگ نہیں دیکھ پائے تھے۔ وہ چھتریاں کھلنے کا تھا۔ اتنا خوب صورت منظر کہ دل موہ لے۔ میں نے اپنے کمرے میں یہ منظر مقید کر لیا۔ ساری چھتریاں ایک ہی وقت میں ایک ہی آواز اور رفتار سے کھلنے اور بند ہونے کا منظر بہت دلربا تھا۔ اسی طرح ان چھتریوں کے بند ہونے کا منظر بھی منفرد تھا۔ کمال کی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔

دیگر زیارتوں کا سفر بھی بڑا ہی اچھا رہا۔ مسجد قبا، مسجد قبلین گئے مجھویں خریدیں۔ احد کا پہاڑ اور حضرت حمزہؓ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے بھی گئے۔ اللہ کی رحمت ہر جگہ نظر آئی۔ کتنا رحیم اور کریم ہے میرا رب جو کہ بہت بزرگی والا اور مہربان ہے۔ جس نے ہم گناہ گاروں پر کرم کیا۔ اور حضرت محمدؐ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔

ان دونوں مقامات پر آپؐ کو نیت جہاں سے آئے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ مگر ہر بندہ اپنی، اپنی عبادات میں مشغول، نماز کے اوقات میں تمام دکانیں کاروبار بند کر کے یا پھر آگے کھڑا لگا کر ہر کوئی نماز کی طرف بھاگتا نظر آئے گا۔ جیسے کوئی بچہ ماں کی پکار پر

احوالِ کلیوں کی مہکتی کآ

رُخ چوہدری کے معطر قلم سے



تقریب کی روح رواں عذرا رسول اپنی ایڈیٹرز کے ساتھ
دائیں سے آمنہ حماد، لبنی خیال (عذرا صاحبہ)، نزہت اصغر اور یمنی احمد

ریڈرز کو تو انتظار رہتا ہے ایسی محفلوں کا سو پاکیزہ کی روح رواں محترمہ عذرا رسول کی پلاننگ میں یہ سرفہرست ہوتا ہے کہ کب تقریب کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔ عید الفطر کے بعد سے اس کے بارے میں سوچا جا رہا تھا مگر کبھی راسخز کی مصروفیات اور کبھی دفتری یا نجی مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ کراچی سے باہر رہنے والی ہماری معزز راسخز اور تیمرہ نگار بہنیں تو صرف تنہا کر کے وہ

عزیز قارئین! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اب آپ کو اس محفل کی جانب لیے چلتے ہیں جس کی بابت آپ مختصر گزشتہ شمارے میں پڑھ چکے ہیں۔ حسب روایت ادارہ پاکیزہ کی جانب سے سن سیٹ کلب ڈیننس، کراچی میں ایک تقریب عید ملن کا اہتمام کیا گیا بلکہ اسے ہم سالانہ گیٹ نو کیدر کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا..... کراچی میں مقیم ہماری راسخز اور

باعث نہ آسکیں کی تو رفعت سراج کی بھی بہت محسوس ہوئی۔ ان کے شوہر نامدار کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی اور عطیہ عمر کے بلند ہوتے بلڈ پریشر نے انہیں آنے کی اجازت نہ دی۔ زہرہ جنید، اسلام آباد سے واپس نہ آ پائیں تو معذرت کر ڈالی۔ فرحین انظر، کبھت اعظمی، غزالہ عزیز، سیکرٹ فرخ، یاسمین رشید، عذرا آفتاب کوئی ہم راہی میسر نہ ہونے کے باعث نہ آسکیں۔ ہم نے تو نہ آسکے والوں کے اسمائے گرامی تحریر کر دیے ہیں اب تقریب کا باقی احوال رخ چوہدری نے اپنے ماہرانہ انداز میں لکھا ہے۔ مزید تفصیلات ان کے قلم سے پڑھیے گا۔

یہاں ہم خصوصی طور پر شکر یہ ادا کرتے ہیں اپنی سینئر ترین رائٹر فریدہ اشفاق کا کہ جو ادبی حلقوں میں کم، کم ہی نکلتی ہیں اور لکھنا تقریباً ترک ہی کر دیا ہے۔ اب اس محفل میں آنے کے بعد اور کچھ، کچھ رائٹرز کے کہنے کے باعث شاید دوبارہ سے لکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کے ساتھ، ساتھ دوشیزہ ڈائجسٹ کی روح رواں منزہ سہام کا شکریہ کہ جنہوں نے عذرا رسول سے دوستی کا دم بھرتے ہوئے تقریب میں شرکت کی باقی تمام معزز رائٹرز اور قابل قدر تبرہ نگاران کا

جاتی ہیں کہ ہم کیوں نہیں شامل ہو پاتے۔ ارے بھی آپ سب بھی اپنے آپ کو شامل ہی سمجھا کریں۔

12 ستمبر 2017ء بروز منگل بوقت چار بجے اس خوب صورت تقریب کا انعقاد طے پایا۔ ہم یعنی نزہت اصغر، آمنہ حماد، معاون مدیرہ پاکیزہ، لبنی خیال، مدیرہ جاسوسی ڈائجسٹ، یعنی احمد، مدیرہ سپنس ڈائجسٹ اور ہماری مہمان رائٹر عالیہ حرا ان کی پیاری بیٹی (جو آفس ہی آگئی تھیں) کے ہمراہ سن سیٹ کلب پہنچے تو وقت کی پابند سیاستاف اسی لمحے پہنچی تھیں۔ بس اس کے بعد رائٹرز کی مہربان آمد شروع ہو گئی۔ دس منٹ کے وقفے سے عذرا صاحبہ بھی تشریف لے آئیں پھر تو آہستہ، آہستہ ہال میں خوب صورت رنگا رنگ آنچلوں کی بہار، خوشبوؤں سے مہکتے خوب صورت و دلکش لمبوسات کی دیک اور خوش رنگ و گلگوں چہروں کی چمک اترتی چلی گئی۔ کبھی دبی، دبی سرگوشیاں تو بھی پُرسرت ہنسی کے جلت رنگ بچتے سناٹی دینے لگے۔ چلت رنگ سے انجم انصار کی یاد ابھری جو اسلام آباد اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں گئی ہوئی تھیں انہوں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ انشاء اللہ پھر کسی موقع پر وہ ضرور آئیں گی۔ عظمیٰ آفاق اپنی نئی مصروفیات کے



دائیں سے منزہ سہام مرزا، نزہت جبین ضیا، نزہت اصغر، سیاستاف، عقیلہ حق، افسر سلطانہ،

عذرا رسول، غزالہ رشید، مسیحہ شاہ اور عالیہ حرا



دائیں سے (استادہ) ناہید فاطمہ حسنین، سعدیہ رئیس، عقیلیہ حق، سیما مناف، عذرار رسول، شکفتہ شفیق،
 نزہت شاہ، عالیہ حرا، شائستہ اعجاز، نسیم مایارا (نشتوں پر) دائیں سے منزہ سہام مرزا (مدیر اعلیٰ دوشیزہ ڈائجسٹ)
 صبیحہ شاہ، رضوانہ پرنس، سیار ضاردا (معروف کار) اور ہابیگ

بھی شکریہ کہ جن کے معتبر ناموں اور دیگر احوال سے
 رنج چوہدری آگاہ کر رہی ہیں۔
 ایک ضروری بات یہ کہ ہم نے اپنے مہمانوں
 سے پاکیزہ کے بارے میں چند جامع تجاویز بھی مانگیں
 تو جن مہمانوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے بعد
 فرصت کے لمحات میسر آگئے تھے انہوں نے تو فوراً
 رائے دے دی باتوں نے باقی آئندہ کہہ کر ہاتھ
 اٹھالیا..... چلیں کوئی بات نہیں، یہ ملنا ملنا تو ہوتا ہی رہتا
 ہے پھر کبھی دیگران کی قیمتی رائے بھی جان لیں گے
 آپ فی الحال ان چند مہمانوں کی ہی آرا پڑھ لیجیے.....
 (پیرہ پاکیزہ)

☆ سیما مناف کی رائے کچھ یوں تھی۔
 1- ایسی تقریبات ہر ماہ ہونی چاہئیں۔
 2- مشہور و معروف پاکیزہ رائٹرز کے پرانے
 افسانوں میں سے ہر ماہ ایک افسانہ لگایا جائے۔
 ☆ ناہید فاطمہ حسنین نے کیا کہا آپ بھی پڑھیں۔
 1- سچ تو یہ ہے کہ میں پاکیزہ سے پوری طرح
 مطمئن ہوں، میرے ذہن میں کچھ نیا یا الگ

احوال تقرب

معیار پر ہی پزیرائی ملے تو یقین کریں رنگ باتیں کریں گے، ملاقاتوں میں بھی رنگ بھکیں گے۔
☆ عقیلہ حق نے تجاویز کے ساتھ فرمائشیں بھی کی ہیں۔

1۔ الحمد للہ پاکیزہ ہمیشہ سے ایک مکمل رسالہ رہا ہے پھر بھی کچھ تجاویز ہیں جو میں دینے کی ہمت کر رہی ہوں۔

2۔ رسالے میں ہر ماہ ایک بہترین افسانے کو خصوصی اعزاز دینا چاہیے ضروری نہیں کوئی تقریب ہو، سالانہ ہائی ٹی میں بھی ایوارڈ دیا جاسکتا ہے۔

3۔ سروے کے سوالات قارئین کی رائے سے بھی بنائیں جائیں تو ایک خوشگوار تبدیلی اور اپنائیت کا احساس بڑھے گا۔

4۔ میرا افسانہ ہر ماہ ہونا چاہیے۔ (ہا ہا ہا)
☆ نگہت غفار دعاؤں کے خزانوں کے ساتھ، ساتھ بہت پیاری تجاویز دے رہی ہیں۔

1۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کیونکہ الحمد للہ یہ نہایت قد آور اور ہر لحاظ سے بہتر ہے، ہر قسم کا مواد موجود ہے ہمارے پاکیزہ میں۔

3۔ ہر رائٹر کے فیملی ممبرز پر مشتمل انٹرویو، مع تصاویر ضرور شائع ہوں۔
☆ ڈاکٹر ممتاز ضیاء نے ہماری رہبری کچھ یوں کی۔

1۔ عذرا کی ہر ماہ حاضری، اس سے بہت، بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

2۔ جس محبت اور خلوص کا یہ مظہر ہے اسے قائم رہنا چاہیے۔

3۔ پرانے لوگوں کو یاد رکھنا (جو کہ رکھا جاتا ہے) اسے قائم رکھنا چاہیے۔

☆ غزالہ رسید نے اپنے خوب صورت خیالات کا بہت خوب صورتی سے اظہار کیا آپ بھی پڑھیں۔

1۔ گیت نوگیر کی تفصیل اچھے انداز میں، اچھے عنوان کے ساتھ شائع کریں۔

2۔ افسانوں کے انتخاب میں خصوصی طور پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ایک ہی خیال، پیغام کو بار بار دہرایا نہ جائے۔

3۔ مصنفین کی عزت نفس اور ان کو کہانی کے



دائیں سے نگہت غفار جمیر اطارق، نرہت اصغر، تاجید فاطمہ، حسنین، سعدیہ رئیس، معذرا رسول، بدرخ چوہدری، شائستہ اعجاز

1۔ پاکیزہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ سلسلے وار ناولز کے علاوہ مکمل ناول یا ناولٹ زیادہ تر قسط وار نہیں ہونے چاہئیں۔ کبھی، کبھی ٹھیک رہتے ہیں۔
2۔ پاکیزہ کا نیا سلسلہ طغوز مزاح کی ادبی کاوشیں قابلِ تعریف ہے۔

3۔ رائٹرز سے کوئی ایک سوال پوچھا جائے اور تمام رائٹرز اپنے، اپنے جوابات دیں..... سب رائٹرز کے جوابات ایک ساتھ شائع ہوں جو دلچسپ اور مزے دار بھی ہوں۔

☆ نزہت جمیں ضیائے مختصر اظہارِ رائے کچھ یوں کیا ہے۔

1۔ پہلی تجویز کے ساتھ، ساتھ درخواست ہے کہ ایسی تقاریب کا سلسلہ جاری و ساری رکھا جائے۔ (انشاء اللہ)

2۔ انعامی سلسلے شروع کیے جائیں۔
☆ عالیہ حرا نے تجویز تو تقریب کی دی ہے مگر تعریفی کلمات ضرور کہے (بہت شکریہ)

1۔ ایسی تقریب جلدی، جلدی کیا کریں، درمیانی وقفہ رائٹرز کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔ تمام رائٹرز کے کھلکھلاتے قہقہے، لفظوں کے چٹکے اور جملوں کی گل کاریاں اک سماں تھا افسانوی روایت تھا۔ سب رائٹرز کم اور سہیلیاں زیادہ لگ رہی تھیں۔

2۔ یہ تقریب سال میں دوبار تو ضرور ہونی چاہیے ایسا لگتا ہے جیسے لکھنے کا حق ادا ہو رہا ہے۔ عذرا رسول آپ کا پاؤں اہلنا انداز دل موہ رہا تھا۔ ویسے اسے کسی تجویز کی ضرورت تو نہیں ہے یہ اپنی مثال آپ ہے۔

3۔ شائستہ زریں کے انٹرویوز اور سروے۔ بے حد مکمل اور دلچسپ ہوتے ہیں تمام سلسلے ہی اپنی جگہ بہت مکمل ہیں۔ پاکیزہ اک ایسا رسالہ ہے جس میں ہر عمر کے پڑھنے والے کے لیے تحریر ملے گی۔

پاکیزہ کی دو شینز انیس خوب سے خوب تر کی تلاش میں بہت اچھا اور مکمل لکھتی ہیں۔ خدا کرے تمام رائٹرز



دائیں سے عالیہ حرا، عذرا رسول اور حسنہ (بٹی عالیہ حرا)

2۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ ہر رائٹر کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ اس محفل میں شامل ہوتا رہے۔

3۔ پاکیزہ ڈائری میں اچھی تحریر پر ہر ماہ نہ سہی تین مہینے میں ایک انعام ہونا چاہیے سب سے اچھے خط پر بھی انعام ہونا چاہیے۔

☆ شائستہ اعجاز کی محبت بھری تعریف کے ساتھ ایک تجویز آپ بھی پڑھیں۔

1۔ پاکیزہ ماشاء اللہ کافی شاندار جا رہا ہے۔ آپ نے جو چیزیں رکھی ہیں سب اچھی ہیں۔

2۔ تجویز کی منجائش تو نہیں ہے پھر بھی ایک آدھ مزاحیہ کالم کا اضافہ ہو جائے۔

عذرا رسول اور نزہت اصغر ماشاء اللہ ویل ڈن.....

☆ سعدیہ رئیس بہت منفرد تجاویز لے کر آئی ہیں۔

کا زور قلم اور زیادہ..... (ماشاء اللہ)

☆☆☆

احوال کلیوں کی مہک کا

اخ چوہدری کے قلم سے

انسان بنیادی طور پر متحرک رہنا پسند کرتا ہے اور یوں بھی حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ سکوت اور جمود انسانی معدے کے آسمان پر غبار اور بخارات بن کر دماغ کو چڑھ جاتا ہے تو پھر بندے کو ہولناک خواب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی ہی جمودی کیفیت ہم پر بھی سوار تھی۔ سستی کے مارے کہیں کچھ لکھا جا رہا تھا نہ کہیں آنا جانا تھا۔ مگر تھا اور اس میں جمائیاں لیتے ہم..... بس بلیوں کی طرح تانک جھانک رہے تھے کہ کہیں سے کوئی بلا لے..... کیونکہ کافی دنوں سے کوئی تقریب ایشینڈ نہیں کی تھی۔ پاکیزہ کی طرف سے کچھ انتظار تھا۔ چھوٹی عید گزر گئی..... بڑی بھی گزر گئی۔ کوئی بلا واپس نہیں..... اور پھر ہمارے انتظار کے سکوت کو ہماری پیاری سی نزہت اصغر نے توڑ ڈالا اور پاکیزہ کی جانب سے حسب سابق ہائی ٹی پرسن سیٹ کلب میں شرکت کی دعوت دی..... تو دل چونکہ بچہ ہے بچوں کی طرح خوش بھی ہوا اور خوشی کی یہ شیرینی ہم نے ناہید کو بھی

احوال تقریب

بانٹی یوں تو تقریبات میں آنا جانا ہوتا ہی ہے مگر جو مزہ اپنے ہم سخن، ہم نواؤں میں بیٹھ کر آتا ہے اس کی بات ہی اور ہے..... اور اس سلسلے میں عذرار رسول کی محبتوں کی ہمیشہ ہی سے میں معترف رہی ہوں کہ وہ اپنی رائٹرز کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ اور گاہے بہ گاہے تقریبات کا گلشن سجا کر پاکیزہ لکھاریوں کا گلہ سہ سجا کر خود بھی اس مہک سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور رائٹرز کو بھی ایک دوسرے سے جھوٹے سچے ٹھکڑے (ہاہاہا) کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

اور اس موقع کی احوال نگاری کے لیے ہم جیسے احوال نگار کو موقع پر پہنچ کر پیاری، پیاری دوستوں کو رکتے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہیے تھا مگر کیا کیجیے کہ اس احوال نگار کا تعلق پاکستانی قوم سے ہے جو کوئی بھی بل جمع کرانے کے لیے آخری ڈیٹ کی شدت سے منتظر رہتی ہے۔

خیر جی احوال نگار کے ساتھ ایسا ہی ہوا میزبان نزہت نے ایک ہفتہ قبل دعوت دی احتیاطاً وقت پر پہنچنے کی نصیحت بھی سینڈ کر دی تاکہ تمام رائٹرز سہیلیاں آپس میں کھل مل جائیں۔

خیر سے گلانی جوڑے باکے دو چہرہ انیاں سن سیٹ کلب، ڈیفنس کو چلیں..... مگر ہماری ہوشیاری کو لگی



دائیں سے ہابیک، نامور شاعرہ ثمین سیف، آمنہ حماد، عذرار رسول، بختی خیال، فریدہ اشفاق، نزہت اصغر، یحییٰ احمد اور ڈاکٹر ممتاز ضیا

اہلک لی نظر پورا ایک گھنٹا عالم ٹریفک نے ہمیں
 ۱۰ لے رکھا۔ وقت گزرا جا رہا تھا، ہماری ہارٹ بیٹ تیز
 ۱۱ لاتی جا رہی تھی۔ چشم تصور میں عذرا رسول اور نزہت
 امن لو سب سے باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ ٹریفک
 ملنا اور گاڑی ابھی تھوڑی دور اور چلی ہی تھی کہ ٹائر
 صاحب اپنی ہوائی لکے سڑک پوس تھے۔ انفٹ.....
 آج تو تقریب میں پہنچنا ناممکن، یہ دل و دماغ کا
 متفقہ فیصلہ تھا۔ اب سعودی عرب سے آئے ہوئے
 ہمارے بھیا جی اکیلے ہی ٹائر کی تبدیلی کے عمل میں
 مصروف تھے۔ بیگم بھی ویسے حوصلہ بردار ہی تھیں۔
 بھی رائٹز بورمٹ ہوتا جب احوال نگاری
 کرنا ٹھہری تو یہ احوال بیان کرنا بھی ضروری..... خیر
 جب ہمارے "F.16" نے ہمیں سن سیٹ کلب کے
 گیٹ پر اتارا تو لگتا تھا تقریب کا ہاتھی گزر چکا ہے پر
 دم ہانی تھی۔

اب اندر جاتے ہوئے ندامت نے دامن قحام
 کر رکھو..... یہ کوئی وقت ہے..... ایک ہفتہ پہلے بتایا
 گیا اور محترمہ اب تشریف لارہی ہیں، ناہید سے مشورہ
 کیا کہ واپس چلتے ہیں اور ایک معذرت کال کر کے
 نزہت اور عذرا رسول کی ہمدردی سمیٹ لیتے ہیں مگر یہ
 جو منیر صاحب ہیں ناں اکثر اوقات نامناسب موقع پر
 ہاگ جاتے ہیں..... انہوں نے ہمارے بال نوچ کر
 کہا۔ "جب یہاں تک پہنچ ہی گئی ہو..... تو..... اندر
 جاؤ، مرو، میری سکھیوں یقین کرو..... ہال کی
 سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سر ندامت سے جھک رہا تھا۔
 اندر پہنچے تو..... "واؤ..... زبردست" کی آوازیں کے
 ساتھ مختلف قسم کی خوشبویات نے ہمارا استقبال کیا۔

"ارے رخ اتنی دیر کردی بھی تم نے..... ہم تو
 تمہارا انتظار کر رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم
 ضرور آؤ گی....." یہ وہ جملہ تھا جس نے ہل بھر میں
 ہمارے اندر ٹائر والی ہوا بھردی..... یہ جملہ پاکیزہ کی
 روح رواں عذرا رسول صاحبہ کا تھا جو گھر سے گلابی
 پھولوں والے آف وائٹ رنگ کے خوب صورت

لباس میں مثل گلاب ہی لگ رہی تھیں۔ ماشاء اللہ ان
 کے حسین اخلاق نے ان کی شخصیت اور چہرے کو ماند
 نہ پڑنے والا حسن دیا ہے۔ ان کا جملہ مجھے معتبر
 کر گیا۔ "شکریہ عذرا!"

سب ہی دوست رائٹز باتوں میں مصروف
 تھیں۔ ہماری آمد سے پہلے نہ جانے ان خواتین نے
 کیا..... کیا باتیں کی ہوں گی کچھ دیر کے لیے میری سونی
 پیاری سہیلیاں میری طرف متوجہ ہوئیں..... دل چاہا
 سب کو دل میں بٹھا لوں جو اتنی محبت سے مل رہی
 تھیں..... سب سے پہلے فریدہ اشفاق ملیں، ارے
 فریدہ ایک مدت کے بعد دیکھا، وہی پیاری شکل وہی
 شفیق مسکراہٹ..... بہت خوشی ہوئی انہیں دیکھ
 کر..... اور خوشی تو مجھے اس وقت ہوئی جب عالیہ حرا بھی
 اپنی ہم شکل بیٹی کے ساتھ گلے مل رہی تھیں سچ، سچ عذرا
 آپ کا بے حد شکریہ آپ بڑے اچھے پیارے دوستوں
 سے ملواتی ہیں..... "کیسی ہو گڑیا؟" یہ جملہ کہہ کر مجھے
 گلے لگانی والی نزہت جیں ضیا تھیں..... پیاری نزہت
 نے ساری محبت لفظ گڑیا میں سمیٹ دی..... کھبت غفار
 آپا، دعاؤں کا ہار پہنائے ملیں۔ اس دوران عذرا بار،
 بار یہ کہتی رہیں..... "ارے ابھی پہلے کچھ کھالو پھر سب
 سے ملنا۔" ایک تو یہ کہ کھانے پر قیامت گزر چکی تھی اور
 دوسرے میری سکھیاں اب اپنے، اپنے ڈرائیورز کو فون
 کر رہی تھیں۔ پھر میں نے منزہ سہام کو دیکھا سوائے
 سلام کچھ اور بات نہ ہوئی کہ وہ فلائی کر گئیں پھر سیمہ
 مناف پر نظر پڑی جنہوں نے بے خودی لکھ کر سب کو...
 بے حد متاثر کر دیا تھا۔ اب غزالہ رشید کے ساتھ بیٹھی جائے
 سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ رضوانہ پرنس جانوسی چھیلی
 سیمہ رضا ردا دل گردہ ہاں، ہاں ابھی ملتی ہوں ارے،
 ارے تسنیم ماپا راک جا میں بھی..... میں تو آپ سے
 ملی بھی نہیں..... وہ عذرا سے گلے مل رہی تھیں تقریب
 سے رخصت چاہ رہی تھیں۔ عقیلہ حق نے قسم کھائی تھی کہ
 خوب صورتی اور شاندار تیاری کے سارے ریکارڈ توڑ
 دوں گی..... قارئین تصویریں بھی خوب لی جا رہی



دائیں سے (بٹی ناہید فاطمہ حسنین) عذرا رسول ناہید فاطمہ حسنین اور شبنم سیف

بچی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی کی نوید سال بھر پہلے مجھ جیسی رائٹر کو سنا دی تاکہ ہال کی بتیاں بند ہونے سے پہلے پہنچ جاؤں..... شکریہ ناہید!

رائٹر اسما قادری سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اور یہ ایک اور حسینہ کہنے کو تانی جان، دادی جان ہیں لیکن دیکھنے میں میاں ہیں نرم لہجے کی خوب صورت سی شاعرہ گفتگو میں شوق ہیں۔

سعدیہ رئیس کیسی ہو بھئی اس ابتداء سے جملے پر ان کا خدا حافظ کہنا احساسِ جرم دلا گیا۔ اور دیر سے پہنچو..... ”اللہ تو انوں کو کچھے ٹریفک والو..... تے تار پائی“ ان کی وجہ سے میں اپنی پیاری، پیاری دوستوں سے جی بھر کے بات بھی نہیں کر پائی۔ میری عدم موجودگی میں سب نے مٹتی مڑے، مڑے کی باتیں کی ہوں گی۔ عذرا رسول کے مڑے دار چٹکے..... رضوانہ پرنس کی باتیں باوقار سی صبیحہ شاہ... پر خلوص اختر شجاعت، جن کی دینی تحریروں کی وجہ سے دل میں ان کا ایک خاص مقام ہے..... بھال ہے جوان سے زیادہ بات ہو سکی ہو۔ صبیحہ شاہ کی مہربان سی مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ ان کا انٹرویو بھی زبردست تھا۔ ہما بیک اپنی شاعرہ دوست شبنم کے ہمراہ تھیں۔

فہمیں..... سیلفیاں بھی ہو رہی تھیں مگر..... مگر ایک خاتون غیر حاضر ہیں جن کی تحریر کی انگلیوں کی جلتی جگ چاندنی بکھیرتی ہے تو ”بہت اچھا لگتا ہے“ بی انجم انصار جن کو مجھ سمیت سب نے ہی بہت، بہت، بہت مس کیا..... نزہت نے بتایا انجم اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی ہیں۔ انجم آپ کو بہت مس کیا (جی بالکل) ذکر آیا نزہت کا تو..... میں اس خاتون سے باقاعدہ مجلس ہوں۔ بھئی اس لیے کہ ہر ملاقات میں اسماٹ سے اسماٹ ہو رہی ہیں.....

اور دوسری خاتون، حسین سے حسین تر..... یعنی عذرا رسول..... لیکن عالیہ حرا کو دیکھ کر قدرے تسلی ہوئی کہ ہماری طرح کوئی اور بھی وزن بڑھانے پر تھلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا اپنی بہن اور بھانجی کے ساتھ تھیں۔ حمیرا طارق..... شائستہ اعجاز عذرا کی دوست ہیں بہت محبت سے ملیں لیکن یاسمین رشید نظر نہیں آئیں..... وہ بھی عذرا کی عزیز دوست ہیں اور ہمیں بھی بہت پسند ہیں۔ پاکیزہ کی تمبر نگار گینہ ضیا گلش اپنی پیاری سی بیٹی کے ساتھ نظر آئیں..... بے حد پیاری، محبت کرنے والی خاتون ناہید حسنین اپنی بیٹی جس کو عذرا بار، بار حسینہ کہہ رہی تھیں۔ ماشاء اللہ حسنین

ہماری وجہ سے رکی ہوئی تھیں مگر گھر سے محترم معراج رسول کے ملازم کے فون آنے پر معذرت کرتی اٹھ گئیں..... کہ ”بھئی میں رک تو جاتی مگر معراج صاحب کو کھانا خود کھلاتی ہوں۔“ ان کے جاتے ہی ہم بھائی، بھابی کو جلد آنے کے لیے فون کرنے لگے۔

نزہت جبین اور نگہت غفار ہمارے ساتھ، ساتھ رہیں۔ ہاں جانے سے پہلے قارئین کے منہ میں پانی لانے والی اشیائے خوردنی تو گھنوا دوں جسے سب لے کر لے لے کر کھایا جیسے مزیدار حلیم مسالوں کی ورائٹی کے ہمراہ، مگر گرم خستہ سموسے، الفریڈو پاشا، جو بہت ہی لذیذ تھا، چکن سینڈوچز، گرم، گرم گلاب جامین اور کریمی چیٹریز اس کے علاوہ کولڈ ڈرنک، چائے، تہوہ، وغیرہ الگ ٹبل پر تھا۔

میں عذرار رسول صاحبہ سے یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ آپ جو گاہے بگاہے دوستوں کو، رانٹرز کو جمع کرتی ہیں سب ملتے ہیں نئی دوستیاں وجود میں آتی ہیں تعلقات بنتے ہیں پرانے فریٹس ہوتے ہیں، یہ ایک کاہ خیر ہے محبتیں بانٹنا، سہینا کار خیر ہے اور مل کر بیٹھنا اور پھر اہتمام کرنا اللہ کریم کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کار خیر کا اجر عظیم دے اور آپ کی ذاتی زندگی کے آنگن میں ہمیشہ خوشیوں کے پھول مہکتے رہیں، آمین ثم آمین..... اب مجھے راستہ دیں، نزہت اور آمنہ سے چھپ جانے دیں۔

آخر میں میری کیا بلکہ سب کی پُر خلوص دعا ہے کہ عذرار رسول صاحبہ، معراج رسول صاحب اور ان کے بیٹے، بہو خوش رہیں، سلامت رہیں اور ایسی پاکیزہ محفلیں سجاتے رہیں۔ پاکیزہ والوں کی یہ اداسب سے اچھی ہے کہ ڈھیر ساری پاکیزاؤں کو ایک جھت کے نیچے اکٹھا کرتے ہیں۔ ایسی پیاری محفلیں سجانے والے سلامت رہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔ پیارے قارئین مجھے بھی دعاؤں میں ہا رکھیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆☆

بھئی آمنہ محادثہ نے احوال لکھنے کو کہا تھا اور پابند کر دیا تھا مجھے تین صفحات کا..... تو لڑکی ایسا کیسے ہو سکتا ہے عذرار رسول کی پاکیزہ محفل ہو ان کی پیاری سی پاکیزہ رانٹرز ہوں اور جو شریف نہیں لائیں ان کو بھی تو مس کیا ہے ناں..... سیکنڈ فرخ تو کینٹ میں ہماری ہی پڑوسی ہیں وہ بھی نہ آسکیں۔ عطیہ عمر، اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے اور افسر سلطانہ سے اتنی سی بات ہوئی کہ صرف فون نمبر ہی لیے جا سکے۔ سہارا دار میں نے تمہارے خوب صورت لہجے میں خوب صورت اور اچھی باتیں بہت مس کیں۔ اب میں اپنی پیاری سہیلیوں غزالہ رشید اور سیما مناف سے کچھ بات کرنے لگی ہوں۔ سیما مناف کے مشورے میرے لیے بہت قیمتی ہوتے ہیں ان سے کی گئی گفتگو قارئین آف دی ریکارڈ ہے۔

میں ان تمام مہکتی کلیوں سے مطلب رانٹرز سے معذرت خواہ جن کو میری کوئی بات بری لگی ہو دوست بستہ معذرت خواہ ہوں..... اور اگر پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو دل میں خوب ”یہ“ ”وہ“ کہہ لیجئے گا۔ (ہا ہا ہا)

بھئی آمنہ محادثہ اور نزہت اصغر تم لوگ مجھے گھورو

مت..... ہاں اپنا غصہ دل میں اتار لو..... میں تو احوال یاراں پورا کر کے ہی دم لوں گی جو اتنے دنوں سے روکا ہوا ہے۔ ارے بھئی میں بھول جاؤں مجھے اپنی بھانجی عالیہ حرا کی بیٹی کو ڈانٹنا ہے، بچی نہ وڈیو اچھی بنی ہے نہ ہی کوئی ڈھنگ کی تصویر آئی ہے..... اب یہ نہ کہنا آئی آپ جیسی ہیں ایسی آئی، چلو اگلی ملاقات میں تم اپنی اس غلطی کا ازالہ کر لینا ورنہ تمہاری ماں کی خیر نہیں..... ارے ہاں یاد آیا اس تقریب میں میرے ساتھ ایک خاتون آئی تھیں ناہید چوہدری کے نام سے..... مجبوتوں کی بھیڑ میں وہ نظر ہی نہیں آئیں۔

”ارے بھئی ناہید، رخ ایک تو دیر سے آئی ہو اب تصویریں تو بنالو.....“ عذرار صاحبہ کی آواز آئی۔

لہجے جناب آدھے پون گھنٹے میں ادھوری ملاقاتیں ہوئیں ادھوری شکایتیں ہوئیں مگر ملاقات میں مکمل محبت سمیٹی۔ کھلتے گلاب کی طرح عذرار رسول آخر میں صرف

ایک سو سال کی تقاضے اور بچوں کی تربیت؟

سائستہ زریں

ایک سو سال کی تقاضوں کے پیش نظر اپنے بچوں کی تربیت میں آپ کن امور کو پیش نظر رکھتی ہیں؟

شگفتہ فرقت

(صدر انجمن بھوپال)

ایک سو سال کی تربیتی ضرورت بچوں کی تربیت کی ہے پہلے شاید کسی نہیں رہی۔ آج کا زمانہ کمپیوٹر کا ہے ہر چیز تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ مثنوں کا کام سینکڑوں میں ہو رہا ہے۔ بچے بڑے سب



موبائل کی دنیا میں گن ہیں۔ مختلف ایپس چل رہے ہیں۔ تقریباً ہر گھر میں کھانے کے وقت، چائے کے وقت غرض مختلف کاموں کے وقت سب موبائل میں مصروف ہیں۔ موبائل کوئی بری چیز نہیں اس

کے بے شمار فائدے ہیں لیکن آج افراطی اور محبتوں سے دوری کے اس ماحول میں ہمیں بچوں کی تربیت کے لیے انہیں سمجھانا ہوگا کہ موبائل کے ساتھ، ساتھ گھر والوں اور گھر آئے مہمانوں کو وقت دینا بھی بہت ضروری ہے۔ ہر وقت کے موبائل کے استعمال نے بچوں کو گھر، بھائی چارگی، محبتوں اور ایک دوسرے کے مسائل سے بیگانہ کر دیا ہے۔ بچوں کو سمجھانا بہت ضروری ہے کہ موبائل اور کمپیوٹر کی اپنی اہمیت ہے اور رشتے ناؤں کی اپنی۔ دونوں طرف توازن رکھنا بہت ضروری ہے۔

سعدیہ ہما شیعہ

(ایڈووکیٹ، شاعرہ)

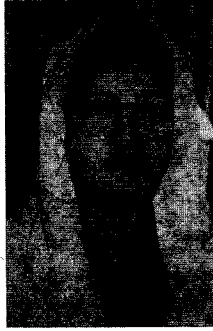
صدی کوئی بھی ہو بچوں کی تربیت میں اسلامی امور کو

جتنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے بیسویں صدی میں تخلیق کیا جانے والا پروین شاکر کا یہ عہد اس عہد کے بچوں کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب الیکٹرانک میڈیا نے بڑوں، بچوں سب پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ اس کے باوجود ماؤں کے لیے بچوں کی تربیت کا عمل کارِ محال نہ تھا۔ بچے والدین کی زیادہ سنتے اور اپنی کم سناتے تھے۔ لیکن ایک سو سال کی سوشل میڈیا اور خود ارادیت (اپنے معاملات خود سنبھالنا) کے زعم میں مبتلا بچوں کی تربیت ماؤں کے لیے جاں کاغی سے کم نہیں۔ آج کے باشعور بچوں سے کسی معاملے میں اگر جواب طلبی کی جائے تو اپنی خود اعتمادی اور علمیت کے گمان میں گرفتار یہ بچے جواب میں سوال در سوال کر کے بڑوں کو حیرت اور آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

نونہال ہوں یا نوجوان اب سب کا شیوہ یہی ہے۔ آج کے بچے خود کو ہر معاملے میں اپنے والدین سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کی ان باریکیوں سے بھی باخبر ہیں جن کی ابجد سے اکثر والدین بھی واقف نہیں۔ ان حالات میں ان بچوں کی ماؤں پر ان کی تربیت کی ذمے داری پہلے کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی کہ انہیں اپنے بچوں کو ایک سو سال کی تقاضوں کے مطابق پروان چڑھانا ہے اور اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات کا امرت بھی ان کے اندر گھولنا ہے کہ کہیں ان کے یہ بچے ترقی یافتہ دور میں سوشل میڈیا کے برق رفتار ارتقا تک غیر ضروری رسائی حاصل کر کے خنزیر کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس ضمن میں اکثر ماؤں کو پریشان دیکھا گیا ہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور ماؤں سے دریافت کیا کہ.....

پیش نظر رکھوں گی کہ ہماری بقا دین اسلام میں ہے۔ اپنے بچوں کو دین سے جوڑیں گے تب ہی کامیابی ملے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ



بچوں کو دینی مدرسوں میں داخل کرادیں۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دین کے ساتھ، ساتھ دنیاوی تعلیم بھی بہت ضروری ہے اور ہمارے دین کو پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے جو اچھے

طریقے سے دین کا احیا کر سکیں۔ آج ہم دہرے معیار میں مبتلا ہیں۔ معاشرتی تقاضے کچھ اور ہیں اور دین کے کچھ اور ایسے ہیں۔ اکیسویں صدی کا ساتھ بنانے اور بچوں کو بے حیائی اور فحاشی کے اس طوفان سے جہاں ایک فکری بے بسی کے سامنے ہے اس سب سے بچنے کے لیے تربیت میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے دین کی چھتری بھینکنے سے روک سکتی ہے۔ ورنہ ہماری سلیبس بے باکی کے اس سمندر میں غرق ہو جائیں گی۔

سمر فاطمہ

(ایگزیکٹو انجینئر پاکستان ریفرنری لمیٹڈ)

موجودہ دور کے پیش نظر آج اکیسویں صدی میں بچوں کو نہایت سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے سر ہونے منت بچوں میں وقت سے پہلے ہی ہر چیز کی آگہی اور سمجھ بوجھ ہے۔ جس کی وجہ سے بچوں کو ہر میدان میں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور نمایاں صلاحیتیں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر میری اولین ترجیح تعلیم ہے۔ میرے خیال سے والدین کو تعلیم میں بچوں پر



میں سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور نمایاں صلاحیتیں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر میری اولین ترجیح تعلیم ہے۔ میرے خیال سے والدین کو تعلیم میں بچوں پر

خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے بچے کلاس میں ہر امتحان میں شروع ہی سے ممتاز رہیں۔

کیونکہ یہ چیز بچوں میں خود اعتمادی کا باعث بنتی ہے۔ دوسرے نمبر پر میری کوشش ہوتی ہے بچوں میں اخلاقیات کی پاسداری اور اقدار کی پابندی پیدا کی جائے۔ کیونکہ موجودہ صدی میں یہ روایات کھو چکی ہیں۔ والدین غلط حرکت پر اپنے بچوں کی حمایت کرتے ہیں۔ جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اور آخر میں ہمیں اپنے بچوں میں مذہبی فرائض کی تعلیم اور آگہی بھی دینی چاہیے۔ کیونکہ اسلام کا مہیاب زندگی گزارنے کے لیے ایک مکمل ضابطہ نجات ہے۔

عقیلہ حق

(مصنفہ)

جن لوگوں نے بیسویں اور اکیسویں صدی کے درمیان سفر کیا ہے وہ ان حیرت انگیز تبدیلیوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور میں بھی بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی اکیسویں صدی کی ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس صدی کے بچوں کو مادرائی کہانیاں نہیں سنا سکتے۔ اس صدی کے الیکٹرانک دور کے بہت... پُر اعتماد، بولند اور چیلنج کو پسند کرنے والے بچے ہر چیز کو سترس میں رکھتے ہیں۔ چند لمحوں میں ان کی انگلیاں مشرق سے مغرب کا سفر کی بورڈ کے ذریعے طے کر لیتی ہیں۔ کیونکہ میں اکیسویں صدی کی ماں ہوں اس لیے میں ان کی پڑھائی کے ساتھ، ساتھ ان کے مسائل پر بھی نظر رکھتی ہوں۔ ان کے دوستوں سے بھی دوستی رکھتی ہوں اور اکثر ان کے دوستوں کی لسٹ کم کرتی رہتی ہوں۔ میں اپنے بچوں کو مارتی نہیں بلکہ سمجھاتی ہوں ان کی دوست بن کر، ان کے دل میں اتر جاتی ہوں اور ان کے دل میں چھپے خدشات اور جذبات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں ان سے جھوٹ نہیں بولتی جو مسئلہ ہو وہ ان کے ساتھ شیئر کرتی ہوں۔ بہت چھوٹی عمر سے میرے بچوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو گیا ہے۔ اگر وہ بارہ سو روپے کے پزا کی فرمائش کرتے ہیں تو میں ان کو بتاتی ہوں کہ بارہ سو روپے میں بعض لوگ ایک ہفتے کا راشن خریدتے ہیں تاکہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھیں تو آسائش کے ساتھ، ساتھ دوسروں

مونا وسیم

(قلمکار)

آج کے دور میں بچوں کی اچھی اور جدید تعلیم جسے حاصل کر کے وہ دنیا میں اپنا مقام بنائیں ہر والدین کی خواہش ہے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا کم پڑھے لکھے۔ میں خود ایک بڑھی لکھی خاتون ہوں اور میرے بچے اچھے اور بڑے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں اس کے ساتھ ہی دینی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دنیاوی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر



معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن دنیاوی تعلیم سے بڑھ کر دینی تعلیم ضروری ہے کہ بچے کے پاس دنیا تو ہے مگر دین نہیں تو ایسا ہے کہ گاڑی تو ہے لیکن وہ چلتی نہیں، ایک ایسا پھول ہے جس میں

خوشبو نہیں۔ دینی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے کے حوالے سے ایک، ایک چیز سکھائی جاتی ہے قرآن حکیم مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اعلیٰ دنیاوی تعلیم حاصل کر آج کے بچے والدین کی عزت نہیں کرتے کیا فائدہ ایسی تعلیم کا کہ جس سے بچے دنیا تو سنوار لیں مگر عاقبت نہیں۔ دینی تعلیم حاصل کر کے صرف بچوں کی ہی عاقبت نہیں سنورے گی بلکہ والدین کی دنیا بھی سنورے گی اور یہی بچے ان کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں گے۔ اور والدین دنیا میں عزت سے زندگی گزار سکیں گے۔

فصیحہ آصف خان

(شاعرہ و مصنفہ)

آج کا دور بہت تیز جا رہا ہے۔ میٹ اور میڈیا کا

کی ضروریات کا خیال بھی رکھیں۔

سوشل میڈیا، الیکٹرانک ترقی، گلوبل دنیا کے ریوٹ، موبائل فون اور ایسی بہت ساری چیزوں کی موجودگی میں سب سے اہم چیز اور بات یہ ہے کہ میں ان کو

یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئی ہوں کہ یہ سب ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسان کا کردار ہوتا ہے۔ بہت سی چیزیں دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ ایک دن ہم سب کو اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اکیسویں صدی ہو یا بیسویں صدی ہر صدی کی ماں ایک جیسی ہوتی ہے اور میں بھی ہوں۔

عرشی زبیر

(معلمہ)

بچ تو یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں بچوں کی تربیت ماؤں کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ میری کوشش اور دعا یہی ہے کہ اس آزمائش میں اللہ کے کرم سے سرخرو رہوں (آمین)۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بے شک انسان اس کی کشش سے دامن نہیں چھڑا سکتا لیکن اس کے ساتھ، ساتھ ہم ماؤں کی بڑی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں سے اس کا درست اور ایک حد تک استعمال کرائیں اور جہاں اس کا استعمال ضروری نہیں اس سے گریز کی تاکید بھی کریں۔ بالخصوص قرآن حکیم کی تلاوت کے وقت اور کھانے کے وقت موبائل ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے یہ بات ادب اور تہذیب دونوں کے خلاف ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے مسلمان بچوں کو جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ بچوں کی اس سے واقفیت بے حد ضروری ہے تاکہ مسلمان کسی سے بھی پیچھے نہ رہیں۔ بس ضرورت ہے تو ان اشیاء کے استعمال میں توازن کی کہ توازن کامیاب زندگی کی بنیاد نہیں اس کا اہم حصہ بھی ہے۔

گا۔ آج کل کے مادی دور میں جبکہ ہر دوسرا شخص بچپن کے بچے بھاگ رہا ہے۔ ایسے میں اولاد کو بچپن سے زیادہ انسان اور اپنی قدر کرانی چاہیے۔ انسان کی قدر جدید ایجادات کی کئی برائیوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

☆☆☆

عزیز قارئین! بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ماؤں نے بچوں کی تربیت میں دنیا کے ساتھ، ساتھ دین کو بھی شامل کیا ہے۔ بلاشبہ اسلامی تعلیمات، روایات اور مشرقی تہذیب کو غیر محسوس طریقے سے اگر تربیت کا حصہ بنالیا جائے، انہیں خیر و شر کا فرق سمجھایا جائے اور اس کے ساتھ، ساتھ اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا جائے کہ دنیا کی بہترین اور کارآمد ایجادات مسلمان سائنسدانوں کی مہربان منت ہیں..... اس کے علاوہ مسلمان حکمرانوں کی اپنے دور میں کیے جانے والے ترقی کے کاموں سے بھی بچوں کو باخبر کیا جائے تو یقیناً احساس کسرتی اور کم مائیگی کا شکار یہ بچے اس اعتماد سے اکیسویں صدی کے تقاضوں کے تحت ترقی کا سفر طے کریں گے کہ دنیا کی اس ترقی میں مسلمانوں کا کردار بہت اہم ہے۔ اور جو کہیں تربیت میں کمی رہ جائے تو جدید ٹیکنالوجی کا بکثرت استعمال، سوشل میڈیا کی برق رفتاری اور قبل از وقت غیر ضروری معلومات کی بچوں کے ذہنوں تک رسائی ان کے لیے سم قاتل بن جائے گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مائیں نہایت دأشمندی سے بچوں کو ان اشیاء کے متوازن اور درست استعمال کی تلقین کریں کہ اس سے بچوں میں احساس ذمے داری پیدا ہوگا۔

بے شک یہ بچے ہماری کائنات ہیں ہمارے دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی روشنی ہی نہیں ہماری زندگی بھی ہیں اور زندگی کی حرارت کے لیے تناسب کے ساتھ، ساتھ دینی و دنیاوی تعلیم و تربیت کا ٹانگہ بہت ضروری ہے کہ یہی توانائی ہمارے آج کے بچوں کو آنے والے کل میں مسلم طاقت بن کر عالمی سطح پر خود کو منوانے کا اہل ثابت کرے گی، انشاء اللہ۔

☆☆☆

زمانہ ہے۔ بچے اس میں بری طرح پھنسنے اور دھنسنے جا رہے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر گھر کا ماحول دیندار اور اسلامی ہو تو بچوں کی اعلیٰ تربیت ممکن ہے۔ والدین بچوں کو دینی تعلیم کے زور سے آراستہ کر دیں یہ تب ہی ممکن ہے جب والدین خود راہ راست، اور صراطِ مستقیم پر عمل پیرا ہوں۔ اپنے بچوں کو اسلام کی شخصیات سے روشناس کرائیں۔ برے بھلے کی تمیز سکھائیں ان پر نظر رکھیں۔ ان کو وقت دیں، تاکہ دوستانہ و اچھے ماحول میں رہ کر وہ ان فضولیات سے دور رہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے بچوں کے ساتھ محبت آمیز رویہ استوار کریں۔

اسما ناصر

(گھریلو خاتون)

آج کے دور میں بچوں کی شخصیت بنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس کے لیے بچوں کی یکساں دینی و دنیاوی تعلیم بہت اہم ہے۔ بچوں کی تربیت میں یہ بات شامل کرنی چاہیے کہ ان کے سب سے زیادہ بچے اور مخلص دوست ان کے والدین ہیں۔ جو برے بھلے وقت میں آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ اور کبھی بچوں سے کوئی غلطی ہو جائے تب انہیں یہ اعتماد ضرور دلائیں گے کہ اگر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ آئندہ اسے نہیں دہرائیں گے تو والدین ان کی مشکل حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ بچے والدین سے کبھی کبھی نہ چھپائیں کیونکہ اس صورت میں وہ خود مزید مشکل میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی بڑی اور اہم ضرورت بیٹوں کے ساتھ، ساتھ بیٹیوں کی اچھی جدید تعلیم ہے جو والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے۔



اور بیٹیوں کے ساتھ، ساتھ بیٹیوں کی اچھی تربیت بھی از حد ضروری ہے اور اگر بیٹیوں کی تربیت میں خواتین کی عزت کرنا بھی شامل ہو جائے تو بہت سی سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے۔

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

ممتاز نثر نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا شمار ملک کے معروف و مقبول مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ماہ انہی مزاح نگار کی بہترین کاوشوں میں سے ایک باب ”خندہ پیش آنیاں“ منتخب کیا گیا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے بانوق قارئین ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

میں۔ کہتے ہیں ”عورت کوئی راز نہیں رکھ سکتی۔“ حالانکہ عورت گہمتی ہے۔ ”میں تو راز رکھ سکتی ہوں، وہ لوگ نہیں رکھتے جنہیں میں بتاتی ہوں۔“ ایک عورت نے اپنی سہیلی سے شکایت کی کہ تم نے اس سے وہ بات کہہ دی ہے حالانکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس سے مت کہنا۔ ”اچھا“ سہیلی افسوس سے بولی۔ ”میں نے تو اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں ہرگز نہ بتائے کہ میں نے اسے یہ بات بتادی ہے۔“ اس پر عورت نے طویل آہ کھینچی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے اب تم اسے مت بتانا کہ میں تم سے شکایت کر رہی تھی۔“ اکیلی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے لیے پر نفوس خود خریدتی ہے۔ عورت سب سے زیادہ توجہ اپنے آپ کو دیتی ہے۔ سقراط نے کہا تھا۔ ”ایک بار آپ نے مرد کو عورت کے برابر کر دیا تو پھر مرد بھی اس کے برابر نہ ہو سکے گا۔“ بیسویں صدی میں جو عورت خود کو ذہین سمجھتی ہے، وہ مردوں کے برابر حقوق مانگتی ہے۔ جو ذہین ہے، وہ نہیں مانگتی۔ بیوی کے روپ میں ذہانت اور خوب صورتی کیجا ہو سکتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ دوشادیاں کرنا اتنا بھی آسان نہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کہا۔ ”میں شادی کرنے کے معاملے میں ہاف ماسٹڈ ہوں۔“ تو

بین الاقوامی شہرت یافتہ فوجی دانشور مارٹن وین کے بقول اکیسویں صدی میں افراتفری اور بد نظمی کا دور دورہ ہوگا، کوئی ملک دوسرے ملک پر حملہ نہ کرے گا بلکہ ملک کے اندر ہی نسلی، لسانی، مذہبی و سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی آپس میں لڑائیاں ہوں گی۔ یہ سن کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اس حساب سے ہمارا پاکستان اکیسویں صدی میں پہنچ بھی چکا ہے۔

امریکی ماہرین نے اکیسویں صدی کی یہ نشانی بتائی ہے کہ اس میں مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ نظر آئیں گی۔ خواتین ملکی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں اور مقام بھی ریڑھ کی ہڈی والا یعنی پیچھے ہی رہتی ہیں لیکن اس تیز رفتار دور کا مقابلہ کرنے کی ان میں پیدائشی صلاحیتیں ہیں۔ ایک بار ہمارے کالج میں باکسنگ کے مقابلے میں رنگ کنٹری کے لیے مائیک ہماری کلاس فیلو کو دیا گیا۔ تیسرے راؤنڈ کے بعد ایک باکسر نے اس سے کہا۔ ”بی بی آہستہ، آہستہ کنٹری کریں، آپ اتنی تیز ہیں کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ ہمارے ہاں زیادہ حادثات زبان کی تیز رفتاری کی وجہ ہی سے ہوتے ہیں۔ عورت کی شرم اس کے دانتوں کے درمیان ہوتی ہے جبکہ مرد کی آنکھوں

کے جین بھی دریافت کر لیے گئے ہیں۔ یہ بہت پہلے دریافت ہو جاتے لیکن جب سائنس دان دیکھتے، دوسرے جہز کے پیچھے چھپ جاتے۔ آج کل تو سینماؤں کے باہر بورڈ ہوتے ہیں۔ ”صرف بالغوں کے لیے“ اکیسویں صدی میں یہ بورڈ میٹرنی اسپتالوں کے دروازوں پر ہوں گے..... عورتیں کپڑے دھونے کے لیے صابن اور صرف استعمال نہیں کریں گی۔ ٹیلیفون استعمال کریں گی، لاٹری والے کو بلانے کے لیے۔

سگمنڈ فرائیڈ نے کہا تھا۔ ”میں اپنی تیس سالہ ریسرچ کے بعد اس سوال کا جواب نہیں پاسکا کہ عورت چاہتی کیا ہے؟“ مرد غلطی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ مرد کتنا احمق ہے، عورت غلطی کرے تو کہتے ہیں کہ یہ عورت کتنی احمق ہوتی ہیں۔ مرد جب برے کام کرتا ہے تو اپنا نام پتہ بدل لیتا ہے یا ٹھکس رکھ لیتا ہے۔ عورتیں بھی شادی کے بعد اپنا نام بدل لیتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عورت، مرد سے اچھی نہیں ہے، یہ کہتے ہیں کہ وہ مرد سے بری نہیں ہے۔ وہ گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنا اور ملازم کہلانا زیادہ پسند کرتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ گھر میں رہے اور باس بنے۔ عورتیں ہی ایسی تحریریں نہیں لکھتیں جن میں دوسری عورتوں کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔ یقین کریں مردوں کو بھی دوسری عورتوں کے مسائل درپیش ہیں۔ اکیسویں صدی میں منصفہ نازک زیادہ ہوں گی۔ اس حساب سے امید ہے کہ حالات بھی خست نہ ہوں گے، نازک ہی ہوں گے۔ اس صدی کی خواتین تو مائنڈ میک اپ کرنے کے لیے بھی بیوٹی پارلر جائیں گی۔ شاید اس لیے یہ بھی پیش گوئی ہے کہ اکیسویں صدی کی عورتیں ذہن سے زیادہ حسین ہوں گی جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس صدی میں بھی عام مرد زیادہ بہتر دکھ سکے گا بہ نسبت زیادہ بہتر سوچنے کے۔

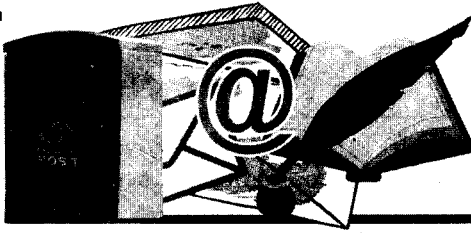
☆☆☆

”سہری بولے۔“ شادی کے لیے اتنا ہی مائنڈ مائیک اپ ہے۔“ میٹری کلنٹن کے بقول ”مرد اتنا بد صورت عورتوں سے نہیں گھبراتے جتنے اکیلے میل عورتوں سے گھبراتے ہیں۔“ مرد بازار میں دو قسم کے تحفے خریدتے ہیں، ایک وہ جو بیوی کے لیے خریدتے ہیں اور دوسرے وہ جو منگنے خریدتے ہیں عورتیں تو خیر بازار سے بیزار ہوتی ہی نہیں۔ الزبتھ ٹیلر کے خاوند سے کسی نے پوچھا تھا۔

”دنیا کی وہ خاتون جس سے مل کر دل چاہا ہو کہ کاش میں کنوارہ ہوتا وہ کون تھی؟“

وہ بولا۔ ”میری بیوی۔“ کہتے ہیں جب مرد کو عورت کی سمجھ آتی ہے، اس کی بیوی اسے گھر سے نکلنے نہیں دیتی۔ اس کے باوجود کو لمبس عورت کے بغیر امریکا تو تلاش کر سکتا ہے مگر دھلی ہوئی جراثیم نہیں۔ ہر عورت میں دو روحیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کی اپنی اور ایک اپنے خاوند کی، زنانہ صدی کا سن کر لگتا ہے اس صدی میں عورت سے عمر پوچھنا، قابل دست درازی پولیس ہوگا۔ ویسے عورت کو کبھی انڈر اسٹیٹیٹ نہ کریں، سوائے اس وقت کہ جب اس کے وزن یا عمر کی بات کی جائے۔ چالیس سال کی عمر میں عورتوں کو اکثر بیماریاں شروع ہونے لگتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ بیماریاں اکثر پچاس سال کی عمر میں ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کو چپ کرانے کا واحد طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ زیادہ بولنے سے عمر بڑھتی ہے۔

کاسمو پولیشن میگزین کی تازہ رپورٹ کے مطابق اگر مرد پہلے اظہار محبت نہ کرتا ہوتا تو نسل انسانی کئی ہزار سال پہلے معدوم ہو چکی ہوتی لیکن آنے والی صدی میں عورتوں کی شائی نیس (جھجک، شرم، کم آمیزی) بھی ختم ہو جائے گی۔ ہم نے ایک تقریب میں پڑھنے کے لیے شائی نیس پر مضمون لکھا تھا لیکن شائی نیس کی وجہ سے پڑھ نہ سکے۔ اب تو شائی نیس



بہنوں کی محفل مدینہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!
تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو ذیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالمین کا پروردگار ہے۔ اور کروڑ ہا درود و سلام رحمۃ
العالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن کی آمد سے جہالت و ظلمت کے اندھیرے جھٹے اور دنیا
میں حق کا یول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخروئی نصیب
فرمائے اور ہمارے وطن عزیز کو اپنی امان میں رکھے۔ (الہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے
پیاری بہنو! السلام علیکم!..... پُر خلوص دعاؤں کا تحفہ لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں..... کیسے کیا حال ہیں، موسم کی
جھیلیاں کس طرح اثر انداز ہو رہی ہیں؟ یہاں کراچی میں تو ابھی تک موسم گرما ہی چل رہا ہے جبکہ ملک کے دیگر شہروں میں تو
موسم بدلنے کی خبریں ہیں، اسی بدلتے موسم کے اثرات کے نتیجے میں فلو بھی کافی پھیل رہا ہے۔ دعا ہے آپ سب لوگ ان
تالیف سے محفوظ رہیں۔

اب آتے ہیں پاکیزہ کے گزشتہ ایٹھویں طرف کہ جس کی بہت ہی پزیرائی ہوئی۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک رہے اور
آپ بہنوں کی طرف سے موصول ہونے والے مراسلات بھی بہت خوب رہے اور یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں بلکہ سب کی
رائے کی روشنی میں، میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ ہماری رائٹرز نے بڑی محنت اور لگن سے کہانیاں تحریر کیں۔ بہت عمدہ موضوعات
پر لکھا۔ میں تو خیر اپنی رائٹرز کی تعریف کر رہی ہوں مگر دیگر لوگوں نے مجھ تک ذاتی طور پر جو تعریفیں پہنچائی ہیں یہاں
کرواؤ اتنی نہیں لکھ سکتی ہاں مجموعی طور پر تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ اتنی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور
رائے بھی دیتے ہیں جو ہماری رائٹرز کی حوصلہ افزائی کے لیے واقعی ایک ٹانگہ ہے۔

ہماری بے حد سیرتیرہ نگار ڈاکٹر ممتاز فضا اپنی گونا گوں مصروفیات سے وقت نکال کر مجھے فون کرتی ہیں اور ہماری فیملی کی
فحریت لیتی رہتی ہیں، میں ان کے خلوص کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اسی طرح میں اپنی تمام قاری بہنوں کی ممنون ہوں جو اپنی
دعاؤں میں ہمیں یاد رکھ رہتی ہیں۔ اللہ آپ سب کو خوش آباد رکھے اور ایک دوسرے کا ہمدرد، غم گسار اور پُر خلوص ساتھی
بنائے رکھے، الہی آمین..... اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو.....

دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

عزیز قارئین اس گزرتے ماہ اکتوبر میں دل بے حد غمگین رہا۔ جی ہاں ہماری بہت پیاری رائٹزر فرحانہ ناز ملک کی یادیں
ساتھ، ساتھ رہیں۔ 11 اکتوبر کا دن بہت مشکل سے کٹا کہ دو سال پہلے اسی صبح فرحانہ ناز کا آخری میسج مجھے آیا تھا..... اب تو
میں یادیں ہی یادیں ہیں۔ ہمارے بہت سے قارئین نے فرحانہ کو یاد کیا۔ ان کی فیملی کے متعلق پوچھا۔ ان کے بیچ اللہ کی مدد
سے نیکی مدارج طے کر رہے ہیں۔ تو بس بہنوں اللہ تعالیٰ صبر کی سِل رکھ کر ہی غم بھینچا کرتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے بندوں سے
بے پناہ محبت کرتا ہے اور حیات و موت کا یہ سلسلہ ازل سے جاری و ساری ہے بس اس کے دوران ہمیں وہ اعمال سرانجام دینے
ہیں جو خالص خوشنودی رب غفور کا باعث ہوں۔ اللہ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا کرے، الہی آمین۔

بہنو! آپ کے بہت پیارے خطوط اور اس میں دیے گئے مشورے، نصیحتیں، حکایتیں، باتیں سب بہت بھلے معلوم ہوئے ہیں۔ بلاشبہ یہ محفل تو گھر آگن کی طرح ہیں۔ جہاں مل بیٹھ کر مسائل حل ہوتے ہیں، دکھ ہانٹے جاتے ہیں، حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس سب کا بے حد شکریہ..... اسی سے ہم رسالے کو بہتر بناتے ہیں، تبدیلیاں لاتے ہیں اور اپنی خامیاں بھی دور کرتے ہیں۔ نئی لکھنے والیوں سے منود بانہ عرض ہے کہ اپنی تحریروں کی ایک کاپی اپنے پاس رکھیں اصل مسودہ ہمیں بھیجیں اور ایک سے ڈیڑھ سینے کے بعد اس کی اشاعت کے بارے میں معلوم کریں۔ پاکیزہ کا مطالعہ جاری رکھیں کسی بھی مہینے آپ کی کہانی لگ سکتی ہے۔

پیارے، پیارے خطوط پڑھنے سے پہلے اپنے بچوں کے اور چھوٹے بہن بھائیوں کے ضروری امور نمٹا دیں تاکہ آپ سکون سے مطالعہ کر سکیں۔ ٹھیک ہے ناں بہنو.....! ہاں بزم پاکیزہ کے متعلق آپ کی تجاویز بھی ملیں انشاء اللہ نیا سال پاکیزہ کے لیے خوش آئند ہوگا کہ اس میں ہم اپنی بہنوں کے لیے مشاقق راسخز کی تحریروں اور دلچسپ سلسلے لے کر آ رہے ہیں۔ آپ کی پسند کو اولیت دینا ہی ہماری ترجیح ہے۔ آپ بس مثبت و تعمیری تنقید سے ہمیں نوازتی رہیے۔ آپ کو ہر آن خوش آمدید کہنے کے لیے ہماری ٹیلی فون لائنز مستعد ہیں۔ نزہت اصغر 03316266612 دفتر کال کرنے کے لیے.....

122.107 یکمیشین 1021.35802552/35386783

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک بار غلوں دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آمین کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نامور شاعرہ ثبین سیف کے گھر شاعرہ، ناہیدہ فاطمہ حسنین کی کتاب کی پزیرائی کے سلسلے میں بطور خاص شام منائی گئی جس میں شہلا رضا، ڈپٹی اسپیکر سندھ اسمبلی مہمان خصوصی تھیں۔ اس تقریب میں عذرا رسول صاحبہ نے بھی خصوصی شرکت کی اور دیگر شہروں سے آئی ہوئی مہمان خواتین شہر آنے بھی شرکت کی، یہ خوب صورت تقریب بہت باوقار طریقے سے انجام پائی۔ (مبارک ہونا مہد آپ کو)

☆ راسخز ثریا فرخ کے بیٹا، بہو نے اس سال حج کی سعادت حاصل کی۔ (مبارک باد)

☆ اس سال کانی پاکیزہ قارئین کی بچوں اور بہنوں نے انٹرمیڈیٹل اور انجینئرنگ میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اب بچیاں انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کے لیے انٹری ٹیسٹ دے رہی ہیں۔ دعا کریں انہیں اس میں بھی کامیابی ملے۔ (اللہ آمین)

☆ نرس نسیم، صابہ موہرہ کی کزن نورین، جڈیال فیض اللہ کی بیٹی شانزے نے بہت مہارت اور لگن سے قرآن پاک حفظ کر لیا ہے۔ (ماشاء اللہ اور مبارک باد) نرس کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کے کزن کا مران عجیب آف سویاں کی شادی بالآخر اپنی من پسند لڑکی سے بچہ درخوئی انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ شاعرہ فریدہ جاوید فری تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کوہ مری کی سیر کر کے آئی ہیں اس لیے اب قدرے بہر ہیں۔ (الحمد للہ)

☆ مسزینین، لید کی پیاری بھتیجیوں کائنات بتول اور قدیل فاطمہ کو اپنی، اپنی سالگرہ مبارک ہو۔

دعائے صحت کی التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل تمبرہ نگار فرخندہ جمعفری، سگرات کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ مستقل تمبرہ نگار انجم مشیر، کراچی کو گردن کے مہروں میں تکلیف ہے۔

☆ تمبرہ نگار صبا آصف، کراچی کی والدہ کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ رابعہ طیبہ عنصر محفل، راولپنڈی کی طبیعت آج کل خراب چل رہی ہے۔

☆ مستقل تمبرہ نگار نگینہ ضیا بخش، کراچی اور ان کی پیاری بیٹیاں ان دنوں شہر میں پھیلے ہوئے بخار چکن کوئیامیں جتا ہیں۔ اسی میں ان کے شوہر کی آنکھ کا بھی آپریشن ہوا ہے۔ ہمیں اپنے گھر والوں کی صحت کی طرف سے کافی پریشان ہیں۔ (اللہ

☆ نرس نسیم، صابہ موہرہ کی والدہ کی طبیعت تاساز ہے۔

انتقال برصا

☆ گزشتہ ایک سال میں پاکیزہ تبصرہ نگار انجم مشیر، کراچی کے بہت قریبی اعزا کی اموات یکے بعد دیگرے ہوئیں جس کی وجہ سے وہ کافی متصفی رہیں۔ (اللہ پاک ان کے خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین)
☆ مصنفہ عطیہ عمر کی خالہ جان منیم اسلام آباد جو ان کی تائی جان بھی تھیں اور یہ سب انہیں اماں جان ہی کہتے تھے مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

☆ رائٹر منعم ملک کے شفیق نانا جان انتقال کر گئے۔

☆ مستقل قاری صبا آصف، گلشن حدید، کراچی کے والد ماجد محمد سعید خان مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ صبا نور، لیڈ کی ماہیں سالہ کرنز رابعہ نسیم کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ پاکیزہ رائٹر اتمام ایمان، علی پور چشمہ کے والد گرامی قاضی احسان احمد کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ رائٹر قاترہ رابعہ کے اکوٹے نیچے کاروڈا یکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اس کی شادی کو ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے۔

☆ رائٹر، شاعرہ اور براڈ کاسٹر سیمارضا روا کی خالہ اور خالہ زاد بھائی نامعلوم افراد کی فائرنگ کا شکار ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان سے موبائل فون اور نقدی بھی لوٹ لی گئی۔

☆ نصیبہ آصف خان، ملتان کے والد ماجد کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ تمام مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک باسورہ فاتحہ اور تین باسورہ اخلاص مع اول و آخر درود پاک پڑھ کر بخش دیں۔ اللہ پاک ان سب کی مغفرت کرے، آمین۔

☆☆☆

بہنوں! بھائی! آپ کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب.....

بھہ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار اکتوبر کا پاکیزہ جلد ہی مل گیا آپ کا ادارہ یہ ہمیں قمری تاریخوں کی فعالیت اور برکت پر جھنجھوڑ رہا تھا۔ واقعی ہم مسلمانوں کو بیسوی سال کے بنائے قمری سال کو اپنانا چاہیے۔ دین کی باتیں، اللہ اور اس کا نور پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ کوہ گران افسانہ واقعی زبردست تھا۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ سے کہ ہماری فریاد جاوید فری ان کے بھائی اور معراج صاحب کو مکمل صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ پاکیزہ کی طرف سے عید ملن پارٹی کا پڑھ کر ہمارے منہ میں بھی مانی آگیا پھر سوچا کہ کاش ہم بھی کراچی میں ہوتے اور اس پارٹی میں شامل ہوتے اور آپ لوگوں سے ملاقات کرتے۔ بزم پاکیزہ بھی جاری رہیں اور سوال ہمارا اور جواب آپ کا بھی شروع کر دیں۔ انجم آپ کی کچی کی شادی پر دی مبارک باد دیں۔“ (مختصر تبصرے کا شکریہ..... اس دفعہ تقریب کا احوال بھی پڑھ لیجیے گا، چلیں آپ نے تو ایک اور سلسلے کا لکھ دیا۔)

بھہ نسیم ما پارلہ، کراچی سے۔ ”خوب صورت سے ٹائٹل کے ساتھ اکتوبر کا پاکیزہ بے حد شاعرانہ رہا..... دین کی باتیں، ذکیہ آپا اور اختر شجاعت کے مضامین زبردست ہماری بے پناہ رہنمائی کرتے ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور ہمت اور زیادہ ہو جو باتیں ہم نہیں پڑھ سکتے ہیں وہ ایک مضمون میں دے دیتی ہیں۔ کہانیوں میں صبر شاہ کی فپ ٹپ ٹولا جواب بھی ان کی جتنی بھی پیچھے تھیں وہاں کہہ سکتے ہیں۔ بہت خوب صورتی سے بہت بڑی، بڑی باتیں کر گئیں۔ آج کل کے بچوں کی تھلنگ کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا۔ اور ہابیک کی اور ٹیلیم احمد بشر کی 2005ء کے نزلے کے حوالے سے سپر کہانیاں تھیں باقی بھی بے حد حساس تحریریں اس کے علاوہ شیریں حیدر کا ناول امرت بھی بہت زبردست جارہا ہے۔ عقیدہ حق کی کہانی درد، تکلیف اور دھن کی چین و دیریک محسوس ہوتی رہی۔ ویل ڈن عقیدہ اشارتہ زریں کا کیا گیا انٹرویو بہت اچھا رہا۔ اشارتہ کے خوب صورت سوال اور مدیحہ کے دلچسپ جواب دونوں بہت ہی عمدہ تھے۔ آپ کی ادارت میں پڑھنا بہت اچھا جارہا ہے۔ بہنوں کی محفل بھی خوب اچھی جم رہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام سلسلے بھی بہت اچھے جارہے ہیں۔“ (بہت شکریہ لکھ لی تبصرے

کا آپ کی سائنس ہمت بڑھاتی ہے)

بہ نورین شہزاد، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کے تو تمام سلسلے بہترین ہیں۔ البتہ بزم پاکیزہ کی جگہ کوئی Knowledgeable سلسلہ شروع کر دین تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پاکستان میں اتھینٹک ہے اتنا کام ہو رہا ہے ہر فیئلہ میں ہمارا الیہ یہ ہے کہ اچھا کام ظاہر نہیں ہوتا افسوسناک واقعات، بہت تیزی سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ (جی یہ تو ہے) پاکیزہ کی جتنی رائٹر ہیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں ایک چھوٹی سی بات کرنا چاہوں گی بحث اور بلاوجہ بحث سے سب کو بچتا چاہیے، بحث کرنے سے آخر میں حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا ہاں دلوں میں رنجش ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔“ (جی بہت خوب صورت بات کئی آج کل سوشل میڈیا سی بحث کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اللہ سب کو ہدایت دے۔ آپ تفصیلی تبصرہ بھی لکھیں)

کچھ فریڈہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ ملا اپنا لیٹر دیکھ کر خوش ہوئی۔ واقعی پاکیزہ دکھ سکھ کا ساتھی اور بے حد پیارا دوست بھی ہے۔ اب میری طبیعت کچھ بہتر ہے۔ (اللہ بہتر ہی رکھے) سب سے پہلے ذکیہ بلگرامی سے متعلق پڑھتی ہوں بے حد سکون ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت مند اور لمبی زندگی عطا کرے، آمین۔ جو بیمار ہیں ان کو صحت کاملہ عطا ہو اور جن کی وفات ہوئی اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ انجم انصار کو بھیجی کی شادی مبارک ہو اللہ تعالیٰ ان کو بھی صحت اور تندرستی دے اور معراج صاحب کو بھی۔ اس مرتبہ طیبہ غفر مغفل نے ناولٹ اے عشتما مجھے پارس کر دے لکھ کر کمال کر دیا ہے اچھا اور منفرد موضوع تھا وہ آئیں اور چھانگیں۔ ویڈیو طیبہ جی خوش رہو ایسا ہی اچھا، اچھا لکھتی رہو عقیلہ جی کا افسانہ بھی بے حد کمال کا لگا وہ تو لکھتی ہی بے حد اچھا ہیں بے حد سلام دعا۔ مانی ثورث رائٹر، اقبال بانو کے ناولٹ اور افسانے پڑھے دیر ہو گئی۔ کیا بات ہے ان کے افسانوں کی۔“ (عجلیں اقبال بانو جلدی سے ایک عدد افسانے کے ساتھ آجائیں۔ شکریہ تبصرے کا فریڈہ بس آپ اسی طرح تبصرے بھیجتی رہیں)

بہ نسیم فریدی، کوہاٹ سے۔ ”نزدہت آئی آپ کو پاکیزہ کی ایڈیٹر بننے کی مبارک باد! ماشاء اللہ آپ نے بہت اچھی طرح پاکیزہ کی باگ سنبھالی ہے۔ پاکیزہ پہلے کی طرح بہت اچھا جا رہا ہے۔ (بہت شکریہ آپ سب کا تعاون ہے) انجم آئی کے جانے کا بہت دکھ ہوا ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ (جی یہ تو ہے) پاکیزہ اور ہم ایک نیلی کی طرح ہیں اتنے عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اگر نیلی ممبر کہیں اور چلا جائے دکھ اور افسوس ہوتا ہے اور کمی محسوس ہوتی ہے۔ انجم آئی سے پاکیزہ کے ذریعے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ زندگی عطا فرمائے۔ (آمین) عذرا آئی کیسی ہیں اللہ تعالیٰ معراج رسول صاحب کو صحت عطا فرمائے۔ عذرا آئی کو بھی بہت سلام۔ آئی، بہنوں کی محفل پہلے کی طرح بہت خوب جارہی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ (اب بہتر ہیں) ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو سلام کوثر خالد کا تبصرہ بڑے مزے کا ہوتا ہے ایڈیٹر مندلیب کے لیے بہت دعا کریں..... سب بہنوں کو اور پورے امت مسلمہ کو اسلامی سال مبارک ہو اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنی امان میں رکھے۔ (الٹی آمین، اب تبصرہ بھی لکھیے گا)

✉ میمونہ المعروفہ رابعہ بصری، اپنے شہر کا نام بھی بتائیں اور یہ بھی بتائیں سب آپ کو اس نام سے کیوں بلااتے ہیں؟ پاکیزہ کی تحریروں پر تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

بہ صائمہ بخاری، سرگودھا سے۔ ”میرے شوہر انزفوس میں ہیں سوشل پر کی پوسٹنگ کی وجہ سے ہم شہر، شہر گھومے ہیں۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ بس پاکیزہ میں کہانیاں لکھنا چاہتی ہوں۔“ (ضرور لکھیں اپنا تبصرہ بھی لکھیں۔ پاکیزہ معیاری تحریروں کو خوش آمدید کہتا ہے)

کچھ حدیث اختر، حاصل پور، بہاول پور سے۔ ”آپ کے کیا حال ہیں (ہم ٹھیک ہیں آپ کی دعائیں ہیں) کالج کی واپسی پر پاکیزہ لیا اور کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر بس، ہم تھے اور ہمارا پاکیزہ..... یہ روز بروز نکرتا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کا خون پسینہ لگتا ہے تو پاکیزہ جتا ہے اور ایک شاہکار وجود میں آتا ہے۔ سارا ہی شمار بہترین تھا ابھی ایک یاد آپ سے شیئر کر لی ہوں۔ اگست 93ء میں اللہ پاک نے مجھے بیٹے سے نوازا اس سے پہلے میری دو بیٹیاں تھیں اور دونوں کی باریمرے شوہر لے مجھے گولڈرنگ تحفے میں دی۔ بیٹے کی دفعہ پوچھا کہ اب آپ کو کیا چاہیے..... آپ یقین کیجیے میں نے کہا مجھے میرا پسندیدہ رسالہ ماہانہ لگوائیں کیونکہ اس سے پہلے ہم چند خواتین مل کر مختلف رسالے خریدتی تھیں اور آپس میں تقسیم کر لیتی تھیں۔ اس وقت ہم گلدوراج میں رہتے تھے۔ آپ ذرا اندازہ کریں ہماری وابستگی کا..... (ارے ڈیر حدیث ہمیں بھر پور اندازہ ہے بلکہ آپ

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کالفظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

کی معصوم فرمائش پر پیار آیا۔ واہ بھی.....) اللہ بخشش کرے میرے شوہر، منیر صاحب کی کہ انہوں نے فوراً لکھوا دیا۔ ہم نے تو انہی رسالوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جیسے کہ ماں سے سیکھتے ہیں۔ سو دعا ہے یہ رنگ رنگیلا جن سدا چمکے پھلے (آمین) میرا بیٹا منیب آپ کا شکر یہ ادا کر رہا ہے اور سلام بھی کہہ رہا ہے۔“ (ہماری طرف سے دعائیں)

بھ سعیدہ، مردان سے۔ ”ہاجی یہاں ہم سب پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں مطلب یہ بہت پاپور ہے۔ آج آپ سے بات کر کے بہت خوش ہو رہی ہے۔ میں اس میں لکھا بھی چاہ رہی ہوں۔“ (جی ضرور)

✉ سدرہ، لاہور..... آپ اپنی شاعری کسی سے اصلاح کروا کر ضرور بھیجیں۔

✉ اسکا طاہر، اسلام آباد۔ آپ پریشان نہ ہوں کہانیاں بھی جلد لگ جائیں گی۔ آپ تبصرہ بھی بھیجیں۔

بھ شہناز اشرف، راول پنڈی سے۔ ”ہاجی اس ماہ کا پاکیزہ نمبر دن ہے۔ تمام کہانیاں، دینی مضامین اور دوسرے مستقل سلسلے سب بہترین گئے اسے ایسے ہی رکھیے گا۔ سب کو میرا سلام۔“ (جی ضرور آپ کو بھی سلام دعائیں)

✉ خدیجہ میر، پشاور آپ کی کہانیاں ضرور شائع ہوں گی۔ بس کچھ موضوع پالیسی میٹر کی وجہ سے شائع نہیں کیے جاسکتے کہ کسی طبقے کی دل شکنی نہ ہو۔

بھ حمیرا، راول پنڈی سے۔ ”ہاجی، انجم ہاجی کہاں گئیں؟ مجھے فکر تھی پھر آپ سے فون پر بھی بات ہوئی۔ میں نے وہ شمارہ نہیں پڑھا تھا جس میں انہوں نے اپنے جانے کا بتایا تھا۔ اور ایک رات خیر راحت ہوتی تھیں وہ کہاں گئیں؟ پاکیزہ واحد رسالہ ہے جسے ہمیں سے ہر صبح آرہی تھی۔ چند ماہ سے گپ آگیا تھا اب دوبارہ سے پڑھ رہی ہوں تو سب رات خیر یاد آرہی ہیں۔“ (بہت اچھی بات ہے کہ آپ نے دوبارہ سلسلہ جوڑا پاکیزہ ہے۔ انجم ہاجی نے ہمیں رات خیر منٹ لے لی ہے جس کا ذکر انہوں نے مئی 2017ء کے شمارے میں تفصیل سے کیا تھا۔ بے شک انہوں نے بہت عرصے سے بہت کام کیا ویسے ان کی طبیعت اب بہتر ہے آپ ان سے فون پر رابطہ کر سکتی ہیں۔ حمیرا راحت بھی، کبھی شاعروں میں نظر آجاتی ہیں انہوں نے افسانہ نگاری موقوف کر دی ہے۔ اب آپ پاکیزہ کا مستقل مطالعہ کریں اور اپنی رائے سے بھی آگاہ کریں)

بھ منشا حسن غلی، قلع بکھر سے۔ ”ہاجی پاکیزہ تو بہتر سے بہترین ہوتا جا رہا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں دردانہ نوشین خان کا ناولٹ بہت اچھا تھا۔ ہاجرہ ریحان بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہر دفعہ نیا موضوع ہوتا ہے۔ آپ پرانی رات خیر آسید مرزا سے بھی لکھوائیں۔ (جی ضرور انہوں نے شادی کے بعد ترک کر دیا تھا اب دوبارہ آمادہ ہو رہی ہیں۔) سحر ساجد بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں عرش فاطمہ کا ناولٹ رواجی اور تھوڑا کمزور تھا۔“

بھ حمیدہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ ملایا پاکیزہ رسالے کے ٹائٹل پر ایک پاکیزہ سا چہرہ بہت خوب صورت لگا۔ دین کی باتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی اور اللہ کا نور ان کی تازگی کا سبب بنے۔ اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون حسن اخلاق دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ تمام سلسلے وار ناول، افسانے سب سلسلے حسب معمول بہترین تھے۔ مدیحہ رضوی صاحبہ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ تمام رات خیر بہنوں کی محنت کے لیے دعا خاص طور پر بہن فریدہ جاوید فری، ان کے بھائی، علیہ عمر صاحبہ اور ان کی تانی جان کے لیے اللہ پاک اپنے نبی رحمت کے ویسے سے ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین ثم آمین اور اللہ فریدہ جاوید فری صاحبہ کے بیٹے کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین اور معراج رسول صاحب کی طبیعت بہتر ہو (آمین)

بھ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ادارہ یہ حسب معمول سبق آموز

اور ایمان افروز تھا۔ خاص طور پر واقعہ کر بلا کو موضوع بنا کر اچھا درس دیا گیا ہے۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان اور علم میں اضافہ ہوا۔ جبکہ ڈاکٹر ذکیہ بکرامی کی قرآن پاک متعلق تحقیقات دلچسپ اور متاثر کن تھیں۔ افسانوں میں نلیم احمد بشیر کا کوہ گراں اسامہ قادری کا افسانہ بد صورت اور ہما بیک کا زنجیر جنوں ہی تاحال پڑھ پائی ہوں۔ ان سب نے متاثر کیا۔ اداکارہ دیبا کی ادا کارہ بیٹی مدیحہ رضوی کا انٹرویو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بہت سی کام کی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ شمع ہدایت میں حسن اخلاق کے موضوع پر اختر شجاعت کا مضمون قابل تعریف تھا۔ اشعار کا سلسلہ، میں اکثر تنگنائی ہوں، پاکیزہ کا بہت پرانا سلسلہ ہے جس کو قارئین شوق سے پڑھتے ہیں۔ مگر اس کالم کے ساتھ بعض اوقات زیادتی کی جاتی ہے کہ اس کے لیے صرف ایک صفحہ مختص کیا جاتا ہے جس بنا پر اشعار پڑھنے کا ذوق پورا نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح بزم پاکیزہ کو بھی صرف ایک صفحہ دیا گیا۔ بہنوں کی محفل میں آپ نے بہنوں سے اس کالم میں تبدیلی کا ذکر کیا ہے یعنی اب سوال آپ پوچھیں گے اور جواب قارئین نہیں ارسال کریں گی۔ یہ تبدیلی ہمیں ایک دم سے منظور ہے۔ آپ اس تبدیلی کا تجربہ ضرور کریں۔ امید ہے کہ اس طرح اس کالم کو چار چاند لگ جائیں گے۔ فریدہ فری اور ان کے بھائی کی علالت اور فریدہ آپنی کے بیٹے کے ایک سیڈنٹ کی خبر پڑھ کر دل پریشان ہو گیا۔ دعا ہے اللہ رب العزت ان سب کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔“ (آمین، ساجدہ بہن تمبر کے کا شکر ہے..... اشتہار سے متعلق آپ نے بالکل درست کہا۔ اسی لیے تو آپ کی بات مان لی ہے۔)

بھہ نسیم کوثر، کراچی سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ماشاء اللہ افسانے بھی بہت خوب ہوتے جا رہے ہیں، اسامہ قادری نے بد صورت زبردست لکھا اس کی اسٹوری اے دن لگی اسی طرح دوسرا افسانہ زنجیر جنوں ہما بیک نے بھی... بے حد دلچسپ لکھا ہے۔ اور نلیم احمد بشیر کی کوہ گراں نہایت شاندار تحریر لگی۔ جب سیمیا ہی کٹیرے بن جائیں تو کیا ہوگا۔ اللہ رحم کرے۔ ناولٹ میں علیہ غفر عنہ کا اے عشتا مجھے پارس کر دے بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے علاوہ محبت سیمیا کی دلکش صبر ضیافت نے تو گویا دھماکا ڈال دیا واللہ نہایت اچھی اور بہت، بہت نایاب ترین تحریر ہمیں تودل سے پسند آئی۔ مصنفہ مبارک کی مستحق ہیں۔ (جی مصنفہ کی طرف سے شکر ہے) میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں، بحر ش فاطمہ کے ناولٹ کا اینڈ بھی اچھا رہا۔ اور ہاں خاص طور پر عقیلہ حق کے درد تکلیف اور دشمن نے تو واقعی دل دکھا دیا۔ غضب کی تحریر تھی، ہم کو عبت بدنام کیا۔ سیرا رضا ردا کے ناول کا کیا ہوگا میرے خیال سے شکر ہے کی شادی اعزاز شاہ سے کرادیں اور بیال کی شادی جہاں نور سے کرو کر ناول کا جلدی پپی اینڈ کریں۔ (پپی اینڈ ہو گیا) شمع ہدایت میں حسن اخلاق پر اختر شجاعت کا مضمون ہمیشہ کی طرح دل کو بہت بھایا۔ ان کی تحریر دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے آپ نے کہا ہے کہ سوال ہمارا اور جواب آپ کے شروع کیا جائے تو کیسا ہے گا تو پیاری نرہت یہ تو بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔ پیزر آپ نومبر سے یہ سلسلہ اشارت کر دیں بہت مزہ آئے گا۔ اس کے علاوہ گوشہ ظرافت پسند نہیں آ رہا ہے۔ اس پر توجہ دیں۔“ (جی بہتری کی کوشش کریں گے، تمبر کے کا شکر ہے)

بھہ مسز شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے اور بہت غلط والا ہے۔ اس میں شامل تمام سلسلے بہت اچھے لگتے ہیں۔ خاص طور پر ذکیہ آپا اور اختر شجاعت کے لکھے اسلامی مضامین جن سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ یہ سارے بچوں کی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کہانیاں بھی سبق آموز ہوتی ہیں۔ میں تو یقین کریں اپنا فرض ضرور نبھاتی ہوں راہ چلتی لڑکیاں ہوں یا کسی تقریب میں، میں تو ان کے کھلے سر اور بے سکہ لباس پر نوک دیتی ہوں۔ ہمیں اپنا فرض ضرور نبھانا چاہیے ہاں مگر طریقے سے اس میں کسی کو بے عزتی اور ہنک نہ محسوس ہو۔ ہمارا معاشرہ اور لوگ کس طرف جا رہے ہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ اللہ پاک سب کو ہدایت دے اور اپنی امان میں رکھے۔ آمین.....“ (جی شگفتہ بالکل درست کہا..... اللہ سب کو راہ ہدایت دکھائے)

بھہ شامکہ ولعبا، ضلالت عمان سے۔ ”اکتوبر کا سرورق بہت باوقار اور خوب صورت تھا۔ مستقل سلسلے بہترین سلسلے وار کبھی کبھی ریگتے محسوس ہوتے ہیں خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ سلسلہ وار کہانیوں کا اسلوب ہی یہ ہوتا ہے پھر باری آگئی افسانوں کی سب ہی شاندار..... اسامہ قادری، عقیلہ حق، ہما بیک، ہاجرہ رحمان بہت اعلیٰ لکھاریوں نے لکھا۔ مجموعی طور پر اس دفعہ شمارے پر تنقید کی کار تک بہت غالب رہا جو افسانہ شروع کر دیا انتقام افسردہ و دلکش دے جائے سو مزاج اپنے آپ اداسی کی طرف مائل رہا آج کل گلا خراب ہے اور بخار اور زکام کی باقیات تاحال موجود۔ سب کے لیے دو ہیروں دعا میں اور نیک خواہشات..... شکر ہے ادارے کا جن کی بدولت یہ ڈائجسٹ ہیں جو پورس میں اپنائیت و راحت پہنچاتے ہیں۔“ (بہت شکر ہے مختصر تمبر کے کا۔ اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے)

کھسکی غزل، کراچی سے۔ ”کافی طویل عرصے کے بعد بہنوں کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں مگر بہنوں کی محفل ہر ماہ پڑھنا نہیں ہوتی۔ انجم کی ناسازی طبع کی وجہ سے جانے کا افسوس تو رہا مگر سینئر جڈو جینرز کے لیے جگہ خالی کرنی ہی پڑتی ہے یہی زندگی ہے اور دستور زمانہ بھی اچھی بات یہ ہے کہ اس خلا کو آپ نے بہت خوبی سے پُر کیا ہے۔ (شکریہ) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف..... اساقا داری، پاکیزہ ہو یا جاسوسی ڈائجسٹ لا جواب کھتی ہیں مگر اس مرتبہ بد صورت پڑھ کر موہ نہیں آیا عورت کی چھٹی حس بتا دیتی ہے کہ کون مجلس ہے کیا رافہ بد شکل ہونے کے ساتھ، ساتھ بد عقل بھی تھی..... جبکہ حسن نے خبردار بھی کر دیا تھا۔ سحرش فاطمہ کی دوسری قسط اچھی سی لیکن عقیدت نے مایوس کیا بلکہ تکلف ہوئی کیونکہ بہنوں میں جلیبی ہو سکتی ہے مگر ایسی دیکھنی نہ سنی بلکہ بڑی بہنیں تو ہمیشہ ماں کا رد ادا کرتی ہیں۔ اتنی اچھی رائٹر کو کم از کم نفرت کو اس قدر نہیں پڑھانا چاہیے تھا کہ محبت کے لیے جگہ ہی نہیں بچے یہ میری ذاتی رائے ہے کوئی بہن اس قدر شقی القلب ہو ہی نہیں سکتی۔ شر کا ٹکڑی کا مختصر افسانہ لا جواب، ہا بیک نے بھی اچھا لکھا، مدیر رضوی کا انٹرویو بھی خوب تھا۔ روحانی مشورے میں ہمیشہ شوق سے پڑھتی اور عمل بھی کرتی ہوں۔“ (مختصر تبصرے کا شکریہ سہلی..... پاکیزہ آپ کا اپنا ہاتھ ہے۔ کہانی بھی ضرور لکھی)

کھ دردانہ نو شین خان، مظفر گڑھ سے۔ ”قرآن پاک سے عشق کے حوالے سے ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی پر رشک کرتی رہتی ہوں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جس کو جس (مقام، کام، ہستی) کی عمر گہری چاہ ہوتی ہے اسے وہ مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دے دیتا ہے۔ یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ کس نوعیت کی چاہ میں عمر گنوا تا یا چکا تا ہے۔ جو دنیا کی ترقی کے حصول کے لیے تو توانا خرچ کرتے ہیں ان کی منزل یہیں تک ہوتی ہے جو اخروی فلاح کا جنون پالتے ہیں وہ اسی راہ پر گامزن کر دیے جاتے ہیں (جی ہے تو ہے) اساقا داری نے بد صورت افسانہ لکھا ہے اس کا بنیادی خیال ہے کہ جس کو زندگی نے بہت ٹھکرایا ہو وہ کسی بھی نام نہاد و ہمدرد پر دھوکا کھا لیتا ہے مگر دھوکا دینے والا یہ نہیں جانتا کہ اللہ کی رسی کتنی دراز ہے اور کب کھینچ لی جائے گی۔ دردتکلیف اور دھوکا ایک خوب صورت افسانہ ہے۔ اس میں دھیمہ، دھیمہ گداڑ ہے۔ اس کا بیانیہ قلب میں اترنے والا ہے۔ یہ تینوں الفاظ بظاہر ہم معنی سے لگتے ہیں مگر ان کے احساسات کے پیچھے باریک مگر گہری لکیر ہے جس کو اختتام میں واضح کیا گیا ہے۔ اس انسان پر کیا ہوتی ہے جس نے اپنی زندگی کا ہر دور اور ہر روپ جس پر لڑا یا ہو وہی اس کی ہر بہار کی جڑیں کاٹنے والا ہو۔ سلیم احمد بشیر کا افسانہ کوہ گراں 2005ء کے ہولناک زلزلے کے پس منظر میں افسوس ناک کہانی ہے جہاں قدرتی آفت زلزلے سے بھی بدترین دھچکا انسان کی ہوس ناکی سے بچتا ہے۔ میو شاہ کا افسانہ ٹپ..... ٹپ..... ٹپ بھی اعلیٰ پایہ کا افسانہ ہے۔ صرف ایک نسل پیچھے سماجی زندگی کی تھکی لڑکیاں اور مائیں کیسی ہوتی تھیں؟ آئی ٹی (ٹیکنالوجی) کی چھلانگ نے سماج، رویے، معیار اور اخراجات کی بھی چھلانگ لگوا دی۔ موسم سرما کی آمد ہے۔ ہم سب کا پندیدہ اور انتظار کیا جانے والا موسم ہے۔ کیوں ناں آپ سرما کے چند مہینوں میں یہ سلسلہ شروع کریں کہ بہنیں ایک یا دو ورق موسم سرما کی اپنے علاقہ جات یا دیہات، محلہ یا گھر یا کسی پہاڑی مقام کی میر کے حوالے سے منظر نامے لکھ کر بھیجیں۔ مثلاً جو دور دراز گاؤں میں رہتی ہیں وہ اپنے دیہات کی محبتیں، شامیں، لحاف سنا، لحاف بھر دانا، گڑ کا تیار ہونا اور دیگر روایتیں لکھ سکتی ہیں۔“ (بہت اچھی تجویز ہے۔ بہنیں بھیج سکتی ہیں۔ آپ کے مسئلے کے لیے عرض ہے کہ آپ اپنے طور پر کسی عالم، دینی معلم سے رابطہ کریں وہ آپ کو تسلی بخش جواب دیں گے۔)

کھ فریدہ ہاشمی، کراچی سے۔ ”رسالہ ماشاء اللہ بہت عمدہ طریقے سے ترقی کی راہوں کی طرف گامزن ہے۔ خاص طور سے بہن ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کی بہت شکر گزار ہوں کہ ہمارے اور خود اپنے لیے ذخیرہ آخرت تیار کر رہی ہیں اور بہنوں کو سیدھے راستے کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ رفعت سراج کا یہ ناول بے حد اچھا ہے۔ پرنس کے کردار میں کیسا خوب صورت تصوری خاکہ پیش کیا ہے جس میں حسن بھی ہے اخلاق بھی..... دین بھی ہے ادب بھی۔ دولت بھی ہے اور علم بھی..... ساری چیزوں کا اتنا خوب صورت احراز جو آج کی دنیا میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ واہ رفعت داہ..... شیریں حیدر کا ناول بھی اچھا جارہا ہے۔ نئے ناول بلکہ ناولٹ کا موضوع بھی اچھا ہے۔ ہال احمد کا افسانہ ہم بتلا نہیں کیا..... پڑھ کر لطف آیا۔ واقعی بعض مرتبہ بالکل یہی حال ہوتا ہے۔ میو شاہ سے ملاقات اچھی تھی۔ بہت حقیقت پسندانہ گفتگو تھی۔ غدا رہن کے خوب صورت الفاظ اور دلنشین انداز بہت پسند آتا ہے۔ بہت سلام اور معراج صاحب کی مزاح پرسی کر دیں۔“ (بہت شکریہ فریدہ! اعزاز صاحب کی طرف سے بھی سلام)

کھ نگہت غفار، کراچی سے۔ ”مخصوصیت مجھ پر مگر اہٹ لیے سرورق کی ماڈل اچھی لگی۔“ مجھے کچھ کہتا ہے۔ ”ماشاء اللہ

بہت خوب صورتی سے حج کے بارے میں تحریر کیا نہت جیتی رہو بیٹا اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے۔ (آمین) دین کی باتیں نام سے اس عنوان ہی سے ذہن میں سوچوں میں پاکیزگی اور تقدس کا احساس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ذکیہ آپ کی عمر دراز کرے صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ ذکیہ آپ سے عقیدت و ملاقات ماشاء اللہ آپ دونوں بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ کہانیوں میں حاصل زندگی ستاد ہی احمد تو میرا نصیب ہے۔ فرحت انصاری اور بیٹی اور بیٹی احمد شامہ سنگتادی زندگی دانیہ آفرین۔ ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ شائستہ زریں کے سروے میں سیدہ ناز ظفر کا مٹی صاحبہ وہی تو نہیں ہیں جو آج سے کئی سال پہلے ریڈیو پاکستان سے خواتین کا پروگرام پیش کرتی تھیں۔ (جی نہیں) جن بہنوں کے پاس خوشی اور مسرت کے لمحے آئے خدا کرے ہمیشہ اسی طرح آتے رہیں۔ بہت، بہت مبارک ہو۔ پیاروں کو اللہ صحت دے۔ نگینہ فضا آپ کو بھی اسی طرح خوشیاں میسر ہوں۔ اللہ مسز یاسین کی دلی مراد پوری کرے۔ پیاری طیبہ بیٹی کی ڈھیروں، ڈھیر مبارک باد، بیٹی احمد بیگم بہت، بہت مبارک ہو۔ بال اللہ پاک صائمہ کے بھائی کو رزق حلال عطا فرما۔ (آمین) پیاری فریدہ بیٹی اللہ پاک چھوٹے بھائی کو صحت کلی اور جی عمر عطا فرمائے (آمین) اللہ تعالیٰ رفاقت جاوید کو صحت کلی عطا فرمائے۔ شیریں حیدر کو شفا کے کاملہ عطا فرمائے۔ پیاری سیما، اللہ تعالیٰ تمہیں صحت کاملہ اور شفا عطا فرمائے۔ سویرا فلک کے شوہر کو اللہ تعالیٰ مکمل صحت اور شفا عطا فرمائے۔ تمام مرحومین کو اللہ تعالیٰ اپنے دربار میں اعلیٰ درجات پر فائز کرے۔ (آمین) اب اجازت چاہوں گی اللہ تعالیٰ پاکیزہ اور اس کی فیملی پیاری نہت اور ان کی فیملی کو اور ہم سب کو اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے حصار میں رکھے ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت کرے۔ آمین۔“ (چھوٹے سے تبصرے اور بہت قیمتی دعاؤں کا شکریہ)

بھ شریا فرخ، کراچی سے ”تبر کے شمارے میں اپنا افسانہ دیکھ کر دل کھل اٹھا۔ اتنے معیاری رسالے میں افسانہ چھپنا فخر کی بات ہے، بہت شکریہ۔ (افسانہ بہت اچھا تھا شریا) ٹائٹل اس طرح لگا گیا دلہن شریا کے کچھ کہنے والی ہو۔ ویسی ہی مسکراہٹ بہت اچھی تھی۔ امرت کی یہ قسط بھی بہت شاندار رہی۔ شیریں حیدر میری ہمیشہ سے پسندیدہ رائٹر رہی ہیں۔ بہت سارے کرداروں کو لے کر چلنا اور ان سے انصاف کرنا..... مشکل کام ہے مگر شیریں صاحبہ اسے اچھی طرح سمجھتی ہیں (جی بے شک) پاکیزہ کا سب سے بہترین سلسلہ شمع ہدایت ہے۔ آخر شجاعت پر اللہ اپنی رحمتیں نازل کریں (الحی آمین) عذرار رسول کی خدمت میں میرا خالص سلام.....“ (ان کی طرف سے بھی سلام و دعائیں)

بھ انجم میسر، کراچی سے۔ ”تبر کے شمارے میں اپنی تحریر آیا ہے بلا واکہ عنوان سے دیکھی بہت شکریہ... مجھے کچھ کہنا ہے ایک مکمل سبق ہے اللہ ہم سب کو اللہ کے احکام پر چلنے کی توفیق دے۔ ذکیہ آپ سے آپ کی اور عذرار رسول کی محبتوں کا اظہار کرتی.... ملاقات بڑھ کر اچھا لگا اللہ آپ سب کو محبت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ عذرار رسول اب بہنوں کی محفل میں باقاعدہ شریک ہیں محفل کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔ (جی بالکل) رفعت سراج یہ کہاں نہیں کر دل ہے۔ ایک خوب صورت انداز میں آگے بڑھا رہی ہیں لیڈی صوفیہ کا کردار یہ احساس دلاتا ہے کہ رکھ رکھاؤ لوگ و پلک سے سنواری یہ خاتون اس عمر میں بھی محبت کا مرقع ہیں۔ نگہت اعظمی کا سوال لا جواب ہے۔ ہالہ احمد ہم بتلائیں کیا بلکہ دوست بہتر تھا کچھ انتظار کر لیتیں کھانا لینے کے لیے یوں نہ ہوتا..... محرش فاطمہ کی تحریر میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں بہت زبردست..... شیریں حیدر کی امرت پر گرفت ہے اب اور بھی دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ کھکیاں جو کھل رہی ہیں، سیمار خاں کا کہم کو محبت بدنام کیا۔ لگتا ہے مائل بے اختتام ہے۔ شریا فرخ کا نگہن بہت زبردست اکثر درکنگ وومن کا... یہی مسئلہ ہے۔“

بھ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ”عید کی مصروفیات کی وجہ سے مہمانوں کی آمد و رفت رہی۔ پچھلا شمارہ تاخیر سے پڑھا۔ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ (آپ لوگوں کے دم سے ہی رسالے میں رونق ہے پھر یاد تو ضرور رہیں گے) کوئلن اشار بہت اچھے موضوع پر افسانہ لکھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ، ساتھ ان کی انیکوئی پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ طیبہ نے کوئیکہ میں پڑھنے والے بچوں کے مسائل کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ محرش فاطمہ بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ عالیہ خرا کا اشک جھنڈا اور ستارے پر اثر تحریر تھی۔ نگہت اعظمی کا سوال واقعی ہمارے لیے بھی سوال ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ جموٹ بول کر ہی کسی سے امداد وصول کی جائے لیکن اگر ضرورت مند جموٹ نہ بولے تو وہ اپنی ضروریات کیسے پوری کرے۔ حقدار کو حق کیسے ملے۔ اگر کوئی پیٹ بھرنے کے لیے ہی جموٹ بول رہا ہے تو اس کو ضرورت مند سمجھ کر ہی حسب توفیق دے دینا

چاہے۔ پیشور گدا کروں کا پتا لگتا ہے وہ اس کے عادی ہوتے ہیں اللہ ایسی آزمائشوں سے بچائے۔ معاشرے کا ہر طبقہ زکوٰۃ ادا کرے تو شاید ضرورت متاخراد کو چور رستے ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑے۔ (جی بے شک) شیخ تفسیر کا جھمکل سپر ہٹ تھا..... بہت زیادہ محنت کرنے والی سسرال کو اس طرح کے کرنٹ کے جھٹکے لگتے رہتے ہیں۔“

بھ فرخندہ جعفری، سمرات سے۔ ”ماشاء اللہ یہ ڈائجسٹ روز بروز ترقی کی منزل پر گامزن ہے۔ اور اس کی ترقی کی اصل حق و دائرہ عزت رسول صلیبہ ہیں وہ خود بھی محنت کر رہی ہیں اور تمام سینئر جویمز کی حوصلہ افزائی اس طرح کر رہی ہیں کہ مجھ جیسی بیمار اور کم سمجھ رکھنے والی قاری بھی پاکیزہ سے کبھی رشتہ نہیں توڑنا چاہتی۔ پاکیزہ رسالے میں روز بروز نکھار پیدا ہو رہا ہے۔ میں کسی ایک کہانی کا ذکر کیا کروں ماشاء اللہ تمام رائٹرز بہت محنت اور جان مار کر ایسی کہانیاں لکھ رہی ہیں بالکل حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ بیٹی اور بیٹی پڑھ کر ایسا لگا کہ یہ میری کہانی ہے۔ بالکل میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ماں، باپ چاہے کتنا بھی دے دیں اگلے گھر میں وہ سامان اپنی وقعت کھودیتا ہے۔ میں ڈائجسٹ کو پہلے صفحے سے شروع کرتی ہوں آخر تک پڑھتی ہوں۔ مجال ہے جو کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس پر تنقید کی جاسکے۔ مجھے کچھ کہتا ہے میں نہت امصر صلیبہ بہت اچھے الفاظ میں جج کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ بالکل اسی طرح روحانی سکون اور دل کی حالت ہوتی ہے۔ میں نے دو دفعہ عمرہ کیا ہے حضور پاک کے روئے پر گئی ہوں۔ دل ابھی تک حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے کی جالی سے باہر نہیں آیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بکھاری صاحبہ کو اللہ تعالیٰ صحت کا ملہ عطا کرے۔ (آمین) بہت اچھا لکھا اور لکھ رہی ہیں۔ قرآن پاک میں حساب کا علم جس طرح یکجا کر کے انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا اور سمجھایا ہے بہت ہمت اور محنت کا کام ہے۔ کبھی خواہش، فرح ظاہر نے قربانی کے بارے میں بالکل حقیقت پر مبنی کہانی لکھی ہے۔ آج کل لوگ رشتے دار یاں اور دوستیاں بھانے کے لیے قربانی کرتے ہیں۔ سنت ابراہیمی کو بھول جاتے ہیں۔ میں ہر سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قربانی کرتی ہوں۔ جب گوشت بن کر آتا ہے تو فوراً تین حصے کرتی ہوں۔ جو حصہ غریبوں، مسکینوں کا ہوتا ہے اسے الگ کر کے شاپر بنا کر الگ رکھ دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں گیٹ پر لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ان کے حصے کا سارا گوشت تقسیم کرنے کے بعد رشتے داروں کو بھیجتی ہوں۔ میری ایک رشتے دار عورت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں کہ لوگ تو دو دو بوٹیاں ان فقیروں کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔ اور آپ شاپر بنا کر دیتی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں سورہ یسین پڑھ کر گوشت پر دم کرتی ہوں تو ان کا حصہ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ (سبحان اللہ بہت خوب صورت بات کہی) شیخ ہدایت میں آخر شجاعت صلیبہ بہت محنت سے مختلف کتابوں سے موتی چن چن کر پاکیزہ رسالے میں لکھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے۔“ (جی بے شک، یہ سب آپ جیسے قدروان قارئین کے لیے ہی تو ہے)

بھ منعم ملک، ڈیر غازی خان سے۔ ”پاکیزہ کو بہترین بنانے میں آپ لوگ بلاشبہ بہت محنت کرتے ہیں اور یہ نظر بھی آتا ہے۔ میری بس ادنیٰ سی رائے یہ ہے کہ اگر زیادہ سے زیادہ تحریروں پر تعریف و تحقید کی جائے تو ساری کمی نیش پوری ہو جائے گی۔ (جی بالکل درست کہا) میں غلط شوق سے پڑھتی ہوں مگر کہانیوں پر پھر پور تبصرے والی حسرت کہیں نہ کہیں رہی جاتی ہے۔ (اس مرتبہ نہیں رہے گی) بھ فریدہ فضل، ڈالاس سے۔ ”اس سے پہلے بھی ایک خط لکھا تھا۔ وہ چٹا نہیں ملایا نہیں (جو اب تو دیا گیا تھا ڈیر) پاکیزہ میرا بہت پسندیدہ رسالہ ہے۔ وجہ اس کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ عمیرہ احمد، رفاقت جاوید، سیمار ضاردا، بحر ساجد، رفعت سرانج، شیریں حیدر، نگہت سیما بھی بہترین لکھنے والوں کو آپ نے متعین کیا ہوا ہے اس لیے ہمیں بہترین تخلیقات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آپ کے ادارے کے چاروں ڈائجسٹ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں۔ میں نے کچھ مختصر آخری رسالے، الگ، الگ عنوان سے بھیجی ہیں۔ پسند آئے تو شائع کریں۔“ (جی آپ کے بھیجے گئے ترانے بہت خوب صورت ہیں۔ لگتے رہیں گے، خط بھیجنے کا شکریہ)

بھ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ ”تجربہ کا پاکیزہ ملاؤ بہن بنی لڑکی بہت ہی پیاری لگی۔ امرت حسب معمول بہت خوب رہی۔ بہت ہی خوب طرز تحریر ہے۔ شیریں حیدر ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ رفعت سرانج کا بھی ناول خوب جا رہا ہے۔ ہم کو بحث بدنام کیا بھی اچھا رہا۔ چھوٹی، چھوٹی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔“ (پہلی تبصرہ بھیجیں)

بھ ہادیہ احمد، میرپور، آزاد کشمیر سے۔ ”بہترین سرورق کے ساتھ پاکیزہ کا شمارہ ملا۔ مجھے کچھ کہتا ہے پڑھ کر دلی مسرت ہوئی۔ اللہ اور اس کے نور سے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تمام ضرب اور تقسیم کی مثال خوب ہیں۔ ذکیہ آپا سے پرعقیدت ملاقات کا بھی احوال ایسے ہی لگا جیسے ہم بھی اسی محفل میں تھے۔ خدا ان کو صحت و تندرستی نصیب کرے، آمین۔“

گھٹ اعلیٰ کا سوال اپنی مثال آپ رہا۔ سارہ جاتے، جاتے بھی سوال چھوڑ گئی۔ میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں بہت، بہت بہترین ہے۔ دوسرے حصے کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ (اب تو انتظار ختم ہو گیا ہوگا) حاصل زندگی سے لے کر تو میرا نصیب ہے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ہماری مصنفہ بہنوں سے ہمیں کچھ کہنے کو ملتا ہے۔ متاع عمر وہی سجدہ ریس کی بہترین کاوش میری طرف سے مبارک باد گوشہ ظرافت میرا فورٹ کا لم ہے۔“ (مختصر سے تیرے کا شکر ہے)

بھ نرسکیم، صابہ موہڑہ سے۔ ”پاکیزہ ملتا ہے میری صحن راحۃ میں بدل جاتی ہے۔ میں نے سب چکوا لی بک شاپس والوں سے کہہ رکھا ہے جونہی رسالہ آئے مجھے فون کر کے بتانا تو وہ اللہ کے بندے اپنی دکان داری بڑھانے اور کمیشن بنانے کے بہانے گھرنیک دینے آجاتے ہیں۔ لوجی کر لوگ اب ساٹھ روپے کا پاکیزہ تو میں روپے الگ سے دیں چونکہ خود کہہ رکھا ہوتا ہے اس لیے مجبوراً اس بارہ کا بیانا مٹی پڑتی ہیں۔ ہر ایک سے ایک، ایک..... دو میں خود کہہ کر باتی ان بچاروں کو دیتی ہوں جو گھر والوں سے چھپ کر رسالہ نفل میں دیا کر ہاتھ دوسوں میں چھپ، چھپ کر پڑھتی ہیں۔ (ارے بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے اب پاکیزہ کی محبت میں اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے) پہلے آپ کی من موٹی پیاری باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے اپنے فورٹ ناول پہ کہاں بچیں کر دل ہے۔ بھئی یہ ذرا تو بڑی تیر لگی مگر ہمیں نہیں لگتا لیزہ صوفیہ جیسی زمانہ شناس کے ہاتھوں یہ بیخ لنگ کی۔ رفعت سراج صاحبہ کہانی سے ہٹ کر ایک بات پوچھوں اگر ماسٹڈ نہ کریں تو..... تو چپکے سے بتا دیں کیا اب بھی آپ کے بال اتنے ہی لمبے ہیں یا غم زندگی دھوپ کی میں شخص چٹیا میں بدل گئے میں تو آپ کی کہانیوں کے لیے بالوں کی بھی فین ہوں..... بہنوں کی محفل میں سب کے خطوط مجھے منے سے لے کر ذحول ڈرم تک اچھے لگے..... اللہ اور اس کا نور ڈاکٹر ذکیہ، بیچ ہدایت، اختر شجاعت کے مضمون میرے فورٹ میں ان کو تو میں آرام اور دل کی گہرائیوں سے پڑھتی ہوں..... گوشہ ظرافت اچھا اضافہ ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں تازین آفریدی کا سراسر سب سے اچھا تھا۔ ہر ماہ بہنوں کی محفل میں عذرا آپ کی حاضری ان کی نہ صرف پیاری سی باتیں بلکہ مصنفات اور تیرہ نگار بہنوں کے بارے میں ان کی فکر مندنی اچھی لگتی ہے بہت اچھا لگا عذرا آپ کی انٹری ہمیں بھی آپ کے خیالات پتا چلتے رہتے ہیں..... گھٹ سیمائی صید فیاضت اچھی تحریر کی ایسا تو ہر جگہ ہمارے ہر جگہ ناحق تیتوں کا مال کھانا..... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دادا کی زمین ہمیں نڈل سکی۔ (اللہ لوگوں کو ہدایت دے) نہ بہت آپ نے جو یہ آئیڈیا دیا ہے ناں کہ بزم پاکیزہ والا سلسلہ بند کر کے سوال ہمارا جواب آپ کا..... تو بھئی کمال ہے ایسا آئیڈیا ہمارے ذہنوں میں کیوں نہیں آیا تو بدست..... یہ سلسلہ شروع کر دیں لیکن..... ہم تو ٹھہرے پاکیزہ کے کافی پرانے اور پرینہ سماجی تو ہر سلسلے کی کوئی یادگار تو ہمارے پاس ہونی چاہیے ناں تو جب تک میرا بزم پاکیزہ میں انعام نہیں نکلتا تب تک ہم اجازت دینے والے نہیں ہواں میں بیچ دوں گی۔ (جی ضرور بیچیں اور انعام بھی پائیں)

بھ امیس جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ”کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، تو بالکل ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ انتظار تھا، طویل تھا پر اس کے بعد ملنے والا اجر ایسی بڑی اور محبت جس کی ہر انسان کی طرح چاہ تو ضرور مٹی پر امید ہرگز نہیں مٹی۔ بے شک یہ میرے رب کا فضل ہے۔ جزاک اللہ خیر نہت آنی اور قارئین کا بے حد شکر یہ جن کی تعریف نے میرا سیروں خون بڑھا دیا ہے۔ سحرش فاطمہ کے ناول کا اینڈ اچھا رہا..... اور رام کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا نور کے کچے مردوں سے محفوظ رکھے۔ رفعت سراج کے ناول میں ذرا کی مادہ پرستی اور خود غرضی بھی اس کے ساتھ کچھ ایسا ہی کرنے لگی ہے۔ پرنس جیسے لوگ یقیناً اس دنیا میں ہوتے ہیں لیکن کہاں ہوتے ہیں؟ باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے جا رہے ہیں اللہ اور اس کا نور ہمارے دلوں کو بھی منور کر رہے۔“ (آپ کی تحریر اچھی تھی تو بڑی اپنی مختصر تیرے کا شکر ہے)

بھ طیبہ غصہ مغل، راول پنڈی سے۔ ”بہت مبارک باد ورتق ایسا پہلے کبھی نہیں لگا جتنا اچھا اب کے لگا۔ اب میں پہلے تو نہت اصغر کی تعریف کروں گی کہ بہت ہی بہترین انداز میں پاکیزہ سنبھال لیا ہے بلکہ بہت عمدہ کام کر رہی ہیں (بہت شکر ہے) اب میں جو کہنے جا رہی ہوں اس کو لکھنے کے لیے مجھے شایان شان الفاظ نہیں مل رہے آنکھ میں آنسو ہیں اور دل میں دعائیں جزاک اللہ دستو، میری پیاری، پیاری، بہنو! کہ آپ سب نے میرے افسانے، گولڈن اشار، کو جس طرح پڑائی بخشی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی مجھے لگا میرا اب تک کا لکھا گیا کچھ بھی رائگاں نہیں گیا میں ہر اس قاری اور اسٹرکٹہ دل سے شکر ہے ادا کرتی ہوں جن کو میری تحریر پسند آئی اور اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر مجھے پڑھا بھی اور تیرہ بھی کیا سلام ہے ان محبتوں کو اب

میں عذر ایا، آپ کی محبتوں کا جواب کیونکر دوں میں مان لیتی ہوں کہ میری تحریر بہت عمدہ بھی اللہ تعالیٰ کے کرم سے لیکن میں نہیں سمجھتی آپ ویسی ہستی میرے لیے یہ الفاظ کہیں کہ مجھے گولڈن اسٹار مل گیا ہے میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا جو آپ نے کہہ ڈالا جزاک اللہ..... پاکیزہ کی وجہ سے میں مصنفہ کہلائی انجمن آبی کی محبتوں سے لے کر آمدن حاد، نزہت اصغر اور اب سب پر ہماری عذراحتی کی ستائش..... مجھے اپنے پاکیزہ پرناز ہے اسی بارغ کی خوشبو نے مجھے چار جانب پھیلا دیا، میری ہر کامیابی میرے پاکیزہ کی پاکیزگی کے نام..... شکر ہے کے الفاظ نکلیں۔ یوم پاکیزہ کی جگہ نزہت کی بجویز زیادہ مناسب رہے گی۔ (بہت خوب طیبہ، اب اچھی چیز کی تعریف تو کرنی ہی چاہیے نا.....)

✉ فریدہ بیگم، اسلام آباد..... آپ کی کہانی قابل اشاعت ہونے پر ضرور لگے گی تمہارا انتظار کریں۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ، تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

کھ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ”پاکیزہ آتا ہے اور بس اسے جلد سے جلد پڑھنے کی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ یہ ہر وقت رہتا ہے اسکول ہو، میٹنگ ہو یا گھر میرے تو سب ملنے والے، رشتے دار میرے اور پاکیزہ کے رشتے پر رشک کرتے ہیں۔ میرے بھانجے، بیٹھے کا ذکر کر میں رسالے میں کردوں تو وہ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میرے شوہر فلک شیر صاحب بھی کبھی کبھی روک روادی کر لیتے ہیں۔ پاکیزہ تو پورے میاں چنوں، خاندان، ملتان سب جگہ یکساں مقبول ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک تقریب ہوئی تھی میں اس کا بھی حال لکھوں گی (جی ضرور) میری نظم اور تصویر رسالے میں دیکھ کر میری ساتھی اساتذہ بھی بہت خوش تھیں۔ پاکیزہ ہر لمحے ہمارا مان بڑھا رہا ہے۔“ (بہت پیاری باتوں کے لیے جزاک اللہ آپ لوگوں کا ہی حق ہے اس پاکیزہ پر بہت شکریہ، اپنا قیمتی وقت دینے کا)

کھ شاہدہ ذاکر، کراچی سے۔ ”آپ کو لایڈ ٹیٹر شپ مبارک ہو..... امید ہے رسالہ مزید ترقی کرے گا..... میں دینی میں تھی جب بھی باقاعدگی سے مطالعہ کرتی تھی۔ میں بھی بذریعہ تحریر اس میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔“ (جی ضرور، آپ کی بیٹی کی کہانیاں جلد لکھیں گی) ✉ وزیہ ظفر، تلہ نگ، چکوال۔ پیاری بہن آپ سے گزارش ہے کہ پہلی تحریر مختصر لکھیں تاکہ آپ کا اسلوب انداز اور بہت دیکھی جائے۔ آپ کہانیاں ضرور لکھیں مگر پہلے خوب مطالعہ کریں..... پہلی کہانی کی ناکامی پر دلبرداشتہ نہ ہوں..... دوبارہ سے لکھیں۔ آپ میں ٹیلنٹ ہے بس اسے خود تلاش کریں پھر ہم سنوار بھی دیں گے۔

کھ صبا آصف، گلشن حدید، کراچی سے۔ ”ابھی ہم بہن اور بھانجے کے غم میں مبتلا تھے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اُمی کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی آپ سب لوگ ہمارے حق میں دعا کیجیے گا..... اس ماہ کا رسالہ مکمل نہ پڑھ پائی۔ رفعت سراج کا ناول بہت بہترین جا رہا ہے ان سے مجھے بات کرنی ہے کہ جب وہ گلشن حدید میں رہتی تھیں تو ہماری باقاعدہ بات چیت ہوتی تھی۔ پھر میرا وہ نمبر بند ہو گیا تھا۔ انشاء اللہ میں ضرور بات کر دوں گی۔ (آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا ہے) بہنوں کی محفل کی وہی آب و تاب اور رد و ق ہے، بہن کوثر خالد نے میرا دکھ بانٹا اور اپنی بیٹی صبا کا تانا میاں دل بھی بہت دھکی ہوا۔ نئے سلسلوں میں کوشش ظرافت بہت عمدہ جا رہا ہے۔ کیا میں اپنے ابو کے بارے میں تعزیتی مضمون لکھ سکتی ہوں؟“ (جی مختصراً لکھ سکتی ہیں۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور والد صاحب کو جو ارحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔)

✉ نسرتن اختر نیانا، لاہور..... آپ کی جو کہانیاں قابل اشاعت ہیں وہ جلد از جلد لکھیں گی۔ رسالے کی پسندیدگی کا بہت، بہت شکریہ۔

✉ ایک دھکی، بہن، چکوال۔ آپ بالکل دل ملول نہ ہوں، اللہ پاک بہترین راستے نکالے گا۔ بس آپ بتائی مگی دعاؤں کی باقاعدگی رکھیں۔ ہر کام میں منکحت ہوتی ہے اس دیر میں بھی خدا کی حکمت شامل ہوگی۔ اس مرتبہ خاص روحانی مشوروں سے فیضیاب ہوں۔ اور سورہ یٰسین والا لعل ضرور کریں۔

✉ مریم شہزاد، کراچی۔ آپ کی کہانی قابل اشاعت ہے جلد ہی لگی۔ آپ مطالعہ جاری رکھیں اور پھر کہانیاں بھی لکھتی رہیں۔

✉ سیدہ جیا عباس، تلہ نگ۔ آپ کے بیسی گئے مراسلے لکھتے رہیں گے، مزید چیزیں بھی بھیج سکتی ہیں۔ پاکیزہ کہانوں پر تبصرہ بھی لکھیں۔

✉ مسکان اقبال خان، میر پور خاص۔ آپ کا انتخاب اچھا ہوتا ہے۔ اپنی شاعری کی اصلاح کروا کر بھیجیں۔

رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

بھائی عزیز! میں نے اس دفعہ تو رسالہ بھی رک، رک کر پڑھا ہے۔ بچے بیمار تھے اور میں بھی..... آپ کا بہت شکریہ کہ مراسلات لگاتی رہتی ہیں، میں تو تقریب کے احوال کا انتظار کر رہی ہوں آپ لوگ بہت محبت اور خلوص سے بلائے ہیں، کہانیوں کا اس دفعہ کا بھی انتخاب بہت خوب تھا۔ باجرہ رحمان اچھے اور مختصر افسانے لکھ رہی ہیں۔ عقیدہ حق، ہما بیک اور سحر ساجد کی کہانیاں بہت اچھی لگیں، اس کے علاوہ صبیحہ شاہ کی بھی بہت زبردست تھی۔ پاکیزہ میں اتنی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ میری بچیاں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ آخر شجاعت آبی سے مل کر بھی خوش ہوئی اور ان کے مضمون بڑھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ذکیہ آپ کو ہمارا عقیدت بھر اسلام..... بہت، بہت تسک کا کام کر رہی ہیں۔“ (اوہو چلو تم بچوں کو دیکھو اگلے مہینے تفصیلی تبصرہ لکھنا)

بھائی عزیز! میں نے اس دفعہ تو رسالہ بھی رک، رک کر پڑھا ہے۔ بچے بیمار تھے اور میں بھی..... آپ کا بہت شکریہ کہ مراسلات لگاتی رہتی ہیں، میں تو تقریب کے احوال کا انتظار کر رہی ہوں آپ لوگ بہت محبت اور خلوص سے بلائے ہیں، کہانیوں کا اس دفعہ کا بھی انتخاب بہت خوب تھا۔ باجرہ رحمان اچھے اور مختصر افسانے لکھ رہی ہیں۔ عقیدہ حق، ہما بیک اور سحر ساجد کی کہانیاں بہت اچھی لگیں، اس کے علاوہ صبیحہ شاہ کی بھی بہت زبردست تھی۔ پاکیزہ میں اتنی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ میری بچیاں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ آخر شجاعت آبی سے مل کر بھی خوش ہوئی اور ان کے مضمون بڑھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ذکیہ آپ کو ہمارا عقیدت بھر اسلام..... بہت، بہت تسک کا کام کر رہی ہیں۔“ (اوہو چلو تم بچوں کو دیکھو اگلے مہینے تفصیلی تبصرہ لکھنا)

بھائی عزیز! میں نے اس دفعہ تو رسالہ بھی رک، رک کر پڑھا ہے۔ بچے بیمار تھے اور میں بھی..... آپ کا بہت شکریہ کہ مراسلات لگاتی رہتی ہیں، میں تو تقریب کے احوال کا انتظار کر رہی ہوں آپ لوگ بہت محبت اور خلوص سے بلائے ہیں، کہانیوں کا اس دفعہ کا بھی انتخاب بہت خوب تھا۔ باجرہ رحمان اچھے اور مختصر افسانے لکھ رہی ہیں۔ عقیدہ حق، ہما بیک اور سحر ساجد کی کہانیاں بہت اچھی لگیں، اس کے علاوہ صبیحہ شاہ کی بھی بہت زبردست تھی۔ پاکیزہ میں اتنی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ میری بچیاں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ آخر شجاعت آبی سے مل کر بھی خوش ہوئی اور ان کے مضمون بڑھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ذکیہ آپ کو ہمارا عقیدت بھر اسلام..... بہت، بہت تسک کا کام کر رہی ہیں۔“ (اوہو چلو تم بچوں کو دیکھو اگلے مہینے تفصیلی تبصرہ لکھنا)

بھائی عزیز! میں نے اس دفعہ تو رسالہ بھی رک، رک کر پڑھا ہے۔ بچے بیمار تھے اور میں بھی..... آپ کا بہت شکریہ کہ مراسلات لگاتی رہتی ہیں، میں تو تقریب کے احوال کا انتظار کر رہی ہوں آپ لوگ بہت محبت اور خلوص سے بلائے ہیں، کہانیوں کا اس دفعہ کا بھی انتخاب بہت خوب تھا۔ باجرہ رحمان اچھے اور مختصر افسانے لکھ رہی ہیں۔ عقیدہ حق، ہما بیک اور سحر ساجد کی کہانیاں بہت اچھی لگیں، اس کے علاوہ صبیحہ شاہ کی بھی بہت زبردست تھی۔ پاکیزہ میں اتنی اچھی باتیں بتائی جاتی ہیں کہ میری بچیاں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ آخر شجاعت آبی سے مل کر بھی خوش ہوئی اور ان کے مضمون بڑھ کر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ذکیہ آپ کو ہمارا عقیدت بھر اسلام..... بہت، بہت تسک کا کام کر رہی ہیں۔“ (اوہو چلو تم بچوں کو دیکھو اگلے مہینے تفصیلی تبصرہ لکھنا)

آپ کی خیریت کی طالب
نزهت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ - 63c فیروز ٹیکسٹائٹس، ڈیفنس - مین کورنگی روڈ - کراچی - پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552 EXT 107, 118



حمد رب تعالیٰ

دنیا کی ہر زبان کا حسن ادا وہی
اپنا خدا جو آپ ہے، میرا خدا وہی
اپنا خیال آپ تو اپنا بدن بھی آپ
پوچھا گیا 'وہ کون ہے' دل نے کہا 'وہی'
دستِ عطا سے منظروں کو بھی ملی زباں
محسن خیال میں نظر آتا رہا وہی
کوئی بھی سوچ اس کا احاطہ نہ کر سکی
دے کر شعور و آگہی سب پر کھلا وہی
یوں تو سبھی جہان میں ہیں معترف مگر
جو اس کے عشق میں ہے یقیناً جدا وہی
لقمِ سخا پہ میرے دل و جان بھی نثار
لازم تھا نقشِ پائے محمدؐ ملا وہی
خالق سے پیار ہے مگر تخلیق سے نہیں
اب بھی فریبِ ذات کا ہے مسئلہ وہی
ناشر جو قلب و جان پہ چھایا رہا سدا
عقلِ جہاں سے آج بھی ہے ماورا وہی
کلام: ناصر ملک
پسند: صبا نور، لیہ

نعت شریف

وہ	ہیں	مالک	مدینہ
وہ	ہیں	صاحب	مدینہ
مری	بے	قرار یوں	سے
مجھے	آزما	رہے	ہیں
جو	گزر	رہی	ہے
دل	پر		
اسے	خوب	جانتے	ہیں
مجھے	پاس	وہ	بلا لیں
یہی	دل	کی	ہے
		تتمنا	

میں انہی کی خاک پا ہوں
میں تو ہوں سنگِ مدینہ
کوئی جا کے ان سے کہہ دو
میں تڑپ رہی ہوں پل پل
مجھے اذنِ حاضری دیں
جو ہیں صاحبِ مدینہ
عقیدت گزار: فریدہ افتخار، اسلام آباد

منقبت بحضور امام حسینؑ

ہر مطلبی کے ساتھ ہو ہر باغی کے ساتھ
یارِ ہمارا حشر ہو آلِ نبی کے ساتھ
پہنچے تجھے سلامِ ادب شاہِ کربلا
تیرا خیال دل کو ہے تیرہ جہی کے ساتھ
تیری پیاس، اعدا کے اب ساتھ، ساتھ ہے
ہر کاروبارِ زیست ہے تشنہ لبی کے ساتھ
تیرا سا وہ جمالِ پیہر کہیں نہیں
تھوڑی جھلک دکھائی دے بس روشنی کے ساتھ
تیرا وہ عزمِ تیری دلیری تھی خود مثال
سر کو مگر جھکا دیا کس عاجزی کے ساتھ
وہ سر زمین خود پر کرے گی سدا یہ ناز
سب پاک خون اس پر بہا سرخوشی کے ساتھ
تیری وفا کی آج بھی توقیر ہے شاہا
روشن ہے شمعِ جان تری خیر کے ساتھ
دامانِ دل کو کھینچنے ہے محفلِ یہی خیال
جانیں لٹی ہیں کتنی وفائے نبی کے ساتھ
کاوش: فریدہ ہاشمی خلی، کراچی

نماز اور اذان

برسوں سے دنیا میں سب سے زیادہ سنی جانے

از قلم خود: ایمان زہرا شیرازی، کھڈیاں چکوال

موبائل فون کے تحفے

پاس بیٹھے لوگ بھی
اجنبی سے لگتے ہیں
دیکھے، دیکھے چہرے ہیں
اب پرائے لگتے ہیں
دوریاں پہلے بھی تھیں
دوریاں تو اب بھی ہیں
پاس، پاس رہ کر بھی
دور، دور رہتے ہیں
وقت کا تقاضا ہے
یا کہ دل بنے پتھر
ایک گھر میں رہ کر بھی
کیوں پرائے لگتے ہیں
میں بھی کتنی پاگل ہوں
کیسا قصہ لے بیٹھی
اجنبی سے چہروں میں
ڈھونڈتی ہوں اپنوں کو

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

میری آنکھوں کے دریا کی روانی کیوں نہیں دکھتی
اسے اجڑی ہوئی میری جوانی کیوں نہیں دکھتی
میرا کردار شامل وہ اگرچہ کیوں نہیں کرتا
اسے یہ غم زدہ میری کہانی کیوں نہیں دکھتی
وہ جس پر دل کی دنیا بھی لٹائی جا چکی میری
میرے دل پر اسی کی حکمرانی کیوں نہیں دکھتی
میری آنکھیں سلگتے دشت کی صورت ہوئیں آخر
کسی کے پیار کی کوئی نشانی کیوں نہیں دکھتی
زمانہ جاتا ہے میں اسی سے پیار کرتی ہوں
اسے میری محبت راج دھانی کیوں نہیں دکھتی
جہاں بھر سے داکرتا ہے بہت ہی پیار کی باتیں
اسے اپنی یہ حقیقت بھی رانی کیوں نہیں دکھتی
شاعرہ: جمیلہ لطیف، لاہور

والی آواز، اذان کی ہے جو انسان کو خدا کی طرف بلاتی
ہے اور انسان ہر کام چھوڑ کر عبادت کی طرف متوجہ
ہو جاتا ہے۔ لفظ مسجد جس کے معنی ہیں سجدہ کرنے کی
جگہ..... سورج کے طلوع ہوتے ہی چرند، پرند، انسان
سب خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔
عبادت سے دل کو سکون، دن کی شروعات اچھی ہونے
کی خوشی ملتی ہے۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا ہر چیز انسان
نماز سے سیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ سجدے کی جگہ پر
دھیان یعنی غور و خوس اور توجہ وہ بھی ہم نماز سے سیکھتے
ہیں۔ اس وجہ سے مسجد اور نماز کی اہمیت اور بڑھ جاتی
ہے۔ خداوند تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ انسان اگر ایک چڑیا
کی بھی مسجد میں بیٹھنے کی جگہ بنانے میں مدد کرتا ہے تو میں
اس کے لیے جنت کا سامن ہوں۔ اگر ہر انسان پانچوں
وقت کی نماز باقاعدگی سے اور حسن نیت سے ادا کرے تو
دنیا کتنی خوب صورت اور حسین ہو جائے۔ آج کے اس
مالارن اور مشینی دور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔
از: فریدہ فضل ڈالاس، یو ایس اے

کچھ جاننے کی باتیں

☆ نفرت ایک ایسا زہر ہے جو اگر انسان کی رگ،
رگ میں بس جائے تو وہ اسے مار ڈالتا ہے۔
☆ زندگی محبت کے لیے کم ہے تو نفرت کی
کہاں گنجائش.....
☆ جب کوئی بہت ہی عزیز دوست یا رشتہ،
اتہار کو چکنا چور کر دیتا ہے تو انسان نفرت کرنے کا بھی
موصلاً نہیں پاتا۔
☆ بے صبری اور جلد بازی میں اٹھائے گئے قدم
پھتاوے بن جاتے ہیں۔
☆ لوگ دوسروں کے بارے میں جلد غلط رائے
قائم کر لیتے ہیں، دوسروں کے بارے میں ہمیشہ مثبت
سوچ رکھیں۔
☆ کسی کو چاہ کر چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا کیونکہ
جس سے محبت ہو اسے بھولنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

ہے؟“

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کچھ پل خزاں کے سنگ

خزاں کے پتے
پرنندوں کے مانند
شاخوں سے چھڑے
وجود کو سنبھالے
زمین پر اترے
دیکھا جو پانی
نا سمجھ بچوں کی طرح
بلا سوچے سمجھے
گئے کد

اب ہوا کے دوش پر
خود کو کشتی بنائے
لہروں کے ساتھ، ساتھ
کر رہے ہیں رقص
ہے تو کچھ ہی لمبے کاکیل
پھر..... بھی
پورے جوش سے
گھوم رہے ہیں
نہیں جانتے
کہاں ہے منزل

ٹھنڈی ہوا ہے..... پانی میں
اور..... کچھ..... پل.....

جو..... بہت خوب صورت ہیں

کاوش: عذرا آفتاب خان، کراچی

ادھوری بات

ادھوری بات کہتا ہے
ادھوری بات سنتا ہے
نہ جانے کب فراغت ہو
ادھوری بات پوری ہو

مختصر بات

جملہ بہت چھوٹا لیکن اس کی طاقت بہت ہے۔
اللہ کی طرف آ جاؤ اس سے پہلے کہ اللہ تمہیں اپنی
طرف بلا لے۔

از: صبا نور، لیہ

ماں کیا ہے؟

ماں۔ ”بیٹا! آج اتنی دیر سے گھر آئے ہو، کھانا
لاؤں؟“
بیٹا۔ ”ماں! آپ سو جایا کریں میں خود کھا لیا
کروں گا۔“
ماں..... ”نہ بیٹا! مجھے نیند نہیں آتی جب تک تو
گھر نہیں آ جاتا۔“

بیٹا۔ ”ماں! آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔
چلیں دونوں ساتھ کھائیں گے۔“

ماں۔ ”ٹھہر بیٹا! میں گرم کر لاؤں۔ مجھے پتا ہے
تمہیں ٹھنڈا کھانا پسند نہیں۔“

وقت کیسے بیت جاتا ہے، آج دس سال بعد دیر
سے گھر آیا تو کسی کو اس کا انتظار نہیں تھا۔ بچن سے کھانا
لیتے وقت اسے ماں کی یاد آگئی۔ بیوی، منجے سورہے
تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے اسے یاد آیا وہ تو گرم کھانا
کھاتا تھا۔ نوالہ اس کے حلق میں انک گیا اور وہ دونوں
ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

چاند

گرل فرینڈ نے پوچھا۔ ”چاند کتنے ہوتے
ہیں؟“

بوائے فرینڈ بولا۔ ”ایک تم اور ایک وہ
اوپر.....“

ان دونوں کی شادی کے بعد بیوی نے پیار سے
پوچھا۔

”چاند کتنے ہوتے ہیں؟“

شوہر بولا۔ ”اندھی ہو گیا؟ وہ اوپر خر بوزہ نظر آ رہا

ہائے لڑکیاں

لڑکیاں آئینہ ازم کے چکر میں
اچھے رشتے ٹھکراتی ہیں

دھیرے، دھیرے

عمر بڑھنے پر
کسی بوڑھے برگد کے سائے تلے
ستاتی ہیں

اصل ٹھکانا

مجھے شہر خوشاں سے

یہی پیغام ملتے ہیں

کسی بھی دیس میں ٹھہرو

کہیں بھی جا کے بس جاؤ

یہیں پہ لوٹ آنا ہے

یہیں اپنا ٹھکانا ہے

کاوش: افتخار شوق، میاں چنوں

آہ فریاد بکرا

دہلی تپتی ٹانگوں سے آپ کو اس نا تو اں بکرے کا
سلام عرض ہے۔ کیا کہانی سناؤں میں بھلا اپنی.....
پڑوس کی خالہ رخسانہ میری چاروں ٹانگیں فریزر میں
دبائے بیٹھی ہیں۔ جس کی وجہ سے عید کے دن جو میری
ڈائریکٹ فلائٹ جنت کو بھی وہ ملتوی ہو گئی۔

خالہ ذکیہ کے فریزر میں سب کی ملا کر چھ رانیں
پڑی ہیں جس بے جا میں۔ جب تک ان کی میریڈ
بیٹیاں بیٹے نہیں آئیں گی تب تک وہ میری تکہ بوٹی
نہیں کریں گی اور میں ایسے ہی دہائیاں دیتا رہوں گا۔

لیکنہ بچو کے گھر میری سری پر کھیاں، جھنڈنا رہی
ہیں، میں اور میرے ساتھی ابھی تک ہم جنت میں نہیں
پہنچے۔ خدا را میرا گوشت استعمال میں لاؤ اور میری
تکلیف معاف کرو۔

منجانب..... قربانی کا بکرا
از: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

غزل

خواہشوں سے نفس جو آزاد ہے
اصل میں انسان وہ فولاد ہے
ابلیس کو شرمندہ جس نے کر دیا
حضرت آدمؑ کی یہ اولاد ہے
قتل کرتا ہے جو بچوں کو یہاں
آدی کی شکل میں جلا دیا ہے
اب کوئی نہر نکالے تو ذرا
آج زندہ مگر کوئی فرہاد ہے
جس نے بھی ماں، باپ کو ہے دکھ دیا
دین و دنیا اس کا سب برباد ہے
اے خدا تو دل میں اپنا خوف دے
بس تری خاتم کی یہ فریاد ہے
کلام: فریدہ خاتم، لاہور

غزل

جو تم سے ربط قائم تھا دوبارہ ہو نہیں سکتا
ہوئے ہیں مسئلے پیدا گزارہ ہو نہیں سکتا
وفا کی راہ میں اس نے جفا کا درد چھیڑا ہے
جفا اب ہم بھائیں گے ادھارہ ہو نہیں سکتا
یہ دنیا ساتھ ہے اس کے جو سب کا مان رکھتا ہو
جو اپنا بن نہیں پایا ہمارا ہو نہیں سکتا
اگر ہم جان جائیں عشق کی سچی حقیقت کو
تو ہم کو دین و دنیا میں خسارہ ہو نہیں سکتا
نزی، ہم کو مدینے کا سفر درپیش ہو جائے
کہ ان کی ذات سے بڑھ کر سہارا ہو نہیں سکتا
کلام: نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ

دوستی

☆ اچھا دوست حاصل کرنے کے لیے پہلے خود
اچھے بنو۔

☆ دوستی کرنے کے بعد دوست کو سچا پیار اور
خلوص دو اس سے کبھی دھوکا اور بے وفائی نہ کرو۔
☆ دوستی کی بنیاد ہی اعتماد ہے۔

ہمارے آگے ڈٹ کے کھڑا ہے دیکھو آج ہمارا دل
بکھرے گیسو پھینکی رنگت دیکھی تو درپن بولا
تیرا روپ تھا چاندی سونا آنکھیں جھیل کنارہ دل
اس کو دیکھے اب مدت گزری اکثر ہی کہتا تھا
اک دن تم کو نہ دیکھوں تو ہوتا نہیں گزارہ دل
عقل کی سب دلیلیں ہیں رد بھلانے کے دعدے سب جھوٹے
وہ کہے اور ہم نہ مانیں تیرا ایک اشارہ دل
سچے موتی جیسے لوگ چاہ نے تیری رول دیے
سونا مٹی بنجر کردی عشق نے یوں اجاڑا دل
تیری چاہ میں سب کچھ کھویا کیا یہ کہرام چا
چپ کی مہک مارے بیٹھا دیکھ ذرا ہمارا دل
کاوش: ام شامہ، جھڈو سندھ

ماں کا دودھ پینے والے بچے

دماغ سے محفوظ رہتے ہیں

امریکی ماہرین نے کہا ہے کہ ماں کا دودھ پینے
والے بچے دماغ کے مرض سے محفوظ رہتے ہیں۔
امریکی سائنس دانوں نے ایک سے چار سال
تک کے بچوں پر تحقیق کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے
کہ ماں کا دودھ پینے والے بچے دیگر بچوں کی نسبت ہر
حال میں بہتر پائے گئے ان کی نشوونما بھی زیادہ تیز
رفتاری سے ہونے کا پتا چلا اور ان میں سانس کی مختلف
بیماریوں کے خلاف زیادہ قوت مدافعت پیدا ہوئی۔
ان بچوں میں بیماریوں کے خلاف لڑنے کی طاقت
بازار کا دودھ پینے والے بچوں سے کہیں زیادہ پائی گئی۔
ماہرین کا کہنا ہے کہ بچوں کے لیے یوں تو ماں کے
دودھ کے متعدد فوائد ذکر کیا گیا ہے اور ہزاروں سال
سے اسے بچے کے لیے ایک مکمل غذا قرار دیا جاتا ہے
مگر سائنس کی بیماریوں کے خلاف خصوصی مزاحمت بھی
پیدا ہوتی ہے چاہے ماں کی صحت بھی قابل رشک نہ
ہو۔ ان بچوں میں زیادہ طاقت اور بیماریوں کے خلاف
لڑنے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

مرسلہ: ایمان چوہدری، فیصل آباد

☆ دوست سے کبھی ایسی بات نہ کرو کہ اس کا
دل ٹوٹ جائے۔

☆ اچھے دوست کی دوستی ایک چھت کے مانند
ہے جو آپ کو دھوپ اور بارش سے بچاتی ہے۔

☆ مخلص دوست جتنی بار روٹھے اسے مناؤ
کیونکہ اچھا دوست کبھی نہیں ملتا۔

☆ دوست مخلص ہو اور ناراض ہو جائے تو اس کی
خاطر آسو بہاؤ کہ تمہارے آنسو اس کی دہلیز تک پہنچ
جاتے ہیں۔

☆ پُر خلوص مسکراہٹ دوستی کی ابتدا ہے۔

از: نگہت غفار، کراچی

غزل

آجاؤ اپنے شہر کی تحقیر مت کرو
تم غیر کی فضاؤں کی توقیر مت کرو
لوٹ آؤ اپنے شہر میں تاخیر مت کرو
بچپن کی یادگار کی تحقیر مت کرو
مانا کہ زندگی نے بھی مسکھ نہ دیا پر
اپنے دکھوں کی ایسے تو تشہیر مت کرو
ان سے فضا میں رنگ ہوا میں کھنک سی ہے
اڑتے ہوئے پرندوں کو زنجیر مت کرو
پڑھ کر کسی کی آنکھ کے تارے لٹاؤ مت
اپنے دکھوں کو ایسے تو تحریر مت کرو
ڈھا کر کسی کے پیار کے تم تاج محل کو
اس پر جہان اپنے کی تعمیر مت کرو
یہ کائنات ساری تمہارے لیے کنول
کس نے کہا ہے تم کو کہ تغیر مت کرو
شاعرہ: یاسمین کنول، پررور

غزل

اب تک اسی موڑ پر کھڑا ہے محبت کا استعارہ دل
آگے جا کے کچھ دیر لگی میں پر اس نے کہاں پکارا دل
سرد مروتوں کی تنہائی جس کو پاگل کر دیتی ہے
اداسی کی کہر میں لپٹا چاند کے پاس ستارہ دل
دہ بولیں تو پچی بائیں، ہم بولیں تو جھوٹ ہوا



دل نے متاع درد کو جلنے نہیں دیا
نظروں سے اپنی آپ ہی گرتے گئے ہیں لوگ
اے عشق تو نے ہم کو سنبھلنے نہیں دیا

☆ فریدہ افتخار..... اسلام آباد
یاد کرتی ہیں تمہیں آبلہ پانی کی رتیں
کس بیاباں میں ہو، بولو مرے تنہا یارو
☆ ماہ نورخان..... بہارہ کھو

آئینہ پھیلا رہا ہے خود فریبی کا مرض
ہر کسی سے کہہ رہا ہے آپ سا کوئی نہیں
☆ امین رانی..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

زمیں پہ چل نہ سکا آسمان سے بھی گیا
کٹا کے پر وہ پرندہ اڑان سے بھی گیا
تہا کر گئی کچے مکان کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا
☆ نگہت اعوان..... سرگودھا

کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ ناکھونہ کھلا گئے
کوئی کیوں کی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
☆ جبین نیاز..... ملتان

پانی کی ضرورت ہے محبت کے شجر کو
پتھر پہ کبھی بیڑا اگائے نہیں جاتے
☆ سیدہ جیاباس..... تلہ گنگ

خاشی بے سبب نہیں ہوتی
درد آواز چھین لیتا ہے
☆ دل جان بیگم..... صوابی

نیند سوتی ہے میرے بستر پر
اور میں رات بھر ٹھہرتا ہوں

☆ غزالہ طارق..... سرگودھا
نہ ڈمکاتے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں
کسے لگاتے گلے اور کہاں، کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ دگل ہیں صبا کے رستے میں
☆ جمیلہ بلوچ..... لوہی، بلوچستان

ہم نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لبو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں
صرف دھندلاتے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا کس سے خفا یاد نہیں

☆ مسرنگہت غفار..... کراچی
کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے جھپک لہہ کوئی اوجھل نہ ہو
پہلی سیرمی یہ قدم رکھ آخری سیرمی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں رانگاں کوئی پل نہ ہو
☆ کائنات عبدالحلیم..... میرپور خاص

ہم کب تک پیت کے دھوکے میں
تم کب تک دور جھروکے میں
کب دید سے دل کو سیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو
☆ جبین ہاشمی..... بھیرہ

اگر طوفان میں کشتی ڈوب جاتی تو غنیمت تھا
مگر ساحل پر آ کر ڈوبتی دیکھی نہیں جاتی
☆ حسینہ ممتاز خان..... اسلام آباد

نہ دولت سے نہ دنیا سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسل دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے
☆ حمنی قدیل..... کمالیہ

گریہ کیا تو آنکھ میں بھرتا گیا دھواں

☆ سیدہ بانو..... مری

ضبط ، تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زبان ہیں ہم

☆ حراقری..... ملتان

نہ میری آنکھ ، نہ قلب و جگر میں رہتا ہے
وہ دردین کے مرے آدھے سر میں رہتا ہے

☆ سلمیٰ شاہین..... حیدرآباد

تمہیں ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا

☆ عرشہ جنید..... کراچی

بتاؤ ان سے کہاں رابطہ کیا جائے
کبھی جو ہم کو ضرورت ہو بات کرنے کی

☆ شمیمہ کوکب..... جہلم

تفکلی ، تفکلی ارے توبہ
قطرے ، قطرے کو ہم ترستے ہیں

اے خداوند کوثر و تنیم
تیرے بادل کہاں برستے ہیں

☆ مہوش پونم..... ملتان

تلاش میری تھی اور بھگ رہا تھا وہ
دل میرا تھا اور دھڑک رہا تھا وہ

پیار کا تعلق عجیب ہوتا ہے
پیاس میری تھی اور سلگ رہا تھا وہ

☆ رفیعہ ابدالی..... کراچی

برسیں آنکھیں جس کی یاد میں برسات کی طرح
وہ بدل گیا میرے حالات کی طرح

حال جیتے جی انسان کا کوئی پوچھتا نہیں
پھر میت پہ کیوں آتے ہیں سب بارات کی طرح

☆ زریہ مشتاق..... منڈی بہاؤ الدین

جھولی میں ڈال دیجیے رخسار و لب کی بھیک
چلیے کسی غریب کو خوشحال کیجیے

☆ درخشاں ساگر..... کہروڑکا

اس قدر رنج نہ دے جن کو اٹھا بھی نہ سکوں
ورنہ دنیا میں تیرے ظلم کی شہرت ہوگی

☆ شامکہ انجم..... سرگودھا

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستان میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

تیرے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے

☆ امین رانی..... کمالیہ

بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا بگڑ سکتا
ہوا کا زور تو چڑیوں کے آشیاں تک تھا

مجھے زمیں کے مسافر کہاں شکست دیتے
مرا ضمیر بلندی میں آسمان تک تھا

☆ نگہت غفار..... کراچی

نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سائے گی

کوئی بھول چتا ہے کس طرح کوئی بھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت ، وقت کی بات ہے ، تجھے زندگی بتائے گی

☆ ناہید..... آزاد کشمیر

میری خوبی پہ رہتے ہیں یہاں اہل زباں خاموش
میرے عیوں کا چرچا ہو تو کوٹکے بول پڑتے ہیں

☆ فرح طاہر..... ملتان

کون اب روز ، روز ، یاد کرے
ہم اسے حفظ کر کے بیٹھے ہیں

☆ تنیم..... جہلم

ادھوری باس ، ادھوری آس ، ادھوری ذات ہے میری
جو تم سوچو ، جو تم چاہو ، مری تکمیل ہو جائے

☆ مسرت یسین..... لیہ

اسی کے در پر سکون ملتا ہے
اسی کی عبادت سے نور ملتا ہے

جو جھک گیا اللہ کی بارگاہ میں
اسے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے

☆ عربہ ناز..... کوٹلی

تمام جذبوں سے معتبر ہے
اداس آنکھوں سے مسکراتا

منتخب غزلیں



اعلیٰ شعری ذوق رکھنے والے ہمارے پیارے قارئین کے لیے اس ماہ نامور شاعر اور ممتاز ادیب
احمد ندیم قاسمی کے یوم پیدائش کے حوالے سے ان کی غزلیات سے انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔



پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بچھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوہیں
بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

سانٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یا رب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں

اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اٹھتے ہیں بگولے کیا کیا

عشقِ معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیلام
ورنہ ادراک نے دکھلائے تھے رستے کیا کیا

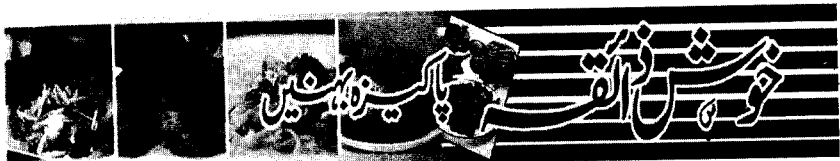
یہ الگ بات کہ برے نہیں مگر بے تو بہت
ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُڈے کیا کیا

آگ بھڑکی تو در و بام ہوئے راکھ کے ڈھیر
اور دیتے رہے احباب دلا سے کیا کیا

لوگ اشیا کی طرح بک گئے اشیا کے لیے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

لفظ کس شان سے تخلیق ہوا تھا لیکن
اس کا مفہوم بدلتے رہے نقطے کیا کیا

اک کرن تک بھی نہ پہنچی مرے باطن میں ندیم
سرِ افلاک دسکتے رہے تارے کیا کیا



بیف اسٹیک و دو ساتہ بیل بیبرز

اشیا: بیف کے بوئے، اسٹیک کے لیے۔ 2 عدد (کٹ لائیں) آئل، 2 کھانے کے چمچ، لیمن، اورک پیسٹ، 1 چائے کا چمچ، سرکہ، 1/2 کھانے کا چمچ۔ گئی کالی مرچ، 1 چائے کا چمچ، نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز، 1/2 عدد۔ لیمن کارس، 1 کھانے کا چمچ۔ نمک، 1/4 کھانے کا چمچ۔

سوس کے لیے:

بی ٹیوٹ، 1 کھانے کا چمچ۔ گارلک مایوسوس، 1 کھانے کا چمچ۔ وائن پیپر، 1 چائے کا چمچ۔

ساتہ دینی بیف کے لیے:

پہلی شملہ مرچ، 2 عدد۔ سرخ شملہ مرچ، 2 عدد۔

ترکیب: بیف پر لیمن، اورک پیسٹ، گئی کالی مرچ، سرکہ اور نمک لگا کر دو گھنٹے کے لیے ریفریجریٹر میں رکھیں۔ اب پین میں آئل گرم کر کے بیف اسٹیک کو دونوں طرف سے فرائی کریں۔ اچھی طرح سے گلانے کے لیے دو سے تین منٹ کے لیے گرل پین میں گرل بھی کر لیں۔ شملہ مرچوں اور پیاز کو باریک سلائسوں میں کاٹ لیں۔ اب نمک، پین میں گرم کر لیں۔ ساتھ ہی لیمن کارس اور نمک بھی ڈال دیں۔ سوس کے لیے تینوں اجزاء کو اکٹھا پیسٹ کر لیں۔ سرونگ پلیٹ میں تیار اسٹیک رکھیں پھر کٹی ہوئی دینی ٹیمپلو ڈالیں اور سوس کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: نقہ، بٹول، بہارہ کبوتر

ڈھابا گوشت

اشیا: مٹن، 1/2 کلو بغیر ہڈی کا۔ نمک، 4 کھانے کے چمچ۔ بزر الاچی پاؤڈر، 1/4 چائے کا چمچ۔ دہی، 5 کپ۔ بانی، ہڈیوں کی پختی 1 کپ۔ بزر الاچی، 8 عدد۔ بڑی الاچی، لونگ، 6 عدد۔ سونف پاؤڈر، 1/2 کھانے کے چمچ۔ اورک پاؤڈر، 1/2 کھانے کا چمچ۔ پیاز، 2 عدد (فرائی کر کے پیسٹ بنالیں) لیمن پیسٹ، 1 کھانے کا چمچ۔ (1/4 کپ پانی میں کس کر لیں) پودینہ (پتے)، 1/2 کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: مٹن ہمسر کی مدد سے کوئٹس یہاں تک کہ اس کا رنگ بدل جائے۔ اب اس میں نمک اور بزر الاچی پاؤڈر کس کر کے مزید کوئٹس یہاں تک کہ پیسٹ کی طرح ہو جائے۔ پھٹی ریانی لگا کر اس پیسٹ کی بالز بنالیں پھر دہی میں پانی ڈال کر اچھی طرح پھینٹیں اور مسلسل ہلاتے ہوئے تیز آگ پر پکائیں۔ جب اگلنے لگے تو آگ بھلی کر کے اتار پکائیں کہ آدھا رہ جائے۔ اب اس میں میٹ کی چھٹی بالز، کچی اور پختی ڈال کر تیز آگ پر ابالیں۔ پھر بزر اور بڑی الاچی لونگ، سونف اور اورک پاؤڈر ڈال کر ڈھک دیں اور 10.12 منٹ تک اگلنے دیں۔ اب لیمن والا پانی، نمک اور پیاز کا پیسٹ شامل کر کے اتار پکائیں کہ گریوی گاڑی ہو جائے اور میٹ بالز گل جائیں۔ آئل چھوڑنے لگے تو چولہے سے اتار لیں۔ پودینہ چمڑک کر سرو کریں۔

یعنی طرح کی ڈش آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

مرسلہ: نقہ، آرا، دینی

فیش و جی ٹیل سوپ

اشیا: پھلی، بغیر کانے کی 500 گرام، آلو (چوکور کٹوے کاٹ لیں)، ایک عدد۔ پیاز، (باریک کاٹ لیں) 1 عدد۔ نمک، 50 گرام۔ سیلیری، 1 ڈھل۔ (چھلکا اتار کر باریک کاٹ لیں) آٹا، 2 کھانے کے چمچ۔ مسٹرڈ پاؤڈر، 1/2 چائے کا چمچ۔ دوسر شازرسوس، 1/2 چائے کا چمچ۔ کارن فلور، (ایک کپ پانی میں گھول لیں) 2 کھانے کے چمچ۔ تازہ پارسے (کٹا ہوا) 1/2 کپ۔ کریم، 2 کھانے کے چمچ۔ نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، حسب ذائقہ۔

پھلی کو ایک فرانک پین میں رکھ کر اتنا پانی ڈال کر ابالیں کہ پھلی ڈوب جائے۔ ابال آجائے تو آگ کم کر کے 8 منٹ تک پکائیں۔ جھان کر پھلی کی پختی الگ رکھ لیں۔ اس کے بعد پھلی کی کھال اتار کر ایک طرف رکھ دیں۔ آلو، سیلیری اور پیاز ایک پین میں ڈالیں اور 1-1/2 کپ پھلی کی پختی ڈال دیں پھر ابالیں، ابال آنے پر آگ کم کر کے بزیایاں گل جانے تک پکائیں۔ اسی دوران ایک بڑے سوس پین میں نمک، پھل لیں۔ آٹا، مسٹرڈ پاؤڈر اور دوسر شازرسوس ڈال کر

اچھی طرح چلائیں۔ 1 منٹ تک پکائیں توٹو، توٹو کر کے 2 کمانے کے بیج کارن فلوئر شامل کریں۔ اچھی طرح کس ہونے تک چلائیں اور یہ آئینہ ایلنے اور گاڑا ہونے تک پکائیں۔ اب بنریاں اور پختی ڈال دیں۔ اس کے بعد بارسلے اور پھل ڈالیں۔ دوسری آج پر پانچ منٹ تک پکائیں۔ کریم، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر شامل کر کے گرما گرم سرور کریں۔

مرسلہ: قول رضا، جرمی

ترکیب: بلینڈر میں لال مرچ باؤڈر، دھنیا باؤڈر، ہری مرچیں، ادراک، لہسن پیسٹ، خشک ماش، 15 عدد ثابت سیاہ مرچیں، 2 عدد بڑی الائچی اور 2 عدد سبز الائچی ڈال کر باریک پس کر کے پیسے میں ملا دیں۔ نمک اور 1 انڈا بھی شامل کر دیں۔ آٹا بال کر چھیل لیں اور اسے میٹھ کر کے اس میں ہر ادھیا، چوپ کی ہوئی پیاز اور 1 انڈا شامل کر دیں۔ بالک کو بال کر چھوڑ کر پس لیں۔ سوس پین میں 2 کھانے کے چمچ مٹی گرم کر کے اس میں لہسن اور سلاخ کی ہوئی پیاز ڈال کر افرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں مکھن، ہر ارنگ، ہلدی باؤڈر ڈال کر چمچ چلائیں پھر بالک ڈال کر خوب اچھی

طرح بھونیں۔ پنیر کا تھوڑا سا آمیزہ لے کر تھیلی پر پھیلائیں اس کے درمیان میں بادام، پستہ، کا جوا اور کشمش کی مناسب مقدار رکھ کر چھوٹے، چھوٹے کوفتے بنا کر فرنیج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ پھر پالک کا آمیزہ ان پنیر کے کوفتوں پر چڑھا کر فرنیج میں دوبارہ جبنے کے لیے رکھ دیں۔ آخر میں قہہ کا آمیزہ کوفتوں پر چڑھا کر فرنیج میں سیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں تیل گرم کر کے کوفتوں کو درمیانی آنچ پر بڑپ فرمائی کر لیں۔ ایک پیتلی میں مکھن اور گھی گرم کر میں اس میں لوگ، ثابت، دھنیا، دارچینی، مٹھیں، دانے، 2 بڑی الائچی، 2 سبز الائچی اور 10 ثابت سیاہ مرچ ڈال کر بکڑرائیں۔ ہری پیاز اور کرپی پاؤڈر ڈالیں۔ ٹماٹر ڈال کر بھونیں پانی تنھار کر چاول ڈالیں نمک اور حسب ضرورت تخی ڈال کر چاول پکائیں۔ چاولوں کو سرورنگ ڈش میں نکال لیں اور فرمائی کیے ہوئے کوفتوں کو درمیان میں سے کاٹ کر اس کے اوپر رکھ کر سیٹ کر لیں۔ مزیدار رینیو بالزودہ رائس تیار ہے کریم سے گاڑ کر لکڑی کے گرم گرم سرو کریں۔

ترکیب قیمتی دانہ اور دال کو بالکل باریک پاؤڈر کی شکل میں پس لیں اب اس میں پاؤڈر کی ۔۔۔ نموڑی سی مقدار بجا کر دودھ میں پاؤڈر ڈال کر رات بھر کے لیے چھوڑ دیں۔ ایک نان اسٹیک پن میں 1 کھانے کا چمچ مٹی گرم کریں اور یہ دودھ والا آمیزہ ڈال کر دھیمی آگ پر پکا لیں۔

چمچ مسلسل چلائیں اور اتنا پکا کہ یہ ریڈ کریم کی طرح نظر آنے لگے۔ ایک طرف رکھ دیں۔ دوسرے پن میں باقی مٹی گرم کر کے جیشی آگ پر آتا ہوا بنائیں۔ باقی بچا ہوائیتی پاؤڈر، بادام، مکھانے، ناریل اور کشمش کے ساتھ گڑ بھی ڈال دیں۔ اب دونوں آمیزے کو چھوٹے لفدوں کی شکل دیں اور جاندی کے ورق سے سجا کر سرو کریں۔

نومبر 2017ء



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ سیدہ علیشاہ، بہاول پور

سوال: اگر میں ان کی رشک قبر ہوں تو وہ بھلا

میرے کیا ہوئے؟

جواب: قبر ہوئے ناں!

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ عامرہ محرم، ملیر ہاٹ، کراچی

سوال: جو لوگ حسد کی بھٹی میں جلے ہیں ان کا

علاج بتائیں؟

جواب: جل جہنم کرم جاتے ہیں تو علاج کی

ضرورت۔

☆ فرخندہ جعفری، گجرات

سوال: سانپ کے ڈسنے اور انسان کے ڈسنے میں

کیا فرق ہے؟

جواب: سانپ کا ڈسا تو قابل علاج مگر انسان کا

ڈسانا قابل علاج..... زخم قیر تک ساتھ جاتا ہے۔

سوال: بعض لوگ کسی کا دل دکھا کر اور طعنہ زنی کر

کے خوش کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: ان کے ڈی این اے میں یہی پیوست ہوتا

ہے، کیا کریں.....

سوال: بخیل اور کتبوس میں کیا فرق ہے؟

جواب: آپ نے تو ایک ہی صفحے پر نمبرہ اور سوال

لکھ کر بھیج دیے یہ کبھی نہیں؟

☆ نسرتین منظر، کراچی

سوال: بچہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت ہے؟

جواب: تم ابھی تک کیا کر رہی ہو محنت یا پھر قسمت کا

انتظار۔

سوال: آئینہ دیکھ کر خود سے باتیں کرتی ہوں اور

ماہنامہ پاکیزہ

ساتھ، ساتھ گنگنا تاتی رہتی ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: آئینے پر زیادہ دھیان دو کی تو ڈر جاؤ گی،

گنگنا کر موڈ جو صحیح کرتی ہو۔

سوال: انسانیت کی معراج کیا ہے؟

جواب: بندگی پر درگزار و اطاعت گزاری رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

سوال: یہ زندگی افسانہ ہے، ناول ہے یا ناولٹ؟

جواب: طویل..... طویل ترین ناول جو محشر پر ہی

تمام ہوگا۔

☆ ماہ رخ، حیدرآباد

سوال: سفر کے دوران اکثر گاڑیوں میں لکھا ہوتا

ہے۔ اپنے سامان کی خود حفاظت کریں اس کا کیا مطلب

ہے؟

جواب: یعنی دوسروں کے سامان کو بھی اپنا ہی

سمجھیں۔

سوال: جس کو چاند کیوں کہتے ہیں؟

جواب: جنہیں کیوں اعتراض ہے تم حسن کو سورج

کہہ لو، حسن کو کیا فرق پڑے گا۔

سوال: ہر شوہر کو اپنی بیوی سے اور ہر بیوی کو اپنے

شوہر سے شکایت کیوں ہوتی ہے؟

جواب: شکایت ہر رشتے کی مجبوری ہے۔

☆ جمیل نیاز، ملتان

سوال: بابی یہ مہنگائی بھلا کون بڑھاتا ہے؟

جواب: جواب جان کر مرواؤ گی کیا لڑکی.....

☆ عرشہ جنید، کراچی

سوال: مجھے دو اور دو پانچ کرنے ہیں..... طریقہ بتادیں؟

جواب: تم زیادہ کے چکر میں ہو ایسا کرو 2 اور 2 بائیں کر لو فائدے میں رہو گی۔

☆ فلک بنت عبدالندیم، حیدرآباد

سوال: حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاجحہ کب دلائی جاتی ہے؟

جواب: پڑوس کی شادی میں اپنے رشتے داروں کو بلا کر۔

سوال: آئیں بائیں شائیں کب کیا جاتا ہے؟

جواب: جب ابا جان رزلٹ کے بارے میں پوچھیں۔

سوال: یہ بزرگ لوگ ہر وقت اپنی جوانی کے قصے کیوں سناتے ہیں؟

جواب: تو تمہارا کیا خیال ہے بعد از مرگ کے قصے ابھی سے بتادیں۔

☆ نسرین یاسین، لطیف آباد

سوال: دنیا کے دوائیے ہتھیار جو انٹیم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہیں؟

جواب: معلوم تو ہے تمہیں، دو چٹانک کا گوشت کا لوتھرا جسے بیچارے دانتوں کے بیچ رہنا پڑتا ہے..... اور سب کچھ کہتی آنکھیں جو قیامت سی قیامت ڈھاتی ہیں۔

سوال: کتے کو کیوتر کی طرح خط دے کر کیوں نہیں بھیجا جاتا؟

جواب: سیانا ہے، راستے ہی میں پڑھ پڑھا کر پھاڑ دے گا۔

سوال: مرد اتنے جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

جواب: کن، کن، کن بیچاروں نے تم سے جھوٹ بول دیا ذرا نام اور حلیہ تو بتانا۔

☆ نزمین سرہیو، سندھ

سوال: منافق لوگوں کی چٹنی بنانے کا آسان

طریقہ؟

جواب: غلوں کی چاشنی میں کئی بار جوش دے لو پھر اسے محبت کے بٹے سے باریک پیس لولا جواب چٹنی تیار ہے۔

سوال: انسان کی منفی سوچ پر تالا لگانا ہے کہیں چابی آپ نے تو نہیں اٹھالی ہے؟

جواب: ایسے تالے کی کوئی چابی نہیں ہوا کرتی، اسے آگ لگا کر تیل بند کیا جاتا ہے۔

سوال: عورتوں کو بھلا ناصی اھقل کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: اوپر کے دو سوالوں کی پتا پر..... ہا ہا ہا..... ☆ ماہ نور خاں، بہارہ کپو

سوال: دل کی سنوگر کرو دماغ کی..... کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

جواب: بہن یہ ان سے کہا جاتا ہے جن کا دماغ بھی ہوتا ہے..... تم کیا کرو گی جان کر۔

سوال: لوگ جل کر کباب ہونے کے بجائے کھل کر گلاب کیوں نہیں ہوتے؟

جواب: یہ تو اپنی اپنی جگہ کی بات ہے وہ چولھے پر بیٹھے ہیں یا باغ میں کھڑے ہیں۔

سوال: دیرینہ خواہش کی تکمیل پر بے اختیار آنسو کیوں نکل پڑتے ہیں؟

جواب: تشکر و خوشی کے..... آنسو ہی تو اصل ہم دم ہیں۔

سوال: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟

جواب: مر کر..... ابدی زندگی میں۔

☆ نسرین..... حیدرآباد

سوال: کون سی بات شوہروں کو خوش کر دیتی ہے؟

جواب: ایک شوہر کو یا سب شوہروں کو وضاحت کر دو۔

☆☆☆

کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اگر آپ جاہن تو ذیل میں دیے گئے کلینزنگ کے گھریلو نسخے استعمال کر سکتی ہیں۔
چکنی جلد کے لیے..... لیمون یا سکنرے کا عرق
خشک جلد کے لیے..... عرق گلاب یا عرق صندل
نارمل جلد کے لیے..... سونف، لیمون، گلاب اور صندل کا عرق

حساس جلد کے لیے..... گلاب اور صندل کا عرق
ایک بہترین نسخہ یہ بھی ہے کہ ایک پیالی نیم گرم پانی میں ایک قطرہ لیمون کا ڈالیں۔ فلائین کا ٹکڑا لے کر اس پانی میں بھگوئیں اور چہرے پر اتنی دیر رکھیں کہ آپ تازگی محسوس کرنے لگیں۔ یہ عمل ٹونر اور کلینزر دونوں کا کام دے گا اور جلد جان دار، صاف اور چمک دار ہو جائے گی۔

ٹوننگ

ٹوننگ چہرے کے کھلے مساموں کو صاف کرتی اور انہیں میک اپ کے اثرات سے محفوظ رکھتی ہے، نیز جلد کو تازہ دم اور تندرست رکھتی ہے مگر اس کی زیادتی جلد کو خشک کر سکتی ہے، اس لیے اسے ہفتے میں ایک بار استعمال کریں۔ ایک اچھا ٹونر جلد کو صاف اور نرم بھی کرتا ہے۔ چہرے پر برف کے پانی کے چھینٹے بہترین گھریلو ٹونر ہے، جو جلد کو طویل عرصے تازہ دم رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف چہرے پر بلکہ طبیعت پر بھی خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس کا فیشل چہرے پر خون کی گردش بڑھا کر سرخی لاتا ہے، مگر اسے ہفتے میں ایک مرتبہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ عرق گلاب کو بھی مؤثر ٹونر سمجھا جاتا ہے۔ چار چائے کے چمچ لیمون کا رس اور چار چمچ گلاب کا عرق ملا کر بوتل میں رکھ لیں۔ اسے چہرے پر لگائیں پھر دیکھیں اس کا اثر.....

☆☆☆

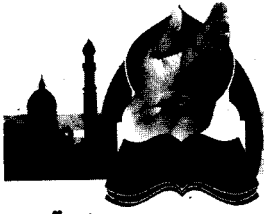
آج کل میک اپ کا استعمال اس قدر عام اور ضروری ہو گیا ہے... لگتا ہے کہ اب کوئی بھی خاتون اس کے بغیر نہیں رہ سکتی مگر تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کاسٹیکس میں شامل کیمیائی اجزاء جلد سے متعلق پیچیدہ مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ معیاری اور مہنگی اشیا (آرائش حسن) ان خطرات کو قدرے کم کرتی ہیں۔

میک اپ ضرور کریں مگر ایک تو معیاری اشیا استعمال کریں دوسرے جلد کی صفائی اور نگہداشت بھی کریں۔

کلینزنگ

میک اپ سے پہلے اور بعد میں چہرے کو کسی صابن سے دھونے سے گریز کریں۔ اس کے بجائے پھولوں اور پھلوں کا اعلیٰ تیل یا عرق یا بغیر خوشبو کا کلینزر استعمال کریں جو آپ کی جلد کے لیے مناسب ہو۔ کلینزنگ کے لیے ہمیشہ نرم و ملائم نشو و نما ملل کا کپڑا استعمال کریں۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ دن کے اختتام پر آپ کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز ہو۔ اس لیے میک اپ صاف کیے بغیر کبھی سونے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مسام بند ہو جاتے ہیں۔ ماہر سے مایہ جیوشن بھی آپ کو یہی مشورہ دیں گی۔ اگر آپ وقت بچانے کے لیے ایسا کر رہی ہیں تو آپ کو اس کی بھاری قیمت داغ و جھول اور چمکی رنگت کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی۔ اگر آپ کے پاس وقت نہیں تو آپ اسکن کنیر واپس استعمال کر سکتی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ کوئی بھی چیز خریدتے وقت اس کے اجزاء کی فہرست ضرور دیکھ لیں۔ نامیاتی اجزاء پر مشتمل کلینزر خریدیں۔

میک اپ سے پہلے کلینزنگ کا استعمال جلد پر پاش کا کام کرتا ہے اور جلد ایسی نظر آتی ہے جیسے آپ نے فیشل کیا ہو، اگرچہ کاسٹیکس کی جدید دوا میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر نتائج کی حامل کلینزنگ کریمیں دستیاب ہیں تاہم انہیں ہر کوئی خریدنے



ادارہ

ماہنامہ اسلامی مشورے

وسعتِ رزق کے لیے

خواہشاتِ لاحدود ہو جائیں تو اپنا رزق ہمیشہ کم لگتا ہے۔ پروردگار تو ہر بندے کو اس کی ضرورت کا رزق ضرور مہیا کرتا ہے۔ یہ ہم ہیں جو ناشکری کیے جاتے ہیں ربِّ غفور نے تو زندہ رہنے کے لیے اور عبادت اور حلال کاموں کے لیے طاقت بھر کا رزق دیا تو ہم نے تین وقت کے بجائے چھ وقت کھانا شروع کر دیا۔ چار جوڑ لباس ضرورت کے لیے کافی مگر چالیس جوڑ کپڑے بھی کم لگے۔ اس طرح مخلوق خدا کی مدد کے لیے دل آمادہ نہ ہو سکا پھر تو اپنی روزی روزگار تو کم ہی لگے گناہاں.....

اللہ پاک نے صدقہ و خیرات، زکوٰۃ کے ذریعے ہمارے رزق کو فراوان کرنا چاہا مگر ہم نے اسے اپنے تک ہی محدود کر لیا اور تنگیِ رزق کی شکایت اپنا معمول بنالیا۔ بہر حال اپنے اعمال پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کیا ایسے افعال و اعمال تو نہیں جو دعاؤں کی قبولیت میں رکاوٹ اور تنگیِ رزق کا باعث ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو صحیح طور پر سنت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلنے کی توفیق عطا کرے آمین،

وسعتِ رزق کے لیے گھر میں سلام کو عام کریں۔ باہر سے آنے والا بد آواز بلند سلام کرے۔ ہر نماز کے بعد تین دفعہ درود ابراہیمی پڑھ کر سورۃ قریش پانچ بار پڑھیں اور پھر درود پاک پڑھیں۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ اور جھج پکار سے بچیں..... بزرگوں کی خدمت و اطاعت کو اپنا شعار بنائیں۔ یتیموں پر رحم کریں۔ اپنے آپ کو

ہرگز ایسا نہیں سمجھیں کہ میں تو بہت عبادت کرتی ہوں اور اللہ پاک میری دعا نہیں سنتا یہ (اللہ نہ کرے) کفر کے برابر ہے۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا رحم خاص فرمائے، آمین۔ ☆☆☆

بچوں کی شادی

کے لیے خصوصی عمل.....

دور کھٹ لٹل حاجت کی نیت سے کسی بھی فرض نماز کے بعد پڑھیں اور خضوع خشوع کے ساتھ گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور دعا مانگیں۔

”اے اللہ پاک و طاہر ہے تیری ذات..... (حنان ہے منان ہے، مستعان ہے، یکنا دوحدہ لاشریک ہے)

تیری قدرت بیش بہا ہے تو اپنے کرم سے اپنے رحم سے اپنے جود و سخا سے ہم پر عنایت فرما..... ہم اپنے گناہوں پر سچے دل سے نادم ہیں۔ ہماری خطاؤں کو درگزر فرما۔ ہمیں سچی توبہ کی توفیق دے۔ ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق بخش، طاقت دے، ہمت دے..... ہماری مشکلات کو حل کر..... ہمارے لڑکے، لڑکیوں کو پاک دامنی عطا فرما.... نیک ازواج نصیب فرما..... اے پالنے والے، ہماری نعمتیں بنانے والے ہمارے بچوں کے اچھے نصیب کر..... اپنے حبیب پاک کے صدقے میں دنیا و آخرت میں ہمیں سرخرو کر..... ہماری آل اولاد کو ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنا دے۔“

آخر میں پروردگارِ عالم کے حضور ہم بھی دعا گو ہیں کہ جن بچیوں کے والدین اپنی بیٹیوں کی

تُسْعِيَةً وَتَسْعِيَةً كَأَيِّ أَيْسُرْهَا
أَلْهَمَ (مَكْنُوءَةً) یعنی لا حول ولا قوۃ الا
بِاللّٰہ۔ ننانوے بیماریوں کی دوا ہے۔ ادنیٰ ان
میں سے غم ہے۔

دین و دنیا کے فکروں سے

کفایت کرنے والا وظیفہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص
صبح کو پڑھے اور شام کو (آیت ذیل) سات، سات
بار۔ اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا اس کو دنیا و آخرت کے
فکروں سے آیت یہ ہے۔
رَحْمَتِي اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيمِ۔ (ابن سنی) کافی ہے مجھ کو اللہ، نہیں کوئی معبود سوا
اس کے، اسی پر بھروسہ کیا میں نے اور وہ رب ہے
بڑے تخت کا۔

☆☆☆

ستر ہزار فرشتوں کی

دعائیں لینے کا عمل

حضرت معقل بن یسار کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص صبح کو تین مرتبہ
پڑھے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سننے والے جاننے والے
کی شیطان مردود سے۔

پھر ایک بار سورہ حشر کی آخری چار آیتیں
پڑھے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے
دعائے رحمت کرتے ہیں اور اگر اسی طرح شام
کے وقت پڑھے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس
کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اگر پڑھنے
والا اس دن یا اس رات مر جائے تو شہادت کا
ثواب پائے گا۔

☆☆☆

شادی کے لیے از حد پریشان ہیں میرے آقا رسول
پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر حضرت بی بی
فاطمہ الزہراءؑ کے صدقے سے جلد سے جلد ان بچیوں
کو بہترین، نیک خصلت اور صالح زوج عطا
ہوں، اُمی آمین۔

☆☆☆

سمندر کے جھاگ کے

برابر گناہ معاف

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی دن میں سو
مرتبہ کہا۔ سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ تو اس کے گناہ مٹا
دیے جاتے ہیں، خواہ سمندر کے جھاگ کے مانند
ہوں۔ (بخاری مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے چُن
لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے (یہ)
وظیفہ (سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ) (صحیح مسلم)
معلوم ہوا کہ یہ وظیفہ فرشتے بکثرت پڑھتے
ہیں۔ آپ بھی کم از کم ایک سو بار روز پڑھ لیا
کریں۔

عرش کا خزانہ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے عبد اللہ بن قیس کو کہا۔ ”کیا میں خبردار
نہ کروں مجھ کو فرشتوں کے خزانوں میں سے ایک
خزانے پر“ عبد اللہ بن قیسؓ نے کہا حضور! ضرور
مجھے خبردار کیجیے..... آپ نے فرمایا۔ ”وہ خزانہ یہ
ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.....“ (بخاری
مسلم)

نہیں ہے طاقت گناہوں سے پھرنے کی اور نہ
قوت نیکی کرنے کی مگر ساتھ اللہ کی مدد سے.....

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لَا حَوْلَ
وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ..... دُوءًا مِنْ



شوابع ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوئی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹر کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بہت زیادہ ہے، ہر قسم کے ٹوٹکے، دوائی وغیرہ استعمال کرتی ہوں لیکن کوئی افادہ نہیں ہوتا۔ میری گردن بہت کالی ہے۔ کمر میں درد بھی بہت زیادہ ہے، سانس بھی پھولتا ہے۔ گرمی میں پسینا بھی بہت زیادہ آتا ہے، بدبودار۔ پندرہ سال سے آپ کا رسالہ پڑھتی آرہی ہوں۔ میرے لیے کوئی بہتر نسخہ تجویز کریں،

جواب۔ صحیح تشخیص صحیح علاج کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت مختصر آپ نے حال لکھا ہے۔ اور نہ کوئی بیماری کی ہسٹری کہ کب سے ہے اور کیا کیا دوا میں کھائیں؟ اور نہ ہی کوئی ٹیسٹ رپورٹس۔ برائے مہربانی الٹرا سائونڈ CBC, LFT, Whole abdomen اور Hepatitis B & C کی رپورٹس کر کر مکمل حال بتائیں تاکہ صحیح تشخیص اور پھر صحیح دوا تجویز کر سکیں گے۔

جسمانی کمزوری

مسز شازیہ..... حیدر آباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال سفید ہونا شروع ہو

جگر کا بڑھنا

مسز طارق..... سیالکوٹ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا جگر بڑھا ہوا ہے، لیکوریا

ٹوکن

برائے شوابع ہومیوکلینک

دسمبر 2017ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر تو جنس دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____
پتا: _____



حلّے بن گئے ہیں۔ اکثر سردرد رہتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا وہ کہتی ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف وزن کم کریں۔ چاول، بڑا گوشت، دہی، نان وغیرہ بالکل نہیں کھاتی۔ سبزھیاں بھی بہت اترتی چڑھتی ہے۔ کالج میں بھی پھرتی رہتی ہے۔ اگلے سال کے شروع میں انشاء اللہ شادی طے کر دی ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی اچھی سی دوا تجویز کر دیں۔

جواب۔ ایام کب شروع ہوئے اور جس عمر میں شروع ہوئے اس وقت اس کی کیا حالت تھی؟ تفصیل سے لکھیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی Magnesium Phos Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں دو مرتبہ چوبیس۔ جبکہ Pulsatilla 200 کے پانچ قطرے آدھے گلاس پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ پیش، 5,5 کے Calc Phos 30 میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ جواب پاکیزہ کے ذریعے ہی دیا جائے گا۔ اس لیے جوابی لفافہ نہ بھیجا کریں۔ اور نہ ہی فون کریں۔

ناک کا گوشت

روحیلہ..... لائنڈھی

میں نے آپ کو اپنی بیٹی کی ناک کے بڑے ہوئے گوشت کا مسئلہ لکھا تھا۔ بیٹی کو دوا سے سانس لینے میں کافی آرام آیا ہے۔ کیا ابھی وہی دوا استعمال کروں؟ جواب۔ جی ہاں مزید ایک ماہ یہی دوا استعمال کریں۔

مسئلہ کچھ اور ہے

اختری..... کورنگی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ دنوں پہلے میرے گردے میں درد ہوا۔ محلے کے ایک ڈاکٹر کے پاس گئی جس نے نیندرکی گولیاں دے دیں۔ گولی کھاؤں تو نیند آ جاتی ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پھر درد شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ 6 ماہ علاج

کئے ہیں، لیکو، یا بھی ہے۔ میرے منہ پر دانے، کھل مہاسے اور جھپیاں بہت زیادہ ہیں۔ کبھی جلد کا رنگ بڑا صاف سا ہوا کرتا تھا، اب جب سے بیمار ہوں خراب ہو گیا ہے۔ برائے مہربانی میرے لیے اچھی سی دوا میں تجویز کریں جن سے فریش نظر آؤں۔

جواب۔ آپ کے ساتھ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی شادی انتہائی کم عمری میں ہو گئی، پھر اوپر تلے کے بچے، آپ کے اندر خون کمی بھی ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی Sepia, Lycopodium 30 کے 7,7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں، اور Ferrum Pentarkan Ptk 45 کی دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ سادے پانی کے ساتھ لیں، چہل قدمی کیا کریں اور متوازن غذا کا استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ماہانہ نظام

زاہدہ..... فیصل آباد

ماہانہ نظام کی خرابی کا مسئلہ اللہ کا شکر ہے تھوڑا بہتر ہوا ہے۔ لیکن بالکل درختم نہیں ہوا ہے۔ پیٹ بھی کم ہوا ہے۔ غیر ضروری بالوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ویسے ہی ہیں بلکہ ایپس پر اور واضح ہو رہے ہیں۔

جواب۔ PTK-60 اسی طرح جیتی رہیں اس کے ساتھ Pulsatilla 30 اور Calc Phos-30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ لیں۔ دو ماہ تک۔

وزن بڑھ گیا ہے

نام شائع نہ کریں..... رازق آباد

میں آپ کا یہ سلسلہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مسئلہ میری بیٹی کا ہے۔ اس کا وزن بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پیٹ اور کولے بہت بھاری ہو گئے ہیں۔ پیٹ باقاعدہ لنگ گیا ہے۔ اس کے ماہانہ نظام میں بے قاعدگی ہے۔ رنگ سناٹا ہوا ہے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے



کروانا پڑے گا۔ پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے 6 ماہ علاج کا خرچہ پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا ہر ماہ کا خرچہ تقریباً 10,000 روپے آئے گا۔ میں ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ اتنا مہنگا علاج نہیں کروا سکتی۔ جس کی وجہ سے مایوس ہو گئی ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ تازیت دعا گورہوں گی۔

جواب۔ رپورٹس کے مطابق خون کی کمی ہے اور جگر کا مسئلہ ہے۔ خط میں آپ نے یہ نہیں لکھا کہ گردے کا درد کس طرف اور کہاں ہوا تھا۔ کیا کھانے سے ہوا تھا۔ اب کیفیت کیا ہو رہی ہے۔ پیشاب، بھوک اور درد کی تفصیل لکھیں۔ کسی اچھی جگہ سے الٹرا ساؤنڈ Whole CBCHCVLFT, ESR, Abdomen رپورٹ کمپیوٹر پر ہو ہاتھ سے لکھی نہ ہو۔ فی الحال ڈاکٹر ولما رشوا بے جرنی کی Berberis VulgQ کے ساتھ Carduus Marianus Pentarkan Ptk-23 کے 10 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ پیئیں۔ ان کے علاوہ Ferr. Phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں، نظر بھی چیک کرائیں۔

سانس کا مسئلہ

فرزانہ..... میر پور

میرے بیٹے جس کی عمر 4 سال ہے بہت سخت بیمار ہے۔ میں آپ کو بہت دکھی ہو کے خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے جلد سے جلد جواب سے نوازیں، میرا بیٹا جب سے پیدا ہوا ہے۔ 4 مہینے ٹھیک رہا ہے۔ اس کے بعد اس کو ہر وقت نزلہ زکام اور شدید کھانسی رہتی تھی۔ ساری رات کھانسا رہتا یا چھاتی بند ہو جاتی تھی اور میں ساری رات اسے گود میں لے کر گزارتی تھی۔ بہت علاج کروائے مگر آرام نہیں آیا۔ پھر جب تقریباً ڈیڑھ سال کا تھا تب سے ایسی کھانسی لگی ہے کہ آج تک ٹھیک نہیں ہوئی اور اب

درد میں چکا ہے۔ بار بار نیبولائز کرتے ہیں، رات میں کئی بار نیبولائز کرتے ہیں اور سانس اتنی شدت سے بند ہوتی ہے کہ بچہ تڑپتا ہے اور کہتا ہے ای میں مر گیا۔ کبھی کبھی نیبولائز کرنے سے بھی فرق نہیں پڑتا ہے اور اب صبح شام انسٹیلر کے بھی دو لف دیتے ہیں تو چار پانچ کھنسنے گزرتے ہیں۔ یہاں پر ہومیو ڈاکٹر سے تین مہینے علاج کروایا مگر آرام نہیں آیا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے پھیپھڑے سکل گئے ہیں۔ ایک اور ڈاکٹر کے مطابق بچے کی سانس کی نالیاں تنگ ہو گئی ہیں اور ریشے سے بھر جاتی ہیں۔ اس لیے سانس نہیں آتا۔ کبھی کبھی اٹنی آتی ہے تو کچا ریشہ بہت لکھتا ہے۔ اور جب سانس کھینچتا ہے تو گردن کے نیچے اور پسلیوں کے درمیان میں گڑھا بنتا ہے۔ کمزور بھی بہت ہے۔ بازو بہت پٹکے ہیں اور جسم پر چڑا ہوا نظر آتا ہے۔ گوشت کا تو نام و نشان بھی نہیں ہے۔ اب بھی، کبھی کہتا ہے کہ میرے کان بند ہو گئے ہیں نظر بھی بہت کمزور ہے۔ کلاس میں بورڈ کے بالکل پاس بیٹھتا ہے تب نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی آنکھ میں ٹیڑھا پن ہے جس کی وجہ سے اسے نظر نہیں آتا اور یہ مسئلہ آپریشن سے حل ہوگا۔ اس کے بارے میں بھی بتائیں۔ بظاہر دیکھنے میں آنکھیں ٹھیک لگتی ہیں۔ میرے بیٹے کے لیے کوئی اچھی سی دوا بتادیں۔

جواب۔ خاندان میں کسی کوئی بی یا دمہ ہو یا نزلہ زکام کا مسئلہ ہو اور ماں دوران حمل اپنی صحت کا خیال نہ رکھے یا وہ خود کمزور ہو تو اس کے ہاں ہونے والی اولاد بھی کمزور اور قوتِ مدافعت کی بھی کمزوری ہوتی ہے۔ دودھ پلانے کے زمانے میں بھی ماں اپنی صحت کا خیال نہ رکھے تو بچے مختلف بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اب آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہیں کیونکہ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اپنی صحت کا پہلے خیال کریں۔ بچے کو تازہ ہوا زیادہ دیں، گائے اور بکرے کا گوشت کھلائیں، موسم کی سبزیوں کے ساتھ موسم کے تمام پھل دیں۔ اصلی دیکسی مرغی اور انڈا فائدہ مند ہے۔ میدے سے بنی چیزیں پرانھا، بسکٹ، ڈبل روٹی، پاپے نہ دیں



شروع کریں۔ Asafoetida

Pentarkan- Ptk-12

قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے

ساتھ دن میں 3 مرتبہ، Ferrum

2Pentarkan-Ptk-45 گولیاں تھوڑے پانی کے

ساتھ دن میں 3 مرتبہ، GrindeliaPentarkan-

10-Ptk-51 قطرے ایک گھونٹ پانی کے ساتھ دن میں

3 مرتبہ، Magnesium Phosphorium-

3 مرتبہ، Passiflora

1Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ،

15Pentarkan- Ptk-66 قطرے ایک گھونٹ پانی

کے ساتھ شام اور رات کو، Urtica Pentarkan-

8Ptk-86 دن قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن

میں 3 مرتبہ لیں۔

چہرے اور ہاتھوں پر درم

نشاط بانو..... کراچی

میں آپ کا کالم میڈیکل کانفیڈنس سے پڑھ

رہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب، کچھ عرصے سے میں مختلف

بیماریوں میں گھری ہوئی ہوں۔ جسم ہر وقت سست رہتا

ہے۔ ذرا ساجلی ہوں تو گرمی اور گھبراہٹ سے چہرہ سرخ

ہو جاتا ہے اور گھبراہٹ بھی ہوتی ہے۔ پیشاب کے بعد

قطرے بھی آتے ہیں۔ حاجت بھی صحیح نہیں ہوتی، دو تین

بار جانا پڑتا ہے۔ صبح اٹھتی ہوں تو ہاتھوں اور چہرے

پر درم ہوتا ہے۔ ہاتھوں کا درم کچھ دیر بعد کم ہو جاتا ہے

لیکن چہرے پر ہر وقت درم رہتا ہے۔ پیڑ ایک دن

بھی صحیح نہیں ہوتے۔ لیکور یا کبھی شکایت ہوگئی ہے۔

بلڈ پریشر کے لیے میں ٹینورمن لیتی ہوں۔ میں

اپنی بیماریوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میرے

لیے اچھا نسخہ تجویز کریں۔

جواب۔ آپ کے اعتماد کرنے کا اور پسندیدگی کا

شکریہ۔ آپ نے اپنا وزن اور عمر نہیں لکھی۔ آپ کراچی

میں رہتی ہیں بہتر ہے کہ ٹائم لے کر آکر ملیں۔ بلڈ ٹیسٹ

کرائیں، CBC Lipid, Urea, Uric Acid ESR،

اور چینی کی چیزوں سے بھی پرہیز کرائیں۔ نہانے کے بعد چٹکے، اسے سی یا دھوپ میں فوراً نہ جائیں اس طرح گرمی سے یکدم ٹھنڈی جگہ میں نہ آئیں۔ ٹھنڈا پانی، شربت، کولڈ ڈرنکس، قافی، برف جیسی چیزوں سے بچیں۔ نارمل پانی دیں۔ شہد اصلی صبح ناشتے میں دیں۔ ڈاکٹر و لمار شوابے جرمنی کی Grindelia Pentarkan- 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں، ایمر جنسی کی صورت میں اس کے 15 سے 20 قطرے آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے سے دے سکتی ہیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے دوبارہ مطلع کریں۔

مختلف مسائل

شازنرے..... انک

کچھ عرصے سے میرے ساتھ کچھ مسائل ہیں وہ

لکھ رہی ہوں۔ دائیں آنکھ بڑی اور بائیں آنکھ چھوٹی

لگتی ہے۔ ماہانہ ایام صرف ایک دن کے ہوتے ہیں۔

چہرے پر بال ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کے نیچے جلتے اور

گڑھے بن گئے ہیں۔ نیند بالکل نہیں آتی۔ آئی بھی ہے

تو 3 سے 4 گھنٹے اور بار بار آنکھ ملتی رہتی ہے۔ ٹانگوں

پر اکثر اور باقی جسم پر کبھی کبھار اس قدر خارش ہوتی ہے

کہ خون بہنے لگتا ہے۔ سانس کی تکلیف ہے۔ آنکھوں کا

استعمال کرتی ہوں۔ کچھ مخصوص مہینوں میں تکلیف ہو

جاتی ہے۔ سینے میں اکثر جلن رہتی ہے اور گیس بنتی ہے۔

گردن معمولی سی سوجنی ہوئی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں

کبھی کبھار درد ہوتا ہے۔ نچھوں میں درد رہتا ہے۔

چہرے کی جلد ڈھیلی ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے پاس لائینیں

پڑنی ہیں۔ سر کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے اب

بال بے حد ہلکے ہو گئے ہیں اور تیزی سے سفید ہو رہے

ہیں۔ بال گر بھی رہے ہیں۔ میرے لیے اچھا سا علاج

تجویز کریں کہ میں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب۔ ڈاکٹر و لمار شوابے جرمنی کی Sulphur

200 کی ایک خوراک (5 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی)

صبح نہار منہ لے کر ایک دن کے بعد مندرجہ ذیل ادویات

Ptk-73 ایک گھونٹ سادہ پانی میں 11 قطرے دن میں 4 بار لیں۔ Spigelia Pentarkan- Ptk-81، 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکچوریا

رائفہ..... لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے پانچ چھ سالوں سے لیکچوریا کی شکایت ہے جس کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں۔ کچھ عرصے میں میرا وزن بے حد بڑھ گیا ہے۔ میرے لیے دوا میں تجویز کریں۔

جواب۔ آپ Serum Prolactin, Insulin, Thyroid Profile چیک کرا کر رپورٹ بھیجیں۔ تمام چیزوں سے بچیں جو ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔ Iodine 30, Natr-Mur 30, Borax 30 کے 7، 7 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

پیٹ میں گیس

آئم عبداللہ..... سیالکوٹ

میرا بیٹا 9 سال کا ہے۔ اس کو گیس پراہل ہے۔ سارا دن گیس خارج کرتا ہے۔ اور گرمیوں میں صبح نہار منہ یا ناشتے کے بعد اٹنی کر دیتا ہے۔ تمام گرمی اس کا یہ مسئلہ رہتا ہے۔

جواب۔ بچے کو سوتے وقت دودھ نہ پلایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی Carboveg 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 2 مرتبہ دیں (صبح و شام) 15 دن بعد حال بتائیں۔ کھانے میں ہلکی غذا دیں۔

profile اور فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ 10 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ Solidago Pentarkan- Ptk-79، 10 قطرے ایک گھونٹ سادہ پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ Viscum Pentarkan- Ptk-89، ایک گولی دن میں تین مرتبہ Magnesium Phosphorium Pentarkan- Ptk-60، نمکین چیزیں اور مرغن اشیا سے پرہیز کریں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

پٹھوں میں درد اور کھنچاؤ

عشرت عزیز..... لاہور

عرصہ 6 سال سے پٹھوں میں کھنچاؤ کی شکایت ہے، دو سال پہلے ڈاکٹر کا علاج بھی کر دیا، وقتی افادہ ہوتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ گردن، ٹانگوں بازوؤں میں شدید کھنچاؤ ہے، ہاتھ پاؤں میں کڑ لیں پڑتی ہیں، نماز بھی نہیں پڑھی جاتی۔ روزانہ دلوانا پڑتا ہے تب کہیں رات گزرتی ہے، کوٹھے اور پسیلوں کے نیچے 10 منٹ چلنے سے درد شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو میں ٹکیہ بھی نہیں رکھتی کہ گردن اڑ جاتی ہے۔ بلڈ پریشر رہتا ہے اور گیس بھی ہوتی ہے۔ اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔

جواب۔ جتنا پیدل چل سکتی ہیں چلیں، تیز مرچ مصالحے اور مرغن کھانوں سے بچیں، Urea, Uric CBCLipid profile, ESR, Acid HbA1C, Calc. Vit-D، اس وقت تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Carbo Vegetabilis Pentarkan- Ptk-22 ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں، Rhus toxicodendron Pentarkan-



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی